مختصر تاریخ ادب اردو

(باتصویر)

از

پروفیسر محمود بریلوی

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

مختصر تاریخ ادبِ اُردو

(باتصویر)

از

پروفیسر محمود بریلوی

فیضانِ اسلام، رودادِ پاکستان، پاکستان کی اسلامی اساس، سیرۃ النبیؐ (انگریزی)، وغیرہ

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طابع شیخ نیاز احمد
مطبع غلام علی پرنٹرز ۔ اشرفیہ پارک ۔ لاہور
اشاعت اوّل ۱۹۸۵ء

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ ۔ پبلشرز
ادبی مارکیٹ ۔ چوک انارکلی ۔ لاہور

فہرست ابواب

نمبر شمار	نام باب	صفحہ
	پیش لفظ از	۵
	دیباچہ از مؤلف	۷
	تعارف ایضاً	۱۱
	حصّہ اوّل۔ اُردو شاعری:۔	۲۱
۱	مُتقدّمین۔ دَورِ اوّل، از ۱۵۵۰ء تا ۱۶۸۷ء:۔ دکن اور اُردو شاعری	۲۳
۲	آگرہ اور اُردو شاعری	۳۶
۳	بہار اور اُردو شاعری	۴۵
۴	سندھ اور اُردو شاعری	۴۸
۵	مُتقدّمین۔ دَورِ دوم، از ۱۶۸۷ء تا ۱۷۵۹ء:۔ دہلی اور اُردو شاعری	۵۴
۶	مُتوسّطین۔ دَورِ سوم، از ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء:۔ آگرہ اسکول	۶۹
۷	مُتوسّطین۔ دَورِ چہارم، از ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء:۔ اُردو پر درباری اثرات	۸۸
۸	مُتأخرین۔ دَورِ پنجم، از ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۸ء:۔ لکھنؤ اسکول۔ شاعری کا ابتذال	۱۰۶
۹	مُتأخرین۔ دَورِ ششم، از ۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۰ء مرثیہ کا ارتقاء	۱۵۳
۱۰	دَورِ ہفتم۔ جدید اُردو شاعری۔ مُستقل نظمیں	۱۶۵

نمبر	نام باب	صفحہ
۱۱	دورِ ہفتم، غزل پسند، شاعری، حقیقت نگاری	۱۹۵
۱۲	۱۹۴۰ء کی اردو شاعری کی خصوصیات - دورِ ہشتم	۲۲۸
۱۳	مرثیہ (رزمیہ شاعری)	۲۳۰
۱۴	قصیدہ	۲۳۹
۱۵	مثنوی (بزمیہ شاعری)	۲۴۳
۱۶	رباعی	۲۶۱
۱۷	سہرا اور عیدی	۲۶۳
۱۸	حمد، نعت و منقبت (مذہبی و صوفیانہ شاعری)	۲۶۵
۱۹	واسوخت	۲۷۰
۲۰	ہجو، ریختی و ہزل	۲۷۲
۲۱	اُردو شاعری کی تجدید	۲۷۶
۲۲	اُردو کے اَن پڑھ شعراء	۲۸۹
۲۳	شاعرات	۲۹۲
۲۴	کلام الملوک	۲۹۶
۲۵	اُردو شاعری کے مراکز - مُربیانِ سخن	۳۰۳
۲۶	اُردو کے ہندو شعراء	۳۰۷
۲۷	اُردو کے یورپی شعراء	۳۱۳
	حصّۂ دوم — اُردو نثر	۳۲۷
۲۸	اُردو ادب کی تاریخ (نثر)	۳۲۹
۲۹	اُردو زبان و ادب کی ترقی میں مسلمان مبلغین و صوفیائے کرام کا حصّہ	۳۳۹
۳۰	بنگال میں اُردو	۳۴۶
۳۱	اُردو تراجم و مترجمین	۳۵۱
۳۲	اُردو نثر کا ابتدائی ادب (کہانیاں)	۳۵۷
۳۳	جدید اُردو ادب (ناول اور مختصر افسانے)	۳۶۹

نمبر شمار	نام باب	صفحہ
۳۴	اُردو کے مشہور اہلِ قلم	۳۷۱
۳۵	اُردو ڈرامہ، اسٹیج، فلم، ریڈیو اور ٹیلی وژن	۳۹۲
۳۶	اُردو میں تنقید، مزاح و طنز نگاری	۴۰۰
۳۷	اُردو صحافت	۴۲۱
۳۸	'ترقی پسند' اُردو ادب (ناول اور مختصر افسانے)	۴۳۰
۳۹	اُردو کی اہلِ قلم خواتین	۴۳۷
	تذکرے	۴۴۱

ہم شکرگزار ہیں جناب محمد عالم مختار حق صاحب کے، جنھوں نے اس کتاب
کو خوبصورت بنانے میں ہمارا ساتھ دیا اور اپنی ذاتی لائبریری سے نہایت
عرق ریزی اور جانفشانی سے نایاب کتب میں سے تصاویر فراہم کیں اور کتاب
کو چار چاند لگا دیئے۔

ادارہ

مقدمہ

پروفیسر ڈاکٹر محمود بریلوی متعدد کتابوں کے مؤلف ہیں۔ وہ گذشتہ نصف صدی سے علمی ادبی کام کر رہے ہیں۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں اور تاریخی، ادبی اور دینی موضوعات پر ان دونوں زبانوں میں اُن کی کتابیں شائع ہو کر علم و ادب میں اضافے کا باعث بنی ہیں۔

اب اُنہوں نے یہ کتاب "مختصر تاریخ ادب اُردو" لکھی ہے، جو اُردو کی ادبی تاریخوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر صاحب نے اس کتاب میں ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک کے اُردو ادب کا ایک تاریخی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں شاعری اور نثر دونوں کے نشیب و فراز کی تفصیل ہے، جو اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ پروفیسر محمود بریلوی نے اس کتاب میں اُردو ادب سے متعلق معلومات کا ایک خزانہ جمع کر دیا ہے اور اس مواد کو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔

اُردو ادب کی اب تک جو تاریخیں مختلف ادوار میں لکھی گئی ہیں، اُن میں تذکروں کا سا انداز زیادہ ہے۔ شاعروں اور نثر نگاروں کے حالات اور اُن کی تصانیف کی فہرست تو ان میں مل جاتی ہے لیکن رجحانات کا بیان ان میں سے بیشتر میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادب کی مختلف تحریکوں کا تذکرہ بھی ان میں سے بیشتر میں نسبتاً کم ہے۔

پروفیسر محمود بریلوی نے اپنی تاریخ ادب اُردو میں ان دونوں پہلوؤں کا خاص خیال رکھا ہے اور برِعظیم ہندو پاکستان کے تاریخی پس منظر میں اُنہوں نے نہ صرف شاعروں اور نثر نگاروں کے حالات بیان کئے ہیں بلکہ جن تاریخی حالات نے اُن کو پیدا کیا ہے، اُن کی تفصیل بھی اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی جو رجحانات اُردو ادب میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور جو تحریکیں اس

میں چلتی رہی ہیں، اُن کا ذکر بھی اُنھوں نے تجزیاتی انداز میں کیا ہے اور اس تکنیک نے اُن کی اس کتاب کو ادبی تاریخ کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام پر پہنچا دیا ہے۔

یہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ اوّل اُردو شاعری کے بارے میں ہے اور اس میں دکنی اور اُردو شاعری، دہلی، آگرہ، بہار، سندھ وغیرہ میں اُردو شاعری نے ترقی کی جو مختلف منزلیں طے کی ہیں، اُن پر سیر حاصل بحث ہے۔ اس کے بعد متوسطین اور متاخرینِ اُردو شعرار کا تذکرہ ہے اور اس سلسلے میں دہلی اور لکھنو کے شعری دبستانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مرثیے کے ارتقار پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اس میں جدید شاعری کے ارتقار اور جدید اُردو شعرار پر بھی زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ترقی پسند شعرار کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ دوسرے حصّے میں اُردو نثر کے ارتقار کا بیان ہے اور اس سلسلے میں نثر کی تمام اصناف اور اس کے علم برداروں کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر محمود بریلوی صاحب نے اس تاریخِ ادب کی تالیف کے سلسلے میں تذکروں، تاریخ کی کتابوں وغیرہ کا مطالعہ محنت سے کیا ہے اور جتنا مواد بھی انھیں ملا ہے، اس سے اُنھوں نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ان تمام کتابوں کے حوالے اس تاریخِ ادب میں موجود ہیں اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کتاب اپنی جگہ اہم نظر آتی ہے۔

اس قسم کی کتابوں میں، ہر لکھنے والا مخصوص مزاج رکھنے کی وجہ سے مخصوص ترتیب کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ محمود صاحب کی ترتیب ان کی اپنی ہے۔ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ بعض لکھنے والوں پر اُنھوں نے جو رائیں دی ہیں، اُن سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ہر لکھنے والا ادبی تاریخ کو اپنے مزاج اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس نے کتنا مواد جمع کیا ہے۔ اس مواد سے کس حد تک فائدہ اُٹھایا ہے اور اس

کو کس طرح پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے مخصوص مزاج اور مخصوص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ اور اس مخصوص مزاج اور مخصوص نقطۂ نظر کی جھلکیاں اس کتاب میں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ لیکن اس میں مواد خاصہ جمع کر دیا ہے۔ اس سے فائدہ بھی اُٹھایا ہے اور حتی الامکان اس کو سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اس لئے مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور اُردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی لینے والے اس سے استفادہ کریں گے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

۷ جولائی ۱۹۸۵ء، لاہور

تعارف

اُردو زبان کی اساس پر جن مستند تصانیف میں بحث کی گئی ہے اُن میں سب سے زیادہ معروف و معتبر کتابیں، ان کے مفصّل و سیر حاصل تبصروں کے باعث، حسبِ ذیل ہیں :۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، (انگریزی)۔ ڈی لنگویسٹک سروے آف انڈیا، (انگریزی)۔ 'وضع اصطلاحات' از مولوی وحید الدین سلیم۔ 'رسالہ علم اللسان' از سیّد محمد دہلوی (مصنّف 'فرہنگ آصفیہ') 'اُردو لٹریچر' (انگریزی) از گراہم بیلی (GRAHAM BAILEY) (ہیریٹیج آف انڈیا سیریز) 'تمدنِ ہند' از سیّد علی بلگرامی 'تمدنِ ہندِ قدیم' از رمیش چندر دت وغیرہ۔

امیر احمد علوی کی 'اُردو شاعری' اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کی 'ہماری شاعری' میں بھی اُردو شاعری و عروض پر بڑے مؤثر انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ 'فرہنگ آصفیہ' کے مصنّف سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب 'محاکمۂ مرکزِ اُردو' میں اُردو زبان کے ہر دو معروف مدارسِ فکر دہلی اور لکھنؤ کے درمیان ادبی رقابت پر بڑے دلچسپ پیرایہ میں بحث کی ہے۔

اُردو ادب میں جدیدیت (خصوصاً اُردو شاعری) کے موضوع پر سردار موہن سنگھ دیوآنہ کی 'ماڈرن اُردو پوئٹری' اور سر عبد القادر کی 'دی نیو اسکول آف اُردو لٹریچر' (انگریزی) خوب ہیں۔ امیر احمد علوی نے اپنی 'اُردو شاعری' میں اور امداد امام اثرؔ نے 'اُردوئے معلّی میگزین' کے فائلوں (۱۹۱۶-۱۸ء) میں اُردو غزل پر تنقید کی ہے۔ 'جدید اُردو شاعری' ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی کتاب 'انگریزی ادبیات کا اثر اُردو ادبیات پر' اور نادر کاکوروی کے 'جذباتِ نادر' کے پہلے حصّہ کے دیباچہ میں (جو عزیز مرزا نے لکھا تھا) زیرِ بحث آئی ہے۔ پھر ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان لاہور کے 'مخزن' مرحوم میں 'بلینک ورس' پر قابلِ قدر مضامین شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں بہاء الدین کالج میگزین (جوناگڑھ) میں قاضی احمد میاں اخترؔ جوناگڑھی اور محمد عمر عباسی کھنتری وغیرہ کے 'سانیٹ' SONNET پر نہایت فکر انگیز مضامین شائع ہوئے تھے۔ اُردو شاعری کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ رجحانات پر 'نیا ادب' نامی اُردو ماہنامے میں پُرمغز مضامین شائع کئے گئے تھے۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان انجمن ترقی اُردو کے آرگن سہ ماہی رسالہ 'اُردو' میں 'اُردو کے اَن پڑھ شعراء' پر نہایت عمدہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ 'اُردو کے ہندو شعراء' پر کئی اُردو تذکروں

ناظم۔ (متوفی ۱۸۶۵ء)، ۹۔ کلب علی خاں نواب (متوفی ۱۸۸۷ء)۔ ۱۰۔ حامد علی خاں رشک اور ۱۱۔ رضا علی خاں۔

برِصغیر کی حسبِ ذیل لائبریریوں میں اُردو ادب کی بُنیادی تصانیف و مخطوطات محفوظ ہیں:۔
ریاست رامپور کی اسٹیٹ لائبریری۔ بانکی پور پٹنہ کی خدابخش لائبریری۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، حیدرآباد (دکن)۔ مسلم یونیورسٹی لائبریری، علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ لائبریری، دہلی۔ ندوہ لائبریری، لکھنؤ۔ دارالمصنفین لائبریری، اعظم گڑھ۔ اسلامیہ کالج لائبریری، کلکتہ اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لائبریری، بھیکم پور (علی گڑھ) وغیرہ۔

حسبِ ذیل معروف اُردو ماہناموں کے پُرانے فائلوں میں قابلِ قدر مضامین لائقِ مطالعہ ہیں:۔
'مخزن'، لاہور۔ 'اُردو'، دہلی۔ 'نگار'، لکھنؤ۔ 'ہندوستانی'، الہ آباد۔ 'زمانہ'، کانپور۔ 'معارف'، اعظم گڑھ اور 'ساقی'، دہلی وغیرہ۔

فارسی، انگریزی اور اُردو میں جو اُردو تذکرے مُرتب کیے گئے تھے، ان کے حوالے کے بغیر کوئی 'تاریخِ ادبِ اُردو' تحریر نہیں کی جا سکتی۔ اُن کی ایک فہرست اِس کتاب کے آخر میں موجود ہے۔

برائے صوبۂ یوپی (اورینٹ پریس لمیٹڈ - او پی آئی) کا ایڈیٹر تھا۔ اُن سے راقم کی متواتر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اور اکثر مسائل زیرِ بحث رہتے تھے۔ راقم کے لکھنؤ سے چلے آنے کے بعد بھی عرصے تک اُن سے خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ لیکن راقم ان کے ماہنامہ "نگار" کی پالیسی کے خلاف تھا۔ ہر چند کہ راقم الحروف کے اپنے بعض مضامین بھی "نگار" میں شائع ہوئے تھے۔ نیاز قیامِ پاکستان کے مخالف تھے لیکن زندگی کے آخر میں پناہ اُنہیں یہیں ملی اور وہ کراچی میں فوت و دفن ہوئے۔

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اسمٰعیل کالج، اندھیری بمبئی میں اُردو کے پروفیسر تھے، جن سے راقم کا رابطہ اُس کے ابتدائی قیامِ بمبئی (از سنہ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء) ہی میں قائم ہو گیا تھا۔ کالج مذکور کے دائرۃ الادب میں راقم الحروف نے ایک بار اپنا معروف لیکن متنازعہ فیہ مضمون "شاہنامہ فردوسی پر ایک محققانہ نظر" پڑھا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت ضیاء الدین برنی مرحوم نے کی تھی اور اس میں پروفیسر ندوی موجود تھے۔ راقم کے اس مقالہ پر متعدد اُردو رسائل میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں اور ادھر پنجۂ لکھنؤ نے تو گویا اس کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ عرصے تک قائم رکھا تھا۔ اور اس کے اس مقالے کی اور خود راقم الحروف کی قرار واقعی خبر لی تھی۔ لیکن اس کا علمی جواب کسی سے بن نہ پڑا تھا۔

مولانا سیماب اکبر آبادی اور آگرے سے راقم الحروف کی بہت ہی قدیم و دیرینہ وابستگی ہے۔ وہ سنہ ۱۹۲۴ء کا زمانہ تھا جبکہ اضلاع آگرہ، متھرا، علی گڑھ اور بلند شہر وغیرہ میں ارتدادِ ملکانہ کی شورش پھیلی ہوئی تھی اور آریہ سماجی ہندو مواضعات میں پھر کر مسلمانوں کو مرتد کرنے کی مہم چلا رہے تھے۔ مسلمانوں نے بھی اس کی دفاع کی خاطر راجہ کاشی کا چھتہ، کشمیری بازار آگرے میں انجمن تبلیغ الاسلام کا ایک مرکزی دفتر قائم کیا تھا، جس کے اعزازی سیکریٹری ایک متمول تاجر مولوی عبد الحی تھے۔ راقم الحروف کے نانا مولوی ریاض الدین احمد صدیقی بریلوی، مولوی مسعود الرحمٰن ندوی پیلی بھیتی اور کئی دیگر سربرآوردہ مسلم رہنما انجمن مذکور کے مرکزی دفتر سے وابستہ تھے۔ ملک کے اطراف و اکناف سے متعدد تبلیغی ٹولیاں منظم ہو کر آریوں سے ملکانہ مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر اُن مواضعات میں گشت کر رہی تھیں۔ [illegible] تحت اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ اُن تبلیغی ٹولیوں میں سے ایک نہایت فعال ٹولی مولوی اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تھی، جس میں راقم الحروف بھی سب سے کم عمر رکن کی حیثیت سے شامل تھا۔ اور دوسری ٹولی میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی کی تھی۔ عظیم بیگ چغتائی انجمن مذکور کے قریب ہی رہتے تھے جن سے راقم کی اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا سیماب کا "قصر الادب" بھی قریب ہی تھا جہاں راقم الحروف برابر جاتا رہتا تھا۔ وہیں راقم کی ملاقات ساغر نظامی اور شاد دگیر اکبرآبادی وغیرہ سے ہوئی تھی۔

فہرست تصاویر شعرائے کرام

۱۔ محمد قلی قطب شاہ

۲۔ مرزا سعید الدین احمد خاں طالب دہلوی

۳۔ مرزا محمد رفیع سودا

۴۔ میر تقی میر

۵۔ میر حسن

۶۔ نظیر اکبر آبادی

۷۔ انشاء اللہ خاں انشاء

۸۔ شیخ امام بخش ناسخ

۹۔ خواجہ حیدر علی آتش

۱۰۔ بہادر شاہ ظفر

۱۱۔ محمد ابراہیم ذوق

۱۲۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب

۱۳۔ حکیم مومن خاں مومن

۱۴۔ میر ببر علی اُنیس

۱۵۔ مرزا سلامت علی دبیر

۱۶۔ منشی دیا شنکر نسیم

۱۷۔ میر مہدی مجروح

۱۸۔ مرزا حاتم علی مہر

۱۹۔ میر مونس

۲۰۔ میر اُنس

۲۱ - میر نفیس

۲۲. امیر احمد مینائی

۲۳- عاشق لکھنوی

۲۴- رشید لکھنوی

۲۵- اوج لکھنوی

۲۶- عروج لکھنوی

۲۷- نواب میرزا داغ دہلوی

۲۸- نواب محمد زکریا خاں ذکی دہلوی

۲۹- مولوی محمد اسماعیل میرٹھی

۳۰- اکبر الہ آبادی

۳۱- سید علی محمد شاد عظیم آبادی

۳۲ - سید علی حیدر نظم طباطبائی

۳۳. ریاض خیر آبادی

۳۴. سید ضامن علی مہدی لکھنوی

۳۵- صفی لکھنوی

۳۶. منشی نوبت رائے نظر

۳۷- سرور جہاں آبادی

۳۸. سید فضل الحسن حسرت موہانی

۳۹. فانی بدایونی

۴۰. ڈاکٹر محمد اقبال

۴۱. رضا علی وحشت کلکتوی

۴۲. پنڈت برج نرائن چکبست

۴۳. عزیز لکھنوی

۴۴. اصغر علی گونڈوی

فہرست تصاویر نثر نگار

۱۔ سر سید احمد خاں

۲۔ مولانا محمد حسین آزاد

۳۔ مولوی نذیر احمد دہلوی

۴۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی

۵۔ مولانا الطاف حسین حالی

۶۔ رتن ناتھ سرشار

۷۔ مولوی سید احمد دہلوی

۸۔ امداد امام اثر

۹۔ سید علی بلگرامی

۱۰۔ منشی سجاد حسین

۱۱۔ مولانا شبلی نعمانی

۱۲۔ مرزا محمد ہادی رسوا

۱۳۔ عبدالحلیم شرر لکھنوی

۱۴۔ علامہ راشد الخیری

۱۵۔ مولوی عبدالحق

۱۶۔ خواجہ حسن نظامی

۱۷۔ مہدی افادی

۱۸۔ شیخ عبدالقادر

۱۹۔ آغا حشر

۲۰۔ سید سجاد حیدر یلدرم

۲۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

۲۲۔ سید سلیمان ندوی

۲۳۔ منشی پریم چند

۲۴ نیاز فتح پوری

۲۵ حامد حسن قادری

۲۶۔ حافظ محمود شیرانی

۲۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد

۲۸۔ عظیم بیگ چغتائی

۲۹۔ مہاشے سدرشن

۳۰۔ قاضی عبدالغفار

۳۱۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی

۳۲۔ علی عباس حسینی

۳۳۔ سید احمد شاہ پطرس بخاری

۳۴۔ سید امتیاز علی تاج

۳۵۔ شوکت تھانوی

۳۶۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

۳۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

۳۸۔ سید وقار عظیم

۳۹۔ آل احمد سرور

۴۰۔ کرشن چندر

۴۱۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

۴۲۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

شعرائے کرام

محمد قلی قطب شاہ

محمد نذیر اکبر آبادی

نواب مرزا سعید الدین احمد خاں طالب دہلوی

مرزا محمد رفیع سودا

سید انشاء

میر حسن

شیخ امام بخش ناسخ

خواجہ حیدر علی آتش

مرزا اسد اللہ غالب

دیا شنکر نسیم

بہادر شاہ ظفر

حکیم مومن خاں مومن

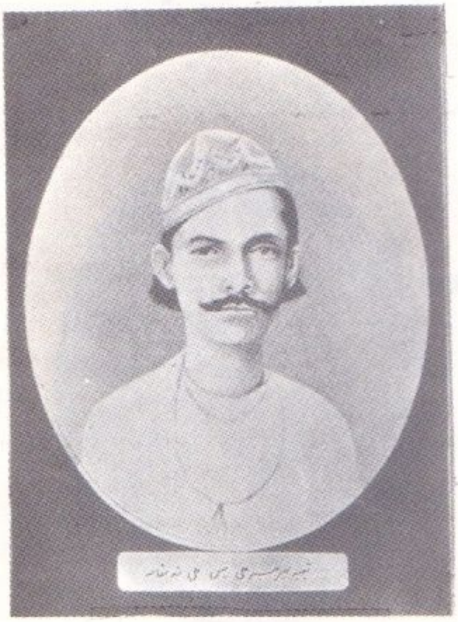

میر ببر علی انیس

شیخ محمد ابراہیم ذوق

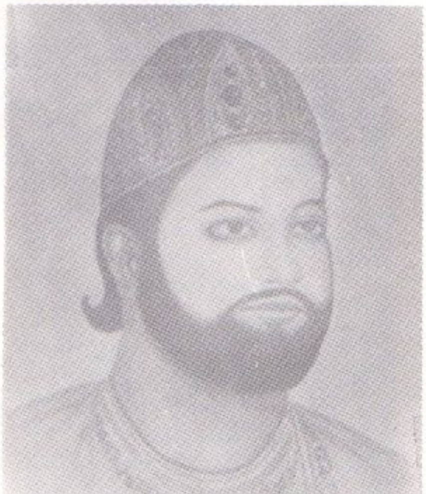

مرزا سلامت علی دبیر

میر مہدی حسن مجروح

مرزا حاتم علی مہر

امیر احمد امیر مینائی

مرزا اوج لکھنوی

حضرت انس

حضرت عاشق لکھنوی

حضرت اوج لکھنوی

میر نفیس لکھنوی

رشید لکھنوی

نواب مرزا خان داغ دہلوی

نواب سید محمد زکریا خان ذکی دہلوی

سید علی محمد شاد عظیم آباد

سید ضامن علی مہدی لکھنوی

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

سید علی حیدر طباطبائی

صفی لکھنوی

اکبر الٰہ آبادی

ریاض خیر آبادی

منشی نوبت رائے زنّار

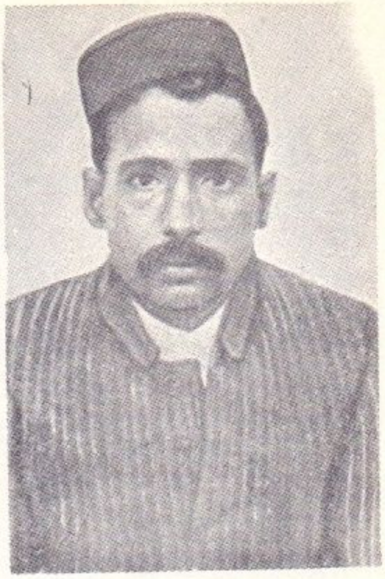
سرور جہاں آبادی

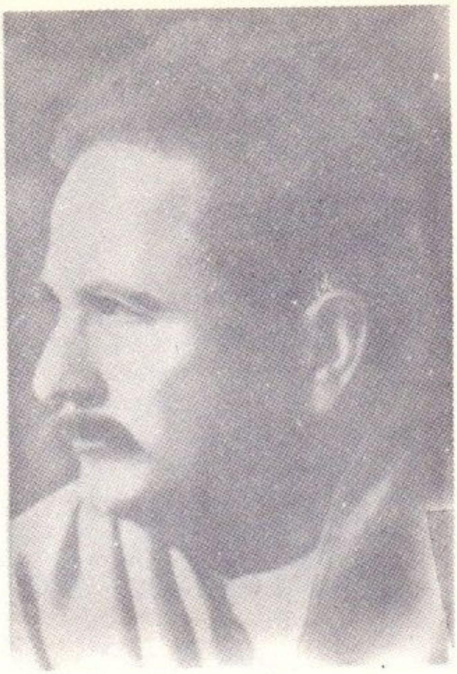
ڈاکٹر محمد اقبال

عزیز لکھنوی

حسرت موہانی

رضا علی وحشت

اصغر گونڈوی

فانی بدایونی

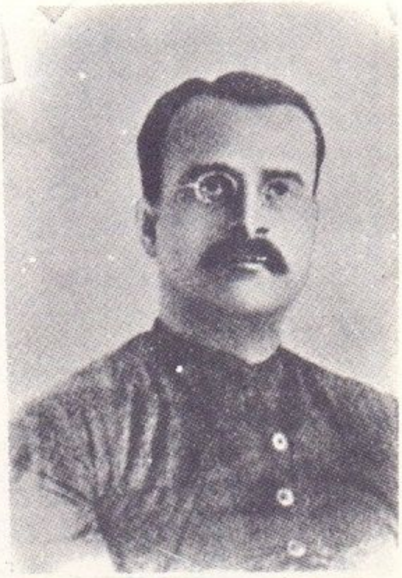
پنڈت برج نرائن چکبست

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

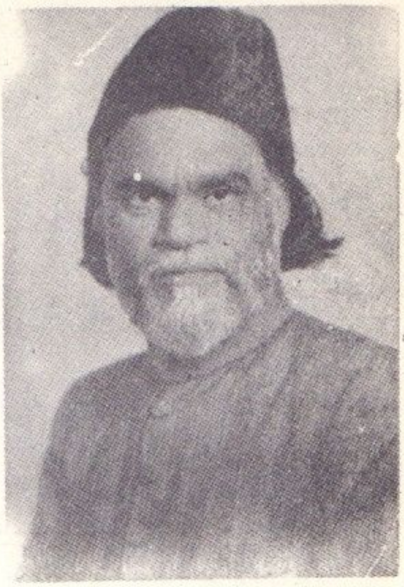

جگر مرادآبادی

حفیظ جالندھری

عنایت اللہ دھلوی

سیماب اکبرآبادی

اختر شیرانی

حامد حسن قادری

جوش ملیح آبادی

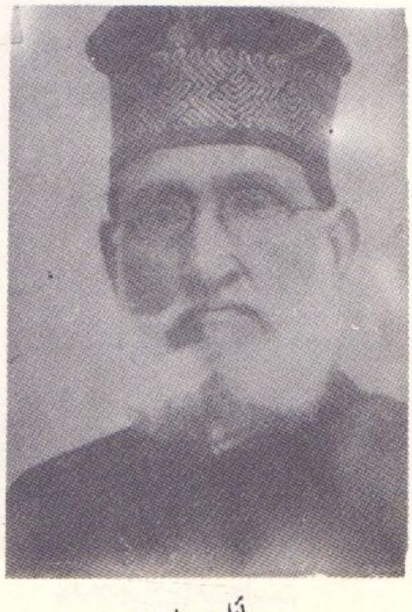

سائل دھلوی

فصاحت جنگ جلیل

حصّہ اوّل

اُردو شاعری

۱

مُتقدّمین

دورِ اوّل : از ۱۵۵۰ء تا ۱۶۸۷ء

دکن اور اُردو شاعری

قدیم دکنی اُردو دراوڑی زبانوں [تامل، تلوگو، کناڑی اور ملیالم] نیز مرہٹی (مہاراشٹری)، گجراتی اور سَوراشٹری (کاٹھیاواڑی) سے مُتاثر تھی۔ دراوڑی زبانوں کا کوئی تعلق سنسکرت سے نہیں تھا۔ وہ دراوڑی زبانیں اس لیے کہلاتی تھیں کیونکہ ہندوستان کے انتہائی جنُوبی حصّے کا تامل نام 'دراوڑ' تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے کئی صدی قبل آریائی عقاید، رسوم وروایات ایک ویدی رِشی آگستیا نامی کے ذریعہ سے اِس انتہائی جنوبی حصّۂ ہند تک پہنچ چکے تھے۔ قدیم دراوڑی حروفِ تہجّی، جو سامی النّسل تھے، 'وَتے لیتُو' کہلاتے تھے۔ جب شمالی ہند پر نیم مُہذب آریائی قوم کا تسلط تھا، اُس وقت دکن میں قدیم دراوڑی راجدھانیوں [آندھرا، چیرا، چولہ اور پانڈیا] کے ماتحت نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ اور مُتمدّن انسانی زندگی کا دَور دَورہ تھا۔ دکنی اُردو کے برعکس شمالی ہند کی اُردو عربی، فارسی، سندھی، مُلتانی، پنجابی اور تُرکی نیز برج بھاشا اور سَوراسینی زبانوں کے زیرِاثر زیادہ تھی لہذا شمالی ہند کی اُردو پر دکنی زبانوں کا اثر بہت کم تھا۔

مسلمانوں کی بیرونِ ملک سے آمد سے قبل دکن میں مُتعدد دیسی ہندو ریاستیں قائم تھیں، مثلاً مشرقی تِلنگانہ علاقہ میں آندھرا نامی راجدھانی قائم تھی جس کا صدر مقام وارنگل تھا۔ مہاراشٹر پر یادَو نسل کے راجپوتوں کی فرماں روائی تھی، اور کرناٹک کا علاقہ بلال راجپوتوں کے ماتحت تھا جن کا دارالحکومت

دوارسمدر تھا۔

سب سے پہلے شمالی ہند سے مسلمان پٹھان ریا ترک بادشاہ سلطان علاء الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور دیوگیر کے راجہ راما دیوا کو شکست دی۔ اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی کے امیر لشکر ملک کافور نے دکن پر یورش کر کے وارنگل، دوارسمدرا اور مدورا کو تسخیر کر لیا۔ ملک کافور کی یہ فتوحات دکن ۱۳۰۲ء سے ۱۳۱۱ء تک جاری رہیں۔ ۱۳۱۸ء میں ایک اور شمالی مسلمان بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ نے دیوگیر کے ہندو راجہ کو شکست دی۔ پھر ۱۳۲۶ء میں سلطان محمد بن تغلق دہلی سے آکر دکن پر حملہ آور ہوا، دیوگیر کو فتح کر کے دولت آباد اس کا نام رکھا اور دہلی کے بجائے اُسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ وہ ۱۳۴۸ء اور ۱۳۵۱ء کے درمیان گجرات اور سندھ میں مقیم رہا۔ ۱۳۴۶ء میں دکن کی مشہور ہندو ریاست وجیانگر قائم ہوئی اور ۱۳۴۷ء میں دکن میں مسلمان بہمنی سلطنت وجود میں آئی۔

مندرجہ بالا ہندو اور مسلمان دکنی سلطنتیں باہم گردست و گریباں رہتی تھیں۔ بہمنی سلطنت کا بانی حسن گنگو جس کا اصل نام ظفر خاں تھا افغان یا ترک النسل تھا۔ اُس نے سلطان علاء الدین بہمنی اوّل کے خطاب کے ساتھ گلبرگہ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ برہانِ معاصر کے مصنف کے بموجب، چونکہ وہ ایرانی شہنشاہ اردشیر دراز دست بہمنی کی اولاد میں ہونے کا مدعی تھا، لہٰذا اُس نے اپنے خطاب میں لفظ 'بہمنی' کا اضافہ کیا تھا۔ معروف مورخ فرشتہ نے غلط فہمی کے باعث لکھا ہے کہ چونکہ وہ ابتدا میں ایک برہمن گنگو نامی کی ملازمت میں تھا لہٰذا اُس نے ازراہِ نیاز مندی اپنا نام حسن گنگو بہمنی رکھ لیا تھا۔

دکن میں بہمنی سلطنت کا زوال ۱۴۸۲ء میں اس کے تیرھویں فرماں روا محمد شاہ بہمنی ثالث کی وفات اور ۱۴۸۱ء میں اس کے نامور ایرانی النسل وزیر محمود گاواں کے قتل کے ساتھ ہوا جس کے بعد ترک النسل بہمنی وزیر قاسم برید نے خود سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۲۶ء میں ثانی الذکر کے بیٹے امیر برید نے اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دکن میں بہمنی سلطنت ۱۷۹ سال تک قائم رہی، جس کا دارالحکومت اس کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ بہمنی (از ۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۶ء) نے گلبرگہ سے بیدر کو منتقل کر دیا تھا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ مختلف ریاستیں وجود میں آئیں یعنی خاندیش، احمد نگر، بیجاپور، برار اور گولکنڈہ، جبکہ خود بہمنی سلطنت بیدر کے مضافات میں ایک مختصر رقبہ پر محدود ہو گئی جو بعد کو بیدر کی برید شاہی آزاد و خودمختار بادشاہت کہلائی۔

خاندیش کی بادشاہت فاروقی شاہی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بادشاہت دراصل بہمنی سلطنت کا حصہ نہ تھی بلکہ اس کے زیر اثر تھی۔ خاندیش کی بادشاہت ۱۳۹۹ء میں قائم ہوئی تھی جبکہ دہلی میں ترکی

مولانا انتظام اللہ الشہابی اکبر آبادی سے راقم الحروف کی ملاقات قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر سید معین الحق، سیکریٹری، آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، کے دفتر اور اس کی سالانہ کانفرنسوں میں ہوئی۔ مولانا مرحوم ٹھوس علمی لیاقت کے مالک اور اردو ادب کے بڑے معتبر نقاد و ادیب تھے۔

جوش ملیح آبادی سے راقم الحروف کا رابطہ غالباً ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا جبکہ راقم ریاست مانگرول (کاٹھیاواڑ۔ بھارت) میں شیخ جہانگیر میاں والیٔ ریاست کا علمی سیکریٹری تھا اور شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ماہنامہ 'کلیم' دہلی کے مدیر تھے۔ جوش لامذہبی کے معرکہ میں نیاز فتحپوری کے حریف تھے اور ان سے مسابقت کی کوشش کر رہے تھے۔ عرصے تک راقم کی ان سے مراسلت رہی تھی۔ پاکستان آکر ان کی دریدہ دہنی میں زیادہ ترقی ہوئی جو بالآخر ان کی 'یادوں کی بارات' پر منتج ہوئی۔ وہ اپنی اسی دریدہ دہنی کے باعث 'ترقی پسند' دانشوروں میں نہایت مقبول و محبوب تھے۔

مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی راقم الحروف کے بمبئی میں ۱۹۳۱-۳۳ء پڑوسی اور دوست تھے اور جولائی ۱۹۳۲ء میں راقم کی شادی (واقع بورڈی، ضلع تھانہ، بمبئی) میں شریک تھے۔ مولانا شہاب بمبئی کی کسی درسگاہ میں معلم تھے اور اردو کے زبردست ادیب و شاعر تھے۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی، لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ راقم الحروف لکھنؤ میں غالباً ۱۹۴۱ء میں ان کا مہمان اور برائے چندے موصوف کے دولت کدے میں مقیم رہا تھا۔ پروفیسر موصوف اردو ادب کی معروف کتاب 'ہماری شاعری' کے مصنف اور اپنے وقت کے زبردست ادیب و دانشور تھے، ان کا مکان دین دیال روڈ پر واقع تھا۔ اسی زمانے میں راقم کی ملاقات لکھنؤ میں مولانا جمال میاں فرنگی محلی سے ہوئی تھی، نیز راجہ صاحب محمود آباد سے۔

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی سے راقم الحروف کی ملاقات ان کے دولت کدے پر جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) میں اوائل ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی جبکہ راقم وہاں پیرزادہ سید عبدالقادر کے مشیر کی حیثیت سے مقیم تھا اور اس کے پڑوس ہی میں قاضی صاحب کی ڈیوڑھی تھی، جن سے راقم کے قریبی روابط قائم ہو گئے تھے۔ قاضی صاحب اردو کے نہایت معروف ادیب و نقاد تھے اور ان کی لائبریری عظیم تھی۔ وہ کراچی آکر فوت و دفن ہوئے۔

احسان دانش کاندھلہ (ضلع میرٹھ۔ یوپی۔ انڈیا) کے رہنے والے تھے، لیکن ان کی پوری زندگی لاہور میں گذری، جہاں وہ فوت و دفن ہوئے۔ وہ ایک عظیم اردو شاعر ہی نہیں بلکہ عظیم انسان بھی تھے۔ راقم الحروف سے ان کے قدیمی روابط تھے۔ راقم بھی ایک مرتبہ احسان مرحوم کے مکان (واقع مزنگ، لاہور)

سلطان فیروز تغلق کی بادشاہت کا دوسرا نصف حصہ تھا۔ خاندیش برائے چندے گجرات کے ماتحت بھی رہا تھا۔ برہان پور اس کا مستقرِ حکومت تھا اور مشہور قلعہ اسیر گڑھ اسی سلطنت کی حدود میں تھا۔ اس قلعہ کو ۱۶۰۱ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے فتح کرکے خاندیش کو وسیع سلطنتِ مغلیہ کا ایک صوبہ بنا دیا تھا۔

بیدر کی بریدشاہی سلطنت، جو ۱۵۲۶ء میں قاسم برید کے بیٹے امیر برید نے قائم کی تھی بہمنی سلطنت کے کھنڈروں پر تعمیر کی گئی تھی۔ ۱۶۰۹ء میں سلطان بیجاپور نے اس پر قبضہ کرکے اس کو اپنی بادشاہت میں شامل کر لیا۔

برار کی عماد شاہی بادشاہت کو ۱۴۸۴ء میں فتح اللہ نے عماد الملک کے خطاب سے قائم کیا تھا لیکن ۱۵۷۴ء میں احمد نگر کے سلطان نے اس پر قبضہ کرکے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ برار کی بادشاہت کے دار الحکومت بالترتیب گاول گڑھ، یالاپورا اور ایلچ پور رہے تھے۔

ملک احمد نے ۱۴۹۰ء میں احمد نظام شاہ کے خطاب کے ساتھ احمد نگر کی نظام شاہی بادشاہت قائم کی تھی۔ وہ نظام الملک بحری کا، جس نے بیدر میں محمود گاواں کو قتل کرایا تھا، بیٹا تھا۔ احمد نظام شاہ نے احمد نگر کی بنیاد ڈال کر اسے اپنا دار الحکومت بنایا۔ اس نے دیوگیری یا دولت آباد کے مشہور قلعہ کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اس کے بیٹے برہان نظام شاہ نے جو شیعہ ہوگیا تھا، ۴۵ سال از ۱۵۰۸ء تا ۱۵۵۳ء تک حکومت کی۔ اس کے بیٹے حسین شاہ نے ۱۵۶۵ء میں ہندو ریاست وجیانگر کی تباہ کاری میں دیگر دکنی مسلمان بادشاہوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ مسلم ہند کی ایک نامور تاریخی ہستی ہوئی ہے جس نے ۱۵۹۶ء میں شہنشاہ اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد کے ماتحت مغل افواج کے خلاف نہایت بہادری کے ساتھ معرکہ آرائی کرکے احمد نگر کی کامیاب مدافعت کی تھی۔ لیکن ۱۶۰۰ء میں شہنشاہ اکبر کی افواج نے احمد نگر فتح کر لیا تھا اور چاند بی بی یا تو تلوار بدست معرکۂ جنگ میں قتل ہوئی یا اس نے خودکشی کر لی تھی۔ لیکن احمد نگر مغل شہنشاہ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں ۱۶۳۷ء میں ایک مغل صوبہ بنا تھا۔

گولکنڈے کی قطب شاہی بادشاہت ۱۵۱۸ء میں ایک ترک نے سلطان قلی قطب شاہ کے لقب کے ساتھ قائم کی تھی۔ جسے اس کے اپنے بیٹے جمشید قطب شاہ نے ۱۵۴۳ء میں قتل کرا دیا تھا۔ جمشید نے ۱۵۵۰ء تک حکومت کی جس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم قطب شاہ بادشاہ ہوا مگر وہ ۱۵۸۰ء میں فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۱۶۱۱ء تک سلطنت کی۔ اس کے بعد گولکنڈہ پر مزید تین بادشاہوں نے حکومت کی یعنی سلطان محمد قطب شاہ [از ۱۶۱۲ء تا ۱۶۲۶ء] سلطان عبداللہ

قطب شاہ [از ۱۶۲۷ء تا ۱۶۷۲ء] اور سلطان ابوالحسن تانا شاہ [از ۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۷ء]۔ ۱۶۸۷ء میں سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے گولکنڈہ کو فتح کر کے اُسے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ قطب شاہی سلطنت کا پایہ تخت ابتدا میں وارنگل تھا، جہاں سے اُسے سلطان قُلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کو منتقل کر دیا تھا۔ ۱۵۸۹ء میں سلطان محمد قُلی قطب شاہ نے گولکنڈہ سے ترکِ سکونت کر کے اپنی ہندو محبوبہ بھاگ متی کی یادگار کے طور پر اس سے چند میل کے فاصلے پر ایک نیا دارالسلطنت بھاگ نگر کے نام سے آباد کیا۔ یہی بھاگ نگر بعد کو حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوا جسے نظامِ دکن نے اپنا مستقل مستقرِ حکومت بنا لیا۔

بیجاپور کی عادل شاہی بادشاہت ۱۴۸۹ء میں یوسف عادل شاہ نے قائم کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ علاقہ قفقاز میں گرجستان کا باشندہ اور خواجہ محمود گاواں کا غلام تھا۔ لیکن اس کے برعکس مؤرخ فرشتہ کوئی اور ہی داستان بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یوسف ترکی کے سلطان مُراد دوم کا بیٹا تھا جس کی تعلیم و تربیت خفیہ طور پر ایران میں ہوئی تھی کیونکہ اُس کا سوتیلا بھائی سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) اُس کا جانی دشمن تھا۔ ایران سے یوسف ایک غلام کی طرح دکن لایا گیا تھا اور وزیر محمود گاواں کے ہاتھ فروخت کیا گیا تھا۔ لیکن اپنی غیر معمولی فطری خصوصیت اور صلاحیتوں کی وجہ سے وہ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کا بانی ہوا۔ یوسف نے شیعی مذہب اختیار کر کے اُس کی اپنی مملکت میں ترویج کی۔ اُسی کے دورِ حکومت میں اُس کے علاقہ کی معروف بندرگاہ گوا پر ۱۵۱۰ء میں پرتگالی بحری قزاقوں نے اپنے لیڈر ایڈمرل اُلبکرک کی سرکردگی میں قبضہ کر لیا تھا۔ یوسف عادل شاہ نے ایک مرہٹہ ہندو سردار مکند راؤ کی بہن سے شادی کر لی تھی جس کا اسلامی نام بُوبُوجی خانم تھا۔ یوسف عادل شاہ ۱۵۱۰ء میں فوت ہوا اور اُس کا جانشین اُس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ ہوا [از ۱۵۱۰ء تا ۱۵۳۴ء]۔ اسمٰعیل کے بیٹے مَلّو کو ۱۵۳۵ء میں معزول کر کے اندھا کر دیا گیا تھا۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ابراہیم عادل شاہ [از ۱۵۳۵ء تا ۱۵۵۷ء] شیعیت ترک کر کے پھر سُنّی ہو گیا۔ اُس کا وزیر اسد خاں بھی خواجہ محمود گاواں کی طرح اپنی دانش مندی و تدبّر کے لیے تاریخِ اسلامیانِ ہند میں معروف ہے۔ علی عادل شاہ [از ۱۵۵۷ء تا ۱۵۷۹ء] نے بیجاپور کے حکمران ہونے کے ساتھ ہی شیعیت اختیار کر کے اہلِ سُنّت پر تعدّی شروع کر دی۔ وہ مشہورِ زمانہ چاند بی بی کا شوہر تھا۔ وہ اپنے محل ہی میں قتل ہوا اور اس کا جانشین اس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنے خاندان کا بہترین بادشاہ ہوا۔ اُس کے بیٹے محمد عادل شاہ [از ۱۶۲۶ء تا ۱۶۵۶ء] نے مُغل شہنشاہ شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس کے بعد اس کا جانشین سلطان علی عادل شاہ

ثانی [از ۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۲ء] بیجاپور کا فرمانروا ہوا۔ وہ مرہٹہ لیڈر شیواجی کے خلاف اپنی جنگ آزمائی کے باعث مشہور ہے۔ اِس خاندان کے آخری بادشاہ سلطان سکندر عادل شاہ [از ۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۶ء] کے عہد میں ۱۶۸۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے بیجاپور پر قبضہ کرکے اُسے سلطنتِ مُغلیہ میں شامل کرلیا تھا۔

سلطنتِ مغلیہ کے دور میں اورنگ آباد نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی جگہ لی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے بیجاپور کی فتح کے بعد دکنی شاعر نصرتی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا اور دکن میں اپنی فوجی مہم کے طویل قیام کے دوران میں اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس طرح اورنگ آباد کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور ۱۶۹۰ء تک تمام دکن پر مکمل تسلط سلطنتِ مُغلیہ کا ہوگیا۔ ۱۷۲۴ء میں آصف جاہ اوّل نے دکن میں حیدرآباد کے مقام پر نظام کے حکمراں خاندان کی بنا ڈالی۔

جبکہ شمالی ہند میں شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں اُردو زبان کی تخلیق نہیں ہوئی تھی اور اُس کا فارسی اور بھاشا زبانوں کے سنگم سے خمیر تیار ہو رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت آج سے چار سو برس سے زائد زمانے سے قبل، دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ (پیدائش ۱۵۶۳ء وفات ۱۶۱۱ء) دکنی اُردو میں نہایت کامیاب شاعری کر رہا تھا۔ جبکہ شمالی ہند میں محض فارسی شاعری کا دور دورہ تھا۔ اُس وقت دکن میں عادل شاہی اور قطب شاہی فرمانروائی دکنی اُردو زبان میں دل آویز شاعری کر رہے تھے اور اُن کے درباروں سے مُتعدد دکنی اُردو شعرا مُنسلک تھے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کے معروف ایرانی شعرائے دربار [از ۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء] مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی، مُوسوی خاں فطرت، مرزا سرخوش، محمد علی ماہر، محمد زمان راسخ اور مُلّا سعید اشرف وغیرہ تھے۔ جبکہ اُس وقت دکن میں معروف فارسی شعرا ملک قمی اور ظہوری تھے (ماہنامہ نگار، لکھنؤ۔ اُردو شاعری نمبر جنوری ۱۹۲۵ء)۔

دکنی اُردو کا پہلا باقاعدہ شاعر نظامی (متوفی ۱۴۶۰ء) تھا جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف بہ نظام شاہ [از ۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۵ء] کے دورِ حکومت میں زندہ تھا۔ اِس حقیقت کا انکشاف اب نظامی کی مثنوی "کدم راؤ۔ پدم راؤ" سے ہوا ہے۔

دربارِ گولکنڈہ کے اوّلین اُردو شعرا فیروز اور محمود تھے، جو ۱۵۶۸ء میں زندہ تھے۔ دربارِ بیجاپور کا پہلا دکنی اُردو شاعر میراں جی تھا جو ۱۵۷۲ء میں بقیدِ حیات تھا۔

جبکہ دہلی میں حضرت امیر خسروؒ (پیدائش ۱۲۵۳ء وفات ۱۳۲۴ء) ایک طرح کی ملی جلی ہندی اور فارسی زبان میں شعر گوئی کر رہے تھے، اُس وقت دکن میں سعدی دکنی اُردو کا مشہور شاعر تھا۔ مُغل

شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں دکن میں دکنی اُردو شعراء حسب ذیل تھے :-
احسانؔ، احمدؔ، اشرفؔ، خوشنودیؔ اور فاضلؔ وغیرہ۔ شہنشاہ شاہجہاں کے عہدِ سلطنت میں دکن کے دکنی اُردو شعراء کے یہ نام ملتے ہیں :- جعفرؔ، سالکؔ، لطیفیؔ، محمودؔ، ہاتفیؔ اور ہاشمؔ وغیرہ۔ اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد کے دکنی اُردو شعراء حسب ذیل تھے :- سنیالیؔ، ملکؔ، فخریؔ، عواصیؔ، حشمتؔ، عبدالرحیمؔ، عبداللہؔ، بیچارہؔ، حبیبؔ اور عزیزؔ وغیرہ۔ دکن میں دکنی اُردو کے یہ ابتدائی شعراء زیادہ تر اللہ تعالیٰ، رسولِ اکرمؐ اور اسلامی صالحین عظام کی شان میں شعر گوئی کیا کرتے تھے (نگار، لکھنؤ، اُردو شاعری نمبر، جنوری ۱۹۲۵ء)۔

دکن میں اُردو شاعری کا آغاز مذہبی طور پر ہوا اور ولی دکنی کے عہد تک یہ مذہبی تاثر غالب رہا، لہٰذا ولیؔ کے ہم عصر شعراء کا کلام بیشتر مذہبی طور کا تھا۔ (تذکرہ جلوۂ خضر، جلد دوئم، صفحہ ۷)۔

دکن میں اِس مذہبی اُردو شاعری کے بعد رومانی شاعری کا دَور دَورہ ہوا جس میں سُلطان قُلی قُطب شاہ اور محمد قُطب شاہ دونوں نے خُوب طبع آزمائی کی۔ دکنی اُردو شاعری مدت تک بھاشا اور سنسکرت کے زیرِ اثر رہی۔ چنانچہ وہ بشکل عام ہندی دوہروں سے مختلف تھی۔ ہر چند کہ دکنی اُردو شاعری پر یہ اثرات بتدریج ولیؔ، آزادؔ اور سراجؔ کے عہد تک بڑی حد تک کم ہو گئے تھے بہ ایں ہمہ ان کا اثر بہت دیر بعد تک کچھ نہ کچھ باقی رہا، جس کا ثبوت سلطان ابوالحسن "تانا شاہ" کے کلام سے ملتا ہے۔ گو یہ بلا شک صحیح ہے کہ اُردو شاعری ابتدا ہی سے سنسکرت اور بھاشا بلکہ فارسی سے بھی مُتاثر تھی جس کی شہادت کافی طور پر سلطان محمد قُلی قُطب شاہ کے کلام سے ملتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے فارسی خیالات و پیرایہ بیان کو دکنی اُردو شاعری میں خوش اسلوبی سے نہ سموئے جانے کے باعث مؤخر الذکر بھاشا کا محض ایک ڈھونڈا چربہ بن کے رہ گئی یہی وجہ ہے کہ ادبی مؤرخین و ناقدین نے اس عہد کی اُردو شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

جب تک ولیؔ دکن میں رہے اُن کی شاعری کا معیار پست رہا لیکن جیسے ہی وہ دکن سے دہلی آئے اور وہاں شاہ سعد اللہ گلشنؔ سے اکتسابِ فیض کیا اُن کی اُردو شاعری معیاری ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ ولیؔ کا تین چوتھائی حصّہ کلام نہایت شگفتہ ہے کیونکہ اس پر شاہجہان آباد کی اُردو ادبی فضا کی چھاپ پڑی ہے "تذکرہ میر حسن" کے مطابق ولیؔ دکنی کے دکنی معاصر آزادؔ اور فراقیؔ بھی دہلی آئے تھے جہاں سے وہ اُردو شاعری میں رومانی "تاثرات" مستعار لے کر واپس دکن گئے، جہاں انھوں نے اس کی ترویج کی۔ اس طرح مُغل شہنشاہ محمد شاہ کے دَورِ حکومت میں ولیؔ دکنی کی بدولت دہلی میں اُردو شاعری کے دَورِ اوّل نے جنم لیا، جس میں ان دہلوی اُردو شعرائے کرام نے نمایاں مقام حاصل کیا مثلاً آبروؔ، ناجیؔ، مضمونؔ اور یک رنگؔ وغیرہ۔ (تذکرہ

جلوۂ خضر، جلد اوّل صفحہ ۸] لیکن ولی دکنی اور اس کے معاصرین کے برعکس، دہلی کی اُردو شاعری کے اِس اوّلین دَور میں دہلوی شعرائے اُردو نے اپنی تمام تر شاعرانہ توانائیاں محض لفاظی و قافیہ پیمائی میں صرف کر دیں ۔ اِن دہلوی شعرائے اُردو کے سرگروہ شاہ مبارک آبرو تھے [شعر الہند، حصہ اوّل ، باب اوّل نیز " قدما کا پہلا دَور صفحات ۲۴ - ۳۰] ۔

متقدمین کا یہ پہلا دَور [از ۱۵۵۰ء تا ۱۶۸۷ء] گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) اور بیجاپور (۱۶۸۶ء) کی بادشاہتوں کے اِنہدام تک جاری رہا جس میں دکن کے قطب شاہی اور عادل شاہی حکمراں خاندانوں کے زمانوں کے اُردو شعرا شامل ہیں ۔ لیکن یہ شعرائے دکن دہلی نہیں گئے تھے ۔ ابتدائی اُردو دکنی شاعری کے تین مراکز تھے یعنی گولکنڈہ کی قطب شاہی بادشاہت ، بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت اور احمد آباد ، گجرات ۔ اِس دَور کے معروف اُردو شعرائے دکن حسب ذیل تھے :-

(۱) قطب شاہی ملوک شعرائے اُردو اور گولکنڈہ کے دیگر اُردو شعرا :- ابراہیم قطب شاہ [از ۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء] اور محمد قلی قطب شاہ [از ۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء] ۔ ثانی الذکر قطب شاہی شاہِ گولکنڈہ کا اُردو میں تخلص معانی تھا اور فارسی شاعری میں قطب شاہ ۔ وہ نہایت پُرگو شاعر تھا اور اُس کے شاعرانہ کلام کو اُس کے بیٹے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۶۱۶ء میں ایک کلیات کی شکل میں جمع کیا تھا ۔ معانی نہایت عمدہ اُردو شاعر تھا جس کے کلام میں ہر صنف کی شاعری ملتی ہے ۔ یعنی مثنوی، قصیدہ ، غزل ، رباعی اور مرثیہ وغیرہ اُس کا اسلوبِ بیان سادہ و اثر آفریں تھا لیکن اُس پر مقامی پیرایۂ اظہار کا اثر غالب تھا ۔ اُس کی ضخیم کلیات اب دستیاب ہے ۔ ایک شیعہ مبلغ شاہ طاہر کی ترغیب سے سلطان قلی قطب شاہ نے شیعی مسلک اختیار کر کے اُسے اپنے ملکِ محروسہ میں بڑی شدت سے رائج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعیت کا تمام دکن میں غلبہ ہو گیا اور مرثیہ خوانی کا گھر گھر چرچا ہونے لگا ۔ [تاریخ فرشتہ ، حصہ چہارم] مرثیہ خوانی کے ساتھ دکن میں میلاد النبیؐ کی محافل بھی کثرت سے برپا ہونے لگیں ۔ اس طرح دکن میں مذہبی اُردو شاعری کا دَور دَورہ ہوا ۔ بایں ہمہ اس کی جگہ بتدریج رومانی و نشاطی شاعری نے قدیم دکنی اُردو لٹریچر میں لی ۔ معانی کا نمونۂ کلام :-

قطب شاہ نہ دے مجھ دیوانے کو پند
دیوانے کو کچھ پند دیا جائے نہ

روزی ہوا قطب شاہ تج عشق کا پیالہ
بھر لے ہیں ہر طرف توں جام شوق کے خمستاں

سلطان محمد قطب شاہ [از سنہ ۱۶۱۲ء تا سنہ ۱۶۲۲ء] بھی دکن میں قدیم اُردو شاعری کا معروف شاعر ہوا ہے۔ اُس کے دو دیوان تھے ایک اُردو شاعری کا اور دوسرا فارسی شاعری کا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ [از سنہ ۱۶۲۶ء تا سنہ ۱۶۷۲ء] ایک عالم فاضل شخص اور عمدہ شاعر تھا۔ اُس نے فارسی اور دکنی اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہر چند کہ اُس کا اسلوبِ بیان سادہ تھا لیکن اس کے کلام میں گہرائی نہ تھی۔ اُس کے عہد میں دکنی اُردو لٹریچر کا آفتاب نہایت روشن و تاباں تھا۔ اُس کا اُردو نمونۂ کلام :-

اے پری پیکر تیرا مُکھ آفتاب
دیکھتا ہوں نور سے نہ مجُھ میں تاب

سلطان ابوالحسن تانا شاہ [از سنہ ۱۶۷۲ء تا سنہ ۱۶۸۷ء] نہایت عیش پسند فرماں روا تھا جسے سنہ ۱۶۸۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے گرفتار کر کے قید کر دیا تھا لیکن اُس کی وفات سنہ ۱۷۰۴ء میں ہوئی۔ وہ دکنی اُردو کا نہایت عمدہ شاعر اور شاعری و شعراء کا مُربی و سرپرست تھا۔ اُس کے کلام کا بیشتر حصّہ تلف ہو گیا۔ اُس کا نمونۂ کلام :-

کس در جاؤں، کاں جاؤں میں، مجُھ دل پہ بھَل بچھراٹ ہے
ایک بات کئے ہوں گے سجن، یاں جی بی بارہ باٹ ہے

گولکنڈہ کے دیگر اُردو شعراء حسب ذیل تھے :-

سید محمد بن جمال الدین قادری المتخلص بہ خاکی دکن میں اُردو کے قدیم ترین شعرائیں سے تھا، جس کا انتقال غالبًا سنہ ۱۶۱۰ء میں ہوا۔ 'اُردو شہ پارے' از ڈاکٹر سید محیٔ الدین قادری زور۔ میر حسن دہلوی کے تذکرہ شعرائے اُردو کے بموجب، خاکی دکنی اُردو کا شاعر نہیں بلکہ دہلوی شاعر تھا۔ خاکی کا نمونۂ کلام :-

جائز نہیں تھیں ہجر کے شب کی شکایتیں
مجُھ کوں حصُول آج تو نقدِ وصال تھا

شجُاع الدین نُوری مُغل شہنشاہ اکبر کا معاصر اور دکنی اُردو کے قدیم ترین شعرائیں سے تھا۔ وہ گجرات کا باشندہ تھا اور مرثیہ گوئی کے باعث مشہور تھا۔

غواصی ایک معروف دکنی اُردو شاعر اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے مُنسلک تھا وہ شاعری کے دو مجموعوں کا مصنف تھا، ایک 'سیف الملوک بدیع الجمال' سنہ ۱۶۲۵ء اور دوسرا 'طوطی نامہ' سنہ ۱۶۳۹ء۔

ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ وہ دراصل ایک نثر نگار تھا۔

اُس کی نہایت معروف مثنوی 'پھول بن' تھی جسے اُس نے ۱۶۶۵ء میں منظوم کیا تھا۔ اُس کا نمونۂ کلام:-

محمدؐ پیشوا ایں سروراں کے
اہے سرخیل سب پیغمبراں کے

وجہی 'قطب مشتری' نام کی مثنوی کا مصنف تھا جو اُس نے ۱۶۰۹ء میں منظوم کی تھی اور جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے معرکۂ عشق پر مبنی ہے۔ وہ شاعر و نثر نگار دونوں تھا۔ اُس کا مشہور نثری کارنامہ 'سب رس' (یا 'حسن و دل') ہے جو محبت اور حسن کے مابین ایک مباحثہ پر مبنی ہے۔ وجہی کا یہ نثری کارنامہ اُردو کی سب سے پہلی مکمل کتاب ہے جس کا موضوع خالص اُردو ادب ہے کیونکہ اس سے پیشتر کی تمام نثری کتابیں مذہب و تصوف پر مبنی تھیں۔ 'سب رس' کا اسلوب بیان تمثیلی ہے اور اُس کی زبان سادہ نہیں ہے۔ اُس کی تاریخ تصنیف ۱۶۳۵ء ہے۔ اُس عہد کا دوسرا نثری شاہ کار اُردو میں 'شمائل الاتقیا' کا ترجمہ ہے (۱۶۷۰ء) جسے میرن یعقوب نے ترجمہ کیا تھا۔ وجہی کا دوسرا نثری شاہ کار 'تاج الحقائق' تھا۔

دکن کے مُتذکرہ بالا اُردو شعرا کے علاوہ، اُس عہد کے گولکنڈہ کے دیگر اُردو شعرا حسب ذیل تھے:
شہاب الدین قریشی مُصنف 'بھوگ بل'۔ طبعی تانا شاہ کا معاصر اور مثنوی 'بہرام و گل اندام' کا مصنف۔
والہ مصنف مثنوی 'طالب و موہنی'، مُظفر مثنوی 'ظفر نامۂ عشق' کا مصنف اور فایز مُصنف مثنوی 'رضوان شاہ و رُوح افزا' وغیرہ ['اُردو کے دکنی شعرا'، از حکیم شمس اللہ قادری]۔

(۲) عادل شاہی حکمراں خاندان کے اور بیجاپور کے دیگر شعرائے اُردو حسب ذیل تھے:-

علی عادل شاہ ۱۵۵۷ء تا ۱۵۷۹ء، ابراہیم عادل شاہ دوم [۱۵۸۰ء۔ ۱۶۲۶ء] جس نے بیجاپور کے قریب ایک نیا شہر نورس پور کے نام سے بسایا تھا۔ یہ سلطان خود ایک ماہر موسیقار تھا اور جگت گرو کہلاتا تھا وہ فن موسیقی پر 'نورس نامہ' کے نام سے ایک منظوم تصنیف کا بھی مُصنف تھا جس کا دیباچہ 'سہ نثر ظہوری' کے نام سے معروف ہے۔ یہ مسلمان بادشاہ ہندی موسیقی کا شیدا تھا۔ جس نے اپنی درباری زبان فارسی سے دکنی اُردو کر دی تھی۔

سلطان محمد عادل شاہ [۱۶۲۶ء۔ ۱۶۵۶ء] علوم و فنون کا زبردست سرپرست تھا۔ علی عادل شاہ دوم [۱۶۵۶ء۔ ۱۶۷۳ء] اُردو کی ترقی میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا اور اس کے دربار سے متعدد اُردو شعرا منسلک تھے۔ یہی کیفیت سکندر عادل شاہ [۱۶۷۳ء۔ ۱۶۸۶ء] کی بھی تھی۔

اُس وقت بیجاپور میں دکنی اُردو کے یہ شعرا تھے:۔ مُلا محمد نُصرت نُصرتی (متوفی ۱۶۷۰ء)

بیجاپور میں عادل شاہی درباری شاعر تھا۔ وہ ایک عمدہ شاعر اور ایک مجموعۂ قصاید اور ایک اُردو دیوان کا مُصنّف تھا لیکن وہ اپنی دو مثنویوں کے لیے زیادہ مشہور ہے یعنی 'گلشنِ عشق'، (جس میں نصرتی نے منوہر کنوَر اور مَدھ مالتی کے رومان کی قدیم ہندو کہانی کو اُردو میں منظوم کیا ہے) اور 'علی نامہ' (جو ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۶ء تک کی سلطان علی عادل شاہ کی لڑائیوں کی ایک منظوم داستان ہے)۔ نصرتی کا نمونۂ کلام:۔

عجب فرحِ رنگیں دل افروز تھی
وے سخت نول ریزہ جاں سوز تھی (علی نامہ)

سید میران ہاشمی (متوفّٰی ۱۶۸۸ء یا ۱۶۹۷ء) پیدائشی نابینا شاعر تھا۔ وہ غالباً اُردو نظم کی اُس صنف 'ریختی' کا موجد تھا جسے بعد ازاں رنگین نے ترقی دی تھی۔ وہ غزلیات کے ایک دیوان اور مرثیوں کے ایک مجموعہ کا مالک تھا لیکن اُس کا نام قدیم دکنی اُردو ادب میں اُس کی مثنوی 'یوسف زلیخا' (۱۶۸۷ء) کے باعث امر ہوگیا [دکن میں اُردو، از مولوی نصیرالدین ہاشمی حیدر آبادی]۔

میراں جی شاہ خواجہ کمال الدین بیابانی کا مُرید اور نہایت متّقی شخص تھا۔ اُس کی تاریخ وفات 'شمس العشاق' (۹۰۲ھ ہجری (۱۴۹۶ء) سے نکلتی ہے۔ وہ نثرِ اُردو کی دو کتابوں کا مُصنّف تھا یعنی (۱) 'شرح مرغوب القلوب' اور (۲) 'سب رس'۔ اُردو شاعری میں وہ حسب ذیل تصانیف کا مالک تھا: 'مثنوی خوش نامہ'، 'مثنوی خوش نغز' اور 'مثنوی شہادت الحقیقت' (تصوّف میں)۔

شاہ بُرہان الدین جانَم میراں جی شاہ کے فرزند اور اُردو نظم میں حسبِ ذیل مذہبی کتب کے مُصنّف تھے:۔ 'وصیّت الہادی'، 'رمز الواصلین'، 'بشارت الذکر'، 'نکتۂ واحد'، 'حجّت البقا'، 'سُکھ سُہیلا'، اور 'ارشاد نامہ' وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ جانَم نے کچھ غزلیں اور دوہے بھی کہے تھے۔

سیوا گُلبرگہ کا باشندہ اور اپنی مرثیہ گوئی کے لیے معروف تھا۔ اُس نے ۱۶۸۱ء میں 'روضۃ الشہدا' فارسی سے اُردو نظم میں ترجمہ کی تھی۔

عبدالمومن خاں مومن، مصنّف مثنوی 'اسرارِ عشق'، (۱۶۸۲ء) (جو ایک اسلامی مسلک 'مہدویہ' کے بانی سید محمد جونپوری کی زندگی اور اُصولوں کے بیان پر مبنی ہے)، اُس عہد کے اچھے شاعر تھے:۔

حسن شوقی دو مثنویوں کے مصنّف تھے (۱) 'فتح نامہ نظام شاہ'، (جو تالی کوٹہ میں وجیا نگر کے ہندو راجہ اور دکن کے مسلمان بادشاہوں کے درمیان جنگ پر مبنی ہے)، اور (۲) 'میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ'، (جو سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کے موقع پر جشن کے بیان پر مبنی ہے)۔

محمود بحری، گوگی کا قاضی، مثنوی 'من لگن'، (۱۷۰۰ء) کا مُصنّف تھا، جس کا موضوع تصوّف

تھا۔ بحری نے غزلیات، رباعیات، قصائد اور مرثیے بھی لکھے تھے۔

اشرف مصنف مثنوی 'جنگ نامہ' (۱۶۱۳ء) جس میں حضرت علیؓ کی جنگ آزمائی کا بیان ہے، نے مرثیے بھی لکھے تھے۔

وجدی مثنوی 'پنچھی بچھا' کا مالک تھا جو شیخ عطار کی 'منطق الطیر' کا ترجمہ ہے۔

مقیمی کا پورا نام مرزا مقیم خاں تھا۔ وہ مثنوی 'فتح نامہ بکھیری (جو سلطان محمد عادل شاہ کی فتوحات پر مبنی ہے) اور ایک رومانی مثنوی 'مہیار اور چندر بھان' کا مصنف تھا۔

کمال خاں رستمی مثنوی 'خاور نامہ' (۱۶۴۹ء جس میں حضرت علیؓ کی لڑائیوں کا بیان ہے) کا مصنف تھا۔

ملک خوشنود مثنوی 'جنت سنگار' کا مصنف تھا (۱۶۴۵ء جس میں بہرام کا قصہ منظوم کیا گیا ہے)۔

محمد امین ایاغی مصنف مثنوی 'نجات نامہ' (۱۶۶۵ء) اور 'شمائل نامہ'۔

سید بلاقی مصنف مثنوی 'معراج نامہ' (۱۶۵۴ء)۔ شاہ راجو، سید قتال اور خواجہ بندہ نوازؒ کی طرح شاہ امین الدین علاؔ نے بھی تصوف پر نثر میں کئی رسایل لکھے تھے۔ اُسی زمانے میں ایک اور اہم کتاب اُردو نثر میں دینیات پر لکھی گئی تھی، جس کا نام 'شرح تمہید' تھا اور جو سید میرن حیدرآبادی (متوفی ۱۶۶۳ء) نے دکنی اُردو میں قاضی عین القضاۃ (متوفی ۱۱۳۷ء ہجری) کی فارسی کتاب 'تمہیدات' سے ترجمہ کی تھی ['اردو' از ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سالانہ نمبر 'کارواں'، لاہور ۱۹۳۴ء]۔

اُسی زمانے میں میاں بانو نامی ایک حیدرآبادی شاعرہ یاسؔ تخلّص کے ساتھ اُردو میں نہایت عمدہ طبع آزمائی کر رہی تھی۔ وہ فیضی دہلوی کی شاگرد تھی اور اُس نے اُردو میں 'پند نامہ عطار' کا ترجمہ کیا تھا۔ ['ہندوستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف' گارساں دتاسی کے لکچر، سہ ماہی جریدہ 'اردو'۔ جنوری ۱۹۲۸ء]

اس دور میں اُردو ادب میں دکنی محاورے بڑی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اور زبان ہر طرح کی اغلاط سے پُر ہے۔ بہ ایں ہمہ دکن میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا جاری رہا اور اس میں ہر صنف میں طبع آزمائی کی گئی، مرثیہ، غزل، قصیدہ، مثنوی، فطرت کی عکاسی، اخلاقی و سماجی نظمیں، رزمی شاعری اور شاہنامے وغیرہ۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کی دونوں سلطنتوں نے اس نئے اُردو ادب اور اس کے شعرا و ادبا کی ہمت افزائی و پشت پناہی کی، نیز قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں نے بذاتِ خود اس تازہ و توانا ادبی تحریک میں عملی حصّہ لیا ['رفتارِ اُردو' از پروفیسر حامد حسن قادری، آگرہ، ماہنامہ 'عالمگیر'،

خصوصی اشاعت، لاہور ۱۹۳۶ء)۔

قدیم دکنی اُردو غزل گوئی پر تبصرہ لاحاصل ہے کیونکہ وہ محض ابتدائی کوشش تھی جس میں اُس نوع کی گہرائی کا فقدان تھا جو اس صنف کی اثر انگیزی کے لیے لازمی ہے۔ قدیم دکنی اُردو غزل گوئی پر بھاشا کا اثر غالب تھا اور بھاشا کی جگہ بعدازاں فارسی نے لے لی تھی۔

قدیم دکنی اُردو شاعری میں قصاید کا بھی فقدان تھا۔ صرف ایک شاعر نصرتی اِس صنف کے لیے قابلِ ذکر ہے۔

البتہ مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس میں شاید ہی ایسا کوئی قدیم دکنی اُردو شاعر ہوگا جس نے مثنوی نہ کہی ہو۔ اُس ابتدائی دور میں ہر طرح کی مثنوی کہی گئی۔ ان میں مذہبی اور صوفیانہ مثنویاں بھی کہی گئیں مثلاً میرانجی کی 'شمس العُشاق'، اور برہان الدین جانم کی مثنویاں۔ عشق و محبت اور حُسن و جمال پر بھی مثنویاں لکھی گئیں مثلاً غواصی کی مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' جُنیدی کی مثنوی 'ماہ پیکر'، طبعی کی مثنوی 'بہرام و گل اندام'، فیض کی مثنوی 'رضوان شاہ و رُوح افزا' اور عاجز کی مثنوی 'قصۂ لعل و گوہر' وغیرہ۔ اُس قدیم عہد میں غیر زبانوں سے بھی مثنویاں اُردو میں ترجمہ کی گئیں، مثلاً ہاشمی اور امین نے مثنوی 'یوسف زلیخا' فارسی سے اُردو میں ترجمہ کی۔ اُسی زمانے میں مثنویوں کی شکل میں اُردو میں سوانح حیات منظوم کیے گئے جن کو تاریخی حیثیت دی گئی، مثلاً نُصرتی کی مثنوی 'علی نامہ'، اور مومن کی مثنوی 'اسرارِ عشق'۔ بعض مثنویاں رسوم و رواج اور اُس عہد کی معاشرتی و سیاسی زندگی پر بھی لکھی گئیں، مثلاً نُصرتی کی مثنوی 'علی نامہ'، اور ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن'۔ کچھ مثنویاں اخلاقی اصول پر بھی منظوم کی گئیں۔ غرضیکہ قدیم دکنی اُردو میں ہر نوعیت اور ہر معیار کی مثنوی لکھی گئی۔

مرثیہ کی بھی جس نے شمالی ہند میں بعد کو اُردو لٹریچر میں انتہائی اہمیت حاصل کر لی، بنیاد دکن ہی میں پڑی تھی۔ شروع شروع میں دکنی اُردو مرثیے محض مذہبی حیثیت کے حامل تھے، اس لیے اُن پر توجہ کم کی گئی۔ لیکن مُرورِ وقت کے ساتھ قدیم دکنی اُردو میں اُس نے اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ ان شعرا نے مثنوی کو بھی غزل کی صورت دے کر اس کو اُردو ادب کی ایک صنف بنا دیا۔ اُردو مراثی میں جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ فطرتِ انسانی کی نہایت کامیاب ترجمانی کی گئی جس پر مسلم انڈیا کی فضا اور ماحول کا اثر نمایاں ہے۔ دکنی مراثی محض بیانیہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں گفتگو بھی شامل ہے۔ ان میں تماثیل اور استعارے بھی ہیں۔ قدیم دکنی اُردو میں روایات بھی منظوم کی گئیں۔ قدیم دکنی اُردو شعرا

اشرف، روحی، نظر، سیدان، ہاشم، غلامی، امامی اور ندیم سب نے اپنے اردو مراثی میں لطیف جذبات انسانی کی عکاسی اور دلفریب کردار نگاری کی۔ انھوں نے ان میں مکالمہ کا آغاز کیا، استعاروں سے کام لیا اور دیسی روایات کی ترجمانی کی۔ غرضیکہ اردو ادب کی ابتدا کے باوجود اس میں ایک ترقی یافتہ ادب کی جملہ خصوصیات پیدا کر دیں۔ چنانچہ اردو ادب دکن کے اس بیش بہا عطیہ کا مرہونِ منت ہے جو ہر صنفِ ادب میں فراوانی سے ساتھ موجود رہے بالخصوص مثنوی اور مرثیہ جنھوں نے بعدازاں شمالی ہند پہنچ کر غیر معمولی ترقی کی۔ [مختصر تاریخِ ادب اردو، از پروفیسر سید اعجاز حسین اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی، ۱۹۳۵ء]۔

(۲)

آگرہ اور اُردو شاعری

میر امن اپنی 'باغ و بہار' میں لکھتے ہیں کہ

"جب شہنشاہ اکبر آگرے میں تختِ سلطنت پہ بیٹھا تو مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ اُس کی فیاضی سے مستفید ہونے کے لیے اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن اُن میں سے ہر ایک مختلف بولی بولتا تھا۔ مگر جب وہ بات کرنے اور تبادلۂ کاروبار کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے تو ایک نئی زبان 'اُردو' نے جنم لیا جو ان کے باہمی اظہارِ خیال کا ایک مشترک ذریعہ بنی۔"

پھر جب اکبر ہی کے عہد میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک نیا طریقۂ مال گذاری زمین کے ٹیکس کی ادائیگی کے لیے وضع کیا، تو ہندو رعایا کو فارسی زبان سیکھنی پڑی۔ اس طرح فارسی اور ہندی کے اختلاط سے ایک جدید زبان کا خمیر تیار ہوا، جس کو عوام نے 'اُردو' کہا۔ ['ہندوستان کی جدید زبانوں کی ایک تقابلی گرامر'۔ انگریزی۔ از بینس ص۱۵

A Comparative Grammar of The Modern Languages of India, by Benes, P. 15]

مولانا عبدالسلام ندوی نے اُردو زبان کی پیدائش کے بارے میں اپنے 'تذکرہ شعر الہند' (جلد اوّل ص ۱۲-۱۳) میں حسب ذیل نظریہ پیش کیا ہے:-

"شہنشاہ اکبر نے آگرے کے قلعہ کے اندر ایک زنانہ بازار قائم کیا جس میں ایرانی، عرب، تُرک اور ہندوستانی خواتین نے اپنی اپنی دکانیں سجائیں۔ شاہی محل کی خواتین اور درباریوں کی بیویاں گاہک بنیں۔ یہ رنگین اجتماع باہمد گر تبادلۂ خیالات کے باعث ایک نئی زبان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا۔ اس نئی مخلوط زبان کا ڈھانچہ ایک اور ذریعہ سے بھی بنا۔ مثلاً گو کہ عہدِ اکبری میں سلطنت مُغلیہ کی درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی، لیکن بہت سے شاہی درباریوں اور ہندو

زبانوں کی زبانیں مختلف تھیں، جن کے یکجا ہونے سے ضرورتاً تبادلۂ خیال کے باعث ایک نئی اور مخلوط زبان کا ہیولا تیار ہوا اور شہنشاہ اکبر نے اس نئی مخلوط زبان کی پیدائش و ترقی میں ذاتی طور پر دلچسپی لی۔ وہ فارسی اور ہندی زبانوں دونوں کے شعرا اور ادبا کا سرپرست تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر بذات خود ہندی اشعار کہا کرتا اور تخلص رائے کرتا تھا۔"

شہنشاہ اکبر کے نورتنوں [فیضیؔ، ابوالفضلؔ، خانخاناںؔ، ٹوڈرملؔ، کوکلتاشؔ، حکیم ہمامؔ، حکیم ابوالفتح، راجہ مان سنگھ اور بیربلؔ] میں سے ایک راجہ ٹوڈرمل نے بھگوت پران کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ ٹوڈرمل کے ہندی اشعار نے اس نئی مخلوط زبان "اردو" کی بنیاد ڈالی۔ راجہ بیربل بھی ہندی زبان کا شاعر تھا جس کو اکبر بادشاہ نے "کوی رائے" کے معزز خطاب سے نوازا تھا۔ بیربل کے ساتھ ایک افسانوی ہستی "ملا دو پیازہ" کا نام بھی مشہور ہے جس کی بذلہ سنجی، مزاح اور حاضر جوابی آج تک ضرب المثل ہیں۔ وہ حسب ذیل اردو شعر کا شاعر خیال کیا جاتا ہے ؎

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا
ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا

[تذکرۂ خندۂ گل]

کہا جاتا ہے کہ عبدالرحیم خان خاناں اور فیضی بھی اس نئی مخلوط زبان "اردو" کی طرف مائل تھے۔ ان کے علاوہ شہزادے بھی نئی اردو زبان میں دلچسپی لیتے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی "تزک" میں شہزادہ دانیال کے بارے میں اس طرح لکھا ہے :۔

"او بنغمۂ ہندی مائل بود۔ گاہے بزبان اہلِ ہند و باصطلاح ایشاں شعرے می گفت۔ بد نبودے۔"

شہنشاہ جہانگیر ہندی شعرا کا سرپرست تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ شاہجہاں کے عہد میں اکبر بادشاہ کے زمانے کی مخلوط نئی زبان "اردوئے معلّٰی" کہلائی۔ اس سے زیادہ اس نئی مخلوط زبان اردو کی زبردست ہر دلعزیزی کا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس دور کے ایرانی شعرا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ [شعر الہند، حصہ اول ص ۱۴]

شاہجہان بادشاہ کے دورِ حکومت میں شہزادہ دارا شکوہ کا میر منشی پنڈت چندر بھان برہمن (متوفی ۱۶۶۲ء) مصنف "منشآت برہمن"، اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ مولوی قدرت اللہ گوپاموی مصنف "نتائج الافکار" کے مطابق برہمن اکبرآباد (آگرہ) کا باشندہ تھا۔ برہمن کے

اُردو کلام کا نمونہ :- (خُم خانۂ جاوید، جلد اوّل)

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

برہمن کا ہمعصر سید شاہ دوست محمد تھا، جو حضرت سید تا امیر ابوالعلاء احراری اکبر آبادی کا مُرید تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے دریائے جمنا کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے پیر کی یاد میں نظم پیم کہانی لکھی تھی، جس کا ایک شعر ذیل میں درج ہے ؎

پیم کہانی کہت ہوں سنو سکھی تم آئے
پیم ڈھونڈن کو ہوں گئی آئی آپ گنوائے

صفیر بلگرامی کے بقول "یہ امر ثابت ہے کہ شہنشاہ شاہجہاں کے عہد میں اُردو زبان بخوبی رائج ہو چکی تھی۔ ہر چند کہ درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اُردو بولنے کا گویا فیشن ہو گیا تھا۔ میں نے شہنشاہ شاہجہاں کا اپنے بیٹے دارا شکوہ کے نام ایک اُردو خط دیکھا تھا۔" (' جلوۂ خضر ' از صفیر بلگرامی ص۵۵)۔

اُس وقت جبکہ شہزادہ شجاع اور شہزادہ اورنگ زیبؒ باہمدگر جنگ آزما تھے، شاہجہاں بادشاہ نے اپنے منجھلے بیٹے شجاع کو خط لکھا تھا لیکن وہ اورنگ زیبؒ کے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اِس شاہی فرمان کی بُنیاد پر شہزادہ اورنگ زیبؒ نے اپنے فرمانروا باپ کو جو تحریر فارسی میں بھیجی تھی اُس کا حسب ذیل فقرہ شاہد ہے کہ شاہجہاں کا شہزادہ شجاع کے نام خط ہندی (اُردو) میں تھا:-

"ایں فرمانِ عالی کہ در زبانِ ہندی از دستخطِ خاص رقمے فرمودہ شاہد ایں معنی است ......"

آگرے کی سکونت ترک کر کے شہنشاہ شاہجہاں نے نیا شہر شاہجہاں آباد (نئی دہلی) بسایا جہاں تمام کاروبار سلطنت اکبر آباد سے منتقل ہو گئے۔ دارالسلطنت کی اِس منتقلی نے دہلی میں اُردو زبان کے قیام و ارتقا میں بڑی مدد دی۔ اس نئی زبان اُردو کے لیے اُس وقت اس قدر جوش و خروش تھا کہ بعض مسلمانوں نے ہندی کی پوری پوری کتابیں از بر کر لی تھیں۔ اِس سلسلے میں ابنِ احمد رازیؔ اپنے تذکرہ ہفت اقلیم، میں میر ہاشم محترم کے بارے میں یوں لکھتا ہے :-

"امروز در ہنداست ، تمام کتاب مہابھارت را کہ مُستجمع اسامیٔ غریبہ و حکایاتِ عجیب است ، در ذکر دارد۔"

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ سلطنتِ مُغلیہ ہند کا ۱۶۵۸ء میں فرماں روا ہوا۔ ہر چند کہ وہ بذاتِ خود شعر و شاعری کی طرف مائل نہ تھا لیکن وہ اُس کے عہد میں بالکل مُردہ نہیں ہوئی۔ اُردو زبان کی ترقی روز افزوں تھی۔ نہ صرف دہلی اور آگرے میں بلکہ شمالی ہند کے دیگر مراکزِ علمی میں بھی ایک دوسرے سے مُسابقت عام تھی اور اُردو زبان کی ہر دلعزیزی کا دَور دَورہ تھا۔ علامہ آزاد بلگرامی اپنے 'تذکرۂ ید بیضا' میں ایک شاعر سَقیر کے مُتعلق لکھتے ہیں، جس نے ایران سے دہلی آکر شاہی دربار میں ملازمت حاصل کر لی تھی، کہ وہ ہندی زبان کا عُمدہ شاعر تھا اور سَقی تخلص کرتا تھا۔

عہدِ عالمگیری میں متعدد اُردو شعراء موجود تھے مگر اُن میں سے کوئی دہلی کا باشندہ نہیں تھا، سب کے سب باہر سے آئے تھے۔ مرزا معز الدین فطرت مشہدی، غلام مصطفیٰ انسان مُراد آبادی، اور مرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی سب اپنے اپنے شہروں سے دہلی آئے تھے۔ ہر چند کہ دہلی میں درباری و سرکاری زبان ہنوز فارسی تھی لیکن اُردو غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل کر چکی تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے آخر زمانۂ سلطنت میں، نواب اسد یار خاں انسان کا اکبر آباد (آگرے) میں بحیثیت ایک اُردو شاعر بڑا چرچا ہوا، جو بعد ازاں شہنشاہ محمد شاہ کا ایک معروف درباری ہوا۔ اُس کا ایک شعر بطور نمونہ ذیل میں درج ہے:-

نہ دیکھی ایک جھلک بھی آپ کی تن پیچ اندھوں میں
اگرچہ نہر بن مُوری بدن سر شب کا ہے

مختصر یہ کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے سے لے کر شاہجہاں کے آغازِ سلطنت تک دہلی میں اُردو زبان کا چرچا واجبی سا رہا مگر شاہجہاں کے دہلی میں آکر رہنے کے بعد وہاں اُردو زبان عام ہوتی گئی حتّٰی کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں دہلی میں اُس کی ہر دلعزیزی بہت بڑھ گئی اور محمد شاہ بادشاہ [سنہ ۱۷۲۰ء - ۱۷۴۸ء] کے زمانے میں تو دہلی میں اُردو نظم و نثر کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔

مولانا عبد السلام ندوی اپنی 'شعر الہند' (حصۂ اول صفحہ ۳۲) میں رقم طراز ہیں کہ

"اگرچہ اُردو شاعری محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں دہلی میں عام ہو چکی تھی لیکن وہاں اُس وقت تک اُس کا معیار بہت پست تھا اور ادبی حیثیت سے وہ قدیم دکنی اُردو لٹریچر اور شاعری کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔"

مولوی حکیم عبد الحیؒ اپنے 'تذکرۂ گُلِ رعنا' میں فرماتے ہیں کہ

"اِس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی میں اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز آبرو اکبر آبادی کے کلام سے ہوا۔"

شاہ نجم الدین مبارک آبرو آگرے میں سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد سلطنت میں پیدا ہوئے تھے [اُردو ادب کے اکثر تذکرے مُتفق البیان ہیں کہ آبرو آگرے میں نہیں بلکہ گوالیار میں پیدا ہوئے تھے۔ مُصنّف] ۔ جب وہ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے تو اُس وقت وہ جوان عمر تھے۔ اُس کے بعد وہ اپنی وفات تک دہلی میں رہے اور وہیں دفن ہوئے جبکہ احمد شاہ بادشاہ کا عہدِ حکومت تھا۔ آبرو خان آرزو اکبر آبادی کے رشتہ دار تھے۔ اُس وقت دہلی میں جعفر زٹلی اور ولی دکنی کی اُردو شاعری کا چرچا تھا۔ ان کے ایک اور ہمعصر شاہ حاتم دہلوی ولی دکنی کے شاگرد و مُتبع تھے لیکن آبرو نے ولی کا اتباع نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ خان آرزو کے شاگرد ہو گئے، حالانکہ آبرو عمر میں آرزو سے بڑے تھے۔ آبرو صاحب دیوان شاعر تھے اور 'گُل رعنا' کے مُصنّف کے بقول اُن کا دیوان ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت تک دہلی میں ملتا تھا۔ آبرو کے شاگردوں کے نام یہ ہیں :۔ میر سجاد سجاد اکبر آبادی، محمد محسن محسن اکبر آبادی، یک رو دہلوی اور فدوی دہلوی وغیرہ۔ آبرو کے دہلوی معاصرین میں شاہ حاتم کے علاوہ مُصطفیٰ خاں یک رنگ اور میر شاکر ناجی وغیرہ تھے۔ اُس وقت کے ان دہلوی شعرا کے بارے میں 'تذکرۂ قُدرت'، 'نکات الشعرا'، 'شعر الہند'، 'چمنستانِ شعرا' اور 'گُل رعنا' نیز اُردو ادب کے دیگر تذکروں میں اچھی رائے نہیں دی گئی ہے۔ ان کے برعکس اکبر آبادی شعرا خان آرزو، آبرو اور مضمون وغیرہ کے بارے میں میر حسن دہلوی نے اپنے 'تذکرۂ شعرائے اُردو' میں اور دیگر اُردو تذکروں نے، بہتر رائے کا اظہار کیا ہے۔

مُغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد سلطنت میں خان آرزو اکبر آبادی ۱۷۲۳ء میں آگرے سے دہلی آئے۔ وہ آگرے میں ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے جبکہ سلطان اورنگ عالمگیرؒ کا عہد حکومت تھا۔ دہلی آنے سے قبل خان آرزو گوالیار میں قاضی القضاۃ رہے تھے۔ آرزو دہلی میں شاہی دربار سے آنندرام مُخلص کے توسّل سے مُنسلک ہوئے تھے جبکہ اُنھیں دربار میں کوئی منصب اور جاگیر داد عطا ہوئی تھی۔ اُردو شاعری کی ترقی کے لیے آرزو نے دہلی میں 'مراختہ' قائم کیا تھا جس نے وہاں اُردو شاعری کے 'آگرہ اسکول' کی بنیاد ڈالی۔ خان آرزو کسی دہلوی یا دکنی شاعر کے شاگرد نہ تھے۔ اُنھوں نے اپنے 'مراختہ' کے ذریعہ سے دہلی میں حقیقی اُردو شاعری کی ترویج کی جس میں میر اور درد وغیرہ یعنی دہلی میں اُس وقت کے اُردو شاعری کے تمام اساتذہ نے شرکت کی۔ آبرو، مضمون، نیز میر آرزو کے شاگرد تھے [میر کے بارے میں ہنوز حتمی طور پہ یہ تصفیہ نہیں ہو سکا ہے کہ وہ واقعی آرزو کے شاگرد تھے۔ مُصنّف] ۔ اُس وقت تک سودا دہلوی بیشتر فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے مگر پھر خان آرزو کی ترغیب سے ریختہ

میں شعر کہنے لگے۔ اپنے ایک ذیل شعر میں سودا نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

اس طرح بجا طور پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دہلی میں تمام اساتذۂ ریختہ یا تو خان آرزو کے شاگرد یا اُن کے شاگرد تھے۔ مولانا آزاد اپنی آب حیات میں اس طرح رقم طراز ہیں :۔

"خان آرزو کو اردو زبان پر وہی حق پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ و منطق پر۔ جب تک تمام منطقیوں کو ارسطو کا متبع کہا جاتا رہے گا، خان آرزو کو اردو شاعری کا بانی کہا جائے گا۔ اردو کے اُس عہد کے مسلّم اساتذہ مثلاً جانجاناں مظہر اکبرآبادی، مرزا رفیع سودا دہلوی، میر تقی میر اکبرآبادی، خواجہ میر درد دہلوی وغیرہ، جن میں سے ہر ایک اردو شاعری کے ایک اسکول کا بانی ہوا، سب آرزو کے شاگرد تھے۔"

خان آرزو کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے اس میں رائے آنند رام مخلص دہلوی، مضمون اکبرآبادی، آبرو اکبرآبادی، بہار، شہاب الدین ثاقب دہلوی، حسن علی شوق دہلوی، میر تقی میر اکبرآبادی ۹ اور پیام اکبرآبادی وغیرہ۔

نادر شاہ کے ہاتھوں ۱۷۳۹ء میں دہلی کی تباہی کے بعد خان آرزو دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں اُن کا انتقال ۱۷۵۵ء میں ہوا۔ خان آرزو کے دہلی چھوڑ دینے کے بعد خواجہ میر درد نے دہلی میں خان آرزو کی قائم کردہ مجالس مراختہ کو جاری رکھا، جو ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو برپا کی جاتی تھیں۔ جب یہ مجالس میر درد بھی جاری نہ رکھ سکے تو انھوں نے میر تقی میر کو ترغیب دی کہ وہ ان کی ذمہ داری قبول کریں۔ اس طرح خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی مساعی سے دہلی میں خان آرزو کے قائم کردہ مراختہ نے اردو کی معیاری شاعری کی بنیاد ڈالی۔ ۹ شعر الہند، جلد اوّل صـ ۴۲-۴۳ اور نکات الشعراء صفحات ۵۴، ۱۵۶۔

محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت تک اردو شاعری کا اسلوب بہت کچھ اصلاح طلب تھا، جس کے لیے خان آرزو نے بڑی کاوش کی، لیکن جب شاہ عالم بادشاہ کا دورِ حکمرانی آیا تو اُس وقت دہلی میں میر تقی میر، سودا، میر درد اور [illegible] جیسے اُردو شاعری کے قد آور مصلحین کا دور دورہ تھا، خصوصاً اسی میدان میں مرزا مظہر جانجاناں اکبرآبادی پیش پیش تھے، جو دہلی میں اردو شاعری کی تجدید و اصلاح کے ایک مستقل دبستان کے بانی تھے۔ شیخ مصحفی اپنے "تذکرۂ اردو" میں اُن کے بارے میں اس

طرح رائے زنی کرتے ہیں :۔

"اوّل کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔
نقاش اوّل زبان ریختہ بہ اعتقادِ فقیر مرزا مظہر است"۔

مرزا مظہر جانجاناں آگرے سے دہلی اُس وقت پہنچے تھے جبکہ خان آرزو دہلی میں موجود تھے اور پھر دہلی ہی کے ہو کے رہ گئے۔ دہلی کے قیام کے دوران مرزا مظہر نے اُردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا وہ کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔ مولانا آزاد نے 'آبِ حیات' میں لکھا ہے کہ "مرزا مظہر کی اصلاحات کے باعث اُردو زبان خرافیات و مہملات سے نکلکر ایک آسان و با اثر ذریعۂ اظہارِ خیال بن گئی"۔ مرزا مظہر جانجاناں اکبر آبادی دہلی میں ۱۷۸۰ء میں فوت ہوئے ان کے شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ خواجہ احسان اللہ بیانؔ اکبر آبادی، انعام اللہ خاں یقینؔ دہلوی، میر محمد حیات حسرتؔ دہلوی، خواجہ کمال الدین دہلوی، شاہ قدرت اللہ قدرتؔ دہلوی اور میر باقر حزیںؔ اکبر آبادی وغیرہ۔

مرزا مظہر کے بعد میر تقی میرؔ اکبر آبادی نے اُردو شاعری کو معراجِ کمال تک پہنچانے میں جو کارنامہ انجام دیا وہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میرؔ
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

میر تقی میرؔ کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ حسبِ ذیل شعراء میرؔ کے شاگرد تھے :۔
میاں کلّن دہلوی، مجنوںؔ دہلوی، مشتاقؔ دہلوی، بندرابن راقمؔ، میر عبدالرسول نثارؔ اور شکیباؔ دہلوی وغیرہ۔

اُردو شاعری کا آگرہ اسکول اُس لایعنی لسانی و ادبی رقابت و معرکہ آرائی سے الگ تھلگ رہا جو دہلی اور لکھنؤ کے دو حریف مراکزِ ادب اُردو میں قائم و جاری تھی۔ اس نہج پہ آگرہ اسکول کے اساتذۂ ادب اُردو نے ایک نہایت سنجیدہ و باوقار توازن قائم رکھا۔ اس قدیم دور کے قدآور ترین اُردو شعراء آگرہ اسکول ہی نے پیدا کیے، مثلاً خان آرزوؔ، آبروؔ، مضمونؔ، مرزا مظہر اور میر تقی میرؔ۔ اور اگر اس فہرست میں مرزا غالبؔ اکبر آبادی کا اضافہ کر دیا جائے تو بقول صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی "اُن کی طرف نظر اٹھانا بھی محال ہو جاتا ہے"۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "بلاشک زبانِ اُردو آگرے اور دہلی میں عالمِ وجود میں آئی۔ اُردوئے معلّٰی نے ترقی یافتہ ہو کر موجودہ شکل اختیار کی" (ماہنامہ نقاد، آگرہ، مئی ۱۹۱۹ء) اس طرح آگرہ اور اُردو کے باہمی ربط کی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے (آگرہ اور اُردو، از مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، ماہنامہ شاعر، آگرہ،

شہنشاہ بابر سے لے کر شہنشاہ جہانگیر کے دورِ سلطنت تک دہلی مسلسل افراتفری کے عالم میں رہا۔ اُس وقت اگر ایک مغل شہنشاہ کا قیام دہلی میں رہتا تو دوسرے کا آگرے میں۔ شہنشاہ اکبر نے اپنے قیام کے لیے اکبرآباد کو پسند کیا تھا تو جہانگیر اور شاہجہاں بھی دونوں شروع شروع میں آگرے ہی میں رہے تھے۔ مغلیہ حکمرانوں سے قبل سلطان سکندر لودھی نے ۱۵۰۲ء میں آگرے ہی کو اپنا مستقر سلطنت بنایا تھا تاآنکہ شہنشاہ شاہجہاں نے نئے دارالسلطنت شاہجہان آباد کی بنیاد ڈالی۔ اُس وقت سے نئی دہلی حکومت ہند کا مستقل مستقرِ سلطنت بن گیا۔ تو یہ اکبرآبادی شعرا دہلی چلے گئے تھے :۔ خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، میاں مضمون، مرزا مظہر، میر باقر علی مخلص، میاں شرف الدین علی پیام، میر باقر علی جعفر، میر باقر حزیں، میر تقی میر، محمد عارف عارف (تلمیذ مضمون اور میر تقی میر کے دوست)، میر سجاد سجاد، محمد محسن محسن، خواجہ احسان اللہ بیان اور غالب وغیرہ۔

اُردو زبان کی پیدائش و ارتقا میں دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی ادوارِ حکومت اور شمالی ہند میں سلطنتِ مغلیہ تینوں کا یکساں طور پر حصہ تھا البتہ شمالی ہند میں اُردو زبان کے قیام و ترقی میں دکن کا کوئی ہاتھ نہ تھا (تذکرہ جلوۂ خضر، تذکرہ جہانگیری، تذکرہ خندۂ گل، مغل اور اُردو، خم خانہ جاوید، تذکرہ میر حسن، اور گلِ رعنا وغیرہ)

شمالی ہند میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہدِ سلطنت میں بھی اُردو دکن میں محمد شاہی دور کی زبان سے بھی زیادہ شستہ و مؤثر تھی یعنی ولی دکنی کی اُس زبان سے بہتر تھی جب تک کہ وہ دہلی نہ آئے تھے۔ شمالی ہند میں اُردو کی اس سادگی، تازگی اور دل پذیری کا سبب آگرہ تھا جہاں سے اُردو شاعری کے ایسے باکمال اساتذۂ فن مثلاً خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، میاں مضمون، مرزا مظہر اور ان کے بعد میر تقی میر اور مرزا غالب دہلی پہنچے جہاں اُنہوں نے مستقل اقامت اختیار کر کے اُردو زبان و شاعری کو چار چاند لگا دئے دہلی میں اُردو زبان و شاعری کی اُس اوّلین و شائستہ شکل و صورت کے بانی وہی اکبرآبادی شعرا تھے۔ دہلی میں اُردو شاعری کا پہلا ترقی یافتہ دور اُنہی اکبرآبادی شعرا سے عبارت تھا ورنہ اُن سے قبل خود دہلوی شعرا کی اُردو شاعری محض مبتذل تھی جیسا کہ جعفر زٹلی کے کلام سے ثابت ہے۔ کچھ ایسی ہی مبتذل کیفیت دہلی کے اس وقت کے دیگر اُردو شعرا ناجی، یک رنگ اور احسان وغیرہ کے کلام کی ہے۔

ان اکبرآبادی اُردو شعرا میں سب سے پہلے آبرو آگرے سے دہلی آئے جن کے بعد خان آرزو، مضمون اور مرزا مظہر دہلی پہنچے۔ مولوی عبدالرب اکبرآبادی بھی شہنشاہ محمد شاہ کے عہد میں آگرے سے دہلی آئے۔

اُنھوں نے ۱۷۲۲ء میں دہلی کی شاہی رصدگاہ میں بیٹھ کر اُردو زبان میں علمِ مساحت پر ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اِس سے قبل اُنھوں نے اُردو ہی میں ایک کتاب ریاضی پر بھی لکھی تھی۔ اِس طرح مولوی عبدالرّب کو اُردو نثر کے اوّلین اہالیانِ قلم میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد نے آبِ حیات میں آبروؔ کے متعلق اِس طرح لکھا ہے: "اپنے زمانے میں وہ پختہ کے ایک اُستاد اور ایک صاحبِ طرز اُردو شاعر تسلیم کیے جاتے تھے، جنھوں نے فنِ شاعری کو سنوارا تھا۔"

مرزا مظہرؔ پہلے اُردو شاعر تھے جنھوں نے اُردو زبان میں [illegible] اصلاحات کیں اور بقول صاحبِ تذکرۂ گلِ رعنا، اُردو شاعر کو جادوگری بنا دیا۔ اُن کے [illegible] سامنے اُردو شاعری کے بڑے نقاد اور اساتذۂ فن آتے ہیں یعنی میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ۔

ہر چند کہ میاں نظیرؔ اکبرآبادی [illegible] آگرہ [illegible] ہے اور اِس طرح اُنھوں نے دہلوی شعرا کو براہِ راست متاثر نہیں کیا، [illegible] شاعر [illegible] اور اپنی شادابی سے آگرے کے رُتبے کو اُردو شاعری کے ایک اسکول کی حیثیت سے [illegible] بلند کیا۔ اُردو شاعری کے آگرہ اسکول کا دعویٰ ہے کہ شیخ قلندر بخش جرأتؔ بھی اکبرآبادی تھے۔

اگرچہ شہنشاہ شاہجہاں نے دارالسلطنت آگرے سے [illegible] منتقل کر دیا تھا لیکن اس کے بعد عرصے تک آگرے کی علمی و سیاسی مرکزی حیثیت قائم رہی [illegible] شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے وقت تک، دہلی سلطنتِ مغلیہ کا محض برائے نام مستقر [illegible] وقت تک تمام اُمورِ سلطنت آگرے ہی میں انجام پاتے تھے۔ اِسی طرح [illegible] عرصے تک آگرے ہی میں رہا جس نے شمالی ہند میں اُردو زبان کی اصلاح [illegible] شستگی و نفاست میں آگرے کا حصہ' ازاں احمد اکبرآبادی، ماہنامہ [illegible] ۱۹۳۶ء]۔

(۴)

بہار اور اُردو شاعری

معروف بہاری صُوفی حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی طرح بے شمار بہاری صُوفیہ اور اولیاء نے اُردو نثر و نظم کی ترقی میں زبردست حصہ لیا۔ مُلّا تحقیقؔ عظیم آبادی کو مرزا بیدل (متوفی ۱۷۲۰ء) کا پیشرو کہا جاتا ہے جو بہار میں قدیم ترین اُردو شعرا میں سے تھے۔ تحقیقؔ کا نمونۂ کلام :

جھگڑا باندھ دل موں سما جا
سلونو سانورے ایدھر کوں آجا

تحقیقؔ کے بعد خواجہ عماد الدین عمادؔ عظیم آبادی (۱۶۵۴ء – ۱۶۱۲ء) اور سیّد غلام نقشبند سجادؔ عظیم آبادی (۱۷۰۴ء – ۱۷۵۹ء) بہار میں معروف اُردو شعرا ہوئے۔ عمادؔ عظیم آبادی کا نمونۂ کلام :

بیچ نظر کے ایدھر اُدھر ہر دم آوے جاوے ہے
بل بے ظالم تس پر بھی ٹک دیکھے کو ترساوے ہے

سجادؔ عظیم آبادی کا نمونۂ کلام :

ٹک میری طرف سے بادِ صبا کہتی جا کر صیاد سے تنی
اب جان لبوں پر بلبل کے پہنچی تیری بیداد ستی

اُردو شاعری کے بہاری اسکول کا دعویٰ ہے کہ وہ نہ تو دکن اور نہ دہلی کے زیرِ اثر رہا بلکہ خود بہاری شعرا نے دہلوی شعرا کو متاثر کیا، مثلاً میر تقی میرؔ جعفر عظیم آبادی کے اور مرزا غالبؔ مرزا بیدلؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ بہاری اُردو شاعری نے دکن اور دہلی دونوں کے اثرات سے آزاد رہ کر بطورِ خود ترقی کی جب دہلی میں اُردو کی آواز بھی بلند نہ ہونے پائی تھی اُس وقت بیدلؔ بہار میں اُردو شاعری کر رہے تھے۔

بیدلؔ عظیم آبادی کا نمونۂ کلام :-

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے ہم میں
اُس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے ہم میں

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس
پٹنہ نگری چھوڑ دیں اب بیدل چلیے بدیس

[پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی رسہ ماہی جریدہ "اردو" اورنگ آباد۔ دکن۔ جنوری ۱۹۲۳ء ص ۵۸]

اردو شاعری کے بہاری اسکول کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اردو شاعری کے اولین دور میں صرف بیدل عظیم آبادی ہی تھے جنہوں نے دکن ہی اردو شاعری کے مقابلے میں اپنے کلام سے شمالی ہند کی لاج رکھی۔ اُس قدیم دور میں ایک بہاری ہندو شاعر کا حسب ذیل اردو شعر نقل کرنا برمحل ہوگا جس کا نام راجہ رام نرائن اور تخلص موزوں تھا اور جو شیخ علی حزیں کا شاگرد تھا۔ یہ شعر موزوں نے نواب سراج الدولہ گورنر بنگال اور بہار کی شہادت پر فی البدیہہ کہا تھا۔ موزوں دراصل ایک فارسی شاعر تھا اور نواب سراج الدولہ کے نائب حکومت کے طور پر عظیم آباد میں بہار کا حاکم تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؂

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گذری؟

راجہ شتاب رائے راجہ بنگال کے گورنر کی ماتحتی سے نکل کر بہار کا مطلق العنان وخودمختار حاکم بن بیٹھا تھا بھی ایک عمدہ شاعر اور شعرا کا مربی تھا۔ اس کے عہد حکومت میں عظیم آباد اردو ادب کا ایک معروف مرکز تھا۔ اُس کا بیٹا راجہ بہادر راجہ اچھا اردو شاعر تھا۔ راجہ کے کلام کا نمونہ ؂

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے
ہم اُن تلک نہ پہنچے، وہ ہم تلک نہ پہنچے

عظیم آباد اب پٹنہ کہلاتا ہے۔ بہار (بھارت) کے اس شہر کا نام عظیم آباد شہزادہ عظیم الشان (شہنشاہ جہاندار شاہ کے بھائی) نے رکھا تھا جو حاکم بنگال تھے۔ بیدل عظیم آبادی اور سجاد کے بعد اردو کے ان شعرائے بہار نے شہرت پائی۔ میاں شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی، بیعت قلی خان حسرت عظیم آبادی، میر غلام حسین شورش عظیم آبادی، اور شاہ رکن الدین (شاہ گھسیٹا) عشق عظیم آبادی۔ میاں جوشش صاحب "تذکرۂ جوشش"۔ کا نمونہ کلام ؂

بیکسی سے یہی گلہ ہے مجھے ۔۔۔ تھام لیتی ہے دستِ قاتل کو

حسرت عظیم آبادی کا نمونۂ کلام :-

میخانے میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی! زاہد و واعظ سے دور بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز یہ جو تقصیر رند ہے جس سے اٹکی اٹکی!

میر شورش (متوفی ۱۷۷۶ء) صاحب "تذکرۂ شورش" کا نمونۂ کلام :-

کسی کو خم سے غرض ہے، کسی کو جام سے کام نہ ہم مغاں کا ہے ساقی کے تجھ کو نام سے کام
ہماری صبح رخِ یار، شام زلفِ نگار! نہ مہر و ماہ سے ہے ہم کو صبح و شام سے کام

عشق عظیم آبادی کا نمونۂ کلام :-

تیرے نام پر تڑپتا ہے
اس طرح کا کہیں جگر دیکھا؟

متذکرہ بالا شعرائے بہار کے بعد اردو شاعری میں راسخ عظیم آبادی کا طوطی بولا ["بہار اور اردو شاعری" ماہنامہ سہیل، علیگڑھ۔ سالنامہ۔ جنوری ۱۹۳۶ء]

بہار مدعی ہے کہ اس کی اردو ادبی روایات بہت قدیم ہیں۔ اردو شاعری میں بھی بہار کا یہی مقام سمجھنا چاہیئے۔ میر تقی میر کے ایک ہمعصر راسخ عظیم آبادی بڑے معروف اردو شاعر تھے جو غزل اور مثنوی میں کمال رکھتے تھے۔ ان کا اسلوبِ شعری میر کے کلام کے مشابہ تھا خود میر بھی اردو شاعری میں راسخ کی شعر گوئی کے معترف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ راسخ کو بہار کا میر تقی میر کہا گیا ہے۔ راسخ کے زمانے میں بلکہ ان کے بعد بھی، بہار میں کئی عمدہ اردو شعراء ہوئے، جن میں جوشش عظیم آبادی نمایاں تھے۔ ان کے بعد بہار میں صفیر بلگرامی، شوق نیموی اور شاد عظیم آبادی کی شاعری کا چرچا ہوا، جن کے ساتھ عرش گیاوی اور اثر عظیم آبادی کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ ان سے پیشتر بہار میں اساتذۂ ادبِ اردو تمنا پھلواروی، شفق عماد پوری اور فضلِ حق آزاد تھے۔ اگرچہ بعد کو اردو شاعری کا بہاری اسکول بھی لکھنوی اسکول کی شاعری کے زیرِ اثر آگیا تھا، پھر بھی بہاری اسکول کی اردو شاعری میں دہلی اسکول کی داخلیت کا اثر ضرور رہا۔ بہار بجا طور پر راسخ عظیم آبادی کے کمالِ شعری پر نازاں ہے۔ بہاری اردو شعراء میں سب سے زیادہ صفیر بلگرامی لکھنوی اسکول کے خارجی اسلوب سے متاثر ہوئے تھے۔ ان کے بعد کے بہاری شعراء نے اپنی شاعری میں دہلی اسکول کی داخلیت اور لکھنوی اسکول کی خارجیت دونوں کو سمونے کی کوشش کی۔ اس کی ایک نمایاں مثال شاد عظیم آبادی کا کلام ہے ["اردو غزل گوئی"، از اختر اُرینوی، ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ، اگست ۱۹۳۹ء]۔

(۴)

سندھ اور اُردو شاعری

ہر چند کہ سندھ برِّ صغیر پاک و ہند میں ایک دُور دراز خطہ تھا لیکن اُردو زبان و ادب کے قیام و ترقی کے معاملے میں وہ بھی دیگر مراکزِ اُردو کے دوش بدوش رہا۔ قانع کی تصنیف "مقالات الشعراء" کی دریافت نے اب تاریخِ ادبِ اُردو کی سندھ سے متعلق گم شدہ کڑی کو فراہم کر دیا ہے۔ باشندۂ ٹھٹھ میر علی شیر قانع سندھ کا ایک عظیم دانشور ہوا ہے۔ اپنی دیگر ادبی تصانیف کے علاوہ قانع نے اپنے دو نہایت بیش قیمت علمی و ادبی کارنامے چھوڑے ہیں، یعنی (۱) تحفۃ الکرام، جو پہلے ہی شائع ہو چکا اور (۲) مقالات الشعراء، جس کی دریافت کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا۔ ثانی الذکر کتاب میں اُن سات سو فارسی شعراء کا ذکر ہے جو یا تو سندھ ہی کے قدیم باشندے تھے، یا سندھ میں کچھ عرصے تک مقیم رہے تھے۔

قانع نے "مقالات الشعراء" کی تحریر و تدوین ۱۷۵۴ء میں شروع کی تھی اور اس کی تکمیل پانچ سال کے بعد کر لی تھی۔ حالانکہ "مقالات" سندھ کے فارسی شعراء کا تذکرہ ہے لیکن اس میں اُن شعراء کا بھی حوالہ ہے جو اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ یہ حصّہ "مقالات" ہمارے مقصد کے لئے نہایت اہم ہے اس لیے کہ وہ تاریخِ ادبِ اُردو کی سندھ سے متعلق گم شدہ کڑی فراہم کرتا ہے۔ اسی کی اور دیگر ذرائع کی مدد سے "سندھ اور اُردو شاعری" کے بارے میں ہمیں حسبِ ذیل واقعات کا علم ہوا ہے :-

اُس وقت جبکہ دلی اور اورنگ آباد (دکن) میں شاہ سعد اللہ گلشن کی ترغیب سے اُردو شاعری کے نونہال کی پرورش کر رہے تھے، سندھ میں علامہ عبدالجلیل واسطی بلگرامی کی شخصیت علم و ادب کا مرکز تھی۔ وہ ۱۷۰۵ء میں سیوستان اور بھکر (سندھ) کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے تھے لیکن ۱۷۱۶ء میں وہ اس کام کو چھوڑ کر اپنے وطنِ مالوف کو واپس چلے گئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے دورانِ قیام سندھ میں شاہ محمد معین تسلیم، میر حیدر الدین کامل اور دیگر سندھی شعراء کو اُردو شاعری کی طرف رغبت دلائی تھی۔ علامہ عبدالجلیل کے بعد ان کے ہونہار فرزند علامہ سید محمد شاعر نے اپنے لائق باپ کی جگہ سنبھالی اور دس سال تک سندھ میں مرکزِ علم و ادب رہنے کے بعد (یعنی ۱۷۲۰ء سے ۱۷۳۰ء تک) وہ بھی اپنے وطن کو واپس چلے گئے لیکن وہ اپنا سندھ میں جانشین علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کو بنا گئے۔ علامہ سید محمد شاعر ۱۷۳۲ء میں دوبارہ

سندھ آئے اور ۱۷۴۲ء تک یہاں مقیم رہے۔ علامہ عبدالجلیل واسطی اور علامہ سید محمد شاعر بلگرامی دونوں عربی، ترکی، فارسی نیز ہندی زبانوں کے شاعر تھے۔ علامہ سید محمد شاعر کے ایک ہم عصر جعفر علی بینوا تھے جو نواب مہابت خاں ناظم کی گورنری کے زمانے میں (۱۷۱۶ء ۔ ۱۷۲۲ء) ٹھٹھہ آئے تھے۔ اُردو ادب کے متداول تذکرے بتاتے ہیں کہ سندھی شاعر اُردو بینوا شہنشاہ محمد شاہ کے دورِ سلطنت کے آغاز میں دہلی پہنچے تھے۔ شیخ قیام الدین قائم نے اپنے تذکرہ "مخزن نکات" میں بینوا کا حوالہ دیا ہے لیکن ان کا پورا نام نہیں لکھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ "شعرائے اُردو" میں بینوا کے بارے میں قائم ہی کی عبارت کو نقل کر دیا ہے۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل نے اپنے تذکرہ شعرائے اُردو "گلزارِ ابراہیم" میں خان آرزو کی بیاض سے بینوا کے دو اُردو اشعار نقل کیے ہیں۔ تذکرہ "گردیزی" میں بینوا کا نام درج نہیں ہے چونکہ مغل بادشاہ محمد شاہ کا دورِ حکومت ۱۷۱۵ء سے شروع ہوا تھا اس لیے قائم نے جس بینوا کا ذکر کیا ہے وہ میر جعفر علی بینوا ہی ہیں جو دہلی سے ٹھٹھہ پہنچے تھے اور جن کا حوالہ میر علی شیر قانع نے اپنی تصنیف میں دیا ہے۔ بینوا فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ اُن کا نمونہ کلام ؎

بینوا ہوں زکوٰۃ حُسن کی دے

او میاں مالدار کی صورت

علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی سندھ میں ایک سرکاری وقائع نگار کی حیثیت سے مقیم رہے وہ ایک عظیم مؤرخ تھے۔ اُنھوں نے اپنی مشہور کتاب "ید بیضا" سندھ کے قیام کے دوران ہی میں تصنیف کی تھی۔ آزاد بلگرامی عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر گوئی کرتے تھے۔ اُن کے اُردو اشعار مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعرا" میں اور لالہ سری رام نے اپنے "خمخانہ جاوید" میں نقل کیے ہیں۔ اُن کے متعدد شاگرد تھے جن میں سے ایک میر مرتضیٰ کا ذکر "مقالات الشعرا" میں ہوا ہے۔

شیخ محمد علی حزیں ایران سے ہندوستان آتے ہوئے کچھ عرصے تک ٹھٹھہ میں رہے جبکہ میر غلام علی آزاد سندھ میں مقیم تھے (ٹھہرے تھے)۔ ملا باقر شہید صفاہانی (متوفی ۱۷۶۴ء) اورنگ آباد سے شیخ حزیں کا تلمذ حاصل کرنے کے لیے ٹھٹھہ آئے تھے۔ شہید صفاہانی فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مولوی عبدالجبار خاں آصفی نے اپنے تذکرہ "شعرائے دکن" میں شہید کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

شہید اُس نفس کافر کیش کو مار

حقیقت کا مظفر جنگ ہو جا

اُسی زمانے میں آفتاب رائے رسوا سندھ آئے۔ اُنھوں نے تمام سندھی شعرا کی ایک

مجلس برپا کی جس میں ان شعراء نے شرکت کی یعنی مُلّا محمد باقر، قاضی عبدالقادر اور شیخ محمد کریم ۔ مُلّا محمد باقر غالباً وہی مُلّا باقر شہید صفاہانی تھے جن کے شاگرد، بقول مصحفی، عظیم فارسی شاعر مرزا قتیل تھے۔

اُس زمانے کے ایک سندھی شاعر ''مقالات الشعراء'' کے مصنف کے مطابق وَرد تھے جنہوں نے اُس وقت کے ٹھٹھہ کے قاضی کے خلاف بہت سی ہجویں کہی تھیں جن میں سے ایک، جو حافظ شیرازی کی مشہور غزل کی بحر و قافیہ میں کہی گئی تھی ۔ اِس مطلع سے شروع ہوتی تھی ؎

اَلا یا اَیُّہا المُفتی شُدہ ریشِ تو جنگلھا
اُکھاڑوں بال یک یک کر، بناؤں خوب کملھا

صاحب 'مقالات' کے مطابق شیخ وَرد کو ۱۷۳۰ء میں ایک قتل کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

اس عہد کے ایک اور شاعر محمد سعید رہبر گوالیاری تھے جو نواب سیف اللہ خاں، کی گورنری کے زمانے (۱۷۲۴ء اور ۱۷۳۰ء) میں ٹھٹھہ آئے تھے۔ 'مقالات' کے مصنف نے اُن کا محض حوالہ دیا ہے لیکن اُن کا کوئی اُردو شعر نقل نہیں کیا۔

میر قانع نے سندھ میں ایک اور اُردو شاعر کا حوالہ دیا ہے یعنی میر غلام مُصطفیٰ محزوں، جو کچھ عرصے تک ٹھٹھہ میں مقیم رہے تھے۔ محزوں 'مقالات' کے مطابق ٹھٹھہ میں شیخ عبدالسُبحان قائمؔ کے مکان میں ٹھیرے تھے، جو سندھ کے انشاء مشہور تھے۔ وہ ایک عمدہ شاعر اور بڑے بذلہ سنج انسان تھے۔

سندھ کے دو اور معروف شعراء مخدوم محمد مُعین تسلیم اور میر حیدرالدین کامل تھے ۔ ابوتراب میر حیدرالدین کامل ایک صُوفی اور میر علی شیر قانع کے پیر تھے ۔ اُن کے ایک اور شاگرد میاں محمد پناہ رجا تھے۔ کامل کا انتقال ۱۷۵۰ء میں ہوا۔ وہ ایک خوش گفتار فارسی اور اُردو شاعر تھے۔ میر قانع نے اپنے 'مقالات' میں اِن الفاظ میں اُن کی تعریف کی ہے: ''ہر چہ اشعارِ ہندی، ایشاں عالمگیر است، اَمّا آنچہ فقیر یاد می دارد می نویسد'' اُن کے حسبِ ذیل دو اشعار سے اُن کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے :-

لبوں دِلبر کے میرے قتل پر بیڑا اُٹھایا ہے
اِلٰہی خُون سے میرے تُو اُس کو سُرخرو کرنا !

خالِ رُخسار پہ اَچھبا ہے
گال کے کھیت میں اُگا ہے تِل !

مخدوم محمد معین تسلیم ٹھٹوی بڑے عالم و فاضل شخص تھے وہ ایک صوفی بزرگ اور میاں ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹوی اور شاہ عبداللطیف نازک بھٹائی کے پیرو تھے۔ میر نجم الدین عزلت رضوی بھکری اور مولوی محمد صادق اُن کے مریدوں میں تھے۔ تسلیم کی میر سعداللہ سورتی سے علمی مراسلت رہتی تھی۔ مخدوم محمد معین ٹھٹوی کا انتقال ۱۷۴۷ء میں ہوا۔ وہ فارسی میں تسلیم اور اردو میں بیراگی تخلص کرتے تھے۔

تسلیم (بیراگی) کے بعد سندھ میں اردو کے ان شعراء کے نام ملتے ہیں:۔ (۱) میر محمود صابر رضوی استرآبادی، جو دہلی نژاد تھے، ٹھٹہ میں ۱۷۴۷ء میں وارد ہوئے تھے۔ 'مقالات' کے بیان کے مطابق، وہ ایک نہایت پرگو شاعر تھے، جنہوں نے ۱۷۵۹ء تک ایک لاکھ سے زائد اشعار کہے تھے۔ وہ بنیادی طور پر مرثیہ گو اور 'روضۃ الشہدا' کے مصنف تھے۔ وہ اپنی تصنیف 'تحفۃ الکرام' کی تکمیل سے چند ماہ پیشتر فوت ہوئے۔ (۲) محسن الدین شیرازی سورت سے آکر سندھ میں برائے چندے مقیم رہے تھے (۳) میر حفیظ الدین علی، میر حیدرالدین کامل کے بھتیجے، بھی اردو شاعر تھے۔ (۴) سید فضائل علی بے قید ابتدا میں عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی معیت میں سندھ آئے تھے اور بعد کو وہ ٹھٹہ کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ وہ اردو کے اچھے شاعر تھے اور اُن کی اردو مثنوی کا ذکر میر حسن اور علی ابراہیم خاں نے اپنے 'تذکروں' میں کیا ہے۔ (۵) عماد الملک غازی الدین خاں نظام فیروز جنگ نے 'بخشی الممالک' کا خطاب احمد شاہ بادشاہ سے اور 'وزیر الممالک' کا خطاب شہنشاہ عالمگیر ثانی سے پایا تھا۔ تذکرہ 'گلزار ابراہیم' کے مصنف کے مطابق وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے اچھے شاعر تھے اور سندھ میں ۱۷۸۰ء میں آئے تھے۔ (۶) سید ضیاءالدین، ضیا 'مقالات الشعراء' کے مصنف میر علی شیر قانع کے عم زاد بھائی تھے۔ وہ میر تھارا خاں رفیق (متوفی ۱۸۲۹ء) حاکم میرپور خاص کے مصاحب اور اُس کے درباری شاعر تھے۔ وہ فارسی اور اردو شاعری دونوں میں صاحب دیوان تھے۔ ضیا کی اردو شاعری کا نمونہ

کس کی طاقت نہیں ہے دیکھے اُسے
جن نے دیکھا ہے بے قرار آیا

(۷) میر علی شیر قانع مصنف 'مقالات الشعراء' نے شعر گوئی کی تربیت میر حیدرالدین کامل سے پائی تھی۔ اُن کے ایک شاگرد منشی پرسرام مشتری (ایک فارسی گو شاعر تھے، جو اردو میں بیربل تخلص کرتے تھے۔ بیربل میر محمود صابر رضوی کے بھی شاگرد تھے۔

نواب عبداللہ خاں ضیغم نے اپنے تذکرہ 'یادگار ضیغم' میں متعدد اردو شعرائے سندھ کا ذکر کیا ہے۔ سید ثابت علی زوار سیوستانی فارسی، سندھی اور اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ وہ

مخدوم نورالحق مستانی سیوستانی اور غلام علی مدّاح ٹھٹوی دونوں کے شاگرد تھے۔ اُن کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ میر صوبیدار خاں میر میر فتح علی خاں ساکن حیدرآباد (سندھ) کے فرزند بھی عمدہ شاعر اور شعرائے کے مربی تھے۔ ان کی رحلت ۱۸۴۵ء میں ہوئی۔ مخدوم عبدالکریم کرم کا جو ٹھٹھ کے غلام حیدر کے بیٹے تھے انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ غلام حسین افضل سبز پوش ٹھٹوی شاعر اور نثر نگار دونوں تھے۔ آخر عمر میں وہ اسد تخلص کرنے لگے تھے۔ اُن کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہوا۔ وہ "تنبیہ المعاندین"، "مثنوی نان و نمک"، "نظم نوروز" اور "انشائے افضل" کے مصنف تھے۔ سید غلام محمد گدا ہاشمی آخوند احمدی اور آخوند روشن حیدرآبادی کے شاگرد تھے۔ وہ نواب میر حسین علی خاں کے درباری شاعر تھے اور سندھی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کا "سکندر نامہ" نظامی کا منظوم ترجمہ شائع ہو چکا ہے (ماہنامہ مہر، اکتوبر ۱۹۳۵ء)

مخدوم عبدالکریم صدیقی نقشبندی کے فرزند مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹوی کا، جو میاں محمد زاہد شاکرانی کے شاگرد تھے، شروع میں تخلص مسکین تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کے فرزند محمد زماں حبیب (متوفی ۱۸۸۸ء) بھی اردو شاعر تھے۔ اس عہد کے ایک اور اردو شاعر قاضی غلام علی جعفری ابن یحییٰ جعفری طیاری ٹھٹوی تھے جن کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔

سندھ میں مذکورہ بالا شعرائے کے بعد کے یہ شعراء قابل ذکر ہیں:۔ میر حیدر علی افسر، میر غلام حیدر تاب اور سیٹھ محمد اسمٰعیل مغموم مدراسی۔ تذکرۂ یادگار ضیغم میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ اُس وقت سندھ میں ایک اور اردو شاعر غلام محمد خاں خبیر کے شاگرد محمد یوسف خاں ظہیر تھے۔ سندھ میں اُس عہد کے دیگر اردو شعراء یہ ہیں:۔ منشی دھنپت رائے بیکس، قاضی محمد ہاشم مخلص، شیر علی خاں اسد، سعد اللہ نیازی انصاری، ولی محمد ولی، ولیم برونیٹ (WILLIAM BRUET) ولیم، پیر بخش اثر اور منشی محمد منیر منیر وغیرہ [سندھ کے اردو شاعر، از افسر صدیقی امروہوی، رسالہ اردو، سہ ماہی، جولائی ۱۹۲۷ء]

متقدمین شعرائے اُردو، دورِ اوّل کی خصوصیات

متقدمین شعرائے اردو کا یہ پہلا دور (۱۵۵۰ء تا ۱۶۸۶ء) جس کا زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ہاتھوں دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی مسلمان سلطنتوں کے انہدام تک مبنی تھا، بیشتر دکنی اردو شاعری اور دکنی اردو شعراء پر منحصر تھا جنہوں نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ۔ لیکن اردو شاعری کا یہ اولین دکنی دور غزل اور قصیدے کے لحاظ سے کم اہم لیکن مثنوی اور مرثیہ گوئی میں ممتاز تھا، حالانکہ ثانی الذکر ہر دو اصناف شعری کا بھی فطری طور پر آغاز ہی تھا۔

یہ ایں ہمہ اِن اوّلین دکنی شعرائے نے اُردو شاعری کی جُملہ اصناف کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ اُردو نثر نگاری کے معاملے میں بھی دکن پیش رو ہی رہا۔ دہلی میں تو اُس وقت محض فارسی کی فرماں روائی تھی اور وہاں اگر اُردو نام کی کوئی شئے ہو سکتی تھی تو وہ ہندی دوہروں کے ساتھ مقامی محاوروں کا ایک بھونڈا سا امتزاج تھا۔ البتہ آگرے میں صحیح خطوط پر اُردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا جو دہلی پہنچ کر مزید نکھر گیا۔ بہار اور سندھ میں بھی ساتھ ساتھ اُردو شاعری کا آغاز ہو چلا تھا۔

مُتقدمین شعرائے اُردو کے دوسرے دَور میں اُردو شاعری کے یہ مُختلف مدارسِ فکر دہلی پہنچ کر متحد ہوگئے۔ ولی اور اس کے معاصرین کے بعد اُردو شاعری اور ادب کی ترقی کے معاملے میں شمال ہند کے مقابلے میں دکن بہت پیچھے رہ گیا۔

مُتقدمین دَورِ اوّل کا بہترین شاعر غوّاصی کو تسلیم کیا گیا ہے جس کے بعد ابنِ نشاطی، نُصرتی اور ہاشمی کے نام لیے جاتے ہیں۔

۵

متقدمین دَورِ دوم

۱۶۸۷ء — ۱۷۵۹ء

دہلی اور اُردو شاعری

مع دکّنی شعرا

اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف حصے میں، جبکہ سلطنتِ مُغلیہ معرضِ زوال میں تھی، برِصغیر پاک و ہند میں ایسی دو نامور و غیر معمولی حکمران مسلمان شخصیتیں موجود تھیں جو بہتر ماحول اور موافق حالات میں یقیناً احیائے اسلام کا پرچم بلند کرتیں، یعنی نواب سراج الدولہ شہید (شہادت ۱۷۵۷ء) حاکم بنگال و بہار اور سلطان ٹیپو شہید (شہادت ۱۷۹۹ء) فرمانروائے میسور (دکن)۔ یہ دونوں مسلمان فرماں روا اُردو زبان سے واقف تھے بلکہ ٹیپو سلطان کو تو اُردو زبان کا شاعر بھی بتایا گیا ہے۔ انگریز مؤرخوں نے اپنے تعصب کی بنا پر ان دونوں کو بُرے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ وہ دونوں انگریز غاصبوں کے مُخالف تھے۔

دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز محمد افضل جھنجھانوی (متوفی ۱۶۲۵ء) کے کلام سے ہوا۔ وہ عہدِ جہانگیری (۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء) کے شاعر تھے یعنی شاہِ گولکنڈہ سلطان محمد قُطب شاہ (متوفی ۱۶۲۶ء) اور شاہِ بیجاپور سلطان ابراہیم عادل شاہ (متوفی ۱۶۲۶ء) کے دکن میں ہمعصر۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ دکن اور شمالی ہند ہر دو مقامات پر اُردو شاعری نے بیک وقت جنم لیا اور مُتقدمینِ دورِ اوّل میں بھی دہلی دکن سے پیچھے نہ رہی۔ چونکہ اُس عہد کی شمالی ہند میں اُردو شاعری کے متعلق وافر مواد موجود نہیں ہے لہٰذا دکنی اُردو شعرا کو متقدمین دورِ اوّل میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی ثُم دہلوی "بارہ ماسہ" کے مُصنف تھے جس کے چند اشعار ذیل میں منقول ہیں:-

ارے یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے | کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے
پڑی ہے گال میں میرے نیم پھانسی | مَرن اپنا ہے اور لوگوں کا ہانسی
مُسافر سے جنہوں نے دل لگایا | اُنھوں نے سب جنم روتے گنوایا

ہندوستان پر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک حکمرانی کی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ہندوستان کا بہترین فرماں روا تھا۔ اُس کا انتقال دکن میں احمد نگر کے مقام پر ہوا تھا۔ یہاں اُن کا ایک یادگاری مقبرہ تعمیر کیا گیا تھا لیکن اُسے دولت آباد (دکن) کے قریب روضہ نامی (جسے خُلد آباد بھی کہا گیا) گاؤں میں دفن کیا گیا تھا۔ اُس کی رحلت کے ساتھ سلطنتِ مُغلیہ کی عظمت کا خاتمہ ہو گیا لیکن یہ ایک عجیب وغریب حقیقت ہے کہ قریباً اُسی زمانے سے اُردو شاعری و ادب کا ارتقا شروع ہوا۔ سلطان اورنگ زیبؒ کے جانشین مرزا مُعظم بہادر شاہ (شاہ عالم اوّل) کے لقب کے ساتھ فرمانروا ہوئے (۱۷۰۷ء-۱۷۱۲ء)۔ اُن سے لے کر شاہ عالم ثانی آفتاب (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) تک مع اُن دونوں کے گیارہ مُغل بادشاہ یکے بعد دیگرے تختِ دہلی پر متمکن ہوئے مگر برائے نام۔ ان میں زیادہ معروف حسبِ ذیل مُغل بادشاہ تھے

فرخ سیر (۱۷۱۳ء-۱۷۱۹ء)، محمد شاہ پیا (۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء)، احمد شاہ (۱۷۴۸ء-۱۷۵۴ء) اور عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء-۱۷۵۹ء)۔

متقدمین دورِ اوّل کے زمانے میں اُردو شاعری دکن میں تو اپنے عروج پر تھی لیکن دہلی میں اُس کا محض آغاز ہوا تھا جس کے نمائندے جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) تھے جو مُغل شہنشاہ فرخ سیر کے عہد کے شاعر تھے۔ اُن کا کلام محض ننگ ہندی تھا جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے:-

دبی دھاک اورنگ شاہِ ولی در اقلیم دکن پڑی کھلبلی
دریں پیر سالی و ضُعفِ بدن مچا ہی دیا چوکڑی در دکن

یہ ممکن ہے کہ محمد افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کے زمانوں کے درمیان دہلی میں کوئی اور اُردو شاعر بھی ہوئے ہوں لیکن ان کے متعلق کوئی اطلاع اُردو تذکرہ نویسوں کو نہیں ملی۔ اُس عہد میں آگرہ اور بہار نے دہلی کی لاج رکھ لی۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ آگرے میں خان آرزو اور شاہ مبارک آبرو سے پہلے اُردو شاعر موجود تھے۔ اُس زمانے میں بہار میں مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۷۲۰ء) اور سید عماد الدین عماد عظیم آبادی (متوفی ۱۷۱۲ء) موجود تھے۔

اُس عہد میں وہ دکنی شعرا بھی شامل ہیں جو اورنگ آباد یا سلطان اورنگ زیبؒ کے آخری ایامِ زندگی سے لے کر شہنشاہ شاہ عالم ثانی آفتاب کی تخت نشینی کے زمانے تک (سلطنتِ مُغلیہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی شمولیت کے بعد) دکن کے دیگر مقامات پر موجود تھے، خواہ وہ دہلی گئے ہوں یا نہیں، نیز اُس عہد کے دہلوی شعرا۔ اس طرح اُس عہد کے اُردو شعرا یہ تھے:- ولی اور اُن کے دکنی معاصرین (سراج، داؤد، عزلت، عاجز، اور آزاد وغیرہ)، اکبرآبادی شعرائے اُردو (خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، مضمون اور

مرزا مظہر وغیرہ) اور دہلوی شعرا (یک رنگ، شاکر ناجی، حاتم، احسن، کلیم اور فغاں وغیرہ) ۔

دکن میں اردو شاعری کا یہ دور قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے زوال کے بعد شروع ہوا جس میں زبان پہلے کی نسبت آسان و سلیس تر ہو گئی، داخلیت بڑھ گئی اور ان دکنی شعرا کے اردو کلام میں، جو دہلی گئے اور وہاں سے متاثر ہو کر پلٹے، مقامی دکنی اثرات برائے نام رہ گئے۔

دہلی اور شمالی ہند میں، اس دور سے قبل، اگر اردو شاعری میں کچھ کہا گیا ہوگا تو وہ محفوظ نہ رہا اور جو ہمدست ہوا وہ قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ غزل اور قصیدے کا کوئی دیوان، جو اس دور سے متعلق کیا جا سکے، دستیاب نہیں ہے۔ اس دور میں مستقل طویل مثنویاں اور مراثی بھی نہیں لکھے گئے۔ باقاعدہ غزل گوئی اور دیوان سازی کا آغاز دہلی میں وہاں ولی دکنی کے پہنچنے کے بعد ہوا۔ اس دور میں دہلی کی اردو شاعری میں بھی دکن کی طرح زبان و اسلوبِ بیان کے نقائص اور خامیاں ہیں۔ بہ ایں ہمہ اس اولین دور میں بھی سادگی زبان، شیریں گفتاری، وفا و اثر اندازی دہلی کی اردو شاعری کا طرۂ امتیاز رہے ["رفتارِ اردو"، از پروفیسر حامد حسن قادری، ماہنامہ "عالمگیر" لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۶ء] ۔

اس دور کے بہاری اردو شعرا سے ہم واقف ہیں، یعنی سید غلام نقشبند سجاد عظیم آبادی (متوفی ۱۱۵۹ھ)، جوشش، حسرت، شورش اور عشق عظیم آبادی وغیرہ۔

اس دور میں مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی خود اردو شاعر تھا اور آفتاب تخلص کرتا تھا۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی بھی اردو میں شاعری کرتا تھا اور اس کا تخلص شعاع تھا۔

اس دور کے بعض اور آیندہ دور کے تمام اردو شعرا نے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں اردو شاعری کو اس کے سابقہ نقائص سے پاک کر کے اس کے اسالیب کو نکھارا اور بڑی حد تک اسے سہل ممتنع بنایا۔ اس نہج پر اس دور میں مرزا مظہر اور شاہ حاتم، اور اس کے بعد کے دور میں، میر، مرزا سودا، درد اور قائم اردو شاعری کے زبردست اساتذہ ہوئے۔ انھوں نے اردو شاعری میں بڑی اصلاحات کیں اور اس کے اسلوب کو اس قدر ترقی دی کہ شاہ حاتم نے اپنے سابقہ دیوان کو، جو آبرو اور ناجی کے متروک طرزِ بیان پر مبنی تھا، منسوخ کر کے ایک زیادہ مختصر دیوانِ اردو جدید ترقی یافتہ زبان پر مبنی، مرتب کیا، جسے "دیوان زادہ" کہا گیا۔ اس عہد کی اردو شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زبان کو نکھارا اور اس میں سے سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکنی الفاظ اور محاوروں نیز عربی اور فارسی کے بے محل مصطلحات کو خارج کر دیا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ کام مرزا مظہر اور شاہ حاتم نے کیا جنھوں نے اردو زبان میں زبردست اصلاحات کیں اور اسے دہلی کی مروجہ اصطلاحات اور محاوروں سے مملو کر دیا۔ لیکن اس عظیم الشان اصلاحی کام کی

تکمیل میر اور سودا نے کی جس کے باعث وہ بجا طور پر نہ صرف اُردو زبان کے مصلحین باور کیے جاتے ہیں بلکہ وہ اس ترقی یافتہ اسلوب بیان کے بانی بھی تھے۔ اُن کی اُردو زبان میں ان اصلاحات کو صفیر بلگرامی نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنے قابل قدر تذکرہ "جلوۂ خضر" میں محفوظ کر لیا ہے۔ ان اصلاحات کے بعد اُردو شاعری فارسی شاعری کی نہج پر قائم ہو گئی اور اُردو شعرائے نے فارسی شعراء کا تتبع اختیار کر لیا۔ فارسی شاعری کے ابوالآباء سعدی اور حافظ ہوئے ہیں۔ اس دور کے بعض اُردو شعرائے نے اُن ایرانی شعراء کی نقل کی سعی کی، بالخصوص ناصر علی، جلال، اسیر، کلیم اور بیدل کے انداز بیان کی۔ لیکن بہتر اُردو شعرائے نے طالب آملی اور سنائی کے اسلوبِ بیان کو اپنایا ["شعر الہند، جلد اول، باب اول، "قدما کا دوسرا دور"، صفحہ ۳۲-۴۱]۔

(۱)
ولی اورنگ آبادی

(۱۶۶۸ء ——— ۱۷۴۲ء)

ولی اپنے تمام معاصرین اور ان کے پیشروں سے کہیں زیادہ بہتر اُردو شاعر تھا لیکن اُس کے فن شاعری کو بھی جلا اُس وقت ملی جبکہ وہ دکن سے قریباً ۱۷۰۰ء میں دہلی پہنچا۔ وہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کا آخر زمانۂ سلطنت تھا۔ دہلی میں وہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملا، جن کی ترغیب سے ولی نے اپنے اندازِ بیان کو یکسر بدل ڈالا اور دکنی کے بجائے دہلوی اظہارِ بیان اختیار کر لیا۔ اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ خود دہلی میں اُردو شاعری ولی کی آمدِ دہلی کے بعد سے ہی پروان چڑھی ["شعر الہند، جلد اول صفحہ ۲۵]۔

ولی کی زندگی کے متعلق جملہ اُمور [اُس کا نام، وطن، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات، مولد، مدفن] سب تحقیق طلب ہیں۔ اُس کا نام مختلف طرح سے لیا گیا ہے یعنی ولی محمد، محمد ولی، ولی الدین، شمس ولی اللہ، شمس الدین معروف بہ ولی اللہ، شمس الحق اور حاجی ولی وغیرہ۔ بعض مصنف اس کا وطن و مولد احمد آباد (گجرات) بتاتے ہیں اور دیگر اورنگ آباد (دکن)، لیکن کثرت رائے ثانی الذکر کے حق میں ہے۔ بعض مورخین اُس کی تاریخ پیدائش ۱۶۶۹ء بتاتے ہیں اور دیگر ۱۶۸۲ء لیکن کثرت رائے ۱۶۶۸ء کے حق میں ہے ["کلیات ولی"، مرتبہ احسن مارہروی، "دیوانِ ولی"، مرتبہ پروفیسر سیانی، "نگار"، اُردو شاعری نمبر، جنوری ۱۹۲۵ء، "گل رعنا"، اور "شعر الہند"، وغیرہ]۔ لیکن "تذکرہ شعرائے دکن" کا مصنف یہ تاریخ ۱۶۴۳ء بتاتا ہے ["انتخاب زریں"، مرتبہ سر راس مسعود ۱۹۲۶ء صفحہ ۴]۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (چودھواں ایڈیشن ۱۹۲۹ء) کے مطابق ولی ۱۶۸۰ء اور ۱۷۲۰ء کے درمیان زندہ تھا۔ ڈاکٹر مولوی عبد الحق ولی کی تاریخ

پیدائش ۱۶۸۸ء اور تاریخ وفات ۱۷۴۴ء بتاتے ہیں ["اُردو" ماہنامہ کارواں، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۲ء]۔ ایک اور جگہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ولی کی تاریخ وفات ۱۱۵۵ء بتائی ہے [سہ ماہی رسالہ "اُردو" جنوری ۱۹۳۴ء]۔ لیکن کثرتِ رائے ۱۷۴۲ء ہی کے حق میں ہے۔ ولی کے مدفن کے متعلق زیادہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ احمد آباد (گجرات) میں دریا خاں کے مقبرے کے مقابل ہے۔ ["مختصر تاریخ ادب اُردو" از پروفیسر اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۵ء]۔ گارساں دتاسی (GRACIN DE TASSY) نے "کلیاتِ ولی" اپنے نوٹ اور ترجمہ کے ساتھ پیرس میں ۳۶-۱۸۳۴ء میں شائع کی تھی۔ عام طور سے ولی دکنی کی عمر کا اندازہ ۴۰، یا ۷۰، سال کیا گیا ہے۔

ولی سورت اور احمد آباد گئے تھے اور شہنشاہ اورنگ زیبؒ کی زندگی کے آخری ایام (غالباً ۱۷۰۰ء) میں وہ دہلی گئے تھے جہاں وہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے تھے۔ مؤخر الذکر ایک نقشبندی صوفی اور فارسی شاعر تھے۔ شاہ سعد اللہ دہلی میں غالباً ۱۷۹۳ء میں فوت ہوئے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ولی نے شاہ گلشن کے مشورے کے مطابق اپنی اُردو شاعری کا اسلوب بدل دیا تھا۔ اُس زمانے میں دہلی میں یہ مشہور فارسی گو شعرا تھے جو گاہے گاہے اُردو میں بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے، یعنی مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی، میر جعفر زٹل دہلوی، سلیمان قلی خاں داؤد، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خاں فراق، علی قلی خاں ندیم، مرزا معز الدین فطرت، قزلباش خاں اُمید اور میر شمس الدین فقیر وغیرہ ["تذکرہ مخزن نکات" از قائم چاندپوری]۔ اکبر آبادی شعرا (خان آرزو اور شاہ مبارک آبرو وغیرہ) ولی دکنی کے پہلے دورہ دہلی کے بعد آگرے سے دہلی آئے تھے۔ قزلباش خاں اُمید کے اُردو کلام کا نمونہ ؎

در و دیوار سے اب صحبت ہے
یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

ندیم کی اُردو شاعری کا نمونہ ؎

جُدائی میں تیری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مُو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

فراق کا نمونہ کلام ؎

اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں
کوئی اُن ہم نواؤں سے کبھی بھی یاد کرتا ہے؟

فقیر کے اُردو کلام کا نمونہ ہے ؎

زندگی موجِ آب ہے گویا
دم کا آنا حباب ہے گویا

آبحیات میں مولانا آزاد نے ولی کو اُردو غزل کا بانی کہا ہے۔ ولی کی ابتدائی تعلیم و تربیت گجرات (ہند) میں ہوئی تھی، جہاں وہ ایک صوفی سلسلے سے وابستہ بھی ہو گئے تھے۔ ولی کا دیوان ۱۷۱۹ء میں دہلی پہنچا تھا جس نے اردو غزل میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ولی دوسری مرتبہ دہلی مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں (۱۷۲۲ء) میں آئے تھے۔ ولی نے پانچ مغل شہنشاہوں کا عہدِ حکومت دیکھا تھا، یعنی اورنگ زیبؒ، شاہ عالم اول، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ۔ ولی کے ان چار دکنی معاصرین نے اُردو شاعری میں ولی کا اتباع کیا، یعنی مرزا داؤد داؤد اورنگ آبادی (متوفی ۱۷۵۴ء) عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی (متوفی ۱۷۶۴ء)، میر عبدالولی عزلت اورنگ آبادی (متوفی ۱۷۷۵ء) جن کے والد سید سعداللہ سلون ضلع رائے بریلی یوپی ہند کے باشندے تھے اور سورت میں آباد ہو گئے تھے۔ اور چوتھے میر سراج الدین سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۴ء-۱۷۶۳ء) جن کی زبان ولی سے بھی زیادہ صاف اور آسان تھی اور جو دکن میں ولی کے بعد بہترین اُردو شاعر سمجھے جاتے تھے۔ سراج، داؤد اور عاجز دہلی کبھی نہیں گئے لیکن عزلت ۱۷۵۰ء میں شہنشاہ احمد شاہ کے دورِ حکومت میں دہلی گئے تھے اور خان آرزو اور میر تقی میر سے ملے تھے۔ مذکورہ بالا چار دکنی اُردو شعرا کے علاوہ، ایک احمد گجراتی تھے اور دوسرے فقیراللہ آزاد دکنی۔ یہ دونوں بھی اچھے اُردو شعرا تھے۔ آزاد فراقی دکنی کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ سراج کا نمونۂ کلام ؎

آہ سوزاں سے میرے دامنِ صحرا میں سراج
قبرِ مجنوں پہ چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ولی نے خود اپنے دہلی کے قیام کے دوران بہت کچھ اُردو شاعری کے اساتذہ سے سیکھا، جنھوں نے ولی کے اسلوبِ بیان کو بہت متاثر کیا۔ اسی لیے ولی کی شاعری میں گہرائی و داخلیت ہے، اس کی زبان صاف ستھری ہے، اور اس میں ہندی اور فارسی کا نہایت معقول و پسندیدہ امتزاج ہے [''اُردو'' از مولوی عبدالحق، ماہنامہ کارواں، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۴ء]۔

ولی کو اُردو غزل کا بانی کہا گیا ہے اور اس کے فنِ شعری کو بہت سراہا گیا ہے۔ بایں ہمہ اس کا کلام مبتذل اظہارِ جذبات سے بالکل پاک نہیں ہے۔ مثلاً :-

خوباں جہاں کے عرق عرق ہوں تو کیا عجب   جس وقت جلوہ گر ہو جمالِ گربند لعل

شمعِ بزمِ وفا ہے امرت لال
سروِ باغِ ادا ہے امرت لال

برایں ہمہ ولی کی اُردو شاعری کا بیشتر حصّہ اُردو غزل کے اعلیٰ معیار پر پُورا اُترتا ہے۔ یہ زمانہ دہلی کی بہترین اُردو شاعری کا نہ تھا جہاں تغافلی ہی کو فنِ شاعری کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں دہلی کی اُردو شاعری زیادہ سے زیادہ پہیلی کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی۔ ہر چند کہ اُس وقت کی دہلی میں اُردو شاعری چنداں باوقار نہ تھی لیکن پھر بھی وہ لکھنؤ اسکول کے اخلاق سوز اسلوب سے کہیں بہتر تھی۔ دہلی اسکول کے ابتدائی اُردو شعرا تخیل وطرزِ بیان دونوں میں اپنے لکھنوی اسکول کے معاصرین سے افضل تھے۔ مرزا مظہر جانجاناں، مضمون، حاتم اور فغاں وغیرہ اُردو شاعری کے دہلوی اسکول کے مایۂ ناز نمایندے تھے۔ ["شاعر و ناظم کی سرحدِ امتیاز"، از صبا راشدی، ماہنامہ "کنول"، آگرہ جنوری ۱۹۳۶ء]

ولی نے اُردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً غزل، قصیدہ، رُباعی، مستزاد، قطعہ اور مثنوی۔ اُس کے قصائد خوب ہیں، خصوصاً وہ جو اُس نے شہر سُورت کی توصیف میں کہا ہے۔ ولی دکن کی زبان کے مقابلے میں دہلی کے محاورات اور اسلوبِ بیان کو ترجیح دیتے تھے اور دہلوی شعرا نے اُردو غزل میں ولی کے اِسی اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی، جو ہندی اور فارسی کے نہایت خوشگوار امتزاج پر مبنی تھا۔ ولی نے اُردو غزل گوئی میں مہارت کے باعث زیادہ شہرت پائی، جو بڑی دل آویز، فکرانگیز اور اثر آفریں ہیں۔ اگر اُن کی بعض لغزشوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ولی اپنی غزل گوئی کے معاملے میں اپنے تمام دہلوی اور دکنی معاصرین سے ممتاز تھے۔ حسبِ ذیل شعر میں ولی نے خود کو گجراتی اور دکنی دونوں بتایا ہے ؎

ولی ایران و تُوران میں ہے مشہور
وطن گو اُس کا گجرات و دکن ہے

مذکورہ بالا تمام بیان کا ماحصل یہ ہے کہ ولی پیدا تو گجرات (ہند) میں ہوئے تھے لیکن اُن کی زندگی دکن میں بسر ہوئی۔ اُن کی رحلت بھی گجرات ہی میں ہوئی۔ وہ ایک صُوفی شاعر اور مولانا شاہ نورالدین سہروردی کے مُرید تھے ["آدم الشعرائے اُردو ولی گجراتی ثمّ دکنی کی شاعری"، از مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی، ماہنامہ "نیرنگِ خیال"، لاہور، سالنامہ جنوری ۱۹۲۹ء]۔

حسن اُس دلرُبا کا مُدّت سے ۔۔ عکس آئینہ خیال ہوا
اب جُدائی نہ کر، خُدا سے ڈر ۔۔ بیوفائی نہ کر، خُدا سے ڈر

میں عاشقی میں تب سے افسانہ ہو رہا ہوں — تیری نگہ کا جب سے دیوانہ ہو رہا ہوں
مُفلسی سب بہار کھوتی ہے — حُسن کا اعتبار کھوتی ہے
کیونکہ ملنا صنم کا ترک کروں — دلبری اختیار کھوتی ہے
آغوش میں آنکی کہاں تاب ہے اُس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

(۲)

سراج الدین علی خان آرزو اکبر آبادی

(۱۶۸۹ء ——— ۱۷۵۵ء)

آرزو اکبر آبادی شیخ حُسام الدین حُسام کے فرزند تھے۔ آرزو کا مدفن لکھنؤ میں ہے۔ تمام اُردو تذکرے اس امر پر متفق ہیں کہ خان آرزو ایک عالم و فاضل، خلیق و ہر دلعزیز شخص تھے۔ وہ اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں عظیم شعرائے اُردو کے اُستاد تھے۔ میر تقی میر ان کے کثیر تلامذہ میں سے ایک تھے۔ آرزو کا بہت کم کلام دستیاب ہو سکا ہے۔ اُن کی غزلیات 'مجموعۂ نغز' میں نقل کی گئی ہیں۔ آرزو کی غزل گوئی کا نمونہ درج ذیل ہے۔

یہ شان یہ غرور لڑکپن میں کچھ نہ تھا — کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے؟
جان، کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں — زندگانی کا کیا بھروسا ہے!
عبث دل بیکسی اپنی پہ تو کس ہر وقت روتا ہے — نہ کر غم، اے دِوانے، عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے
وعدے تھے سب خلاف، جو کچھ لب سے ہم سُنے — کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا

(۳)

نجمُ الدّین شاہ مُبارک آبرو اکبر آبادی

(متوفّی ۱۷۵۰ء)

آبرو مشہور صُوفی بزرگ شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کی اولاد میں تھے اور گوالیار ہی میں پیدا ہوئے تھے اُن کے ایام طفلی آگرے میں بسر ہوئے اور عالمِ شباب میں وہ دہلی آئے، جہاں وہ فوت و دفن ہوئے

وہ تقریباً پچاس سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اُن کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ آبرو خان آرزو کے رشتہ دار و شاگرد تھے۔ وہ صاحبِ دیوان تھے مگر ان کا دیوان ۱۸۵۷ء کے فسادات میں تلف ہو گیا تھا۔ آبرو نہایت پسندیدہ شخص تھے۔ گو کہ ان کا کلام سلیس تھا لیکن اس میں گہرائی نہ تھی کیونکہ آبرو لفاظی کی طرف مائل تھے (" تاریخِ زبان و ادبِ اردو، (انگریزی) از رام بابو سکسینہ)۔ اُن کا نمونۂ کلام

افسوس ہے کہ مجھ کوں وہ یار بھول جاوے — وہ شوق، وہ محبت، وہ پیار بھول جاوے
پھرتے تھے دشت دشت دِوانے کدھر گئے — وہ ہائے عاشقی کے زمانے کدھر گئے
نین سے نین جب ملائے گیا — دل کے اندر میرے سمائے گیا
تمہارا دل اگر ہم سے پھرا ہے — تو بہتر ہے، ہمارا بھی خدا ہے

(۴)

شیخ شرف الدّین مضمونؔ اکبر آبادی

(متوفیٰ ۱۷۴۵ء)

مضمونؔ ضلع آگرہ (ہند) کے قصبۂ جاجمؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ دہلی آنے کے بعد وہ اپنی تمام عمر "زینت المساجد" کے اندر رہے۔ وہ خود کو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد میں بتاتے تھے، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکّر لبوں کو مرید
کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

اگرچہ مضمونؔ بھی شاہ مبارک آبرو کی طرح خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے لیکن اُنھوں نے بھی آرزو کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ اُن کی اُردو شاعری پھیکی پھیکی تھی لیکن گاہے ماہے وہ اچھا شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ اِسی وجہ سے اُن کی چنداں شہرت نہ ہوئی۔ انتقال کے بعد وہ دہلی ہی میں دفن ہوئے اُن کے کلام کا نمونہ

چھپ کر مخالفوں سے اِس طرح آ پلنگ پر — کوئی سُنے نہ پیارے تیرے قدم کا کھٹکا!
یار کے قول کو نہیں ہے قرار — اِس پستی دل کو بیقراری ہے!

یہ میرا اشک قاصد کی طرح ایک دم نہیں تھمتا کسی بیتاب کا گویا لیئے مکتوب جاتا ہے

⑤

مرزا شمس الدّین جانجاناں مظہر اکبرآبادی

(۱۶۹۹ء ——— ۱۷۸۰ء)

مرزا مظہر کے باپ کا نام، جو شہنشاہ اورنگ زیبؒ کے ایک درباری تھے، مرزا جان تھا، اسلئے شہنشاہ موصوف نے مرزا مظہر کا نام جانِ جاں، رکھا تھا جو کثرتِ استعمال سے جانِ جاناں ہوگیا۔ مرزا مظہر خود کو حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کی اولاد میں بتاتے تھے۔ اُن کی ماں کا تعلق بیجاپور کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ مرزا مظہر مالوہ، وسطی ہند میں، کالا باغ کے مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کم و بیش سات مُغل شہنشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا اور اُن کو عشرۂ محرم ۱۱۹۵ھ ہجری مطابق ۱۷۸۰ء کے روز شہید کیا گیا تھا۔ وہ صُوفیہ کے نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بے شمار مُرید تھے جن میں ہنود بھی تھے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے صُوفی بزرگ تھے اور نہایت مُتقی و مرتاض شخص تھے۔ اُن کے تقوے کا یہ عالم تھا کہ وہ بادشاہوں کے تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ صفیر بلگرامی صاحب 'تذکرہ جلوہ خضر' نے اُن کی شہادت کی تاریخ ۷ محرم ۱۱۹۹ھ ہجری مطابق ۱۷۸۴ء اور ان کی عمر ۸۸ سال بتائی ہے۔
مرزا مظہر کے مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں :- انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، بساول لعل بیدارؔ اور خواجہ احسان اللہ بیاںؔ۔ مرزا مظہر فارسی میں صاحبِ دیوان شاعر تھے لیکن اُردو میں اُن کا دیوان نامکمل رہا۔ اُنہوں نے حاتمؔ دہلوی کے ساتھ مل کر اُردو زبان و ادب میں اصلاحات کے سلسلے میں نہایت قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کو لایعنی لفاظی سے خود بھی پاک کیا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اُن کی اُردو شاعری سادہ، سلیس، اثر انگیز اور دلفریب ہے۔ اُن کے فن شعری کا نمونہ

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے اگر ہوتا چمن اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا لیکن اِس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
اتنی فرصت دے کہ رُخصت ہولیں اے صیاد ہم مُدتوں اِس باغ کے سایے میں تھے آباد ہم
خُدا کے واسطے اِس کو نہ ٹوکو! یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

گر گُل کو گُل کہوں، تو تیرے رُو کو کیا کہوں!
بولوں نگہ کو تیغ ، تو ابرو کو کیا کہوں!

(۶)

شاہ ظہور الدین حاتم دہلوی

(۱۶۹۹ء ——— ۱۷۹۲ء)

حاتم دہلوی کی عمر قریباً ۹۳ سال ہوئی تھی مُصحفی نے حاتم کا سنہ وفات ۱۷۸۱ء بتایا ہے۔ وہ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں وفات پا کر دفن ہوئے۔ وہ سلطان اورنگ زیبؒ کے آخری ایام سلطنت میں پیدا ہوئے تھے اور اُنھوں نے شہنشاہ شاہ عالم کے دورِ حکومت میں وفات پائی۔ اِس طرح اُنھوں نے آٹھ مُغل بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ جب ۱۷۱۹ء میں دیوانِ ولی دہلی پہنچا تو حاتم پہلے دہلوی شاعر تھے جنھوں نے ولی کے اسلوبِ بیان اور طرزِ شاعری کا اتباع کیا۔ حاتم کے باپ کا نام فتح الدین تھا۔ حاتم شروع میں ایک سپاہی کی حیثیت سے نواب امیر خاں محمد شاہی کی فوج میں بھرتی تھے لیکن بعد کو وہ صوفیہ کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے جو میر بادل علی شاہ کے قبرستان میں برپا ہوا کرتی تھیں اور آخر کار وہ خود صُوفی بن گئے۔ حاتم اُردو شاعری کے دہلوی اسکول کے بانی کی حیثیت سے 'جگت اُستاد' کہلاتے تھے۔ سودا جیسے باکمال شاعر اُن کے شاگرد تھے۔ سودا کے علاوہ حاتم کے دیگر شاگردوں کے نام یہ ہیں: تاباں، لالہ مُکند رائے فارغ اور سعادت یار خاں رنگین۔ 'کلیاتِ حاتم' ضخیم ہے جس میں ہر صنفِ شاعری موجود ہے مثلاً قصاید، رُباعیات، غزلیات وغیرہ۔ اپنی زندگی کے آخر زمانے میں حاتم نے اپنے کلام کا ایک مُختصر مجموعہ مُرتب کیا جس کو اُنھوں نے 'دیوان زادہ' کہا۔ میر تقی میر نے اپنے 'تذکرہ' 'نکات الشعرا' میں حاتم کے متعلق اچھی رائے نہیں دی، لیکن دیگر تذکرے میر کی تصدیق نہیں کرتے۔ اپنے 'دیوان زادہ' میں حاتم نے اُردو زبان میں اصلاحات کی کوشش کی ہے حالانکہ اُنھوں نے خود اُن پر مکمل طور پر عمل نہیں کیا۔ مگر اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ حاتم نے اُردو زبان کو آسان و سلیس بنانے کی بڑی کوشش کی۔ حاتم کا انتقال تقریباً ۹۳ سال کی عمر میں ۱۷۹۲ء میں ہوا اور وہ دہلی دروازہ کے باہر دفن ہوئے۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر کی فرمائش پر حاتم نے قہوہ کی تعریف میں ایک مثنوی تصنیف کی تھی جس کو شمالی ہند کی اُردو میں پہلی طویل نظم سمجھنا چاہیئے۔ حاتم کا نمونۂ کلام

زندگی دردِ سر ہوئی حاتمؔ — کب ملے گا مجھے پیا میرا؟
ہائے بیدرد سے ملا کیوں تھا — آ گے آیا میرے کیا میرا
ہمیں پوچھو تو ہستی اور عدم میں کیا تفاوت ہے — جو آیا اور کوئی بزم میں ہم ٹک سرک بیٹھے
دلوں کی راہ خطرناک ہو گئی آیا! — کہ چند روز سے موقوف ہے سلام پیام

(۷)

اشرف علی خاں فغاںؔ دہلوی

(متوفی ۱۷۷۲ء)

فغاںؔ شہنشاہ احمد شاہ کے دودھ شریک بھائی اور قزلباش خاں اُمیدؔ اور علی قلی خاں ندیمؔ دونوں کے شاگرد تھے۔ انتقال کے بعد وہ عظیم آباد میں دفن ہوئے تھے۔ وہ بڑے بذلہ سنج شخص تھے اور اِسی وجہ سے اُنھیں مغل شہنشاہ سے "ظریف الملک کوکہ خان" کا خطاب ملا تھا۔ احمد شاہ دُرّانی کے حملہ سے دہلی کی تباہی کے بعد فغاںؔ ۱۷۵۴ء میں دہلی سے مُرشد آباد چلے گئے تھے جہاں اُن کے چچا ایرج خاں (یار ربیع خاں) حاکم تھے۔ مُرشد آباد سے فغاںؔ نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت میں فیض آباد (اودھ یو۔پی۔ اِنڈیا) گئے لیکن وہاں بھی نہ ٹھہرے۔ بالآخر وہ عظیم آباد گئے جہاں راجہ شتاب رائے نے اُن کی سرپرستی کی۔ اُن کا نمونۂ کلام

تیرے فراق میں کیونکر یہ دردناک جیئے؟ — مرے تو مر نہیں سکتا، جیئے تو خاک جیئے
نہ اُلفت، نہ محبت، نہ مروّت — تری خاطر کوئی بدنام کیا ہو؟
مجھسے جو پوچھتے ہو، بہرحال شکر ہے — یوں بھی گذر گئی میری، وُوں بھی گذر گئی

اُس عہد کے دیگر معروف دہلوی شعراء یہ بھی ہیں:۔ میر محمد حسین کلیمؔ۔ عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ۔ سید محمد شاکر ناجیؔ۔ غلام مصطفیٰ خاں یکرنگؔ اور احساںؔ۔

(۸)

کلیمؔ

کلیمؔ میر تقی میرؔ کے برادرِ نسبتی تھے اور اپنے کلام میں بیدلؔ کا اِتباع کرتے تھے۔ وہ دہلی ہی میں فوت ہوئے۔ اُن کا نمونۂ کلام:۔

تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہے برسات
پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال، ہم فریاد کو پہنچے

(۹)

امیر خاں انجام

انجام کے باپ شہنشاہ اورنگ زیبؒ کی جانب سے کابل کے گورنر تھے۔ انجام خود شہنشاہ محمد شاہ کی طرف سے اِلہ آباد کے حاکم تھے۔ انجام نہایت بذلہ سنج شخص تھے اور فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انجام نے اپنی زیرِ نگرانی اُردو زبان میں اصلاحات کی خاطر ایک انجمن قائم کی تھی [نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی کا خطبۂ صدارت]۔ وہ ایک عالم و فاضل شخص تھے اور عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت اور بھاشا زبانوں سے بھی واقف تھے لیکن ۱۷۴۷ء میں شہنشاہ محمد شاہ کے حکم سے اُن کو قتل کر دیا گیا تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے انجام کے قتل کی تاریخ ۱۷۴۳ء بتائی ہے اور اُن کا نام سید اسحٰق اور ان کے باپ کا نام سید میر میران لکھا ہے۔ انجام بیدل کے شاگرد اور اُردو کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

دُور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

(۱۰)

ناجی

ناجی عمدۃ الملک امیر خاں (محمد شاہی)، انجام کے داروغۂ مطبخ اور اپنی پھبتیوں اور حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے۔ انجام اور ناجی دونوں کی قبریں دہلی میں ہیں۔ اُن کا نمونۂ کلام :-

اُس کے رُخسار دیکھ جیتا ہوں   عارضی میری زندگانی ہے

نہ بیتر باغ نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دل بہار کے لئے جان مُفت جاتے ہیں

(۱۱)

غلام مصطفیٰ خان یکرنگ

غلام مصطفیٰ خان یکرنگ مرزا مظہر کے شاگرد اور محمد شاہ بادشاہ کے درباری کی حیثیت سے بڑے معزز و بااثر شخص تھے۔ وہ صاحبِ دیوان تھے۔ اُن کا نمونہ کلام:-

پارسائی اور جوانی کیونکہ ہو ایک جاگہ آگ و پانی کیونکہ ہو

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے

نہ اپنا وہ دماغ و دل رہا ہے

مُتقدمین دَورِ دوم کی خصُوصیات

ولی اور مرزا مظہر اور کسی قدر مضمون اور فغاں کے علاوہ اس دَور کے کسی اور شاعر نے اُردو کی اصلاح و ترقی میں کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دی۔ اِس طرح اُردو شاعری کا یہ دَور گویا مستقبل کی ترقی کا محض پیش خیمہ تھا۔ ولی، مرزا مظہر اور حاتم کے علاوہ کسی اور شاعر نے اُردو شاعری میں کوئی پایدار اور مؤثر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ولی نے اُردو شاعری میں بھاشا کے نہ صرف الفاظ متعارف کیے بلکہ اُنھوں نے بھاشا کے جذبات و تخیلات کو بھی اپنایا۔ ولی کے بعد اس دَور کے شعرائے نے اُردو میں بھاشا کے محض الفاظ مستعار لیے مگر اس کے جذبات کی جانب اعتنا نہ کیا اور فارسی شاعری کے خیالات و معنویت کی اپنی اُردو شاعری میں ناکام عکاسی کی۔ اُنھوں نے زبان کی سادگی، سلاست و پُرکاری کی جانب بھی بھرپور توجہ نہ کی۔ اس طرح اس دَور کی اُردو شاعری ابہام و فقدان تأثر کی شکار ہو گئی۔ بہ ایں ہمہ جب کبھی اس دَور کے اُردو شاعر نے ان نقائص سے اپنے کلام کو پاک رکھنے کی سعی کی تو اس کے کلام میں داخلیت، معنویت و پُرکاری پیدا ہو گئی۔ اس دور میں تصوف کی جانب بھی رجحان بڑھا جس میں مرزا مظہر نمایاں نظر آتے ہیں اِس طرح اِس دَور کی، ولی کے بعد، ممتاز ہستی مرزا مظہر کی تھی۔ دوسروں نے ان دونوں کی محض نقالی کی لیکن مضمون اور فغاں کسی حد تک مستثنیٰ ہیں۔ حاتم کی انفرادیت اُن کی اصلاحات زبان کے باعث تھی۔ مرزا مظہر اس دَور میں حقیقی غزل گو شاعر تھے کیونکہ ان کے کلام میں معنویت، داخلیت و اثر انگیزی ہے۔

دکنی اور شمالی ہند کی اُردو کا فرق

جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے، مُغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں آگرے میں ایک ایسی

جدید و مخلوط زبان کا خمیر تیار ہونا شروع ہو گیا تھا جسے بعد کو "اُردو" کہا گیا۔ دکن میں بھی کم و بیش ویسی ہی لسانی تبدیلی رُونما ہونے لگی تھی۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ جس زبان کو بعد کو "اُردو" کہا گیا، برج بھاشا ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور آگرہ برج کے علاقے کے اندر واقع تھا، لیکن دکن میں جس زبان نے جنم لیا اور وہ پروان چڑھ کے "اُردو" کہلائی، اُس کا کوئی تعلق برج بھاشا سے نہیں بلکہ اُس دور کی مقامی دکنی زبان سے تھا اور یہ حقیقت امیر خسرو کی "نُہ سپہر" سے واضح ہو چکی ہے کہ دکنی ایک جداگانہ زبان تھی [ماہنامہ کلیم، دہلی، اگست ۱۹۳۷ء]۔

(۶)

متوسطین دورِ سوم

از ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء

آگرہ اسکول (مع شعرائے دکن)

اُردو شاعری کا یہ دَور شہنشاہ عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء۔۱۷۵۹ء) کے انتقال اور شہنشاہ شاہ عالم ثانی آفتاب (۱۷۵۹ء۔۱۸۰۶ء) کی تخت نشینی کے وقت سے شروع اور شہنشاہ اکبر شاہ ثانی شعاع (۱۸۰۶ء۔۱۸۳۷ء) کی تاجپوشی پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی یہ دَور شہنشاہ شاہ عالم ثانی آفتاب کے عہدِ سلطنت کے اُردو شعراء پر مبنی ہے۔ اس دور کے اُردو شعراء حسب ذیل تھے :-

آگرے کے میر تقی میرؔ، میر سجاد سجّادؔ، میاں نجم الدین علی سلامؔ، اشرف الدین علی پیامؔ، میر عبد الرسول نثارؔ، خواجہ احسن اللہ بیانؔ، میر محمد باقر حزیںؔ اور شیخ بقا اللہ بقاؔ وغیرہ۔ دکن کے راجہ لچھمی نراین شفیقؔ اور صاحب اورنگ آبادی، حاجیؔ، تجلیؔ، ایمانؔ اور احسانؔ وغیرہ۔ اور دہلی کے سوداؔ، دردؔ، سوزؔ، یقینؔ، اثرؔ، ضیاؔ، میر حسنؔ، فدویؔ، تاباںؔ، بہارؔ، فراقؔ، ہدایتؔ، حسرتؔ، مخلصؔ، قاسمؔ اور قدرتؔ وغیرہ۔ نیز قائمؔ چاند پوری، آزادؔ بلگرامی، منّتؔ اور آصفؔ لکھنوی وغیرہ۔

شہنشاہ عزیز الدین شاہ عالمگیر ثانی کے بیٹے ... ابو المظفر علی گوہر شاہ عالم ثانی آفتاب دہلی میں تخت پر ۱۷۵۹ء میں بیٹھے۔ اُن کو نواب نجیب الدولہ (حاکم نجیب آباد، ضلع بجنور، یوپی، انڈیا) کے بیٹے غلام قادر روہیلہ نے ۱۷۸۹ء میں اندھا کر دیا تھا۔ ان کا ایک طویل اور مصیبت زدہ زندگی کے بعد ۱۸۰۶ء میں انتقال ہوا اور وہ حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار کے مغربی جانب دہلی میں دفن ہوئے۔ اُن کی اُردو شاعری کا نمونہ :-

صبح تو جام سے گذرتی ہے　　شب دل آرام سے گُذرتی ہے
عاقبت کی خبر خُدا جانے　　اب تو آرام سے گُذرتی ہے

لچھمی نرائن صاحب اور شفیق اورنگ آبادی اس عہد کے ایک دکنی اُردو شاعر اور تذکرہ چمنستانِ شعراء کے مصنف تھے۔ شفیق کھتری ہندو اور مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ اُن کا نمونہ کلام سے

بہار آئی جنوں نے سر اُٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

(۱)

میر محمد تقی میر اکبر آبادی

آگرے میں میر کا آبائی مکان عید گاہ کے قریب شہر کی فصیل سے باہر واقع تھا۔ میر آگرے میں، ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان کے مطابق، ۱۷۱۲ء میں، ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق، ۱۷۱۳ء میں، اور دیگر ذرائع کے مطابق، ۱۷۱۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ میر کے والد کا نام' آزاد کے اور عام رائے کے مطابق، میر عبداللہ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق، میر علی متقی، اور ڈاکٹر جسٹس سر شاہ محمد سلیمان کی تحقیق کے مطابق، میر محمد علی تھا' (مقدمہ انتخاب مثنویات میر، ص۵۔ یہ تحقیق میر کی اپنی تصنیف "ذکر میر" کے مباحث پر مبنی ہے)۔

میر کے والد ایک عالم و متقی بزرگ تھے اور میر کی سوتیلی ماں خان آرزو کی بہن تھیں۔ میر کے پہلے اُستاد اُن کے والد کے مرید سید امان اللہ تھے۔ اپنی جوانی میں میر پر دیوانگی طاری رہی تھی۔ اپنے ایک دوست میر جعفر کی وساطت سے میر کا امروہہ کے ایک شاعر سید سعادت حسین سے رابطہ قائم ہوگیا تھا جن کی ترغیب سے میر شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور جنہوں نے غالباً میر کے ابتدائی کلام کی اصلاح بھی کی تھی۔ میر کے ایامِ طفلی ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا جس کے باعث تلاشِ روزگار میں میر کو آگرے سے دہلی جانا پڑا۔ دہلی میں خواجہ محمد باسط کی وساطت سے اُن کے چچا نواب صمصام الدولہ امیر الامراء کی سرکار میں میر کو ملازمت مل گئی، جہاں اُن کو ایک روپیہ یومیہ تنخواہ ملتی تھی، لیکن اس کے کچھ عرصے کے بعد دہلی شہر نادر شاہ کے حملے میں تباہ ہوگیا اور نواب صمصام الدولہ بھی مارے گئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ میر نے خان آرزو سے کچھ فارسی اور عربی پڑھی ہو لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے کہ میر اُردو شاعری میں خان آرزو کے شاگرد تھے۔ میر خواجہ میر درد اور میر سجاد کے قائم کردہ مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے، جہاں سے میر کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اعتماد الدولہ قمر الدین خان کے

داماد اور عظیم اللہ خاں کے بیٹے رعایت خاں نے میر کو اپنا مصاحب بنا لیا۔ بعدازاں میر کچھ عرصے تک ہندوستان کے مختلف مقامات میں مارے مارے پھرتے رہے۔ لیکن بالآخر وہ دہلی کو پلٹے۔ اس دوران میں میر نے فارسی اور عربی میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ دہلی میں میر کئی اُمرا کے مصاحب بنے لیکن دہلی کے حالات سازگار نہ تھے۔ اُس زمانے میں نواب اسحاق خاں موتمن الدولہ کے بیٹے نواب سالار جنگ کے ذریعہ سے نواب آصف الدولہ نے میر کو لکھنؤ طلب کیا، جس کے لیے سالار جنگ نے خان آرزو کو لکھا اور سفر خرچ بھی بھیجا۔ چنانچہ میر لکھنؤ پہنچے۔

اس سے قبل میر دہلی سے اکبرآباد گئے تھے جہاں اُن کے بھائی عمر رضی موجود تھے لیکن تعلقات کی ناہمواری کے باعث میر کو واپس دہلی آنا پڑا اور وہ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علیخان آرزو کے پاس مقیم ہوئے، لیکن اُن کا یہ قیام بھی ناسازگار رہا۔ ان نجی پریشانیوں نے میر کے دماغی توازن کو سخت مُتاثر کیا جن کے باعث میر بالکل گوشہ نشین ہو گئے جبکہ وہ رات دن ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑے رہتے تھے۔

میر کی اُردو شاعری سہل ممتنع، سادہ، آسان، سنجیدہ، باوقار، اثر انگیز، اور داخلی جذبات سے لبریز ہے۔ اس میں گہری معنویت کے ساتھ غم و اندوہ کی کارفرمائی ہے۔ میر کے کلام میں ہر صنفِ شعری پر طبع آزمائی موجود ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ اور قطعہ وغیرہ۔ میر کے کلام کا سودا کے کلام سے موازنہ کرنا غلط ہے۔

اگرچہ مثنوی میں میر حسن میر تقی میر پر فائق تھے اور قصیدے میں سودا میر پر بازی لے گئے تھے لیکن اُردو غزل میں آج تک کوئی شاعر میر کی بلندیوں کو نہ چھُو سکا۔ یہ کہانی کہ دہلی سے لکھنؤ آنے کے بعد میر ایک سرائے میں ٹھیرے تھے اور پھر ایک مشاعرے میں اپنے ایک قطعہ کے ذریعہ سے خود کو اہلِ لکھنؤ سے مُتعارف کیا تھا غیر مُستند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ پہنچنے کے بعد میر سالار جنگ کے مکان پر قیام پذیر ہوئے تھے اور اُنہی کے توسل سے وہ نواب آصف الدولہ کے دربار میں باریاب ہوئے تھے۔ میر ایک نہایت سادہ، سنجیدہ اور منکسر المزاج شخص تھے۔ میر اُردو زبان کے اُستاد فارسی سے کما حقہٗ واقف اور عربی زبان سے بخوبی آشنا تھے۔ اس کی سند ان کی نثری تصانیف (ذکرِ میر۔ فیضِ میر اور نکات الشعرا) سے ملتی ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ میر دس گیارہ سال کی عمر کے تھے کہ آگرے میں ان کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اُنھیں دہلی آنا پڑا، جہاں اُنھیں راجہ نگر مل کے یہاں نوکری مل گئی۔ میر کی زندگی

متواتر و مسلسل آزمائشوں سے دوچار رہی اُس پر دہلی کی سیاسی افراتفری مُستزاد تھی۔ ان مصائب و آلام نے میر کی شاعری کو بہت متاثر کیا اور اس پر غم انگیزی و اضطراب مستولی ہو گئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد خان آرزو، سودا اور میر سوز کی طرح میر بھی ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہنچے جبکہ وہاں نواب آصف الدولہ کی حکمرانی تھی۔ لکھنؤ میں میر صاحب کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نواب وزیر نے میر صاحب کا ماہانہ مشاہرہ دو سو روپیے مقرر کیا اور انھیں اپنی مصاحبت سے نوازا۔ میر لکھنؤ ہی میں ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے اور میاں الماس کے امام باڑے کی چار دیواری کے اندر دفن ہوئے۔ میر کے تلامذہ حسب ذیل تھے:۔ میاں عبدالرسول نثار اکبرآبادی، میاں گلشن، محمد محسن، مجنوں، مشتاق، نزار، میاں شکیبا اور لالہ بندرابن راقم متھرادی (بعض تذکرہ نویسوں نے راقم کو میر کا نہیں بلکہ سودا کا شاگرد بتایا ہے۔ خمخانۂ جاوید، جلد سوم، تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ قدرت، اور نکات الشعراء وغیرہ) مذکورہ بالا شعرا میں کوئی بھی میر کا جانشین ثابت نہ ہوا۔ راقم کا نمونۂ کلام ہے

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

عبدالرسول نثار کا نمونۂ کلام ہے

ہات سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم
یہ گریباں دامنِ صحرا کو دکھلاویں گے ہم

میر کی تصانیف میں ان کی کلیات ہے، اُن کی فارسی شاعری کا دیوان ہے اور چھ دیوان اُن کی اُردو شاعری کے ہیں۔ وہ تذکرۂ نکات الشعراء اور دو نثری تصانیف فیض میر، اور ذکر میر کے بھی مالک ہیں۔

میر کے واحد بیٹے میر محمد عسکری المعروف بہ میر کلّو عرش لکھنؤ میں بڑی عسرت میں رہے۔ میر کلّو کی ایک ہی بیٹی تھی جن کا بیٹا خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی (مصنف تذکرۂ آبِ بقا) کے مطابق لکھنؤ میں یکہ ہانکتا تھا۔ میر کلّو عرش کے شاگردوں کے نام یہ ہیں: شیخ فدا علی عیش لکھنوی، منشی سرفراز علی قمر لکھنوی، شاد پیر وغیرہ اور فلک وغیرہ۔ صفیر بلگرامی نے عرش کو ناسخ کا شاگرد بتایا ہے، جو غلط ہے کیونکہ عرش ہمیشہ ناسخ کے مخالف رہے۔

میر کے اشعار میں غضب کی غنائیت ہے اور اُن کا اسلوب شعری مسحور کن ہے۔ اُن کی غزلیں اور مثنویاں اُردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں۔

اُس وقت سے لے کر آج تک تمام شعرائے اُردو نے غزل کے شاعر کی حیثیت سے میر کی فضیلت کو تسلیم کیا ہے۔ میر نہایت قانع، خوددار اور زود رنج شخص تھے اور ہمیشہ خود کو لیئے دیئے رہتے تھے۔ اُن کو بجا طور پر "اُردو غزل کا ابوالآبا" کہا گیا ہے۔ وہ بلا شک اُردو شاعری کے غیر متنازعہ فیہ اُستاد تھے ["شعر الہند" از مولوی عبدالسلام ندوی]۔

میر اوسط قد کے ایک دُبلے پتلے شخص تھے اور ان کا رنگ گندمی تھا۔ وہ بڑے با وقار، سنجیدہ و بُردبار السان تھے۔ وہ کم گو تھے اور آہستہ بولتے تھے۔ وہ زود رنج تھے اور یاوہ گوئی سے مُتنفر۔ وہ ایک پُرگو اور نہایت شائستہ شاعر تھے۔ آزاد نے میر کو واسوخت کی صنف کا بانی کہا ہے۔ شمس العلماء حکیم سید امداد امام اثرؔ عظیم آبادی (مصنف "کاشف الحقائق") کے مطابق، غزل گوئی میں میر کی بے مثال انفرادیت آج تک قائم ہے، جو خلوص و صداقت پر مبنی تھی۔ اُنھوں نے حسن و محبت سے متعلق اپنے ذاتی تجربات کو اِس پُرکاری، فنی مہارت و اثر اندازی کے ساتھ اپنے اشعار میں بیان کیا ہے کہ وہ شاعری نہیں ساحری معلوم ہوتی ہے اور عالم گیر جاذبیت کی حامل ہے۔ آزاد نے میر کو "اُردو غزل کا سعدی" کہا ہے اور اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ["مختصر تاریخ ادبِ اردو" از پروفیسر اعجاز الہ آبادی۔ ماہنامہ "نیساں"، سالنامہ ۱۹۲۴ء۔ ماہنامہ "ہمایوں"، جولائی ۱۹۲۶ء۔ ماہنامہ "نگار"، نومبر ۱۹۲۶ء۔ ماہنامہ "مُرقع"، مارچ اور جون ۱۹۲۷ء۔ ماہنامہ "ایوان"، دسمبر ۱۹۲۴ء اور "مقدماتِ عبدالحق" جلد اوّل، حصہ دوم، ۱۹۲۱ء]۔ میر کے کلام کا نمونہ

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان، پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اُسکے گئے — ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
ابتدائے عشق ہے، روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
اب کرکے فراموش تو ناشاد کروگے — پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا — پڑھتے کسی کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دھُنیے گا
سراپا میں جس جا نظر کیجیے — وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
ایسے جُنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا؟ — چھوڑا وفا کو اُن نے، مُروّت کو کیا ہوا!

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا، اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

(۲)

میر محمد سجاد سجّاد اکبر آبادی

سجّاد کے والد کا نام میر محمد اعظم اکبر آبادی تھا۔ سجّاد اُردو شاعری میں شاہ مبارک آبرو اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ سجّاد مستقلاً دہلی میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

بُتوں کی بھی یہ یاد دو روز ہے
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

(۳)

شرف الدین علی پیام (م۔ ۱۱۵۷ھ)

پیام خان آرزو کے شاگرد تھے اور دہلی میں بس گئے تھے۔ قائم چاندپوری نے لکھا ہے :۔ "نظم ہائے رنگین و نثر ہائے متین دارد"۔ اُن کا نمونہ کلام :۔

دِلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے کام عُشّاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

(۴)

میر نجم الدین علی سلام

سلام میر شرف الدین علی پیام اکبر آبادی کے بیٹے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

حدیثِ زُلف چشمِ یار سے پُوچھ
درازی رات کی بیمار سے پُوچھ

(۵)

خواجہ احسان اللہ بیان

بیان مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ دیگر اکبر آبادی شعراء کی طرح وہ بھی آگرے سے دہلی آگئے تھے پھر وہ دہلی سے حیدر آباد (دکن) چلے گئے تھے، جہاں ۱۱۹۸ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کا نمونۂ کلام :۔

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹا روز، گذر جائے گی شب بھی

(۶)

میر محمد باقر حزیںؔ (م- ۱۱۶۵ھ)

حزیںؔ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ وہ دہلی سے نقل سکونت کرکے عظیم آباد چلے گئے تھے جہاں ان کی سرپرستی نواب صولت جنگ نے کی تھی۔ حزیںؔ کا نمونۂ کلام ؎

کچھ کہا شاید اُس نے قاصد سے
دل پہ میرے وہ اضطراب نہیں

(۷)

شیخ بقاء اللہ بقاؔ

بقاؔ حافظ لطف اللہ خوشنویس عیش کے بیٹے تھے۔ بقاؔ مرزا فاخر مکیں کے فارسی میں اور شاہ حاتم اور بعد ازاں میر درد کے ریختہ میں شاگرد تھے۔ بقاؔ کا وطن مالوف تو آگرہ تھا لیکن وہ پیدا دہلی میں ہوئے تھے۔ وہ لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں ان کا ۱۷۹۱ء میں انتقال ہوا۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

رکھتا ہے یوں وہ زلفِ سیاہ فام دوش پر
صیاد جس طرح سے رکھے دام دوش پر

دہلی اسکول

(۸)

میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی

ضیاؔ شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت میں فیض آباد آئے جبکہ دہلی تباہ ہو چکی تھی، اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ سے ضیاؔ عظیم آباد (غالباً ۱۷۶۱ء میں) گئے جہاں راجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر راجہ نے ان کی سرپرستی کی۔ ضیاؔ عظیم آباد ہی میں فوت ہوئے ان کا نمونۂ کلام ؎

بھول کر بھی ہمیں نہ یاد کیا!
ہم تیرے جی سے ایسے بھول گئے

(۹)

لالہ مکند لال فدوی لاہوری

فدوی پنجاب کے ایک ہندو بنیے کے بیٹے تھے۔ وہ اسلام قبول کرکے دہلی میں آ بسے تھے، جہاں وہ 'مرزا بھچو' کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ وہ نواب ضابطہ خاں نجیب آبادی کی سرکار سے وابستہ تھے۔ پہلے وہ شاہ صابر علی کے شاگرد ہوئے تھے، پھر اُنھوں نے شاہ مبارک آبرو کی شاگردی اختیار کرلی۔ فدوی نے سودا کی ہجو لکھی تھی جس کا سودا نے جواب دیا تھا۔ نواب ضابطہ خاں کی فرمائش پر فدوی نے جامی کی فارسی مثنوی 'یوسف زلیخا' کا منظوم اُردو ترجمہ کیا تھا۔ فدوی آنولہ گئے تھے جہاں ان کی ملاقات مصحفی سے ہوئی تھی۔ وہ کچھ مدت تک ٹانڈے کے نواب محمد یار خاں کی ملازمت میں بھی رہے تھے۔ فدوی مُرادآباد میں فوت ہوئے۔ مصحفی نے اپنے 'تذکرۂ ہندی' میں، مصنف 'تذکرۂ گلزارِ ابراہیم' نے، نیز قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرے میں، تینوں نے، فدوی کی بدچلنی پر تعریض کی ہے۔ فدوی کا نمونۂ کلام ؎

تیری ہم نے تاثیر بس آہ دیکھی
نہ آیا وہ کافر بہت راہ دیکھی

(۱۰)

میر عبدالحیٔ تاباں دہلوی

تاباں میر علی حشمت شہید کے شاگرد تھے (نکات الشعراء)، لیکن 'شعر الہند' اور 'گلشن ہند' کے مطابق، وہ سودا کے شاگرد تھے، مگر عام طور پر وہ شاہ حاتم کے شاگرد مشہور ہیں۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

کہتے ہیں اثر ہوگا روتے ہیں، یہ ہیں باتیں
ایک دن بھی نہ یاد آیا، روتے ہی کاٹیں راتیں

(۱۱)

لالہ ٹیک چند بہار (م ۔ ۱۱۸۰ھ)

بہار خان آرزو کے شاگرد تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

نہیں معلوم کیا حکمت ہے شیخ اِس آفرینش میں
ہمیں ایسا خرابا تی کیا، تجھ کو مُناجاتی

(۱۲)

حکیم ثناء اللہ فراق

فراق حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت کے بھتیجے اور میر درد کے شاگرد تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

دل تھا مِتا کہ چشم پہ کرتا تیری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

(۱۳)

حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت

ہدایت میر درد کے شاگرد تھے اور ۱۸۰۰ء میں دہلی میں فوت ہوئے تھے۔ میر قدرت اللہ خاں قاسم ان کے معروف شاگرد تھے۔ ہدایت کا نمونۂ کلام ؎

ایک دن بھی مہرباں نہ وہ بے وفا ہوا
اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

(۱۴)

مرزا جعفر علی حسرت (م - ۱۲۰۶ھ)

حسرت ابوالخیر عطار کے بیٹے اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصے تک فیض آباد میں مقیم رہ کر، حسرت لکھنؤ واپس آئے اور اکبری دروازے میں اپنے باپ کی دکان میں کام کرتے رہے۔ اُن کا ۱۸۰۲ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہ مُفتی گنج میں دفن ہوئے۔ اُن کا نمونۂ کلام ؎

تمہیں غیروں سے کب فرصت، ہم اپنے غم سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

(۱۵)

رائے آنند رام مخلص

مخلص فارسی میں مرزا بیدل کے اور ریختہ میں خان آرزو کے شاگرد تھے۔ وہ نواب وزیر اعتماد الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام ؎

آنے کی دُھوم کس کی گلزار میں پڑی ہے
ہاتھوں میں اپنے پیالہ نرگس یہ کھڑی ہے

(۱۶)

حکیم قدرت اللہ خاں عباسی قاسم

قاسم ایک تذکرۂ شعرائے اردو کے مصنف اور درد کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۳۰ء میں فوت ہوئے تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام ؎

وہ آئے بغل میں کہیں یا جی ہی نکل جائے
مٹ جائے کسو طرح تو یا رب خلش دل

(۱۷)

میر قدرت اللہ قدرت

قدرت میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے اور مرشد آباد میں ۱۷۹۰ء میں فوت ہوئے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

تو کیا سماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکر گذرے ہے
بہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پُر خوں ہے

(۱۸)

مرزا محمد رفیع سودا

سودا دہلی کے ایک تاجر مرزا محمد شفیع کابلی کے فرزند تھے۔ سودا دہلی میں ۱۷۱۳ء میں پیدا ہوئے

تھے اور فارسی اور عربی دونوں زبانوں سے واقف تھے ۔ وہ پہلے ایک فارسی شاعر تھے اور سلیمان قلی خاں داؤد (یا وداد) کے شاگرد تھے، لیکن خان آرزو کی ترغیب سے شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کر کے ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے ۔ سودا نے اتنی شہرت پائی کہ شہنشاہ شاہ عالم بھی انھیں اپنا کلام دکھانے لگے لیکن کسی وجہ سے سودا ناراض ہو کر شاہی دربار سے الگ ہو گئے اور پھر کبھی اس سے منسلک نہیں ہوئے دہلی میں اس عسرت کے زمانے میں دو امرا مہربان خاں اور دوست خاں نے سودا کی مدد کی ۔

دہلی کی تباہی کے بعد، سودا فرخ آباد چلے گئے جہاں وہ نواب بنگش احمد خاں غالب جنگ کے دیوان مہربان خاں رند کے پاس ٹھیرے ۔ فرخ آباد سے سودا فیض آباد چلے گئے جہاں نواب شجاع الدولہ نے ان کی خاطر مدارات کی ۔ نواب آصف الدولہ کی حکومت کے عہد میں سودا فیض آباد سے لکھنؤ گئے ۔ جہاں وہ شاہ اودھ کے درباریوں میں شامل ہو گئے اور مرزا فاخر مکین کے ساتھ ادبی جنگ آزمائی کرنے لگے ۔ سودا کی وفات لکھنؤ میں ۱۷۸۱ء میں ہوئی اور وہ آغا باقر کے امام باڑے کے اندر دفن ہوئے ۔ ان کے شاگرد حسب ذیل تھے :-

میاں معین ہاشم، ماہر، مرزا عظیم بیگ عظیم اور میر امانی اسد وغیرہ، عبدالحی تاباں ان کے بہترین شاگرد تھے ۔ سودا، نہایت گرم مزاج شخص تھے اور تنقید بالکل برداشت نہیں کرتے تھے ۔ جب وہ کسی سے ناراض ہوتے تھے تو فوراً اس کے خلاف ایک ہجو نظم کر ڈالتے تھے ۔ بہ ایں ہمہ وہ ایک نہایت نامور اور باکمال اردو شاعر تھے ۔ انھوں نے تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے ۔ لیکن قصیدہ اور ہجو گوئی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ۔ سودا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور اظہار خیال کے لیے الفاظ ہاتھ باندھے ان کے روبرو صف بستہ کھڑے رہتے تھے ۔ فارسی استعارات و محاورات کی بھی ان کے ہاں بہتات تھی ۔ ان کی کلیات شائع ہو چکی ہے ۔ ہر چند کہ تغزل میں میر ان پر فائق ہیں لیکن قصیدے میں ان پر کوئی بازی نہیں لے جا سکا ۔ سودا نے مرثیہ نگاری کو غزل کے احاطہ سے نکال کر مربع کی تشکل دی اور اس کے مضامین کو وسیع تر کر دیا جس کے باعث اردو مرثیہ ایک عظیم صنف شاعری بن گیا ۔ غرضیکہ مجموعی طور پر سودا ایک عظیم المرتبت اردو شاعر تھے ۔ ان کا نمونۂ کلام

قطعہ :-

دل سے پوچھا میں یہ کہ عشق کی راہ ۔۔۔ کس طرف مہربان پڑتی ہے ؟
کہا ان نے کہ نہ تو ہندوستاں ۔۔۔ نہ سوئے اصفہان پڑتی ہے
یہ دو راہا جو کفر و دیں کا ہے ۔۔۔ دونوں کے درمیان پڑتی ہے

ہر چند کہ سودا کی اُردو شاعری میں استادی مُسلّم ہے۔ لیکن مثنوی میں اُن کا مقام میر حسن اور میر تقی میر سے نیچے ہے اور غزل میں میر اور مصحفی کے بعد ان کی ہجویں ہر چند کہ اُردو شاعری کے شہ پارے ہیں لیکن ان کے باعث قصیدہ نگاری کی صنف میں ان کے وقار شاعری کو سخت ٹھیس لگی۔ سودا کی بعض غزلیں مثالی حیثیت کی حامل ہیں۔

جب تک میر اور سودا دلی میں رہے ان کے تعلقات باہمد گر نہایت خوشگوار تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ صورت لکھنؤ آکر باقی نہ رہی۔ ان کے بعد سے یہ کچھ دستور سا ہو گیا کہ ہر آنے والے دور شاعری میں ایک بڑا اُردو شاعر دوسرے بڑے شاعر کا مدمقابل بن گیا اور اس طرح ایک طرح کا ادبی محاذ جنگ قائم ہو گیا۔ کسی کا یہ قول نقل کرنے کے قابل ہے کہ ہر دور شاعری میں ایک فطری اُردو شاعر کی ایک غیر فطری متشاعر نے مخالفت کی ہے۔ یہ افسوسناک سلسلہ میر اور سودا سے شروع ہوا تھا۔ ان کے بعد یہ روایت مصحفی اور انشاء، آتش اور ناسخ، غالب اور ذوق، انیس اور دبیر اور داغ اور امیر نے قائم رکھی مگر انشاء، ناسخ، ذوق، دبیر اور امیر کی طرح سودا کو بھی متشاعر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اگر غزل میں میر کی فوقیت مُسلّم ہے تو قصیدے میں سودا کو تمام دیگر اُردو شعراء پر برتری حاصل ہے۔ میر کی یہ برتری سودا پر اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ یہ موازنہ مثنوی کی صنف میں بھی کیا جاتا ہے کیونکہ میر کو غزل کی طرح مثنوی میں بھی سودا پر فضیلت حاصل تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں مثلاً مُصنفِ گلشن بیخار، اور مولانا سید علی حیدر طباطبائی نے اپنی شرح دیوانِ غالب میں سودا کی غزل گوئی کو بھی سراہا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے تو میر بھی بعض اوقات بڑی بلندیوں سے بہت نیچے گر گئے ہیں اس کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند"۔ اس عہد کی اُردو شاعری میں ایک نہایت معیوب و اخلاق سوز اظہار خیال لواطت سے متعلق تھا جس سے میر کا دامن بھی نہیں بچا۔ بہ ایں ہمہ میر کو غزل گوئی میں سودا پر سبقت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ میر قصیدہ گوئی میں ناکام تھے۔ گو یہ صحیح ہے کہ اُن کا پایہ قصاید میں سودا سے کم تر تھا (شعر الہند، حصّہ اول، باب اوّل۔ میر و مرزا، صفحات ۴۷۔ ۶۶۔ ماہنامہ زمانہ، جولائی ۱۹۲۰ء۔ ماہنامہ نیساں، سالنامہ ۱۹۲۴ء)۔

(۱۹)

خواجہ میر درد

درد کے باپ خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ

سے ملتا تھا۔ دردؔ دہلی میں غالباً ۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شاعری اور تصوف دونوں اُنھیں ورثہ میں ملے تھے۔ اپنی جوانی میں دردؔ نے ... تصنیف کی تھیں یعنی 'احکام الصلوٰۃ'، اور 'وارداتِ دردؔ'۔ وہ فارسی اور اُردو شاعری دونوں میں صاحبِ دیوان تھے۔

نواب سید امداد امام اثرؔ مصنف 'تذکرہ کاشف الحقایق' کے مطابق دردؔ کی غزلوں میں بھی میرؔ کے کلام کی سی جاذبیت و داخلیت موجود ہے مگر ان میں میرؔ کی غزلوں کا سا تاثر پایا نہیں جاتا۔ بقول آزاد دردؔ نے اُردو غزل میں جس طرح تجرباتِ تصوف کو سمویا ہے، وہ بات کوئی اور اُردو شاعر اپنے کلام میں پیدا نہ کرسکا۔ اگرچہ دردؔ کا اُردو دیوان مختصر ہے لیکن وہ خاصے کی چیز ہے۔ دردؔ کے کلام میں وقار، رفعت، پاکیزگی و بلند خیالی ہے۔ اُن کا انتخاب الفاظ بھی خوب ہے۔ اُنھوں نے مادی کے برعکس عشقِ حقیقی کی عکاسی کی ہے۔ ان کی غزلیں مختصر، لیکن مؤثر ہیں۔ آسان بحروں میں دردؔ نے جو چھوٹی چھوٹی غزلیں کہی ہیں ان میں بقول آزاد خنجر پوشیدہ ہیں جن میں تلواروں کی سی کاٹ ہے۔ دردؔ کی اُردو غزلیات اپنے صوفیانہ خیالات، سنجیدگی، انکساری، غم واندوہ اور دل شکستگی کے جذبات کے باعث ممتاز ہیں۔

دردؔ کا دہلی میں ۱۷۸۴ء میں انتقال ہوا اور وہ ترکمان دروازے کے باہر دفن ہوئے۔ اُن کے تلامذہ میں خود اُن کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ تھے، نیز حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ، حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ، حکیم ثنا اللہ خاں فراقؔ، اور میر محمدی بیدارؔ وغیرہ بھی ان کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ دردؔ کا نمونۂ کلام:-

مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہو گئے — اب گاہ گاہ بوسہ بہ پیغام رہ گیا

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی — ایک بھی اُن سے ملاقات نہ ہونے پائی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

میں جاتا ہوں دل کو تیرے پاس چھوڑے — میری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

اُن نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں — پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

خواجہ میر دردؔ کا خاندان دہلی میں تصوف کے باعث ممتاز و مؤقر تھا اور ان کے متعدد مرید تھے۔ میر دردؔ کو اس معاملے میں امتیاز حاصل ہے کہ وہ دہلی کی تباہی کے بعد دوسروں کی طرح، انتہائی صبر آزما حالات میں بھی، دہلی چھوڑ کر کہیں باہر نہیں گئے۔ دردؔ دہلی میں شاہ گلشن کے خلیفہ اور چشتیہ سلسلۂ تصوف میں سجادہ نشیں تھے۔ اُنھوں نے اپنی پوری زندگی دہلی میں اپنی خانقاہ میں گذار دی۔ دردؔ کو فنِ موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ اُن کے غربت کدے پر جو پندرہ روزہ مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں شہر کے بڑے عمائدین حتیٰ کہ گاہے ماہے خود شہنشاہ شاہ عالم ثانی شریک ہوا کرتے تھے۔ دردؔ نے تصوف پر

بعض رسائل بھی لکھے تھے [خم خانۂ جاوید، جلد سوم ۔ میر درد] ۔

(۲۰)

سیّد محمد میر سوز

سوز دہلی میں قریباً ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے والد کا نام میر ضیاء الدین تھا ۔ سوز کے آباؤ اجداد بخارا کے باشندے تھے ۔ سوز شروع شروع میں میر تخلص کیا کرتے تھے ۔ ۱۷۵۶ء میں سوز دہلی سے مہربان خاں رند کے پاس فرخ آباد گئے تھے، جہاں سے وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے ۱۷۷۷ء میں مرشدآباد گئے ۔ ۱۷۹۰ء میں سوز واپس لکھنؤ چلے گئے اور اس کے ایک سال کے بعد وہ فوت ہوگئے یہ بات ہنوز غیر مستند ہے کہ سوز اُردو شاعری میں نواب آصف الدولہ کے اُستاد تھے ۔ اُن کے معروف شاگرد حسبِ ذیل تھے :۔

مرزا رضا قلی خاں آشفتہ ، میر شمس الدین ہوش اور مرزا حسین رضا عیش وغیرہ ۔ سوز کا کلام اپنی سادگی کے باعث مُمیّز ہے ۔ ان کے اسلوب میں کوئی تصنع ، تعلّی یا مبالغہ نہیں ۔ وہ فطری ، مؤثر و شیریں ہے اُنھوں نے محاورات و ضرب الامثال نہایت برجستہ استعمال کئے ہیں ۔ ان کی شاعری زندگی سے بہت قریب ہے اور اس میں بڑی صداقت ہے ۔ وہ دُور از کار تشبیہات و استعارات نیز دشوار فارسی اصطلاحات سے گریز کرتے ہیں [ماہنامہ نگار، لکھنؤ ۔ نومبر ۱۹۲۴ء] ۔ ان کا نمونۂ کلام

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی میرے اللہ نئی

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یا رب ، رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہوگیا

ہوا دل کو میں کہتا کہتا دوانا
پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا

یار اغیار ہو گئے ہیہات
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

گاہ گاہ سلام ہوتا ہے
پر وہ باتیں کہاں ، وہ پیار کہاں

(۲۱)

سیّد محمد میر اثر

اثر خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے اور خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے ۔ وہ دہلی ہی میں پیدا ، فوت و دفن ہوئے ۔ وہ تصوّف و شاعری دونوں میں اپنے بڑے بھائی میر درد کے مُتبع

تھے ۔ اثرؔ اپنی اردو مثنوی "خواب و خیال" کے باعث بہت مشہور ہیں ۔ ان کی وفات غالباً ۱۹۲۴ء سے قبل ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اثرؔ کا دیوان شائع کیا ہے ۔ اثرؔ کی اردو شاعری بہت کچھ دردؔ کی شاعری کی طرح سادہ و آسان ہے مگر اس میں دردؔ کے کلام کا سا تیکھا پن نہیں ۔ بقول مولوی عبدالحق ، اثرؔ کے کلام میں غنائیت کے بجائے مکالمہ کی سی کیفیت زیادہ ہے ۔ اثرؔ کا دیوان مختصر ہے اور اُن کی اکثر غزلوں کی بحر بھی چھوٹی ہے ۔ بقول مجنوںؔ گورکھپوری ، اثرؔ کے کلام کی خصوصیت اصلیت ، تازگی ، صداقت اور ایک نایاب نوعیت کی وارفتگی و سپردگی ہے [ماہنامہ "ایوان" ، گورکھپور جنوری ۱۹۲۱ء ، ماہنامہ "نگار" نومبر ۱۹۲۶ء ، مقدمات عبدالحق ، جلد دوم ۱۹۳۱ء] ۔ اثرؔ کے کلام کا نمونہ :

واقعی کون کسکو چاہے ہے ۔۔۔ ہر کوئی وہم میں نیا ہے ہے
بیوفائی پہ تیری جی ہے فدا ۔۔۔ قہر ہوتا جو باوفا ہوتا !
ہمیں حیرت ہے آپ تجھکو دیویں کیا جواب اسکا ۔۔۔ کہ تجھ بن اب تلک کس طرح ہم نے زندگانی کی ؟
دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا ؟ ۔۔۔ دشمنی پر تو پیار آتا ہے
بیوفا تیری کچھ نہیں تقصیر ۔۔۔ مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا ۔۔۔ جب تجھے ڈر کے ایک نظر دیکھا

(۲۲)

شیخ محمد قیام الدین قائمؔ

قائمؔ چاندپور ضلع بجنور (روہیلکھنڈ یوپی ، انڈیا) کے باشندے تھے لیکن ان کی زندگی بیشتر دہلی میں گذری ۔ وہ شروع میں میر دردؔ کے شاگرد ہوئے لیکن پھر اُنھوں نے مرزا سوداؔ کا تلمذ اختیار کر لیا ۔ قائمؔ کے باپ کا نام علی تھا ۔ دہلی کی تباہی کے بعد غالباً ۱۷۵۶ء میں قائمؔ نواب فیض اللہ خاں والئ ریاست رامپور کے بھائی نواب محمد یار خاں والئ ٹانڈہ کے پاس چلے گئے جنہوں نے قائمؔ کا ماہانہ مشاہرہ سو روپے مقرر کر دیا ۔ لیکن جب مرہٹوں کے حملے کے باعث محمد یار خاں کو ٹانڈہ چھوڑ کر رامپور جانا پڑا تو قائمؔ بھی اُن کے ہمراہ تھے ۔ اس طرح قائمؔ بھی رامپور میں ۱۷۹۵ء میں فوت ہوئے ۔ اُنہوں نے ۱۷۵۵ء میں فارسی زبان میں اپنا اردو شعراء پر تذکرہ "مخزن نکات" تصنیف کیا تھا ۔ قائمؔ ریختہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں ۔ وہ صاحب دیوان تھے ۔ اُن کی اردو شاعری سلیس و سادہ ہے ۔ اُنھوں نے تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُنھیں زیادہ کامیابی غزل اور مثنوی میں ہوئی ۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے ان کے دیوان کا انتخاب

شائع کیا تھا۔ قایم کے دیوانِ اُردو کا ایک اور انتخاب "ممتاز اشعار" کے نام سے نواب عماد الملک بلگرامی نے شائع کیا تھا جس کو مدراس یونیورسٹی نے اپنے نصابِ اُردو میں شامل کر لیا تھا۔ قایم کا نمونۂ کلام

گو ہم سے تم ملے نہ، تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی، اور دن گذر گئے
قبول عذر تو واں ہو، جہاں ملال بھی ہو — بجانِ پاک صفایاں، جو کچھ خیال بھی ہو
ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج — اِس حکایت سے جی بہلتا ہے
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — رُوٹھا تھا آپ تجھ سے میں، اور آپ من گیا

(۲۳)

نواب انعام اللہ خاں یقینؔ

یقینؔ نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے اور مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ اُن کا خاندانی رشتہ مُغل شہنشاہوں سے تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ایک نفیس انسان تھے مگر افیون کھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ ایک کامیاب اور خوشگو اُردو شاعر تھے۔ اگر وہ زیادہ جیتے تو یقیناً اُردو شاعری میں قابلِ قدر اضافہ کرتے، مگر افسوس کہ وہ ۱۷۸۹ء میں کسی سنگین جرم کی پاداش میں خود اپنے باپ کے حکم سے شہنشاہ شاہ عالم کے دورِ سلطنت میں قتل کر دئے گئے جبکہ ان کی عمر بمشکل ۲۵ سال تھی۔ بعض مؤرخین نے یقینؔ کو اُردو شاعری کا کیٹس KEATS کہا ہے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی کے مطابق اُن کی قبر لکھنؤ میں ہے ["تذکرۂ آبِ بقا"]۔

پروفیسر اعجاز الہ آبادی نے اپنی "مختصر تاریخ ادبِ اُردو" میں یقینؔ کا سنہ وفات ۱۷۵۵ء لکھا ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ یقینؔ کا کلام نہایت دلکش و شیریں ہے اور اس میں بلا کی غنائیت ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے یقینؔ کے کلام کی اس خصوصیت کو بہت سراہا ہے [دیباچۂ دیوانِ یقینؔ ص۱۲، دیوانِ یقینؔ (مسودہ انڈیا آفس لائبریری، لندن) از سیّد محی الدین قادری زورؔ حیدر آبادی، ماہنامۂ "نگار" لکھنؤ جون ۱۹۲۸ء، "یقینؔ" از عرشؔ فاروقی، ماہنامہ "نگار"، فروری ۱۹۲۹ء]۔ یقینؔ کے دیوان کی یہ خصوصیت قابلِ لحاظ ہے کہ اس میں صرف ۰۰ ، ا غزلیات ہیں اور ہر غزل میں محض پانچ اشعار ہیں۔ اُن کا نمونۂ کلام

سچ کہو اے بُلبُلو! کس باغ سے آتی ہو تم؟ — ہے ہمارے بھی نہیں کچھ آشیانے کی خبر؟
تیری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت؟
دل چھوڑ گیا ہم کو، دلبر سے توقع کیا — اپنے نے کیا یہ کچھ، بیگانے کو کیا کہئے

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو　　کیا عیش کر گیا ہے ظالم دِوانے پن میں

(۲۴)

میر غلام حسن حسنؔ

حسنؔ میر غلام حسین ضاحکؔ کے بیٹے تھے اور دہلی میں ۱۷۲۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اجداد کا وطن ہرات (افغانستان) تھا۔ ان کے باپ ضاحکؔ بھی اچھے شاعر تھے لیکن انھوں نے اپنی شاعرانہ توانائی ہجو بازی میں ضائع کر دی تھی۔ اِس ضمن میں ان کی سوداؔ کے خلاف معرکہ آرائی مشہور ہے۔ حسنؔ نے پہلے اپنے باپ کی شاگردی اختیار کی مگر پھر اُنھوں نے میر دردؔ کا تلمذ اختیار کر لیا۔ لیکن لکھنؤ آنے کے بعد وہ میر ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد ہو گئے۔ مگر جلد ہی اُنھوں نے ضیاؔ، کا اسلوب شاعری ترک کر دیا اور میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کے اسالیب شاعری کی پیروی کرنے لگے۔ حسنؔ اپنی جوانی میں اپنے باپ میر ضاحکؔ کے ساتھ دہلی سے فیض آباد آ گئے تھے۔ جب نواب آصف الدولہ نے مستقر حکومت فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل کیا تو حسنؔ بھی لکھنؤ آ گئے اور نواب سالار جنگ کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ حسنؔ کا انتقال لکھنؤ میں ۱۷۸۶ء میں ہوا اور وہ محلہ مفتی واڑہ میں قاسم علی خاں کے باغ کے پیچھے دفن ہوئے۔ غزل میں حسنؔ میر دردؔ کے کلام کا اِتباع کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں تصوّف کی کارفرمائی ہے۔ مثنوی میں وہ میرؔ کے مُتبع تھے اور قصیدے میں سوداؔ کے، لیکن آخر الذکر صنف میں وہ چنداں کامیاب نہیں ہوئے۔ میر حسنؔ ایک قدامت پسند شخص تھے۔ اُن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات سادگی، اثر انگیزی اور محاورات کا نہایت برجستہ استعمال ہے۔ اس میں تصوّف کی بھی چاشنی ہے۔ فارسی میں حسنؔ کا تذکرۂ شعرائے اُردو، مشہور ہے، لیکن جس چیز نے میر حسنؔ کے نام کو لافانی بنا دیا وہ اُن کی بے مثال اُردو مثنوی 'سحرالبیان' یا 'قصۂ بے نظیر و بدرِ مُنیر' ہے۔ اِس مثنوی میں حسنؔ نے ادبی بلندی کی چوٹی کو چھو لیا ہے اور اس میں اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کا جو نقشہ اُنھوں نے کھینچا ہے وہ داد سے مُستغنی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مثنوی ادبِ اُردو کا بہترین شاہکار ہے۔ حسنؔ کا نمونۂ کلام

جان و دل ہیں اُداس سے میرے　　اُٹھ گیا کون پاس سے میرے؟
شبِ وصلِ صنم ہے آج اے ہمدم کسی ڈھب سے　　گریبانِ سحر کو ٹانک رکھنا دامنِ شب سے
دی تھی یہ دعا کس نے میرے دل کو الٰہی　　اُجڑے یہ گھر ایسا کہ پھر آباد نہ ہووے
یہ سینہ بھی جائے قدم تھا کسی کا　　کبھی اس طرف بھی کرم تھا کسی کا

۲۵

حسّان الہند مولانا سید غلام علی واسطی بلگرامی آزاد

آزاد بلگرامی ہندوستان میں عربی شعراء پر ایک کتاب کے مصنف تھے جس کا نام تھا 'سبحۃ المرجان' اُن کا عربی شعرائے ہند پر یہ تذکرہ عربی زبان میں لکھا گیا س ب ح ت اُنھوں نے فارسی شعرائے ہند پر دو تذکرے 'سروِ آزاد' اور 'خزانۂ عامرہ' لکھے تھے۔ وہ 'تذکرہ مآثر الکلام فی التاریخ بلگرام' کے بھی مصنف تھے۔ اُنھوں نے اپنے خاندان پر مبنی ایک تذکرہ 'شجرۂ طیبہ' کے نام سے لکھا تھا۔ اور اُردو میں وہ 'ہجو سے بلّی نامہ' کے مصنف تھے۔ وہ ایک مُتبحر عالم تھے، عربی و فارسی کے فاضلِ اجل اور زبردست دانشور اور عمدہ شاعر۔ وہ بلگرام میں قریباً ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور اورنگ آباد دکن میں ۱۷۸۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام دکن میں بسر ہوئے تھے۔ وہ قصیدہ گوئی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ اُردو سخن گوئی میں وہ قایم چاندپوری کے شاگرد تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام ؎

لب نہ ہلانا روبرو قایم کے ہے ترکِ ادب
عُذر کر آزاد، تا ہو عفو یہ تقصیر اب

آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلّق !

آگرہ اور دہلی کا یہ باہمی ادبی تعلّق، جو مُتقدّمین دورِ اوّل سے شروع ہوا تھا، مُتقدمین کے دوسرے دور میں زیادہ راسخ و استوار ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دہلی میں اُردو ادب و شاعری کی باقاعدہ ترقی اُن شعرائے اکبر آبادی کی مساعی سے ہوئی جو دہلی آکر آباد ہو گئے تھے۔ مُتوسطین دورِ سوئم میں اس تعلّق کی سب سے مضبوط کڑی میر تقی میر کی ذات تھی۔ یہ سلسلۂ تعلّق غالب کی وفات تک جاری رہا۔ مُتوسطین دورِ چہارم کے شعراء میں نظیر اکبر آبادی کی انفرادیت نمایاں ہے اور اگر آگرہ اسکول کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ حرارت بھی اکبر آبادی شاعر تھے تو دورِ چہارم میں آگرے کا مرتبۂ شعری دہلی سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔

مُتوسطین دورِ سوم کی خصوصیاتِ شعری

صحیح اور حقیقی اُردو شاعری کا یہ بہترین دور تھا جبکہ اُردو زبان، ادب و قواعد کی اصلاح کی

گئی۔ درانھیں ترقی دی گئی۔ اس دور میں اظہارِ بیان باوقار رہتا، تخیلات میں وسعت تھی اور جذبات ومحسوسات پاکیزہ تھے۔ اپنے موضوع سے خلوص، تاثیر، گہرائی اور داخلیت جیسے خصائص غالب تھے۔ سودا کے قصاید، میر و درد کے تغزل اور اثر و میرحسن کی مثنویوں کا آج تک جواب نہ ہوسکا۔ سودا کے قصاید ہر لحاظ سے مکمل و بے مثال ہیں۔ میر کی مثنویوں نے دہلی میں فطری شاعری کی بُنیاد ڈالی اور اُن کا تغزل اُردو شاعری کی جان اور رُوح ٹھیرا۔ اثر اور میرحسن کی مثنویاں اس صنفِ سخن کی معراج ہیں۔ میر درد کے صوفیانہ کلام نے اُردو شاعری کو ایک امتیازی درجہ دیا۔ اِس دور کے بعض شعرا (سودا، میر، سوز، میرحسن، میرضیا اور میرحزیں وغیرہ) دہلی سے لکھنؤ گئے جہاں اُنھوں نے اُردو شاعری کو فروغ دیا۔ ان دہلوی شعرا نے لکھنؤ میں صحیح قسم کا معیارِ شعری پیدا کیا، جس کے نتیجہ میں اُردو شاعری کے چوتھے دور میں، لکھنؤ میں صحیح شاعرانہ زندگی کی تخم ریزی ہوئی جس نے بالآخر متاخرین کے پانچویں دور میں ایک علیحدہ لکھنؤ اسکول کا قیام ممکن بنا دیا۔

اُردو ادب میں میر کے کلام کا اسلوب نہایت کامیاب، مخلص اور حقیقی شاعری کا ترجمان ہے۔ ایک صدی قبل کی میر کے تغزل کی غنائیت آج بھی دل و دماغ دونوں کے لیے سامانِ نشاط و انبساط ہے۔ جب تک اُردو زبان و ادب زندہ ہیں اور ان میں دلچسپی باقی ہے میر کو اس کے لیے خراجِ تحسین دیا جاتا رہے گا۔ میر نے اپنے دلی جذبات کی عکاسی نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ اپنے اشعار میں کی ہے اور اُنھوں نے اپنے ذاتی تجرباتِ زندگی کو نہایت سچائی و اثر انگیزی کے ساتھ منظوم کیا ہے۔ اُن کی شاعری اُن کی اپنی اندرونی آواز کی صدائے بازگشت تھی۔ ان کے برعکس سودا شان و شوکت، شور و شغب، تعلّی و استعارات کے شایق تھے۔ میر کی سادگی، انکساری، حلم، عجز و جذباتی داخلیت کے برعکس، سودا بلند بانگ دعاوی، نمائش و اظہارِ افتخار کے عادی تھے۔ مختصر یہ کہ جبکہ میر نے اُردو غزل کا پُربہار باغ سجایا تو سودا نے قصیدے کا مضبوط قلعہ تعمیر کیا۔ سودا کی ہجو بازی بھی لکھنوی اسکول کی مبتذل اُردو شاعری سے کہیں بہتر تھی۔ [ماہنامہ کنول، آگرہ، جنوری ۱۹۳۶ء]

(۷)

متوسطین۔ دورِ چہارم

از ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء

اُردو شاعری پر دربار و سیاست کے اثرات

اُردو شاعری کا یہ دور شہنشاہ اکبر شاہ ثانی شجاع (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) کے عہدِ حکومت کے شعراء پر مبنی ہے، جن میں سے بعض معروف تر شعراء حسبِ ذیل تھے :۔

ہوسؔ، سلیمانؔ، لطفؔ، منتؔ، افسوسؔ، نواب آصفؔ، ہگلی کے اخترؔ، نظیر اکبر آبادی، اسیرؔ اکبر آبادی، راسخؔ، شہیدیؔ، رنگینؔ، انشاءؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ۔

مندرجہ بالا شعراء میں آصفؔ، اخترؔ، نظیرؔ اور اسیرؔ غیر دہلوی شعراء تھے۔ باقی شعراء یا تو دہلوی تھے یا اُردو شاعری کے دہلوی اسکول کے پیرو تھے۔ راسخؔ عظیم آبادی اُردو شاعری کے بہاری اسکول کے نمائندے تھے، آصفؔ اور اخترؔ لکھنوی اسکول کے، اور نظیرؔ آگرہ اسکول کے۔

شاعری اپنی فطری نشوونما کے لیے خارجی و بیرونی غیر مداخلت کی محتاج ہے۔ جب کبھی وہ، خصوصاً تغزّل، درباروں کے شور و شغب کے زیرِ اثر آیا ہے اُس نے اپنی فطری، جذباتی و داخلی خصوصیت کو کھو دیا ہے اور اُس پر خلوص و صداقت کے بجائے تعلّی و تصنّع کا غلبہ ہو گیا ہے [شعر الہند، جلد اوّل ص۱۷۰] یہی وجہ ہے کہ درباری شعراء مثلاً سوداؔ، انشاءؔ اور ذوقؔ وغیرہ کے ہاں میرؔ کے کلام کی سی سنجیدگی، گہرائی اور دلدوزی اور دردؔ کے کلام کی سی اُفتادگی، روحانی اثر اندازی و انکساری کا مکمل فقدان ہے۔
[کاشف الحقائق، جلد دوم ص۳۷-۴۲]۔

(۱)

نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ شُستری دہلوی

ہوسؔ موتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں گورنر گجرات کے بیٹے نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ کے فرزند تھے۔ اُمتہ الزہرا بیگم (جو بہو بیگم کے خطاب سے مُخاطب کی جاتی تھیں) ہوسؔ کی پھوپھی تھیں۔ ہوسؔ کا وطن اور مولد دونوں دہلی تھے، مگر وہ فیض آباد میں رہے اور فوت و دفن (محلہ مفتی گنج)

لکھنؤ میں ہوئے۔ ہوسؔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ حیرانی ہے کہ اُردو تذکرے ہوسؔ کے بارے میں خاموش ہیں، لیکن وہ غالباً ۱۷۸۵ء اور ۱۸۲۴ء کے درمیان زندہ تھے۔ ہوسؔ نہایت شیریں کلام اُردو شاعر تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

نہیں اختیاری سفر میرا جہاں لے چلیں اسیر ہوں
مجھے کام بانگِ درا سے ہے، نہ صدائے کوس رحیل سے

کبھی زلف دن کو جو کھول دی، تو نمود تھی شبِ تار کی
جو نقاب شب کو اُلٹ دیا، تو سحر تھی فصلِ بہار کی

اِس منزلِ ہستی میں ہمیں کوئی بتادو
ہم تو سببِ عزمِ سفر بھول گئے ہیں

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد

نقش پائے رفتگاں کا سلسلہ جاتا رہا
ہم تو تھک کر رہ گئے اور قافلہ جاتا رہا

یارانِ رفتہ بھول گئے ہم کو اے ہوسؔ
رہ میں کسی نے لوٹ لیا کارواں کو کیا؟

کہانی پر اپنی رُلاتے تمھیں
یہ قصّہ بھی یاں مختصر ہو چکا

دِوانہ کس قدر ہے یہ موسم شباب کا
تصویر کے لبوں سے ہوں خواہاں جواب کا

ہوسؔ جب ذکر آجاتا ہے اُس کا
زباں ہوتی نہیں دو دو پہر بند

(۲)

مرزا سلیمان شکوہ سلیماںؔ

شہنشاہ شاہ عالم کے فرزند شہزادہ سلیمان شکوہ دہلی میں شاہ حاتمؔ کے شاگرد تھے مگر جب

وہ لکھنؤ آئے تو پہلے تو وہ شیخ ولی اللہ محبّ کے شاگرد ہوئے مگر پھر بالترتیب مصحفی اور انشاؔ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوئے شیخ ولی اللہ محبّ سوداؔ کے شاگرد تھے۔ شہزادہ سلیماںؔ دہلی سے ۱۷۹۰ء میں لکھنؤ آئے تھے، جہاں اُنھوں نے اپنے قیام کے لیے جنرل مارٹن کی ٹیڑھی کوٹھی خریدی تھی۔ اُنھوں نے اپنی بیٹی کی شادی نصیر الدین حیدر والیٔ اودھ سے کر دی تھی۔ دہلی سے لکھنؤ آتے ہوئے شہزادہ سلیماںؔ برائے چندے رامپور میں بھی ٹھیرے تھے، پھر لکھنؤ چھوڑ کر وہ پہلے تو کاسگنج گئے، جہاں سے وہ آگرہ گئے اور وہیں ۱۸۳۷ء میں وفات پا گئے۔ اُنھیں سکندرہ میں شہنشاہ اکبر کے مقبرے کے اندر دفن کیا گیا۔

جب تک شہزادہ سلیمان شکوہ لکھنؤ میں مقیم رہے اُن کی جائے قیام اور اُن کا ذاتی دربار دہلی کے مہاجر اردو شعراء کا لکھنؤ میں مامن و ملجا بنا رہا۔ سلیماںؔ کا نمونۂ کلام :-

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس
ایک برچھی ہے کہ پہلو میں چبھو دیتے ہو

تیرے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب
ہو گیا اُس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا !

(۴)

مرزا علی لُطفؔ دہلوی

لُطفؔ مرزا کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے جو ۱۷۴۱ء میں استرآباد سے نادر شاہ کے ساتھ دہلی آئے تھے اور اُنھیں دربارِ دہلی میں ملازمت مل گئی تھی۔ لُطفؔ کسی کے شاگرد نہ ہوئے لیکن وہ اُردو شاعری میں سوداؔ کے طرزِ کلام کی پیروی کرتے تھے۔ اُنھیں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں مُنشی کی جگہ مل گئی تھی۔ لُطفؔ نے اُردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی مُرتّب کیا تھا۔ اُن کا نمونۂ کلام :-

کب کی دیتی بلا، جو جانتے ہم
دیکھے دل اِس بلا میں پڑتے ہیں

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوز[illegible] ہجراں زباں پر لائیں کیا

(۴)

ملک الشعراء میر قمر الدین منّت سونی پتی

منّت امام نصیر الدین مشہدی کی اولاد میں اور شاہ عبد العزیز دہلوی سے رشتہ دار تھے۔ وہ مولانا فخر الدین کے مُرید تھے۔ میر ممنونؔ منّت کے بیٹے تھے۔ منّت میر شمس الدین فقیرؔ کے فارسی شاعری میں اور شیخ قیام الدین قائمؔ کے اُردو میں شاگرد تھے۔ منّت لکھنؤ جا کر شیعہ ہو گئے تھے۔

منّت کا وطن اور مولد سونی پت تھا لیکن اُن کی زندگی دہلی میں اور بعد ازاں لکھنؤ، حیدر آباد دکن، اور کلکتہ میں گذری۔ وہ کلکتہ ہی میں ۱۷۹۲ء میں فوت اور وہیں دفن ہوئے۔ اُن کا نمونۂ کلام :-

علاجِ دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے سے
یہاں کیا ہو گیا وہ مُعجزہ حضرت سلامت کا؟

منّت ایسے کو دل دیا تُو نے
اے مِری جان کیا کیا تُو نے

(۵)

میر شبر علی افسوسؔ دہلوی

افسوس نواب میر جعفر گورنر بنگال کے توپخانے کے افسر میر علی مظفر خاں کے بیٹے تھے۔ افسوس کا آبائی وطن صوبۂ آگرہ کی ایک بستی نارنول تھا لیکن ان کا مولد دہلی تھا۔ افسوس کی بیشتر زندگی لکھنؤ میں گذری اور آخر میں وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں 'میر منشی' ہو گئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ افسوس پہلے تو میر حیدر علی حیرانؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے، اس کے بعد میر سوزؔ دہلوی کے۔ افسوس غالباً ۱۸۰۹ء میں حیدر آباد دکن میں فوت و دفن ہوئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کی تاریخِ پیدائش ۱۷۳۶ء لکھی ہے۔ افسوس خود کو حضرت امام جعفر صادقؑ کی اولاد میں بتلاتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد ایران میں خواف کے باشندے تھے جہاں سے وہ برِصغیر ہند و پاکستان میں نارنول کے مقام پر آ کر آباد ہو گئے تھے۔ افسوس کے دادا سید غلام مصطفیٰ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے تھے، جہاں وہ نواب صمصام الدولہ کی مصاحبت میں داخل ہو گئے تھے۔ افسوس کے باپ عمدۃ الملک نواب امیر خاں کے مصاحب تھے۔ نواب کے قتل ہو جانے کے بعد افسوس

کا خاندان پٹنہ چلا گیا مگر جب نواب میر جعفر معزول کئے گئے تو افسوس لکھنؤ آ گئے جہاں وہ شہنشاہ شاہ عالم کے بڑے بیٹے مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے مصاحب ہو گئے۔ ان ذرائع کے توسل سے افسوس کا رابطہ انگریز ریزیڈنٹ لکھنؤ کرنل اسکاٹ Col. Scott سے قائم ہو گیا جن کی سفارش سے افسوس فورٹ ولیم کالج کے میر منشی مقرر ہو کے کلکتہ چلے گئے۔ افسوس صاحبِ دیوان شاعر اور گلستانِ سعدی کے اردو ترجمہ "باغ اردو" کے نیز "خلاصۃ التواریخ" کے حصۂ اول کے مترجم تھے۔ افسوس نے "کلیاتِ سودا" پر ریویو بھی کیا تھا۔ افسوس کا نمونۂ کلام:۔

دِل، تیری بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار
بیوفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر

قیامت لگاوٹ ہے آنکھوں کے بیچ
جسے مُڑ کے دیکھا، لگا لے چلے

آج اُس بزم میں ٹھیرا تو ہے جانا اپنا
جی دھڑکتا ہے وے، دل ہے دِوانا اپنا

(۶)

وزیر الممالک یحییٰ خاں المعروف بہ مرزا امانی الملقب بہ نواب آصف الدولہ آصف وَالئ اودھ

آصف شہنشاہ شاہ عالم ثانی کے وزیر اور نواب شجاع الدولہ اور بہو بیگم کے جگر گوشہ تھے۔ وہ فیض آباد میں ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۷۷۳ء میں فیض آباد ہی میں اودھ کے تختِ سلطنت پر بیٹھے تھے۔ اُن کا انتقال ۱۷۹۷ء میں لکھنؤ میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے تھے۔ وہ اُردو شاعری میں سوز کے شاگرد تھے، لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے اس کی تردید کی ہے۔ بہر ایں ہمہ آصف کا اسلوبِ شاعری میر سوز کے کلام سے بڑی مشابہت رکھتا ہے، لیکن ان کے کلام میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ انشا اور مصحفی دونوں سے متاثر تھے۔ وہ نہایت عمدہ اُردو شاعر تھے آصف کا نمونۂ کلام:۔

دِل، تُو جاتا ہے اُس کے کوچے میں
جا، میری جان، جا خُدا ہمراہ

ایک کروٹ سے سو نہیں سکتا
اِس دلِ بیقرار کے باعث

یہ پیام دیجیو قاصد اکر خرابی اور تو کیا کہوں!
وہ جو جائے امن تھا ایک دل، غم و درد امیں لیا گئے

(۷)

ملک الشعراء قاضی مولوی محمد صادق خاں اختر

ہُگلی

اختر قاضی محمد لعل ہگلوی کے بیٹے تھے۔ وہ ہگلی (بنگال) میں پیدا ہوئے تھے لیکن اُن کی زندگی لکھنؤ میں گذری جہاں وہ فوت و دفن ہوئے اختر لکھنؤ ۱۸۱۴ء میں پہنچے تھے۔ وہ مرزا محمد حسن قتیل فرید آبادی کے شاگرد تھے جو نواب سعادت علی خاں کے عہد کے عہد میں لکھنؤ میں ایک مُسلمہ عالم فاضل شخص اور انشاؔ کے ذاتی دوست و ہمکار تھے۔ قتیل فارسی کے ایک معروف ادیب تھے حالانکہ مرزا غالب اس کے معترف نہ تھے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب غازی الدین حیدر نے اختر کو "ملک الشعراء" کا خطاب دیا تھا۔ اختر فارسی شعراء کے ایک تذکرہ "آفتاب عالم تاب" کے مصنف اور فارسی اور اُردو دونوں میں صاحب دیوان تھے۔ اُن کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ اختر تحصیلدار تھے۔ وہ کئی فنون میں ماہر تھے۔ اپنے فارسی تذکرے اور فارسی اور اُردو دیوانوں کے علاوہ، اختر کی دیگر تصانیف "صبح صادق"، "نور الانوار"، اور "محامد حیدریہ"۔ اُن کا نمونہ کلام:-

عجب ڈھب کی یہ تعمیر خراب آباد ہستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے، بلندی یاں کی پستی ہے

اُٹھ جائے ہے غم دل سے تو درد آن بسے ہے
صد شکر کہ یہ گھر کبھی ویراں نہیں رہتا

کل بنکے شیخ مُجتہد العصر سا تھیا | دکھلاکے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہِ بتحنز مجھے بطنز | معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
ہم نے کہاکہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے | پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست | اور ہو یقین آپ کے اِس اجتناب کا
مے ہووے، کُنج باغ ہو، ساقی ہو ماہ وش | اور واں مُخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا | دے ذایقہ زبان کو دہن کے لُعاب کا
اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو | گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحان لنظیر تو یہ آپ کا غلام
قایل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و نشاب کا

(۸)

شیخ ولی محمد نظیرؔ اکبر آبادی

نظیرؔ شیخ محمد فاروق اکبر آبادی کے فرزند تھے۔ وہ آگرے میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ ایک مُعلّم تھے۔ غالباً وہ ۱۷۴۰ء میں پیدا اور ۱۸۳۰ء میں فوت ہوئے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر زُبیدا احمد الہ آبادی نے نظیر کی جائے پیدایش اپنی تصنیف' حدیقۂ اردو' میں دہلی بتائی ہے جو درست نہیں ہے۔ نواب وزیر والیٔ اودھ نے بار بار نظیرؔ کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی مگر نظیرؔ نے آگرے ہی میں قیام کو ترجیح دی تھی۔ نظیرؔ بہت پُرگو اُردو شاعر تھے۔ اپنی زندگی میں اُن پر جو کچھ گذرا اور جو کچھ اُنھوں نے دیکھا اُسے اُنھوں نے من وعن نہایت صداقت، خلوص و سادگی کے ساتھ اپنی اُردو شاعری میں مُنتقل کر دیا۔ میاں نظیرؔ کے والد نواب عظیم آباد کے مصاحب تھے۔ آگرے میں نظیرؔ کا آبائی مکان مُلکوں کی گلی میں واقع تھا۔ نظیرؔ کی شاعری اُن کی موجود الوقت سوسائٹی کی مظہر ہے۔ اپنے شاعرانہ کلام میں، نظیرؔ کبھی تو مُعلّم نظر آتے ہیں، کبھی مُصلح، کبھی بذلہ سنج، کبھی صُوفی اور کبھی فلسفی۔ اُن کی شاعرانہ خصوصیات حالات و واقعات کی نقشہ کشی اور محاورات و امثال کا بے دریغ استعمال ہیں، لیکن کہیں کہیں وہ ادبی معیار سے نیچے گر گئے ہیں۔ اُن کی کُلّیات شائع ہو چکی ہے۔ نظیرؔ کی شاعری اُن خود رو پھولوں کی طرح ہے جن کی کسی مالی نے دیکھ بھال نہ کی ہو۔ نظیرؔ کا تعلق اُس عہد کی بزعمِ خود' اعلیٰ مُہذب' سوسائٹی سے نہیں تھا، بلکہ وہ غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا اُن کا کلام بھی' عوامی' تھا۔ اسی طبقہ

عوام کے لیے وہ لکھتے بھی تھے ۔ سادگی، جو حقیقی شاعری کی رُوح ہے، نظیر کے کلام کا طُرّۂ امتیاز تھی ۔ نظیر نے اپنے ماحول و محسوسات کی صحیح اور بے لاگ ترجمانی کی ہے ۔ اُن کا کلام مبالغہ، تصنع، تعلّی اور بناوٹ سے پاک ہے، جو اُس عہد کی نام نہاد "مہذب" سوسائٹی کے عطیات تھے ۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے قبل، نظیر کی اُردو شاعری مقبولِ عام تھی [ماہ نامہ نیرنگِ خیال، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۶ء]

نظیر اُردو ادب میں ایک منفرد و ممتاز مقام کے مالک ہیں ۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ تنگ نظری اور ادبی تعصب کے باعث اُن کی تحقیر کی گئی ہے اور بعض تذکرہ نویسوں نے تو اُنھیں زمرۂ شعراء سے بھی باہر رکھا ہے ۔ لیکن وہ اس دھرتی کے نہایت وفادار اور سچے شاعر تھے ۔ جنھیں اُردو شاعری کا پہلا قومی شاعر کہنا مبالغہ نہ ہوگا ۔ یہ صحیح ہے کہ کسی کسی جگہ ان کا شعری معیار پست ہو گیا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ الفاظ میں نہایت شاطر و چابکدست نقاشِ [illegible] تھے ۔ اُنھوں نے اپنے وطن کی تعریف میں نہایت عمدہ شاعری کی ہے ۔ اُن کی قوتِ مُتخیلہ و [illegible]ع ہے ۔ وہ عوام کی ترجمانی کرتے ہیں کیونکہ وہ انھی میں سے ہیں ۔

نظیر اُردو میں طویل نظموں کے بانی ہیں ۔ نظیر سے پہلے بھی اس ضمن میں دوسروں نے طبع آزمائی کی لیکن وہ نامکمل و بے ربط ہیں ۔ نظیر نے بیانیہ نظموں کو اپنی خصوصیت قرار دے لیا تھا ۔ سودا کی طرح نظیر بھی اس [illegible] میں بعض مقامات پر ادبی معیار سے گر گئے ہیں ۔ لیکن سودا اپنی تندریں ہجو بازی کی بدولت کھو بیٹھے جبکہ نظیر [illegible] کا می فطرت کی تنگ و دو میں اس صنف میں نیچے گر گئے ۔ اس طرح نظیر کا مقام [illegible] بھی اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے سودا سے بلند ہے ۔ نظیر امیل زولا EMILE [illegible]A اور موپاسال MAUPASSANT کی مانند نقاشِ فطرت کے پیش رو اور اُردو میں فطری شاعری کے بانیوں میں سے ہیں لیکن اُن مغربی شعراء اور نظیر کے درمیان یہ بیّن فرق ہے کہ جبکہ اوّل الذکر مغربی شعراء کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے کلام کے ذریعہ سے انسانی فطرت کے تاریک پہلو کی اس ہولناک طریقے سے ترجمانی کریں کہ ان کی حقیقت نگاری سے لوگ سیاہ کاری سے گھنیا جائیں ۔ اس کے بالکل برعکس نظیر اپنی صداقت بیانی و خلوص کے ذریعہ سے ایک مصلح کا کردار ادا کرتے ہوئے تفننِ طبع کی شمولیت کے ساتھ فلاحِ عامّہ کے متلاشی ہیں ۔ سودا کے علاوہ ۔ اگر کوئی اور اُردو شاعر نظیر سے مشابہ کہا جا سکتا ہے تو وہ انشاء تھے ۔ لیکن سودا اور انشاء دونوں نے اپنی شاعرانہ توانائیاں بہت کچھ مسخرے پن، انتقام، ہجو نگاری اور پھبتیوں میں ضائع کیں، جبکہ نظیر کی حقیقت نگاری فطرت کی عکاسی کی خاطر تھی ۔ نظیر کی معمولی سے معمولی نظم بھی دلچسپ و بامعنی ہے ۔ نظیر نے غزلیں بھی لکھی ہیں ۔ لیکن وہ تغزل کے شاعر نہیں تھے ۔ کوئی مقامی تہوار، کوئی روایتی واقعہ،

کوئی رسمی جشن ایسا نہیں تھا جس کو بلا تخصیص مذہب وملت نظیر نے منظوم نہ کیا ہو [ماہنامہ کلیم، دہلی، ستمبر ۱۹۳۷ء ص ۱۲۹-۱۳۲]۔

اپنی زندگی کے آخر ایام میں نظیر آگرے میں تاج محل کے نزدیک محلہ تاج گنج میں بس گئے تھے جہاں وہ معلّمی کرتے تھے اور جہاں وہ فوت و دفن ہوئے۔ نولکشور پریس لکھنؤ نے نظیر کی ایک نئی کلیات شائع کی ہے اور اُسی پریس سے پروفیسر شہباز نے نظیر کے مبسوط سوانح حیات "زندگانیِ بے نظیر" کے نام سے پیش کئے ہیں۔ نظیر کا "بنجارے نامہ" اور اُن کا "کاسۂ سر" پر قطعہ لافانی ہو چکے ہیں۔ اُن کا نمونۂ کلام :-

آغوشِ تصوّر میں جب ہم نے اُسے مَسکا !
لب ہائے نزاکت سے ایک شور تھا بس بس کا

اُس وقت جبیں نکلیں میری حسرتیں نظیر
اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا جنا

لڑی، مُنہ سے نہ بولی، رُوٹھ بیٹھی، جھڑکیاں دے لیں
اُسے سب کچھ بن آتا ہے، مجھے کچھ بن نہیں آتا

چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے
گالوں کی دمک، خُوبی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے

اُٹھا کے سینہ، جھٹک بازو اور بنا سج دھج !
چلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خُدا !

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں، نت دیس بدیس پھرے مارا
قزّاق اجل کا لُوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا بھینسا بیل شُتر، کیا گونیں پلّہ سر بھارا !
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر، کیا آگ دُھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلیگا بنجارا

[- ماہی "ہندوستانی" الٰہ آباد اکتوبر ۱۹۳۸ء اور ماہنامہ "نگار" لکھنؤ، دسمبر ۱۹۳۸ء]

(۹)

خلیفہ گلزار علی اسیر

اسیر نظیر کے فرزند تھے جو آگرے میں ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی پیشۂ معلمی کرتے تھے اور اس حیثیت سے وہ بنارس کے معزول راجہ مہاراجہ بلوان سنگھ اور مانی سنھان کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ریاست گوالیار سے بھی انھیں دس روپیہ ماہوار کا خاندانی وظیفہ ملا کرتا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں مہارانا دھولپور نے اسیر کو طلب کرکے اُن کا پانچ روپیہ یومیہ روزینہ مقرر کر دیا مگر اسیر کا وہاں دل نہ لگا اور وہ جلد واپس آگرہ آگئے۔ اسیر نہایت آزمودہ کار شاعر تھے اور بجا طور پر اُستاد، کہلاتے تھے۔ وہ غزل اور مثنوی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ وہ حشیش اور افیون دونوں کے عادی تھے۔ چونکہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں نظیر کے متعلق اچھی رائے نہیں دی ہے۔ اس لیے خلیفہ اسیر کے اشارے سے نظیر کے ایک شاگرد حکیم میر قطب الدین باطن اکبر آبادی نے انتقاماً ایک اور تذکرۂ شعرائے اُردو ۱۸۴۵ء میں گلشن بےخزاں، یا نغمۂ عندلیب کے نام سے مرتب کیا جس میں شیفتہ اور اُن سب کو بُرا بھلا لکھا گیا ہے جن کی شیفتہ نے اپنے تذکرے میں تعریف کی تھی اور اُن لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جن کے متعلق شیفتہ نے اچھی رائے نہیں دی تھی۔ اسیر کے آباؤ اجداد سنی المذہب تھے اور نظیر تفضیلی تھے لیکن اسیر شیعہ ہوگئے تھے۔ اسیر ذاتی طور پر ایک نیک نہاد انسان تھے لیکن وہ مرزا حاتم علی بیگ مہر لکھنوی کے، جو ناسخ کے شاگرد تھے، اور آگرے میں مقیم تھے، مخالف ہوگئے تھے۔ اسیر کا انتقال ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ انھوں نے دو دیوان اور ایک مثنوی "سوزِ عشق" نامی چھوڑی۔ اسیر کے متعدد شاگرد تھے لیکن ان کے معروف ترین شاگرد منشی نبی بخش حقیر تھے۔ اسیر کا ایک بیٹا تھا جو ایامِ طفلی ہی میں شعر کہنے لگا تھا۔ اس کا تخلص بذیر تھا لیکن وہ عنفوانِ شباب سے قبل ہی فوت ہو گیا۔" ماہنامہ شاعر آگرہ جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۱

اسیر کا نمونۂ کلام:-

تن میں ہوا جو ہے کوئی دم کی بندھی ہوئی
گھٹری یہ غافلو ہے بھرم کی بندھی ہوئی

دُنیا میں انساں کی اور آنسو کی قدر برابر ہے
خاک میں ملتے جاتے ہیں آنکھوں سے گرتے جاتے ہیں

(۱۰)

فخر میر شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی !

راسخ کا آبائی وطن دہلی تھا لیکن وہ خود ۱۷۴۸ء میں پٹنہ کے قریب موضع سائیں میں پیدا ہوئے تھے۔ شروع میں راسخ مرزا شرر کے شاگرد ہوئے تھے لیکن بعد ازاں سودا اور میر کے معاصر شاہ گھسیٹا عشق کے شاگرد مرزا محمد علی فدوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے مگر آخر کار راسخ نے میر تقی میر کی شاگردی اختیار کر لی تھی بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ راسخ سودا یا شاہ نور الحق تپاں کے شاگرد تھے۔ لیکن شاد عظیم آبادی نے اپنے 'تذکرۂ نوائے وطن' میں تصدیق کی ہے کہ راسخ میر ہی کے شاگرد تھے۔ عرصے تک راسخ کلکتہ، غازی پور، فیض آباد اور لکھنؤ میں پھرتے رہنے کے بعد بالآخر ۱۸۰۷ء میں عظیم آباد (پٹنہ) واپس آئے، جہاں وہ ۱۸۲۲ء میں فوت اور اس کے محلہ لودھی کٹرہ میں دفن ہوئے۔ راسخ ایک نہایت خوش گفتار شاعر اور میر اور درد کے پیرو تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی درویشانہ انداز میں گذار دی اور اپنے قیام کے لیے کوئی گھر تعمیر نہیں کیا۔ راسخ موسیقی کے بھی شایق تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ وہ ایک دیوان اور چھ یا سات مثنویوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کلیات ۱۸۹۳ء میں شائع ہو چکی ہے [خمخانۂ جاوید، جلد سوم]۔ دیگر معروف اردو شعرا کے کلام کے ساتھ آیندہ صفحات میں ان کا نمونۂ کلام بھی دیا جائے گا۔

(۱۱)

حاجی کرامت علی خان شہیدی بریلوی

شہیدی عبدالرسول خاں عروضی بریلوی کے فرزند اور بریلی (روہیلکھنڈ۔ یوپی۔ انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ کسی نے لکھا ہے کہ شہیدی کا تعلق ضلع اُناؤ (یوپی انڈیا) کے موضع دایرہ پور سے تھا۔ لیکن شہیدی کا قیام بیشتر لکھنؤ میں رہا۔ وہ ملک کے متعدد مقامات پہنچے، اُدے پور، بھوپال، دہلی، اجمیر، پنجاب اور گجرات میں رہے۔ پہلے وہ مصحفی کے شاگرد ہوئے لیکن پھر شاہ نصیر کے حلقۂ تلمذ میں آ گئے۔ شہیدی بہت اچھے اور کامیاب شاعر تھے۔ وہ اپنی نہایت اثر انگیز، نعت خوانی کے باعث مدّاح رسولؐ،

مشہور ہوئے۔ وہ اپنے عہد کے بہترین اُردو شعرا میں سے تھے۔ وہ ۱۸۴۰ء میں مدینۂ منورہ میں فوت و دفن ہوئے۔ اُن کا نمونۂ کلام

قدر سب چاہنے والوں کی تیرے دیکھ چکے — خوار رہتا ہے پرانا، تو پشیمان نیا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے — قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا
ایامِ مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے — دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے؟

(۱۲)

مرزا سعادت یار خاں رنگین دہلوی

رنگین مرزا طہماسپ بیگ خاں تورانی لاہوری کے بیٹے تھے۔ وہ ۱۷۵۵ء میں سرہند میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کا قیام بیشتر دہلی اور لکھنؤ میں رہا۔ ۱۸۳۵ء میں وہ دہلی میں فوت و دفن ہوئے۔ رنگین شاہ حاتم دہلوی کے شاگرد تھے۔ وہ چار دیوانوں کے مصنف تھے جن میں سے ایک صنفِ ریختی میں تھا۔ وہ قریباً دس تصانیف کے مالک تھے۔ شمالی ہند میں وہ اس خاص صنفِ اُردو شاعری (ریختی) کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ سودا، میر، میر حسن اور انشا کی طرح رنگین بھی دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے جو اُس وقت 'لکھنؤ اسکول' کے نام سے نہایت رکیک و مبتذل اسلوبِ شاعری کا مرکز تھا۔ چنانچہ رنگین کی ریختی بھی اس ابتذال سے مملو ہے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کی اِس صنف میں ہندی الفاظ کا استعمال بہت کیا ہے لیکن اُن کی رومانی شاعری نہایت ناشائستہ اور معیارِ شاعری کے لحاظ سے حد درجہ پست ہے۔ ان کا نمونۂ کلام

دیکھتے ہی شکل سب جاتا رہے ہے یاد سے — حالِ دل کیا کہئے اُس کافر ستم ایجاد سے
کس رات ہوئے آپ ہیں مہمان ہمارے؟ — کب تم نے نکالے، کہو، ارمان ہمارے؟
لگ چلے تجھ سے وہ، کھانی ہو جسے لات کوئی — ہاتھ کس طرح لگاوے تجھے ہیہات کوئی؟

مرزا طہماسپ بیگ خاں نواب حسین الملک المعروف بہ میر منّو خاں وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی سرکار میں لاہور میں ملازم تھے۔ بعدازاں وہ نواب نجیب الدولہ ضابطہ خاں اور ذوالفقار الدولہ کی خدمت میں رہے جہاں سے اُنھیں خطابات محکم الدولہ، خان بہادر اعتضاد جنگ ملے تھے۔ اِس طرح رنگین بھی فنِ سپہ گری میں ماہر تھے اور شہنشاہ اکبر شاہ ثانی کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ کے مصاحب تھے۔ رنگین گھوڑوں کے تاجر بھی تھے۔ وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خاں دونوں کے عہد حکومت میں ایرانی گھوڑے فروخت کیا کرتے تھے۔ رنگین کی کلیات کا نام 'نورتن' ہے جس میں حسبِ ذیل چار دیوان

ہیں یعنی ریختہ، ہیجتہ، آمیختہ اور انگیختہ۔ اور پانچ دوسری کتابیں (مثنوی ایجادِ رنگین، فرس نامہ، زنیت نامہ، مجالسِ رنگین، نثر میں دیگر، تمام شعراء کی ہجو میں۔ اور ان کی بہترین مثنوی "دل پذیر"۔ دیوان ریختہ اور دیوان ریختی [خمخانۂ جاوید]۔

(۱۳)

میر انشاء اللہ خان انشاؔ دہلوی

انشاؔ، میر انشاء اللہ خان نجفی کاشمیری (دہلی میں شاہی دربار کے طبیب) کے بیٹے تھے۔ حکیم موصوف مرشد آباد میں ایک منصبدار تھے جہاں ۱۷۵۶ء میں انشاؔ پیدا ہوئے تھے۔ انشاؔ اپنے والد کے ساتھ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ۱۷۸۲ء میں دہلی آئے تھے۔ اُس وقت اُن کا عالمِ شباب تھا۔ اور وہاں سے لکھنؤ نواب آصف الدولہ کے عہدِ حکومت میں ۱۷۹۵ء میں آئے تھے، جہاں مرزا سلیمان شکوہ، مصحفی کے تلمذ سے دستبردار ہو کر انشاؔ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال (۱۷۹۷ء) کے بعد جب نواب سعادت علی خاں اودھ کے حکمراں ہوئے تو علامہ تفضل حسین خاں کی سفارش سے انشاؔ ۱۷۹۸ء میں ان کے درباری ہو گئے۔ انشاؔ نے ۱۸۰۵ء میں نواب اودھ کا "شکارنامہ" لکھا تھا اور ۱۸۰۷ء میں نواب سعادت علی خاں کی فرمائش پر اُنھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "دریائے لطافت" لکھی جس کا تاریخی نام "اُردوئے ناطقی" ہے۔ اُردو قواعد گرامر پر یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ انشاؔ "رانی کیتکی کی کہانی" کے بھی مصنف ہیں جس میں کوئی عربی یا فارسی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ انشاؔ کی "دریائے لطافت" مصحفی کی تصنیف کے سولہ سال اور قواعدِ گلکرائسٹ GILCHRIST کے چھ سال کے بعد لکھی گئی تھی۔ انشاؔ ۱۸۱۷ء میں فوت ہو کر لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ انشاؔ رنگین کے گہرے دوست اور پہلے شاعر تھے جنھوں نے صنفِ ریختی میں رنگین کی پیروی کی۔ رنگین اور انشاؔ کے اسالیبِ شعری میں باریک سا فرق ہے جبکہ رنگین فحش نگاری میں رنگے ہوئے تھے، انشاؔ ہنسوڑ قسم کے انسان تھے۔ یہ امر یقیناً افسوسناک ہے کہ انشاؔ جیسا فاضل شخص اپنے کمالاتِ ادبی و علمی خرافات و فحاشی کی نذر کر دے۔ اپنی شاعری میں انشاؔ زندگی اور اس کی اقدار کا مذاق اُڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا فنِ شعری تصنع سے پُر اور صداقت بیانی سے مُعرا ہے۔ وہ اُردو میں تکنیکی اصطلاحات کے موجد تھے، اگرچہ وہ اصطلاحات زبان میں نامانوس تھیں۔ وہ ایک ایسے فقیدالمثال ذہین شخص تھے جس نے اپنے علمی و ادبی کمالات اُس وقت کی مُبتذل لکھنوی سوسائٹی کے زیرِ اثر ضائع کر دیے۔ انشاؔ کی ادبی ذہنیت میں بلا کی تخلیقی توانائی تھی۔ اُن کا اثر اُردو ادب پر اچھا اور بُرا دونوں طرح پڑا۔ درباری

زندگی کے اثرات نے اُن کی غیر معمولی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بُری طرح مجروح کیا۔ اُن کی 'دریائے لطافت' کی تصنیف سے ثابت ہے کہ انشاؔ بہتر حالات و ماحول میں اُردو ادب کی زبردست خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام

اُس سے خلوت کی تطہیر چاہتی تو ہیں اللہ سے — واسطے دو دن کے عرشِ کبریائی مانگنا!
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
عجیب لُطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے — کہاں ملاپ میں وہ بات، جو لگاڑ میں ہے
لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے، خدا کے واسطے، مت کر نہیں نہیں

اگرچہ اسلوبِ بیان کے لحاظ سے انشاؔ کی غزلیات غیر متوازن ہیں، پھر بھی شروع میں وہ سوزؔ کے طرزِ کلام کا اتباع کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں [''تذکرہ میر حسن'']۔ بعد ازاں ہر چند کہ اُنھوں نے رنگینؔ کے بیہودہ طرزِ کلام کی پیروی میں اپنی شاعری کا ستیاناس کر لیا تھا، بایں ہمہ گاہے ماہے اُن کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے اُن کی غیر معمولی صلاحیتِ شعری کے اثرات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُن کے ایسے اشعار میں صحیح رومانی داخلیت، روحانیت و تصوف، فلسفیانہ افکار اور حقیقی تغزل کی جھلک نظر آتی ہے۔ انشاؔ کا یہ فطری اسلوبِ شعری، جس پر سوزؔ کے طرزِ شاعری کی چھاپ پڑی تھی، وقتی سیاست اور درباری زندگی کے دباؤ کے باعث لکھنوی معاشرت کے مبتذل اثرات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انشاؔ نے درباری زندگی اور لکھنوی سوسائٹی کو خیرباد کہہ دیا تو اُن کی شاعری میں فطری داخلیت، لذائذ اور صداقت واپس آ گئے۔ مولانا سید امداد امام اثرؔ عظیم آبادی (مصنف 'کاشف الحقائق') کے مطابق، جب تک انشاؔ دربارِ لکھنؤ سے وابستہ رہے اور نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت کی اُس وقت تک اُن کی شاعری محض مسخرہ پن بنی رہی، لیکن درباری زندگی سے کنارہ کش ہونے اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بعد، اُن کی تمام کھوئی ہوئی شعری لطافتیں واپس آ گئیں۔ انشاؔ اور مصحفیؔ دونوں نے اکثر یکساں بحور میں غزلیں کہی ہیں، اور انشاؔ اپنے ادبی حریف و معاصر سے اس شعری مسابقت میں زیادہ پیچھے نہیں رہے ہیں [''شعر الہند'' حصہ اوّل]۔

(۱۴)

شیخ قلندر بخش جرأتؔ اکبر آبادی

جُرأتؔ کا اصل نام یحییٰ امان تھا اور اُن کے والد کا حافظ امان۔ اُن کے بزرگ مُغل شہنشاہوں سے

درباروں سے وابستہ رہے تھے اور "امان" کا خطاب شہنشاہ اکبر نے ان کے خاندان کو عطا کیا تھا۔ جرأت اپنی جوانی ہی میں نابینا ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے دہلی سے فیض آباد آکر تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں جرأت فیض آباد سے لکھنؤ گئے۔ وہ جعفر علی حسرت دہلوی کے شاگرد تھے اور اُنھیں حافظ رحمت خاں شہید والیٔ بریلی (روہیلکھنڈ یو پی انڈیا) کے فرزند نواب محبت خاں محبت کی سرکار میں، جو اُن دنوں لکھنؤ میں مقیم تھے، ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے بعد جرأت شہزادہ سلیمان شکوہ سلیمان کے ملازم ہو گئے تھے۔ جرأت ہر دو فنون موسیقی و نجوم کے ماہر تھے۔ انشا سے اُن کی ادبی رقابت ضرب المثل تھی۔ انشا اور جرأت دونوں نے ہم قافیہ و ہم ردیف غزلیں کہی ہیں۔ جرأت خاص کر عشقیہ معاملہ بندی کے شاعر تھے جس میں اُنھوں نے اپنے لیے ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا۔ جرأت نے اپنے تغزل میں افلاطونیت اور نام نہاد روحانی شاعری کی آڑ نہیں لی بلکہ نہایت صداقت سے اُس مادی و جسمانی محبت کے گیت گائے جو ایک مرد کو کسی عورت سے ہوتی ہے۔ جرأت کے اس اسلوبِ شاعری کی بعد ازاں داغ نے بڑی کامیابی کے ساتھ تقلید کی۔ جرأت ایک نہایت کامیاب تغزل گو اردو شاعر تھے۔ اُنھوں نے سوائے قصیدے کے ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے کلام کی سادگی قابلِ تعریف ہے لیکن اس میں جذبات کی گہرائی نہیں ہے، بلکہ کہیں کہیں تو وہ اخلاقی معیار سے بھی نیچے گر گئے ہیں۔ جرأت کی وفات ۱۸۱۰ء میں ہوئی اور وہ لکھنؤ میں حضرت عباس کی درگاہ کے متصل دفن کیے گئے۔ ان کا نمونۂ کلام

بال ہیں بکھرے، بند ہیں ٹوٹے، کان میں ٹیڑھا بالا	جُرأت ہم پہچان گئے، کچھ دال میں کالا کالا
مقام گریہ ہے احوال اُس بیکس مسافر کا	پڑا جیسے جو دیکھے آتے جاتے کاروانوں کو
یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا	چنپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
دلِ وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی	دِوانہ ہے ولیکن بات کرتا ہے ٹھکانے کی

(۱۵)

شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی

مصحفی کے والد کا نام شیخ ولی محمد امروہوی تھا۔ مصحفی کا وطن و مولد امروہہ (یو پی انڈیا) تھا اور وہ ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بیشتر دہلی میں رہے جہاں سے وہ ۱۷۶۶ء میں نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ چلے گئے۔ ٹانڈے سے مصحفی شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے جہاں سے وہ پھر دہلی

چلے گئے۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں مصحفی پھر دہلی سے لکھنؤ گئے جہاں وہ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے مصحفی کا انتقال نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ میں ہوا، وہ وہیں دفن ہوئے۔

مصحفی کے ریختہ میں آٹھ دیوان تھے اور وہ دو تذکروں کے مصنف تھے۔ ایک اُردو شعرا اور دوسرا فارسی شعرا کا۔ صفیر بلگرامی نے لکھا ہے کہ مصحفی شہنشاہ احمد شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۰۹ء میں ان کی عمر ساٹھ سال سے زاید تھی (دیباچۂ دیوانِ ششم مصحفی، لکھنؤ ۱۸۰۹ء) نیز یہ کہ مصحفی نے اپنا چھٹا دیوان ناسخ کے طرزِ شاعری پر مرتب کیا تھا ۱۸۰۷ء میں ["تذکرۂ جلوۂ خضر"] مصحفی کسی کے شاگرد نہ تھے لیکن وہ سودا اور میر کا اتباع کرتے تھے۔ مصحفی کا اسلوبِ شاعری سادہ و آسان ہے۔ ان کے خاص خاص شاگرد، جو بعد کو خود معروف اساتذۂ شاعری ہوئے وہ یہ ہیں:- آتش، میر خلیق، میر ضمیر اور اسیر وغیرہ۔ مصحفی کی مثنوی 'بحر المحبت'، نہایت معروف ہے۔ مصحفی نے قصاید بھی کہے لیکن وہ سودا کے قصاید کی طرح زور دار نہیں تھے۔ مصحفی نہایت پُر گو شاعر تھے اور وہ اپنا کلام فروخت بھی کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُردو زبان و ادب کی اصلاح میں بھی حصہ لیا تھا۔ بحیثیت ایک عظیم اُردو شاعر کے اُن کی شخصیت کبھی متنازعہ فیہ نہیں رہی۔ وہ بڑے ذہین شاعر تھے اور اُنھوں نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی۔

غزل میں مصحفی کا اپنا کوئی منفرد طرز نہیں تھا۔ کبھی تو اُنھوں نے میر کے اسلوب کی تقلید کی ہے، کبھی میر سوز کی اور کبھی سودا کی۔ اُن کی خصوصیتِ شعری اگر کوئی تھی تو وہ یہ کہ وہ شباب و تقاضائے شباب کی ترجمانی خوب کرتے تھے۔ وقتی سیاست و درباداری کے تقاضوں کے زیرِ اثر ان کے کلام کا بھی ایک حصہ انشا کے طرزِ کلام پر پھیکا اور بے اثر ہے لیکن خوش قسمتی سے وہ انشا کا کامیاب تتبع نہ کر سکے۔

بعض مؤرخوں کے نزدیک شیخ غلام ہمدانی مصحفی (ولد ولی محمد ولد درویش محمد) کا وطن اور مولد غلطی سے امروہہ بتا سے گئے ہیں، حالانکہ اُن کے مطابق مصحفی کا وطن اور مولد دہلی کے قریب قصبۂ اکبر پور تھا۔ مصحفی کے بزرگ مغل بادشاہوں کے ملازم تھے۔ تمام تذکرے مصحفی کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں خاموش ہیں البتہ مولانا حسرت موہانی نے اپنے ایک مضمون میں مصحفی کی تاریخِ پیدائش ۱۱۶۴ھ ہجری (۱۷۵۰ء) لکھی ہے (ماہنامہ 'اُردوئے معلّٰی'، جون ۱۹۰۶ء) لیکن اُنھوں نے اس کی کوئی سند نہیں دی۔ مصحفی کے اپنے 'تذکرۂ ریاض الفصحا'، اور اپنے دیوانِ ششم کے دیباچہ کے مطابق وہ قریباً ۱۱۶۱ھ ہجری (۱۷۴۸ء) میں پیدا ہوئے تھے، جو زیادہ قرینِ قیاس ہے

انگڑائی لیکے اپنا مجھپر خمار ڈالا — کافر کی اِس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا
بن دیکھے جس کے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں — کیا قہر ہے جو اُس سے برسوں جدائیاں ہوں
حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی رو ئیے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
اے مصحفی تو اِن سے محبت نہ کیجیو — ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دِلّی والیاں

[ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ 'مصحفی نمبر' جنوری ۱۹۲۹ء ' فروری ۱۹۳۰ء اور دسمبر ۱۹۲۹ء ۔ ماہنامہ 'دیوان' گورکھپور' جون ۱۹۳۵ء ۔ سہ ماہی 'اُردو' اپریل ۱۹۲۹ء ۔ ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور' مئی ۱۹۳۶ء ۔ تذکرہ 'شعر الہند' حصّہ اول]

متوسطین دورِ چہارم کے خصائصِ شعری

اِس دَور میں بھی سابقہ دورِ سوم کی طرح زبان و اظہارِ خیال کی صفائی و شیرینی ' سادگی و پُرکاری موجود ہے ' لیکن میرؔ کی داخلیت اور دردؔ کی اثر انگیزی کا فقدان ہے ۔ علاوہ ازیں اِس دَور سے تصنّع و مبالغہ ' رکیک جذبات و مُبتذل خیالات کا اظہار شروع ہوا ۔ مزید براں اِس دَور سے غزل کی ایک خاص صنف یعنی 'ریختی' کا رواج ہوا جس میں عورت بے دھڑک طور پر مرد سے اظہارِ محبت کرتی اور تمام اقدارِ اخلاق کے خلاف کُھلم کُھلا مادّی لذّت کے حصول کی خواہاں ہے ۔ اُردو غزل کی اِس مذموم صنف کے بانی ہاشمی دکنی تھے ۔ رنگینؔ ' انشاؔ اور جراَتؔ تینوں نے اُردو غزل میں ناشائستہ مضامین کو رواج دیا ' بلکہ رنگینؔ نے تو اس فحش صنف ریختی میں ایک پورا دیوان تصنیف کیا ۔ مصحفیؔ اِس دَورِ خرافات میں اپنا دامن بڑی خوبصورتی سے بچا گئے ۔ اُن کی اعلیٰ مثنوی نے اِس دَورِ پُرفتن میں اُردو شاعری کی لاج رکھ لی ۔ مصحفیؔ اور انشاؔ دونوں نے قصائد بھی لکھے لیکن وہ سوداؔ کے مقابلے میں نمایاں نہ ہو سکے ۔ اِس دور کے دہلوی شعراء لکھنؤ پہنچے ' جہاں اُردو شاعری کے ایک علیحدہ لکھنوی اسکول نے جنم لیا ' حالانکہ اس سے پیشتر کے دَورِ ثانی سے ہی لکھنؤ میں اُردو شاعری کا چرچا شروع ہو چکا تھا ۔

اِس دَور میں آگرہ اسکول کے ممتاز ترجمان میاں نظیرؔ اور ان کے لائق فرزند خلیفہ اسیرؔ اکبر آبادی تھے ۔ اور اُردو شاعری کے بہاری اسکول کے نمایندے راسخؔ عظیم آبادی جیسے خوش گو شاعر تھے ۔ لکھنوی اسکول کے پہلے شعراء نواب وزیر آصفؔ لکھنوی اور اخترؔ ہگلوی تھے ۔ اِس دَور کی اہمیت اِس لحاظ سے ہے کہ اس نے اُردو شاعری کے قدیم اسلوب کی ترقی و تنزل دونوں کا تجربہ کیا ' لیکن یہ حقیقت اپنی

جگہ مسلمہ ہے کہ درباری زندگی کے مُضر اثرات نے اُردو شاعری کی صحیح جذباتیت، داخلیت، گہرائی اور روحانیت کو سخت مجروح کیا، جن کی جگہ بدقسمتی سے ناشائستہ مادّیت اور شہوانیت نے لی۔ [دشعر الہند، حصّہ اوّل باب اوّل "تلامذہ شعرائے قدیم، ص ۱۰۷-۱۶۶ اور "متبعین شعرائے قدیم، ص ۱۶۷-۱۸۷]۔

متأخرین - دورِ پنجم

از ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۸ء

لکھنوی اسکول - اردو شاعری میں ابتذال

دہلی اور لکھنؤ کی باہمی ادبی رقابت

یہ دَور اُردو شاعری کے اُن شعرائ پر مشتمل ہے جو آخری تاجدارِ سلطنتِ مغلیہ شہنشاہ بہادر شاہ ثانی ظفر کے عہد میں موجود تھے، یعنی برِصغیر جنوبی ایشیا میں برطانیہ کے خلاف پہلی جنگِ آزادی کے اختتام تک، جس کی مدت، ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۸ء تک، اکیس سال ہے۔ اِس دَور میں دہلی اور لکھنؤ دونوں مدارسِ فکر کے شعراء شامل ہیں، نیز وہ غیر دہلوی وغیر لکھنوی اُردو شعراء جو ان کے ہمعصر تھے۔ اس دور کے بہاری شعرائ اثر عظیم آبادی اور صفیر بلگرامی تھے۔ اکبر آبادی اسکول کی نمایندگی مرزا غالب نے کی۔ لکھنوی اسکول میں حسبِ ذیل شعرائ شامل ہیں :-

نوازش، اسیر، اختر، ناسخ اور آتش اور ان کے تلامذہ، جو ۱۸۵۸ء تک زندہ تھے، یعنی رشک، برق، وزیر، بحر، آباد، خلیل، رند، صبا اور نسیم وغیرہ۔ ان کے دیگر تلامذہ کا تعلق دورِ ششم سے ہے۔ دہلوی شعرائ کی نمایندگی ان شعرائ نے کی :- شاہ نصیر، تنہا، تنویر، ذوق، مومن، ممنون، ظفر اور آزردہ وغیرہ۔ اور ان کے معروف تلامذہ، مثلاً نسیم، شیفتہ، مجروح، اور تسکین وغیرہ۔ ذوق، مومن اور غالب کے دیگر تلامذہ کا تعلق دورِ ششم سے ہے۔ ان کے علاوہ وہ اُردو شعرائ ہیں جن کا کوئی تعلق مذکورہ بالا مدارسِ فکر سے نہیں ہے، مثلاً نظام رامپوری، ذکی مراد آبادی اور عشرت بریلوی وغیرہ۔ اِس دَور میں اگر دہلوی اسکول کے مقابلے میں لکھنوی اسکول کے شاعرانہ وقار کو کسی شے نے بچایا تو وہ مرثیہ کی صنف ہے جس کو لکھنوی اسکول نے اپنایا اور جس کی ترقی کے باعث یہ دَور ممتاز ہے۔ لکھنؤ میں صنفِ مرثیہ کو ترقی دینے والے شعرائ بالخصوص میر خلیق، میر ضمیر اور میاں دلگیر تھے۔ مؤخرالذکر کے شاگرد امانت لکھنوی بھی اِس دور کے بڑے معروف شاعر تھے، جنہوں نے اُردو ڈرامہ کو حیاتِ نو بخشی۔

ایشیا میں علوم وفنون حکومتِ وقت کی سرپرستی کے ماتحت ہی زندہ رہے، خصوصًا فارسی شاعری

تو ہمیشہ ہی سرکار دربار سے وابستہ رہی، جس کی سرپرستی ہمیشہ ہی بادشاہ اور اُمرا کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ اُردو شاعری کی خوش نصیبی تھی کہ جب تک وہ دہلی میں رہی، حکومت اور دربار کے اثرات سے محفوظ رہی۔ لکھنؤ اُس وقت تک اُردو شاعری کے ایک مرکز کی حیثیت سے ممیز نہ تھا، وہاں کی شاعری خالصتاً کسی مادی انقلاب کی منتظر تھی چنانچہ جب مُغل بادشاہ شاہ عالم کے عہد میں دہلی اُجڑ گئی تو مادی ضرورت کے ماتحت باشندگانِ دہلی کو لکھنؤ کو ہجرت کرنا پڑی۔ اگرچہ اُس وقت دکن، دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ عظیم آباد اور مُرشد آباد بھی اُردو شاعری کے مراکز تھے، لیکن عام طور پر معروف شعرائے دہلی نے لکھنؤ کو ہجرت کرنے اور وہاں قیام کرنے کو ترجیح دی۔ اِس طرح دہلی کو حیاتِ تازہ لکھنؤ میں ملی اور ثانی الذکر مقام کو اُردو ادب میں وہی مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی جو اس سے قبل اوّل الذکر کو حاصل تھی۔

اگرچہ اُردو ادبا و شعرا کا لُٹا پِٹا قافلہ دہلی سے فیض آباد کی طرف نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت میں ہی رواں دواں ہو چکا تھا، لیکن اس کی پُرجوش پذیرائی لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کے زمانوں ہی میں ہوئی۔ اِس دَور میں لکھنؤ میں یہ ایک طرح کا دستور بن گیا تھا کہ وہاں ہر امیر کی سرکار میں اُردو شاعر اور شاعری کی سرپرستی اُس سرکار کے وقار میں اضافے کا باعث تھی۔ اِس طرح کوئی معروف اُردو شاعر لکھنؤ میں درباری اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ علاوہ ازیں، اِس دَور میں، درباداری کے مذموم اثرات نے شعراء کے باہمی تعلقات کو بھی سخت مسموم کیا حتیٰ کہ مشاعرے اکھاڑے بن گئے۔ لکھنؤ میں، درباری زندگی کے مضر اثرات کے ماتحت، میر اور سودا کے باہمی تعلقات بھی کشیدہ ہوگئے اور مصحفی، جرأت اور انشا ایک دوسرے کے حریف بن گئے ["شعر الہند"، حصّہ دوم صا]

بعض مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ یہ شاعرانہ رقابت پوری دشمنی بن گئی، دست بدست لڑائی ہوئی اور بعض شعرا اپنی جان تک کھو بیٹھے۔ معاشری و اخلاقی زندگی میں خرابیوں کے علاوہ، لکھنؤ میں خود نفسِ شاعری کو جو نقصان پہنچا وہ ناقابلِ تلافی تھا جبکہ اُردو شعرائے اپنے حریفوں کو زک پہنچانے اور اُنھیں شکست دینے کے لیے نت نئے عنوانات شاعری دریافت کئے۔ مثلاً ہجوگوئی ایک صنفِ شاعری کے طور پر اُسی نامبارک دَور کی غیر محمود یادگار ہے۔ رخاص کر سید انشا نے اپنے حریفوں کے خلاف ایسی بدگوئی و بدکلامی کی بوچھار کی کہ ان کے معاصرین کی زندگیاں حرام ہوگئیں۔ اِس طرح اِس دَور میں اُردو شاعری نے اپنی روایتی سنجیدگی و وقار کو برباد کر دیا، جس کی بہ محرومی لکھنوی اسکول اور معاشرت کا براہِ راست نتیجہ تھی۔ انشا تو اِس نہج پر تمام حدودِ اخلاق سے تجاوز کر گئے جس کی بنا پر اُن کا نام بمشکل اچھے شعرائے کے ضمن میں لیا جاسکتا ہے ["شعر الہند"، جلد اول صہ ۷۶ — ۸۰]۔

اگرچہ مذکورہ بالا دہلوی و لکھنوی باہمی رقابتِ شعری جاری رہی جس کے دوران میں بڑی ادبی معرکہ آرائیاں ہوئیں، بہ ایں ہمہ یہ واقعہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ ان دونوں دہلوی اور لکھنوی ادبی مراکز میں ایسی تحریکیں بھی زندہ رہیں جنھوں نے اس مذموم رقابت کی تردید میں اُردو ادب کی صحیح ترجمانی کی۔ اس حریفانہ ادبی جنگ میں ایک نے دوسرے کو غیر معلوم طور پر متاثر بھی کیا۔ یعنی اگر ایک طرف لکھنوی مرکز اُردو نے زبان کی اصلاح کی طرف توجہ دی تو دوسری طرف دہلوی مدرسۂ فکر نے اصل روحِ شاعری کو زندہ و بیدار رکھا۔ لکھنؤ میں اُردو شاعری کا پہلا دَور دہلوی شعرا کا تھا، جس میں میرؔ اور سوداؔ کا دَور دورہ تھا۔ دُوسرا دَور شعری بھی دہلوی شعرا سے متاثر تھا، جس میں مصحفیؔ، انشاؔ اور جراَتؔ نمایاں تھے۔ اِس دَور میں لکھنؤ میں زبان اُردو کے سب سے بڑے مُصلح ناسخؔ تھے۔ ان کے فوراً بعد مومنؔ دہلوی کے شاگرد اور پیرو نسیمؔ دہلوی لکھنؤ آئے جہاں اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نسیمؔ نے ناسخؔ کی اُردو میں لسانی اصلاحات کو قبول کیا لیکن دہلوی اسلوب کو برقرار رکھا۔ میر حسن دہلوی کے خاندان اور مُتبعین نے لکھنؤ میں اپنے روایتی دہلوی طرزِ کلام کو جاری رکھا اور ان کے پوتے میر انیسؔ نے ایک مرتبہ فخریہ طور پر یہ جملہ کہا تھا کہ "یہ میرے خاندان کی روایت ہے، شرفائے لکھنؤ ایسا نہیں کہتے"۔ اِس ایک فقرے سے انیسؔ اور دبیرؔ کے مابین زبان کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ میں ناسخؔ کے حریف آتشؔ دہلوی تھے، جن کی ناسخؔ کے مقابلے میں ایک بہتر شاعر کی حیثیت سے غالبؔ نے تعریف کی ہے۔ لکھنؤ کے زوال کے بعد رامپور اُردو شعرا کا مرکز بن گیا جہاں دہلی اور لکھنؤ دونوں جانب سے شعرائے اُردو پہنچے۔ اِس باہمی ملاپ نے اسیرؔ جیسے تجربہ کار شاعر کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا، حتیٰ کہ امیرؔ اور جلالؔ کے اسالیبِ شعری بھی مکمل طور پر بدل گئے۔ بہ ایں ہمہ داغؔ نے لکھنوی اندازِ شعری کو اپنایا۔ خود لکھنؤ میں شعرا غالبؔ کے فنِ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ اِس ادبی مفاہمت کا اس سے بہتر اور ثبوت کیا دیا جا سکتا ہے کہ آج دہلوی اور لکھنوی دونوں مدارسِ فکر کے رہنماؤں۔ داغؔ اور امیر مینائیؔ۔ کی قبریں ایک مقبرے میں برابر برابر حیدرآباد (دکن) میں بنی ہوئی ہیں [خطبۂ صدارت نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔ اورینٹل کانفرنس، لاہور، ۱۹۲۸ء]

اُردو شاعری کے اِس دَورِ چہارم میں، پہلی بار انشاؔ، جراَتؔ اور مصحفیؔ نے نت نئی بدعتوں کو رائج کیا، زبانِ اُردو میں انقلابی تبدیلیاں کیں اور تغزل میں خارجی مضامین کو متعارف کیا۔ بعد ازاں ناسخؔ اور آتشؔ اور ان کے مُتبعین نے ان خارجی عناصر کو مزید بڑھایا۔ مصحفیؔ اور انشاؔ کے زمانے تک ہر چند کہ اُردو شاعری کا لکھنؤ میں رواج تھا تاہم وہاں تمام وہ لوگ، جن پر اُردو شاعری ناز کرتی تھی، دہلی سے لکھنؤ آئے تھے اور اپنے غیر لکھنوی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ میرؔ نے ایک موقع پر اپنے کلام میں "دہلی کے اُجڑے

دیار" کو لکھنؤ سے دس مرتبہ زیادہ ترجیح دی تھی اور مصحفی نے اس بات پر فخر کیا تھا کہ اُن کا اسلوب شعری "صحرائیانِ پورب" کے طرزِ اظہار سے مختلف ہے [" شعر الہند" حصۂ اول، باب دوم ص ۲۰۴-۲۱۵]

بہ ایں ہمہ انھیں "صحرائیانِ پورب" میں، خود مصحفی کے زمانے میں، شیخ امام بخش ناسخ اُردو شاعری کے اُفق پر اُبھرے جنھوں نے بیشتر قدیم ادبی روایات کو منسوخ کر دیا اور اُردو زبان کی صورت ہی بدل کے رکھ دی۔ اِس طرح اُنھوں نے اُردو زبان میں مکمل انقلاب رُونما کر دیا، جسے خود مصحفی نے قبول کر لیا اور جس کو اُنھوں نے اپنے دیوانِ ششم کے دیباچے میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ناسخ نے قدیم اُردو شعرائے کے سیدھے سادے اسلوبِ شاعری کو یکسر بدل ڈالا اور عروض کے قدیم قوانین میں اہم ترامیم کیں۔ اُنھوں نے ہندی اور بھاشا کے الفاظ کے استعمال کے بجائے اُردو زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کو متعارف کر کے زبان کو مہذب بنایا اور اُن عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کی، جو زبان میں کثرت سے رائج تھے، تذکیر و تانیث کے فیصلے کے لیے باقاعدہ قواعد ایجاد کیے اور ایسی ہی بے شمار اصلاحات کیں۔ اگرچہ اُردو زبان میں اصلاحات کا آغاز مرزا مظہر اور شاہ حاتم کے زمانے سے ہو چکا تھا، جو بعد کے ہر دور میں جاری رہا تھا، پھر بھی زبان اُردو کی مکمل اور آخری اصلاح کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی تھی جس کو شیخ ناسخ نے بحسنِ احسن اور بڑی تکمیل کے ساتھ انجام دیا۔ اُن کے اِس عظیم کارنامے کو عام طور پر بنظر استحسان دیکھا گیا [" جلوۂ خضر" جلد دوم]۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، گو مرزا مظہر اور شاہ حاتم نے اُردو زبان میں اصلاحات کا آغاز کر دیا تھا، لیکن خود اُنھوں نے اپنی ان اصلاحات پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ یہی کچھ سودا اور میر کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مصحفی اور انشا کے زمانے میں بھی زبان میں کچھ اصلاحات کی گئیں لیکن عام طور پر ہنوز وہی زبان رائج رہی جو میر اور سودا کے زمانے میں مستعمل تھی۔ بہ ایں ہمہ ہر دور میں اصلاحِ زبان کی کوششیں جاری رہیں حتیٰ کہ آخر کار شیخ ناسخ نے مکمل طور پر زبان کی کایا پلٹ دی، جسے عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک طرح سے شیخ ناسخ کو میر اور سودا دونوں پر فوقیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ وہ خود اپنی اصلاحات پر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہے۔ زبان میں اس انقلاب کے محرک ہونے کے باعث ناسخ اور آتش دونوں نے اُردو شاعری کے لکھنوی اسکول کے وقار کو بلند کرنے میں بڑی مدد دی۔ اس لیے اُن کے وقت سے دہلی اور لکھنؤ کے دو مختلف مدارسِ فکرِ شعری وجود میں آئے جن کی روایاتِ شعری، اسالیب اور خصوصیات مختلف تھیں۔ مثلاً زبان میں مکمل انقلابی اصلاحات کے باوجود لکھنوی معاشرت میں جو نسوانیت عام طور پر پھیل گئی تھی اُس کا اثر لکھنوی اسکول کی اُردو شاعری پر بھی پڑا، جو ناسخ آتش

اور رند کے کلام سے عیاں ہے، لیکن دہلوی شعرائے اپنے کلام کو بڑی حد تک اس نسوانی اثر سے پاک رکھا اور قدیم اُردو شعرا کے طرزِ بیان و اسلوب کو برقرار رکھنے کی سعی کی [کاشف الحقائق، جلد دوم صفحہ ۱۴۰ و گلستانِ سخن، از مرزا قادر بخش صابر صفحہ ۲۴۵ - اور جلوۂ خضر، جلد اول صفحہ ۲۳۰]۔

اِس عہد کی اُردو شاعری میں رومانی اقدار کا خاتمہ ہو گیا، قدیم روابط بے ربط ہو گئے اور نت نئی مجالس وجود میں آئیں۔ مادی اور جسمانی محبت کا بیباکانہ اظہار موضوعِ شاعری بنا، اور روحانی و آفاقی رومانیت و تغزل کے بجائے خواہشِ نفسانی کی تکمیل اور شہوانی تلذذ کے حصول کا بے دھڑک اظہار مروّج ہوا۔ اِس طرح نفاست و شائستگی رخصت ہو گئے، معنویت کی جگہ لفاظی اور خلوص و صداقت کی جگہ مبالغہ و تصنع نے لیلی، عصمتِ غزل لُٹ گئی، دل کے معاملات زبان پر آ گئے اور اُردو شاعری کی سنجیدگی و وقار قصۂ پارینہ بن گئے۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا اپنے اسالیب کی پستی و ناشائستگی کے باعث محض تک بند معلوم ہونے لگے۔ دہلی میں اُردو شاعری نے فقرا و غربا کی جھونپڑیوں میں جنم لیا تھا اور درویشوں کی خانقاہوں میں وہ پروان چڑھی تھی، لیکن لکھنؤ میں وہ شاہی محلات اور درباروں کی لاڈلی بنی جہاں عیش و عشرت کی فراوانی اور لہو و لعب کی ارزانی تھی۔ لکھنؤ میں مشاعروں نے اکھاڑوں کی صورت اختیار کر لی، معنویت و داخلیت، خلوص و صداقت، فطری جذبات و شائستگی کے فقدان نے اُردو شاعری کو ایک بےجان جسم بنا دیا۔ بادشاہوں اور اُمرا کی پسندیدگی و ناپسندیدگی معیارِ شاعری ٹھیرے اور فحاشی معمول بن گئی۔ اِس دور میں لکھنوی شعرا میں صرف آتش کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے یا پھر غیر لکھنوی اور دہلوی شعرا کو۔ مرزا غالب نے ایک موقع پر دہلوی اور لکھنوی مدارسِ فکرِ شعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ دہلی کا طرزِ بیان اور لکھنؤ کی زبان مستند ہیں۔" [ماہنامہ 'نسول' آگرہ - جنوری ۱۹۳۶ء]۔

حکومتِ اودھ (یو پی، انڈیا) دہلی کی سلطنتِ مغلیہ کے خلاف غداری و بغاوت کا دوسرا نام ہے کیونکہ لکھنؤ کی بادشاہت ملک کی باقاعدہ سلطنت کے خلاف غاصب برطانیہ کی بساطِ سیاست پر ایک شاطرانہ چال تھی تاکہ سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر جائے۔ نتیجتاً حکمرانانِ اودھ سلطنتِ دہلی سے متنفر کئے گئے اور باشندگانِ لکھنؤ نے اُسی مسموم سیاسی فضا میں دہلی سے رقابت ورثے میں لی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ نے ہر دہلوی شے کو مسخ کرنے کی سعی کی۔ مثلاً اگر کسی اسم کی تجنیس دہلی میں مذکر تھی تو اہالیانِ لکھنؤ کو اُس وقت تک چین نہ آیا جب تک کہ اُنھوں نے اُسے مؤنث نہ بنا لیا۔ پھر ایک نہایت اہم فرق مذہب و مشرب کا بھی تھا، جو تاریخِ اودھ کا ایک نہایت دردناک باب ہے۔ حکومتِ اودھ کی مکمل تاریخ ایران کے حکمراں صفوی خاندان کی گویا ایک کاربن کاپی ہے، جس نے ایرانی شاعری کو ایک طویل

دبیر مختتم مرثیہ کی شکل دیدی تھی۔ اور لکھنؤ میں اُردو شاعری گندہ دہنی، فحش نگاری اور یاوہ گوئی کے مترادف تھی۔ اس لیے لکھنؤ کا یہ ادبی دَور، جسے مبالغہ کرنے والوں نے ایک 'سنہرے دَور' سے تعبیر کیا ہے، ذہنی، ادبی و اخلاقی حیثیت سے اتنی پستی میں گر گیا تھا کہ اُس کے زوال کی مثال بین الاقوامی تاریخ میں بھی بمشکل مل سکتی ہے۔ اس بادشاہت اودھ کا ہر حکمراں انسانی کردار و اخلاق کے لحاظ سے بہت پست تھا۔ چنانچہ اُنیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے میں لکھنوی شاعری ناسخ و وزیر جیسے شعرا ہی پیدا کر سکتی تھی نہ کہ درد اور قائم۔ لکھنؤ کی اُس مسموم فضا میں ہر سانس لینے والا خواہ وہ محل میں رہتا ہو یا جھونپڑے میں یکساں طور پر جنسی بدعنوانی کا شکار تھا اور اس کے حواس پر عورت سوار تھی۔ اسی لیے اُس دور کا لکھنوی شاعر اپنے عہد کی نسوانیت کی پیداوار اور اپنی مذموم سوسائٹی کا نمایندہ تھا۔

لکھنوی شاعری کے معنی ہیں ناسخ، آتش اور مصحفی اور ان کے تلامذہ کے افکارِ شعری۔ ناسخ کے کلام کا پھیکا پن اور بے اثری ضرب المثل ہیں اور ان کے تلامذہ اپنے اُستاد سے چنداں بہتر نہ تھے۔ بہار، سحر اور وزیر ناسخ کے معروف تلامذہ تھے اور اُن کی مجموعی شاعرانہ تخلیق محض سعئ لاحاصل تھی۔ آتش یقیناً ناسخ سے بہتر شاعر تھے مگر ان کی شاعری میں بھی لکھنوی اسکول کی خصوصیات وافر طور پر موجود ہیں۔ آتش کے معروف شاگرد رند اور صبا تھے، جن کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنوی اسکول کی شاعری کے نمایندے تھے۔ مصحفی کا تعلق لکھنؤ سے نہیں تھا لہٰذا ان کا شمار اس زمرے میں نہیں ہو سکتا ['مذاکراتِ نیاز'، (لکھنؤ کی شاعری)، از نیاز فتحپوری]

میر جیسا حقیقی شاعر بھی مکمل طور پر لکھنؤ سوسائٹی کے مذموم اثرات سے اپنا دامن نہیں بچا سکا، جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی شکاری تفریحات پر ان کی مثنویوں سے ظاہر ہے۔ یہی الزام سودا پر بھی صادق آتا ہے، جن کے آخری قصاید، خاص کر اُن کی ہجویات لکھنوی اسلوب کی حامل ہیں۔ ہزلیات لکھنوی اسکول کے ادبی زوال کی غالباً بدترین مثال ہیں، جو یقیناً اُردو ادب کے ماتھے پر سیاہ دھبہ ہیں اور جن کے لیے خرافات کی اصطلاح بھی کم ہے۔ انشا اور جرأت دونوں لکھنوی رنگ میں پورے طور پر رنگ گئے تھے، حد یہ کہ مصحفی جیسے سنجیدہ شاعر کی 'نامساعد ماحول کے باعث' بُردباری بھی مجروح ہو گئی تھی۔ افسوس کہ آتش جیسا زیرک و ذہین شاعر اودھ میں پیدا ہوا، کیونکہ آتش کے کلام کا وہ حصّہ جو لکھنوی اسلوب کی شاعری سے کسی طرح بچ گیا تھا عمدہ اور مطالعہ کے قابل ہے۔ یہ یقیناً اُردو شاعری کا ایک المیہ ہے کہ مُتقدمین اور متوسطین کے تمام نقائص تو تلامذۂ ناسخ و آتش کو ورثے میں ملے لیکن ان کے محاسن نہیں ملے۔ لکھنؤ کی بادشاہت کے زوال کے بعد بھی لکھنوی اسکول کے شعرا اپنے کلام کو بہتر نہ بنا سکے [ماہنامہ 'نگار'، لکھنؤ۔ فروری

۱۹۳۹ء - ماہنامہ 'ندیم' بھوپال، جولائی ۱۹۳۷ء - 'شعرالہند' حصۂ اوّل - باب اوّل ص ۱۷ – ۹۲]

سطورِ بالا میں ہم نے اس دور کی لکھنوی معاشرت اور اس کے زیر اثر لکھنوی شاعری کے ابتذال کی عکاسی کی ہے لیکن یہ امرِ انصاف اور مورخانہ دیانت کے منافی ہوگا اگر اُن قابلِ تعریف خدمات کا حوالہ نہ دیا جائے جو لکھنؤ نے اُردو زبان کی ترقی و اصلاح کے لیے انجام دیں۔ قطع نظر اس کے کہ لکھنوی شاعری اعلیٰ جذبات کی عکاسی سے یکسر محروم ہے اور اس نے درباری اثرات کے ماتحت مُبتذل محسوسات کی بازاری زبان میں ترجمانی کی۔ لکھنؤ عرصے سے ایک ممتاز علمی مرکز رہا ہے۔ اسلامی علوم کا معروف دینی ادارہ 'فرنگی محل' وہیں ہے اور وہیں 'ندوۃ العلماء' کی بھی بنیاد رکھی گئی۔ لکھنؤ ہی میں اُردو زبان کی وہ مکمل و مستقل اصلاحات ہوئیں جن کے باعث وہ آج دُنیا کی عظیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور جس کا لوہا دہلی نے بھی مانا۔ لکھنؤ کی ان اصلاحات کی بدولت آج اُردو زبان ہر قسم کی سائینسی اور ٹیکنکی اظہارِ خیال پر قادر ہے۔ انیس و دبیر کے افکارِ شعری اُردو زبان کی وہ ٹکسالیں تھیں جن سے الفاظ و مصطلحات ڈھل ڈھل کر نکلتے اور سکۂ رائج الوقت کی طرح ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلتے رہے۔ ناسخ نے اُردو الفاظ کے ساتھ وہی کام لیا جو ایک جوہری جواہرات کے ساتھ کرتا ہے۔ ناسخ کے شاگرد رشک نے اپنے اُستاد کے اس قابلِ قدر کام کو جاری رکھا بلکہ اسے مزید ترقی دی۔ لکھنؤ میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ۱۸۴۰ء میں 'نفس اللغات' کے نام سے ایک اُردو لُغت مُرتب کی۔ لکھنؤ ہی میں سید انشا نے اپنی معروف کتاب 'دریائے لطافت' تصنیف کی۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخ کے ایک اور شاگرد بہار نے بھی ایک اُردو ڈکشنری مُرتب کی تھی مگر وہ ناپید ہے۔ جلال لکھنوی نے اُردو گرامر پر اپنی متعدد تصانیف سے اُردو زبان کو مالا مال کردیا، مثلاً 'سرمایۂ زبانِ اُردو'، 'مفید الشعراء'، 'تنقیح اللغات'، 'گلشنِ فیض'، اور 'قواعد المنتخب'، وغیرہ۔ اپنی شاعری کے علاوہ امیر مینائی نے 'امیر اللغات' کی تصنیف سے زبانِ اُردو کی بیش قیمت خدمت انجام دی مگر افسوس کہ وہ نامکمل رہی۔ خان علامہ تفضل حسین خاں سیالکوٹی، جو لکھنؤ میں آبسے تھے، ایک ماہرِ لسانیات، مُہندس اور ہیئت داں تھے اور لاطینی اور انگریزی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ اُنھوں نے ہیئت اور الجبرا وغیرہ پر متعدد کتب تصنیف کی تھیں۔ وہ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں موجود تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۰۰ء میں ہوا تھا۔

منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک ہوشیار جنگ رتن سنگھ زخمی بریلوی نواب محمد علی خاں کے میر منشی تھے۔ وہ انگریزی زبان کے علاوہ علوم ہیئت و ریاضی میں بھی ماہر تھے۔ وہ ٹیکنکی اصلاحات وضع کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتے تھے اور 'حدایق النجوم' (۱۸۳۷ء) کے مصنف تھے۔ راجے

منولال سنڈیلوی، جو نواب آصف الدولہ کے ایک درباری تھے، بڑے فلسفی اور سائنٹسٹ تھے اور علوم ریاضی، جغرافیہ، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ پر متعدد رسائل کے مصنف تھے۔ اُن کی رحلت ۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ مولوی محمد اسماعیل مُرادآبادی جو نواب نصیر الدین حیدر کے لندن میں ایجنٹ تھے، ایک معروف دانشور و مصنف تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۳۷ء میں ہوا۔ ان کے معاصر و ہمکار مولوی عبدالرب اور مولوی کمال الدین حیدر نے شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں ۱۸۳۱ء میں لکھنؤ میں انگریز انجینیروں کے تعاون سے ایک رصدگاہ تعمیر کی تھی۔ شاہانِ اودھ کی زیرِ سرپرستی ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا جس میں سائنس کی نئی کتابیں ترجمہ کی جاتی تھیں اور انھیں شاہی مطبع میں طبع کیا جاتا تھا۔ جہاں تک قصہ کہانی کی اشاعت کا تعلق ہے تو داستانِ امیر حمزہ، نوشیرواں نامہ، طلسم ہوش رُبا، ایرج نامہ، بوستانِ خیال، اور فسانۂ آزاد، وغیرہ اور ان کے مصنف میر محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین، طوطا رام شایاں اور رتن ناتھ سرشار کیسے بھلائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح سے نواب مرزا شوق اور دیاشنکر نسیم کے ناموں کو صنفِ مثنوی سے کس طرح علیحدہ کیا جاسکتا ہے اور امانت کا نام کون فراموش کرسکتا ہے جو اُردو ڈرامہ اور تھیٹر کے بانی تھے۔ لکھنؤ کو شرر، سرشار، مرزا رُسوا، سجاد حسین اور جوالا پرشاد برق وغیرہ پر ناز ہے۔ اُردو ادب کے ناشرین کے طور پر قدیم اُردو مطابع 'مطبع مصطفائی، مطبع سلطانی، اور مطبع نولکشور بھی لکھنؤ ہی میں تھے۔ بالخصوص نولکشور پریس لکھنؤ نے، جو ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا تھا اُردو کی بے شمار عمدہ کتابیں شائع کیں [خطبۂ صدارت سید سلیمان ندوی، اُردو کانفرنس، ہندوستانی اکادمی، لکھنؤ جنوری ۱۹۳۷ء]

دَورِ پنجم میں لکھنوی اسکول کی مُبتذل اُردو شاعری کے بعد، دَورِ ششم میں لکھنوی اسکول نے خاص طور پر صنفِ تغزل میں زبردست سنبھالا لیا، جبکہ دہلوی اسکول کے اعلیٰ تخیل کو قابلِ تعریف طور پر لکھنوی اسکول کی اصلاح شدہ رنگین بیانی میں سمو دیا گیا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ دورِ جدید اور دَورِ حاضر میں لکھنوی اسکول کی اُردو شاعری دہلوی اسکول پر بازی لے گئی۔ دَورِ پنجم میں تو دہلوی شعراء نے بھی کسی بلند خیالی و علوئے تخیل کا خاص ثبوت نہیں دیا۔ اسی وجہ سے وہ تنقید سے بچ نہ سکے اور جہاں تک حقیقی تغزل کا تعلق ہے، شاہ نصیر اور ذوق غیر فطری شعراء تھے۔

اس مُبتذل دَورِ شاعری میں جبکہ اُردو شاعری محض تُک بندی بن کے رہ گئی تھی، دہلی نے غالب اور مومن کی بدولت، اس کی لاج رکھ لی۔ دراصل اُردو شاعری نے دہلی سے لکھنؤ کو ہجرت نہیں کی تھی بلکہ محض معدودے چند دہلوی شعراء نے ایسا کیا تھا، باوجود سنگین نقصانات کے، دہلی میں پھر بھی اُردو ادب کا مرکز بنے رہنے کی توانائی باقی تھی۔ غالب، مومن اور چند دیگر دہلوی شعراء کی بدولت، دہلی میں اُردو شاعری اُس قعرِ مذلت

ہیں نہیں گری جس میں لکھنوی شاعری گر گئی تھی [ماہنامہ نیرنگِ خیال، سالنامہ، لاہور ۱۹۳۶ء]

(۱)

شمس العلماء نواب مولوی حکیم سید امداد امام اثرؔ

اثرؔ شمس العلماء مولوی سید وحید الدین خاں بہادر صدرِ اعلیٰ کے بیٹے اور مولوی سید امداد علی خاں بہادر صدرِ اعلیٰ اور ضلع پٹنہ میں قصبۂ نیورہ کے زمیندار کے پوتے تھے۔ اُن کے آبا‌ء خود کو حضرت زید شہید کی اولاد میں بتاتے تھے۔ اثرؔ قصبۂ نیورہ میں ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ "تذکرۂ کاشف الحقائق" کے مصنف تھے، جو 'بہارستانِ سخن' کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ سر علی امام اور سید حسن امام ان کے فرزند تھے۔ اثرؔ کا نمونۂ کلام:۔

ہمیں بزمِ عدو میں وہ بُلاتے ہیں تمنا سے
کرم ایسا بھی ہوتا ہے، ستم ایسا بھی ہوتا ہے

خزانِ زندگی ہے تفرقہ اہلِ محبت کا
مزہ دُنیا میں جینے کا بہارِ دوستاں تک ہے

(۲)

سید فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی

صفیرؔ سید محمد مہدی خبیرؔ، شیخ امان علی سحرؔ لکھنوی، دبیرؔ لکھنوی، غالبؔ اور سید رضا حسین بلگرامی کے شاگرد تھے اور ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۸۸۹ء ہے۔ اُن کا وطن بلگرام تھا لیکن وہ پیدا مارہرے میں ہوئے تھے۔ صفیرؔ بیشتر ضلع شاہ آباد کے مقام آرہ میں رہے تھے۔ وہ مشہور "تذکرۂ جلوۂ خضر" کے مصنف تھے۔ ان کے والد کا نام میر سید احمد تھا اور ان کے نانا سید صاحبِ عالم مارہرے میں اپنے زمانے کے جید عالم اور شاعر تھے۔ صفیرؔ کا نمونۂ کلام:۔

عُذر کرتے ہیں، لو قصور ہوا
کہہ دو منہ سے کہ رنج دُور ہوا

بچھڑ گئے ہم سے یار، کیا کہنا
یوں ہی کرتے ہیں پیار، کیا کہنا

(۳)

مرزا خان نوازش لکھنوی

نوازش سرور کے اُستاد اور ناسخ کے ہمعصر تھے۔ اُنھوں نے بھی تنویر دہلوی، ذکی مُراد آبادی اور میر کلو عرش دہلوی کی طرح، ناسخ اور آتش دونوں کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں اُردو شاعری میں اپنی اُستادی کا سکہ جمانا چاہا تھا، مگر ان کی شاعری پھُس پھُسی تھی۔ اُن کی کچھ چل نہ سکی۔

(۴)

تدبیر الدولہ، مُدبّر الملک، بہادر جنگ، خان بہادر میر مظفّر علی اسیؔر

اسیؔر کے باپ سیّد مدد علی تھے اور اُستاد مصحفی۔ اسیؔر ۱۸۱۳ء میں ضلع لکھنؤ کے قصبۂ امیٹھی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں رامپور میں فوت و دفن ہوئے۔ وہ والیٔ اودھ شاہ نصیر الدین حیدر کے درباری تھے اور اُنھوں نے لکھنؤ میں دونوں بادشاہوں امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا عہد دیکھا تھا۔ وہ اودھ میں دارونۂ جیل تھے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں اسیؔر لکھنؤ میں تھے۔ وہ واجد علی شاہ کی جلاوطنی میں ان کے ساتھ کلکتہ گئے تھے لیکن لکھنؤ واپس آکر پھر رامپور میں بس گئے تھے۔ اسیؔر عربی اور فارسی کے بڑے عالم اور اچھے شاعر تھے۔ وہ فارسی شاعری میں ایک، اُردو غزل میں تین اور حمد و نعت میں ایک دیوان کے مالک تھے۔ ایک حد تک اُن کا اسلوبِ شعری ناسخ کے کلام سے ملتا جُلتا ہے۔ اُن کے شاگردوں میں دو معروف ہوئے۔ ایک تو اُن کے اپنے فرزند حشمت الدولہ بہار الملک صولت جنگ خان بہادر سیّد غضنفر علی حکیم اور منشی امیر احمد امیر مینائی۔ اسیؔر کا نمونۂ کلام:۔

خُدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دُنیا
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

باقی ابھی ہے ترکِ تمنّا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنّا نہیں مجھے

تھک چکے ہیں پاؤں، اُس کا آستانا دُور ہے
دن ہے کم، منزل کڑی ہے اور جانا دُور ہے

(۵)

ابوالمنصور، سکندر جاہ، ناصرالدین، قیصرِ زماں، سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر شاہِ اودھ

اختر کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے لیکن کہا گیا ہے کہ وہ برق لکھنوی کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ وہ والیِ اودھ امجد علی شاہ کے فرزند تھے۔ وہ ۱۸۴۷ء میں تختِ اودھ پر بیٹھے اور ۱۸۵۶ء میں اُنھیں انگریزوں نے معزول کر کے کلکتہ کو جلاوطن کر دیا، جہاں ۱۸۸۷ء میں اُن کی وفات ہوئی اور وہ کلکتہ کے مٹیا بُرج میں امام باڑہ سبطین آباد میں دفن ہوئے۔ کلکتہ میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں وہ محلّہ موشی خولہ میں قیام پذیر ہوئے تھے اور ان کی قیام گاہ کا نام 'سلطان خانہ محل' تھا۔ اختر ایک عیش طبع لیکن فیاض حکمراں اور علما و شعرا کے بڑے مُربّی تھے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری میں چھ دیوان چھوڑے۔ اُن کے عہدِ حکمرانی میں لکھنؤ میں اُردو شعرا کا ایک جمِ غفیر تھا۔ اختر کے متعدد شاگرد تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام:۔

تیری یاد کا دل میں وہ جوش ہے
غمِ دین و دُنیا فراموش ہے!

دیکھ کر نشہ چشمِ میگوں کا
بے پیئے مے آثار آ جائے

آنسو بہے رُخ پر
دل نے مجھے رُسوا کیا

(۶)

والا جاہ میر علی اوسط رشک

رشک میر سلیمان لکھنوی کے بیٹے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ وہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ وہ 'نفس اللغات' کے مصنّف تھے۔ ناسخ کے بعد اُنھی نے ناسخ کے

اصلاحِ زبانِ اُردو کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کیا تھا۔ رشک کے شاگرد بہت تھے۔ اُن کا انتقال ۱۸۶۷ء میں ہوا اور وہ عراق میں کربلائے معلّٰی میں دفن ہوئے۔ اُن کے تین دیوان تھے، جن میں سے دو انھوں نے خود شائع کئے تھے لیکن تیسرا کھو گیا تھا۔ افسوس کہ رشک کی لُغات، شائع نہ ہوسکی۔ اُن کے دونوں مطبوعہ دیوانوں کے نام یہ ہیں :۔ "نظمِ مبارک" اور "نظمِ گرامی"۔ لیکن وہ متداول نہیں ہیں۔ ان کے شاگردوں میں مُنیر شکوہ آبادی زیادہ معروف ہوئے ["خُمخانۂ جاوید" جلد سوم]۔ رشک کا نمونۂ کلام :۔

بوسہ ہمیں دیتا ہے تو دے دونوں لبوں کا
یوں تو مزۂ قندِ مکرّر نہ ملے گا!

شبِ ہجراں سحر ہوئی تو کیا
کسے اُمیدِ زندگانی ہے

بے وصل جو روتا ہوں تو ہو کر متبسّم
فرماتے ہیں "بے فصل کی برسات نکالی"

(۷)

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں بہادر برقؔ

برقؔ مرزا کاظم علی صالح کے فرزند اور ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ وہ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے تھے جہاں وہ ۱۸۵۷ء میں فوت و دفن ہوئے ان کا وطن و مولد لکھنؤ تھا۔ وہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اُن کے متعدد شاگرد تھے جن میں حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی ابن حکیم اصغر علی لکھنوی داستان گو زیادہ مشہور تھے۔ برقؔ کا نمونۂ کلام :۔

قیس کا نام نہ لو، ذکرِ جُنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم، موسمِ گُل آنے دو

سِسکتا ہوں، اچھے مسیحا ہیں آپ
نہ مارا نہ تم نے جلایا مجھے

(۸)

خواجہ محمد وزیر وزیر

وزیر خواجہ محمد فقیر لکھنوی کے فرزند اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ وہ لکھنؤ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں ۱۸۵۱ء میں فوت ہوئے۔ وزیر خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے۔ ان کے شاگرد بہت تھے جن میں زیادہ مشہور آفتاب الدولہ خواجہ اسد قلق لکھنوی اور حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں گویا گوالیاری (جو لکھنؤ میں مقیم تھے) تھے۔ وزیر شوکت بخاری کے طرزِ کلام کے متبع اور ناسخ کے سچے پیرو تھے۔ آتش کے شاگردوں میں صبا اور نسیم نے ناسخ کے اسلوبِ شاعری کی پیروی کی۔ وزیر نے اپنی زندگی تنہائی میں گذاری۔ اُن کا نمونۂ کلام:-

چُومتا ہوں لبِ شیریں، وہ خفا ہوتا ہے
کیا شکر رنجیِ جاناں میں مزا ہوتا ہے

ہے چشم نیم باز، عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے، درِ فتنہ باز ہے

اِسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

(۹)

شیخ امداد علی بہار

بہار شیخ امام بخش لکھنوی کے بیٹے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۱۰ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ لکھنؤ میں توپ دروازے میں رہتے تھے۔ بہار نے مدت تک رامپور میں ملازمت کی۔ اُن کا انتقال ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ میں ہوا جہاں وہ کربلائے تال کٹورا میں دفن ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی عسرت میں بسر کی۔ وہ ناسخ کے کلام کے پیرو تھے۔ بہار کا نمونۂ کلام:-

بُرا مان جاؤ گے، مُنہ پھیر لو گے
نہ پوچھو قسم دیجے، کیا چاہتا ہوں

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل!

(۱۰)

مرزا مہدی حسن خاں آباد

آباد مرزا غلام جعفر خاں لکھنوی کے فرزند اور ناسخ کے شاگرد تھے وہ "بہارستانِ سخن" کے مصنّف تھے اور لکھنؤ میں ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے غزل کی ہر بحر میں ایک علیحدہ دیوان مرتب کیا تھا۔ آباد کا نمونۂ کلام:-

تیرے ہر ایک سخن میں ہیں بہم دو پہلو
کبھی اقرار سے ہوتا نہیں انکار جُدا

دُور سے بھی اگر اشارے ہوں
میرے جینے کے کچھ سہارے ہوں

(۱۱)

میر دوست علی خلیل

خلیل سید جہاں علی کے بیٹے تھے۔ وہ بارہ (اودھ) کے علاقے میں قصبۂ بداولی میں پیدا ہوئے تھے مگر اُن کی سکونت لکھنؤ میں رہی، جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں فوت ہوئے۔ خلیل آتش کے شاگرد تھے۔ وہ نواب نادر مرزا کے ساتھ کلکتہ گئے تھے۔ وہ صاحبِ دیوان شاعر تھے، انکا دیوان لکھنؤ کے مطبع نامی میں طبع ہوا تھا۔ وہ واجد علی شاہ کے عہد میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے اور اُنھیں فارغ البالی حاصل تھی۔ خلیل کا نمونۂ کلام:-

جس نے پوچھا، یہی جواب ملا
آدمی باوفا نہیں ملتا

میرے اُس کے ہیں جو معاملے، وہی اُسکو خوب ہے جانتا
یہ مقام راز و نیاز ہے، دل وجاں کو اِس کی خبر نہیں

لاکھ نازک ہو رشتۂ اُلفت
ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے

[خُم خانۂ جاوید، جلد سوم]

(۱۲)

نواب سیّد محمد خاں رند

رندؔ بُرہان الملک کے بھتیجے نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری کے فرزند تھے اور فیض آباد میں ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۲۴ء میں وہ لکھنؤ آئے اور آتشؔ کے شاگرد ہوکر اپنا تخلص رند رکھا۔ اس سے پیشتر، فیض آباد میں وہ میر خلیقؔ کے شاگرد تھے اور ان کا تخلص وفاؔ تھا۔ اُن کا حج کو جاتے ہوئے بمبئی میں غالباً ۱۸۵۵ء میں انتقال ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے۔ اُن کے کلام میں بُلبل کا نام اکثر آیا ہے جس کے باعث لوگ مذاقاً اُنھیں "چڑیا والا" کہا کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا دیوان خود طبع کرایا تھا۔ وہ دہلی اسکول کی شاعری کا اِتّباع کیا کرتے تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام:-

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

سیر کی، خُوب پھرے، پھُول چُنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں، گلشن تیرا آباد رہے

گلے لگائیں، بلائیں لیں، تم کو پیار کریں
جو بات مانو تو منّت ہزار بار کریں

عندلیب مِل کے کریں آہ و زاریاں
تُو ہائے گُل پُکار، میں چِلّاؤں ہائے دل

پھینک دوں گا میں اسے چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں، دل پہ تو ہے قابو اپنا

کیا ملا عرضِ مُدّعا کرکے
بات بھی کھوئی اِلتجا کرکے

[خُم خانۂ جاوید، جلد سوم]

(۱۳)

میر وزیر علی صبؔا

صبؔا میر بندہ علی لکھنوی کے فرزند اور آتشؔ کے شاگرد تھے۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں ۱۸۵۴ء میں ایک گھوڑے پر سے گر کے فوت ہوئے تھے۔ وہ واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے دیوان کا نام غنچۂ آرزو تھا۔ صبؔا کا نمونۂ کلام :-

دل میں ایک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

کہتے تھے دل نہ دیں گے کسی کو تمام عمر
مجبور ہو گئے مگر ایک دل ستاں سے ہم

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے

(۱۴)

پنڈت دیاشنکر نسیمؔ

نسیمؔ پنڈت گنگا پرشاد لکھنوی کے بیٹے اور آتشؔ کے شاگرد تھے۔ وہ لکھنؤ میں ۱۸۱۱ء میں پیدا اور وہیں ۱۸۴۳ء میں فوت ہوئے تھے۔ وہ کشمیری پنڈت اور مشہور مثنوی ''گلزار نسیم'' کے مصنف تھے۔ نسیمؔ کا نمونۂ کلام :-

ذلت ہے جو پھیلائے بشر پیشِ بشر ہاتھ
یارب نہ کبھی ہاتھ کا ہو دست نگر ہاتھ

(۱۵)

شاہ نصیرالدین نصیرؔ عرف "میاں کلّو"

نصیرؔ شاہ غریب دہلوی کے بیٹے تھے۔ ان کا وطن اور مولد دہلی تھا۔ وہ قایم چاند پوری کے تلمیذ شاہ محمدی مایلؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ نصیرؔ دو مرتبہ لکھنؤ گئے تھے۔ پہلے مصحفیؔ اور انشاؔ کے زمانے میں اور دوبارہ ناسخؔ اور آتشؔ کے عہد میں۔ وہ چار مرتبہ حیدر آباد (دکن) گئے تھے جہاں دیوان چندولال نے ان کی آؤ بھگت کی تھی۔ نصیرؔ ۱۸۳۸ء میں حیدر آباد (دکن) ہی میں فوت و دفن ہوئے۔ وہ سیاہ فام تھے۔ پیری مُریدی اُن کے خاندان میں عرصے سے چلی آتی تھی۔ نصیرؔ نے بہت معمولی تعلیم پائی تھی۔ شہنشاہ شاہ عالم کے دورِ سلطنت میں اُن کی اُردو شاعری مقبولِ عام ہوئی اور شاہی دربار دہلی میں بھی ان کی توقیر کی گئی۔ جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو نصیرؔ لکھنؤ آئے جہاں سے وہ حیدر آباد (دکن) گئے۔ کہا جاتا ہے کہ نصیرؔ نے دکن کا وہ قرض وہاں جاکر چکا دیا تھا جو ولیؔ دکنی نے شمالی ہند پر آکر کیا تھا، اُس وقت دکن میں اُردو شاعری کا رواج کم ہو چکا تھا، جسے شاہ نصیرؔ نے دوبارہ وہاں فروغ دیا اور بہت سے نئے شاگرد وہاں بنائے ["شعر الہند"، حصّہ اوّل ص ۸۲-۸۳۔ ماہنامہ "اُردوئے مُعلّی"، کانپور، اگست ستمبر ۱۹۲۵ء]

اُن کا نمونۂ کلام :-

خیالِ زلفِ بُتاں میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

آ، مان کہا، ہنس نہ ہنسانے سے کسی کے
ہو جائے گا طوفان رُلانے سے کسی کے

اِس قدر ہم نے کیا ہے تجھ کو یاد
ایک عالم کو ہماری یاد ہے

نگاہِ قہر سے، یا چشمِ مہر سے دیکھو
بلا کشانِ محبت تمہارے بس میں ہیں

باز آؤ بُتو، دل کا ستانا نہیں اچھا
یہ گھر ہے خدا کا، اِسے ڈھانا نہیں اچھا

+ + +

(۱۶)

محمد عیسیٰ خاں تنہا

تنہا کا وطن اور مولد دہلی تھا لیکن وہ لکھنؤ میں رہے اور وہیں وفات پائی۔ وہ مصحفی کے شاگرد تھے اور مرثیہ خواں تھے بعض مورخین نے غلطی سے اُنھیں ناسخ کا اُستاد کہا ہے، البتہ وہ ناسخ کے دوست ضرور تھے۔ تنہا کا نمونۂ کلام ــ

شعلہ سا وہ بدن ہے واں پیرہن کے اندر
یاں آگ پُھک رہی ہے اپنے بدن کے اندر

(۱۷)

ملک الشعرا منشی نوازش حسین خاں تنویر

تنویر کا وطن اور مولد دہلی تھا۔ وہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ذوق کے انتقال کے بعد شاہ ظفر اپنا کلام تنویر کو دکھانے لگے تھے، جو غلط ہے۔ اُن کا دیوان تنویر شائع ہو گیا ہے۔ تنویر کا انتقال نیپال میں ۱۸۷۲ء میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے۔ اُن کا نمونۂ کلام:۔

خاک ڈالو اِن شکایاتوں پہ، لگ جاؤ گلے
تمہیں منصف ہو اب یہ وقت ہے تکرار کا؟

(۱۸)

افضل العلما مفتی صدر الدین خاں بہادر آزردہ

آزردہ مولوی لطف اللہ کاشمیری کے فرزند اور مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے مُرید تھے وہ ایک زبردست عالمِ دین تھے اور دہلی میں صدر الصدور کے ممتاز منصب پر فائز تھے۔ وہ دہلی میں ۱۷۸۹ء میں پیدا اور وہیں ۱۸۶۸ء میں فوت ہوئے تھے۔ انتقال کے بعد وہ درگاہ چراغ دہلی میں دفن ہوئے تھے۔ آزردہ شاہ نصیر، میاں محرم اکبرآبادی اور فخرالشعرا میر نظام الدین ممنون کے شاگرد رہے تھے اور وہ ذوق، مومن، غالب اور صہبائی وغیرہ کے ہمعصر اور دوست تھے۔ وہ تذکرۂ شعرائے ریختہ کے بھی مصنف تھے جواب ناپید[1] ہے۔ اُن کا نمونۂ کلام:۔

[1] اب انجمن ترقی اردو کراچی نے چھاپ دیا ہے۔

میں اور ذوقِ بادہ کشی ہائے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تیری بزمِ شراب میں

گیا کون سا صید افگن ادھر سے؟
کہ خالی پڑے آشیانے بہت میں

(۱۹)

مرزا اصغر علی خاں نسیم (سابق اصغر)

نسیم نواب آغا علی خاں قاچار کے بیٹے اور مومن کے شاگرد تھے۔ اُن کا وطن اور مولد دہلی تھا جہاں وہ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ نسیم کا انتقال لکھنؤ میں ۱۸۶۵ء میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے وہ لکھنؤ واجد علی شاہ کے زمانے میں آئے تھے۔ نسیم کا نمونۂ کلام:۔

حیا بڑھنے نہیں دیتی ارادہ نوجوانی کا
اشارہ ہو کے رہ جاتا ہے اُن کی مہربانی کا

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

جب اور کسی پر کوئی بیداد کرو گے
یہ یاد رہے، ہم کو بہت یاد کرو گے

(۲۰)

نواب حاجی مصطفیٰ خاں شیفتہ

شیفتہ اعظم الدولہ، سرفراز الملک، نواب مُرتضیٰ خاں بہادر، مظفر جنگ (لارڈ لیک LAKE کے مصاحب) کے بیٹے اور ولی داد خاں کو ہاٹی (جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے زمیندار اور جاگیر دار) کے پوتے تھے۔ وہ ریختہ میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور مومن کے شاگرد تھے اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ وہ دہلی میں ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۸۶۹ء میں فوت ہو کر دفن ہوئے۔ شیفتہ شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی کے مُرید تھے۔ وُہ اُردو اور فارسی دونوں میں صاحبِ دیوان تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۳۴ء میں اپنا مشہور تذکرہ گلشنِ بیخار، تصنیف کیا تھا جو فارسی میں اُردو شعرا پر ہے

اُن کی کلیات بھی شائع ہو چکی ہے۔ شیفتہ ایک جیّد عالم، شاعر، ادیب اور اپنے عہد کے ممتاز نقاد تھے۔ اُن کا اسلوبِ شاعری نہایت باوقار ہے۔ اُن کا نمونۂ کلام:۔

ایک نیم باز لب ہے ہمارے ہلاک کو
کچھ بھی نہ کیجیے دیکھ کے بس مُسکرائیے

آشفتہ زلف، چاک قبا، نیم باز چشم
ہیں صحبتِ شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز

ساقی پلا وہ بادہ کہ غفلت ہو آگہی
مُطرب سُنا وہ نغمہ کہ ہو جس سے قال حال

کیا کرتے ہیں، کیا سُنتے ہیں، کیا دیکھتے ہیں ہائے
اُس شوخ کے جب کھولتے ہیں بندِ قبا ہم

کیا تجاہل سے یہ کہتا ہے، کہاں رہتے ہو؟
تیرے کوچے میں ستمگار تیرے کوچے میں

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ایک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

(۲۱)

میر مہدی حسن مجروح

مجروح کے والد میر حسین نگار دہلوی تھے اور اُستاد غالب۔ مجروح حالی اور داغ کے ہمعصر تھے۔ اُن کا وطن اور مولد دہلی تھا جہاں وہ غالباً ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مجروح بیشتر محلہ انصاریان پانی پت اور الور میں رہے اور اُنھوں نے دہلی میں ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔ مجروح نے اپنے اُستاد غالب کے طرزِ کلام کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔ مجروح کا نمونۂ کلام:۔

یہ جو پہلو میں آئے بیٹھے ہیں
لاکھوں فتنے جگائے بیٹھے ہیں

لُٹنے سے یہ اُٹھائی ہے لذت کہ راہ میں
ہر ایک سے پُوچھتا ہوں کہ ہے راہ زن کہاں

(۲۲)

میر حسین تسکین

تسکین میر حسن (میران صاحب) کے بیٹے تھے، جو حسین علی خاں کے قاتل میر حیدر کی اولاد میں تھے
تسکین کا وطن اور مولد دہلی تھا۔ وہ صہبائی، شاہ نصیر اور مومن کے شاگرد تھے۔ وہ نواب یوسف علی
خاں ناظم کے عہد میں رامپور میں مقیم ہو گئے تھے، جہاں وہ ۱۸۵۱ء میں فوت ہوئے۔ وہ مومن کے
معروف شاگرد تھے۔ تسکین کا نمونۂ کلام ہے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین
کہ سُوجھتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

(۲۳)

میاں نظام شاہ نظام رامپوری

نظام شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد اور ریاست رامپور (روہیلکھنڈ یو پی انڈیا) کے نواب
یوسف علی خاں ناظم کے درباری شاعر تھے۔ وہ رامپور میں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۸۷۲ء میں
فوت و دفن ہوئے۔ وہ نہایت خوش گو شاعر تھے۔ ان کا نمونۂ کلام :-

اُس کا کہنا وہ شب وصل نظام
ہاتھ مجھ کو نہ لگائے کوئی

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو، چھوڑ دئے مُسکرا کے ہاتھ

مُنہ پھیر کے، ہنس ہنسکے وہ انکار کی باتیں
اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں آتا

چین ملتا نہیں ذرا دل کو
تم سے مل کر یہ کیا ہوا دل کو

کل کا وعدہ کیا پھر اُس نے آج
اور بھی ایک دن چھٹے ہی بنی

(۲۴)

ملک الشعرا منشی مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی

ذکی کے والد کا نام شیخ کرامت علی تھا اور ان کے آبا و اجداد لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے، مگر ذکی مُراد آباد میں پیدا ہوئے اور بیشتر وہیں رہے۔ اُنھیں عرصے تک نواب محمد سعید خاں والیٔ ریاست رامپور سے پنشن ملتی رہی تھی۔ ذکی نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے، جہاں وہ ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔ لکھنؤ سے ذکی دہلی گئے، پھر بہارن پور اور پھر نواب ناصر الدولہ نظام الملک کے عہد میں حیدرآباد (دکن) پہنچے۔ پھر وہ واپس آکر مُراد آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ گئے، جہاں وہ قطب الدولہ کے توسّل سے واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور وہیں سے اُنھیں غالباً ۱۸۴۹ء میں 'ملک الشعرا' کا خطاب ملا۔ ۱۸۵۸ء کے فسادات کے بعد وہ مُراد آباد میں خانہ نشیں ہو گئے تھے۔ نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم نے ذکی کو رامپور بُلا لیا، جہاں اُن کی زندگی کے آخری ایام بسر ہوئے۔ نواب ناظم کے انتقال کے بعد ذکی رامپور سے انبالہ ۱۸۶۴ء میں گئے اور انبالہ ہی میں ذکی کا ۱۸۶۶ء میں انتقال ہوا۔ ذکی نے ۱۸۴۸ء میں اُردو شاعری پر ایک رسالہ 'یادگیر' کے نام سے لکھا تھا۔ نولکشور پریس لکھنؤ نے 'کُلیاتِ ذکی' شائع کی تھی۔ مصحفی اور اسیر کی طرح ذکی بھی ناسخ اور آتش کے زمانے میں اُردو شاعری میں اپنی اُستادی کا سکہ جمانے کے لیے لکھنؤ گئے تھے۔ تنویر اور ذکی دونوں نے لکھنوی اسکول کے اسلوبِ شاعری پر اپنے دیوان مُرتّب کئے تھے، لیکن وہ ناسخ کے طرزِ شاعری میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ صرف نسیم اور داغ اپنی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی طرزِ شاعری کو سمونے میں کامیاب ہو سکے۔ البتہ آتش، مصحفی اور اسیر نے ناسخ کے انداز میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی اور غیر لکھنوی شاعر ناسخ کی کامیاب نقل نہ کر سکا۔ ذکی کا نمونۂ کلام:-

شبِ وصل اپنی گذر گئی، تو سحر کو اپنا یہ حال تھا!
دل و دیدہ حیرت و غم میں تھے کہ یہ خواب تھا یا خیال تھا

جب سامنے وہ پری زاد آ گیا
دیوانہ پن کبھی کا ہمیں یاد آ گیا

واقعی قابلِ سزا ہیں ہم
یعنی دیرینہ آشنا ہیں ہم
شرماکے طیش کھائے خفا ہوکے ہنس پڑے
پاؤں پہ میں گرا جو بدن پر لگا کے ہاتھ
کہنا پیام بر کہ فراموش ہے کیا
وعدہ بھی کچھ کیا تھا کسی بیقرار سے
[خُم خانۂ جاوید، جلد سوم]

(۲۵)

میر غلام علی مشہدی عشرتؔ بریلوی

عشرتؔ بریلوی تلمیذِ سوداؔ مرزا علی لُطف کے شاگرد تھے۔ اُن کا خاص شاعرانہ کارنامہ ۱۷۹۶ء میں 'اُردو پدماوت' کی تکمیل تھی جس کا تاریخی نام 'تصنیف دو شاعر' (۱۲۱۱ھ ہجری) ہے اور جو ۱۸۵۹ء میں مطبعِ مُصطفائی، کانپور، میں طبع ہوئی تھی۔ اِس 'اُردو پدماوت' کا پہلا ثُلث میر ضیاء الدین عبرتؔ دہلوی ثم رامپوری نے منظوم کیا تھا اور باقی دو حصص کی تکمیل عشرتؔ بریلوی نے اُردو نظم میں کی تھی۔ نثر میں اس کی اصل کہانی راجہ رتن سین اور پدماوت کے رومان پر مبنی تھی جسے پُوربی زبان میں مولانا ملک محمد جائسی نے منظوم کیا تھا۔ اِس مثنوی کے علاوہ عشرتؔ بریلوی کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

شبِ وصال میں دل پر قلق ابھی سے ہے
سحر ہے دُور، مرا رنگ فق ابھی سے ہے
کسی نے شام کے آنے کو کیا کہا عشرتؔ
کہ مُنہ پہ آپکے پھُول شفق ابھی سے ہے

(۲۶)

میر مستحسن خلیقؔ دہلوی

خلیقؔ 'مثنوی سحر البیان' کے مُصنّف میر غلام حسن حسنؔ دہلوی کے بیٹے، میر احسن خلقؔ کے چھوٹے

بھائی اور میر ضاحک (سودا کے ہمعصر) کے پوتے تھے۔ خلیق نے شروع میں زندگی فیض آباد اور لکھنؤ میں بسر کی اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ خلیق بڑے پُرگو شاعر تھے اور اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے۔ اُن کا نغزل میں بھی دیوان تھا جسے اُنھوں نے شائع نہیں کیا۔ خلیق نے اپنی تمام زندگی مرثیہ گوئی میں بسر کردی۔ اس خاص صنف شاعری میں ان کے دیگر معاصر میر ضمیر اور مرزا فصیح تھے۔ میر خلیق کا انتقال ۱۸۴۴ء میں ہوا۔ ہر سہ معروف مرثیہ گو شعرائے اُردو میر خلیق، میر ضمیر اور میاں دلگیر لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد تھے۔ ضمیر خلیق کے تین بیٹے تھے۔ میر ببر علی انیس، میر نواب مونس اور میر مہر علی اُنس۔ خلیق کا نمونہ کلام:-

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم
جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم

دل میں تھا آتے ہی اُس کے جا ئیں لگ آغوش سے
جب وہ آیا سامنے تب رہ گئے خاموش سے

خلیق کے معصر منشی چھنو لال (سیکسینہ کایستھ) دلگیر لکھنوی پہلے ہندو تھے، لیکن مسلمان ہوگئے تھے۔ اُن کا سابقہ تخلص طرب تھا اور اُستاد مرزا خانی نوازش تھے۔ جب دلگیر نے محض مرثیہ گوئی شروع کی تو وہ شیخ ناسخ کے شاگرد ہوگئے۔ ان کے مراثی کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔ مرزا فصیح اور میر خلیق ان کے ہمعصر تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے زمانوں میں دلگیر لکھنؤ میں مرثیہ گو شعرائے کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ میاں دلگیر کے بڑھاپے میں لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ دلگیر لالہ شیو پرشاد ستارۂ ہند کے قریبی عزیز تھے۔ دلگیر ۱۸۴۷ء میں فوت ہوئے۔ ان کا نمونہ کلام ؎

معطر اُس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا
حباب بہار ہر ایک شیشۂ گلاب ہوا

(۲۷)

سیّد آغا حسن امانت

امانت لکھنؤ میں ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ میر آغا حسین رضوی لکھنوی کے بیٹے اور مرثیہ گوئی میں میاں دلگیر کے شاگرد تھے۔ وہ صاحب دیوان تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے لیکن جس چیز نے اُن کے نام کو اُردو ادب میں امر بنادیا وہ اُن کا ڈراما 'اِندر سبھا' ہے۔ اُنھوں نے ایک واسوخت بھی

کہا تھا۔ امانت کی زبان میں لکنت تھی۔ اُن کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہوا اور وہ لکھنؤ کے امام باڑہ آغا باقر میں دفن ہوئے۔ امانت اُردو ڈرامہ اور اسٹیج کے خالق تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام ؎

میخانۂ عالم میں دونوں ہیں دِلا یکساں
ہشیار ہوا تو کیا، مستانہ ہوا تو کیا

(۲۸)

شیخ امام بخش ناسخ

ناسخ شیخ خُدا بخش پنجابی باشندۂ لاہور کے، جو خیمہ سازی کا پیشہ کرتے تھے، بیٹے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ناسخ شیخ خدا بخش کے لے پالک تھے۔ ناسخ فیض آباد میں ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے وہیں اُن کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی تھی۔ وہ نواب سعادت علی خاں کے دورِ حکومت میں نواب محمد تقی کے ملازم ہو کر لکھنؤ آئے تھے، جہاں اُس وقت مصحفی، جُرأت اور انشا کی اُردو شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ ناسخ آتش کے حریف تھے اور اُنھوں نے میر اور سودا کو بھی دیکھا تھا۔ ناسخ اپنے عہد میں لکھنؤ میں اُردو شاعری کے مسلّم اُستاد تھے۔ اُن کو فارسی زبان پر بھی مکمل دسترس حاصل تھی۔ ناسخ اردو زبان کے عظیم مُصلح تھے جنھوں نے اُردو قواعد و عروض کی کایا پلٹ دی اور اُردو شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ ناسخ کا اپنے ہمعصروں میں ایک ماہرِ زبان کی حیثیت سے بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ اُن کا اسلوب شعری قواعدِ زبان و محاورات کی صحت کے اعتبار سے بے داغ ہے لیکن اس میں گہرائی اور تاثیر کا فقدان ہے۔

ناسخ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے اور نہ اُنہوں نے عمر بھر اپنی شادی کی۔ اُس زمانے کے فیشن کے لحاظ سے ناسخ کا شمار بانکوں میں ہوتا تھا، جس کے باعث اپنی ابتدائی زندگی میں فیض آباد میں وہ کافی بدنام تھے۔ وہ عربی و فارسی دونوں زبانیں جانتے تھے اور خوش حال زندگی بسر کرتے تھے میر کی زندگی ہی میں لکھنؤ میں ناسخ نے بطور شاعر اور مُصلحِ زبان شہرت حاصل کر لی تھی۔ جب وزیرِ مملکت مُعتمد الدولہ ناسخ کے شاگرد ہوئے تو پھر تو ناسخ کا طوطی بولنے لگا اور ان کی شہرت و ہر دلعزیزی عام ہو گئی حتیٰ کہ مصحفی نے بھی اپنے چھٹے دیوان میں ان کا اتباع کیا لیکن ناکام، اور آتش، شہیدی بریلوی، اسیر، غالب اور مومن غرضیکہ سبھی نے ناسخ کے پیرایۂ بیان کو اپنانے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے کیونکہ وہ ان کے اپنے انفرادی اسالیب سے متصادم تھا۔ ناسخ نے کبھی کسی کی

ناسخ محض ایک پہلوان سخن ہی نہیں تھے، بلکہ وہ حقیقی معنی میں بھی پہلوان تھے۔ وہ کثرت سے کسرت کیا کرتے، اکھاڑے میں زور کرتے اور کُشتی لڑتے تھے۔ اُن کی خوراک بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ ایک دیو پیکر انسان تھے، طویل القامت، چوڑے چکلے۔ گُٹھا ہوا سر اور سیاہ فام۔ مقامی سیاست اور محلاتی سازشوں میں شرکت کے باعث اُنھیں کئی بار لکھنؤ سے جلا وطن ہونا پڑا تھا۔ جلا وطنی میں کئی بار وہ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں مقیم رہے تھے۔ راجہ چندو لال نے مُتعدد بار ناسخ کو بڑی رقوم کا لالچ دے کر حیدر آباد دکن آنے کی دعوت دی تھی لیکن ناسخ نے لکھنؤ نہیں چھوڑا۔ ناسخ کی لسانی اصلاحات کے باعث اُنھیں اُردو شاعری کے لکھنؤ اسکول کا بانی کہا گیا ہے۔ اُن کا نمونۂ کلام

بھُول کر او چاند کے ٹکڑے اِدھر آجا کبھی — میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

انجام کو کچھ سوچو، کیا قصر بناتے ہو — آباد کرو دل کو، تعمیر اِسے کہتے ہیں

چلا عدم سے میں جبراً، تو بول اُٹھی تقدیر — بلائیں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

وہ نہیں بھُولتا جہاں جاؤں! — ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟

[مجموعۂ سخن، از قدر بلگرامی۔ تذکرہ جلوۂ خضر، از صفیر بلگرامی۔ تذکرۂ سخن شعرا، از نساخ (صہ ۲۲۳)۔ تذکرہ گلشن بیخار، از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ کاشف الحقایق، از اثر عظیم آبادی (جلد دوم صہ ۱۳۹)۔ شرح دیوانِ غالب طباطبائی صہ ۲۱۸۔ آبِ حیات، از مولانا محمد حسین آزاد دہلوی۔ شعر الہند، جلد اول باب دوم صہ ۱۸۹-۲۰۱]۔

(۲۹)

خواجہ حیدر علی آتش

آتش کے باپ کا نام خواجہ علی بخش دہلوی تھا، جو دہلی چھوڑ کر فیض آباد کے محلہ مُغلپورہ میں آبسے تھے جہاں آتش کی غالباً ۱۷۶۷ء میں ولادت ہوئی تھی۔ فیض آباد ہی میں آتش کی پرورش اور ابتدائی تعلیم ہوئی تھی۔ آتش کا ابھی بچپن ہی تھا کہ اُن کے باپ کا انتقال ہوگیا اور آتش کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ بہ ایں ہمہ آتش کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کسی قدر مہارت ہوگئی۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں آتش فیض آباد سے لکھنؤ آئے، جہاں وہ مصحفی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے لیکن جلد ہی وہ خود اُردو غزل کے مُسلّمہ اُستاد بن گئے۔ وہ ہمیشہ ناسخ کے حریف رہے۔ ذاتی طور پر وہ ایک آزاد منش انسان تھے۔ بطور شاعر وہ اُردو غزل میں ناسخ سے بہتر اور زیادہ کامیاب تھے کیونکہ اُن کے کلام میں، ناسخ کی

خارجیت کے برعکس، غزل کے تمام محاسن موجود ہیں یعنی داخلیت، جذبات کی پُرخلوص عکاسی، خیالات کی گہرائی اور اثر اندازی وغیرہ۔ آتش کا انتقال لکھنؤ میں محمد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں ۱۸۴۶ء میں ہوا اور وہ سرائے معالی خاں میں دفن ہوئے۔ اُن کی کلیات شائع ہو چکی ہے۔ آتش کا آبائی وطن دہلی تھا لیکن وہ خود فیض آباد کے محلہ مُغل پورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ لکھنؤ میں ان کا مسکن مادھو لعل کی چڑھائی میں تھا۔ لیکن صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ "جلوۂ خضر" میں لکھا ہے کہ "آتش کا تعلق دہلی سے نہیں تھا۔ آبِ حیات میں آزاد نے ان کو دہلوی غلط لکھا ہے۔ وہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں فوت و دفن ہوئے تھے۔" آتش کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی لیکن ان میں سے حسبِ ذیل معروف تھے۔

میر دوست علی خلیل، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علی خاں رند، آغا حجو شرف، نواب مرزا شوق، پنڈت دیا شنکر نسیم، اور مرزا عنایت علی بیگ ماہ وغیرہ۔ ماہ تاریخ کے شاگرد مرزا حاتم علی بیگ مہر کے چھوٹے بھائی تھے۔ شرف واجد علی شاہ کے رشتہ دار تھے جن کے ساتھ وہ مٹیا برج کلکتہ گئے تھے اور جہاں اُن کا سنہ ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا تھا۔ شوق اور نسیم دونوں اپنی مثنویوں کے باعث مشہور ہوئے اور خلیل، صبا اور رند اپنی غزل گوئی کے باعث معروف تھے۔

آتش کے خاندان میں پیری مُریدی چلی آتی تھی لیکن آتش نے اسے اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ غزل گوئی میں وہ اپنے عہد میں اُستاد مانے جاتے تھے۔ غالب جیسے سخت نقاد نے بھی آتش کی غزل گوئی کو سراہا ہے۔ آتش کو شاہی خزانے سے اسّی روپیہ ماہوار کا وظیفہ ملا کرتا تھا جس کا بیشتر حصہ وہ غربا میں تقسیم کر دیتے اور اپنی ضروریات کے لیے بہت کم رقم رکھتے تھے۔ ہر چند کہ اُن کی ذاتی ضروریات نہ ہونے کے برابر تھیں لیکن اپنی داد و دہش کے باعث وہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور عُسرت کے عالم میں بسا اوقات اُن کو فاقے ہوتے رہتے تھے۔ اِس طرح آتش کی پوری زندگی نہایت غُربت و محرومی میں گذری۔ وہ اپنے متموّل شاگردوں سے بھی کبھی امداد لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہر چند کہ آتش کوئی تارک الدُنیا انسان نہیں تھے لیکن عملاً ان کی زندگی درویشانہ تھی اور ان کی موت تک ویسی ہی رہی۔ آتش بھنگ پینے کے عادی تھے اور آخر عمر میں وہ نابینا ہو گئے تھے۔ اُن کا شاعر بیٹا محمد علی جوش عین عنفوانِ شباب میں فوت ہو گیا تھا۔ اس صدمے سے آتش زندہ درگور ہو گئے تھے۔ آتش کا ایک دیوان ان کی زندگی ہی میں متداول تھا، دوسرا ان کی وفات کے بعد مُرتّب کیا گیا۔ بعض لوگوں نے آتش کو اُردو کا حافظ کہا ہے کیونکہ اُن کے کلام میں صوفیانہ خیالات کی عکاسی ہے۔ لیکن افسوس

کہ آتش کے کلام میں یکسانیت کا فقدان ہے۔ وہ صرف غزل گو شاعر تھے اور کسی اور صنف میں انھوں نے طبع آزمائی نہیں کی [تذکرۂ جلوہ خضر، صفیر بلگرامی، جلد دوم ص۴۹، شعر الہند، جلد اوّل باب دوم ص۲۱۶-۲۲۶] اُن کا نمونۂ کلام:

سُن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

دوستوں سے اسقدر صدمے اُٹھائے جان پر — دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ہجو نہیں کہی کیونکہ وہ اس فعل سے متنفر تھے۔ عشرت لکھنوی نے اپنے تذکرہ آب بقا میں لکھا ہے کہ "جب میر نے ناسخ کو اپنا شاگرد بنانے سے انکار کر دیا تو ناسخ نے پہلے تو مصحفی کا اور بعد ازاں مصحفی کے شاگرد علی خاں تنہا کا تلمذ اختیار کر لیا۔" تذکرہ یادگارِ ضیغم میں بھی (ص۵۵ پر) اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ "ناسخ نے شروع میں مصحفی سے اور پھر ان کے شاگرد محمد عیسیٰ تنہا سے اصلاح لی تھی۔ لیکن خود ناسخ نے اس کی تردید کی ہے کہ وہ کبھی مصحفی یا ان کے شاگرد تنہا کے حلقۂ تلمذ میں شامل رہے تھے۔ اس کے برعکس وہ پیدائشی شاعر ہونے کے مدّعی تھے۔" لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سودا کے اسلوب شعری کے پیرو تھے۔ جیسا کہ وہ خود معترف ہیں ؎

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

مذکورہ بالا شعر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ناسخ کی فکرِ شعری کا منبع کیا تھا اور کہ میر نے کیوں اُنھیں اپنے تلمذ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن صفیر بلگرامی نے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ ناسخ کبھی مصحفی یا تنہا کے شاگرد رہے تھے بلکہ "ناسخ تو خود ایک معروف مصلح زبان اردو تھے اور مصحفی، آتش اور اسیر وغیرہ سب نے ان کی لسانی اصلاحات کو تسلیم کیا تھا۔" بقول نساخ "ناسخ کے اسلوب کی آتش کے شاگردوں بالخصوص میر تقی میر کے فرزند میر کلو عرش اور ان کے شاگرد شیخ محمد جان شاد لکھنوی نے مخالفت کی تھی۔ مؤخر الذکر خود کو 'پیر و میر' کہا کرتے تھے، حالانکہ عرش ناسخ کے شاگرد رہ چکے تھے۔" لیکن عرش کو ناسخ کا شاگرد کہنا جدید تحقیق کے مطابق غلط ہے۔

لکھنؤ میں نواب محمد تقی، مرزا حاجی، نواب محسن الدولہ اور نواب معتمد الدولہ آغا میر سے مُصاحبت،

ہم جیسی دبے تکلفی کے باعث، ناسخ کا اثر ورسوخ بے پایاں تھا حتیٰ کہ ناسخ کی شاگردی دنیاوی مفادات کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اور پھر جب لکھنؤ کے ایک نہایت متمول شخص میر کاظم علی نے ناسخ کو اپنا متبنّٰی قرار دیا تو گویا ناسخ کی قسمت ہی پلٹ گئی اور اپنے منہ بولے باپ کے انتقال کے بعد ناسخ لکھنؤ میں ایک امیر کبیر بن گئے۔ ناسخ کا انتقال لکھنؤ میں محمد علی شاہ کے دورِ حکومت میں ۱۸۵۲ء میں ہوا اور وہ محلہ ٹکسال میں اپنے ہی گھر کے اندر دفن ہوئے۔ ناسخ نے اپنے کلام کے دو دیوان چھوڑے۔ اُن کی کلیات بھی ملتی ہے۔ ناسخ کے لاتعداد شاگرد تھے جن میں سے معروف تر یہ تھے:۔ خواجہ محمد وزیر وزیرؔ، مرزا محمد رضا برقؔ، میر علی اوسط رشکؔ، امداد علی بحرؔ، امان علی سحرؔ، مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ اور مہدی حسن خاں آبادؔ وغیرہ۔

(۳۰)

نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالبؔ (نیز اسدؔ)

غالب ۱۷۹۶ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ "گلشنِ بیخار" میں غالب کے متعلق اِس طرح لکھا ہے:۔

"غیرت افزائے صفاہان وشیراز، طوطیِ بلند پرواز چمنِ معانی است وبلبلِ نغمہ پرداز گلشنِ شیوا بیانی۔ پیشِ بلندیِ خیالش اوجِ فلک پستیِ زمین است ودر جنبِ تہ نشینیِ غورش سرفرازیِ قارون کرسی نشیں۔ شاہینِ فکرش جز بہ شکار عنقا نہ پرداز دو انشہابِ طبعش جز بہ عرصۂ فلک نہ تازد۔ غزلش چوں غزلِ نظیریؔ بے نظیر وقصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفیؔ دلپذیر۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر" وغیرہ

سرسید احمد خاں غالب کے متعلق اپنی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" میں اِس طرح رقم طراز ہیں:۔

"اُن کے والد کا نام نامی عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور آپ کا سلسلۂ نسب افراسیاب وپاشنگ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بہ سبب اس کے کہ اُن کے ہم جنس تھے فرماں روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہدِ سلطنت

کا دَورہ تمام ہوا، اُن کے آباؤ اجداد نے سمرقند میں توطّن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جدِّ امجد ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے اور اس کے تباہ ہوتے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطانِ عہد کی سرکار کے مُتوسّل ہو گئے۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشوونما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بُود و باش اکبرآباد میں اختیار کی اور حضرت ممدوح کو والدہ مُشفقہ کے کنارِ شفقت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنّت کو سدھارے۔ آپ کے چچا حقیقی نصراللہ بیگ خاں کہ اُس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صُوبیدار تھے آپ کی پرورش و تربیت میں مصروف ہوئے۔ جب ہندوستان میں تصرّف حُکّام انگریزی کا ہوا، نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کے رفیق ہو کر چار سَو سوار کے رسالہ سے سرگرم جنگ رہے۔ جنرل لیک نے اس کارِ نمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافاتِ اکبرآباد سے اُن کی عینِ حیات تک جاگیر میں عطا کئے۔ پھر اُن کے انتقال (۱۸۰۶ء) کے بعد جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور اُس کے عوض میں اس حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہوئی۔ پھر وہاں سے بہ سبب اُنسِ طبیعت و میلِ خاطر شاہجہان آباد میں تشریف لائے۔ بہترین شغل آپ کا سخن سنجی و معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جانِ سخن پر مِنّت اور سرِ معنی پر بڑے احسان رکھتے ہیں۔ آپ کا جواہر خانۂ نفائس سخن حدِ شمار سے افزوں اور ظرفِ حصر سے بیروں ہے۔ دیوانِ حافظ اُن کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، چراغِ انوری اُنہی کے شعلۂ فکر سے روشن، عُنصری اُن کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اُس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکوّن ہوا تھا۔ اور سحابی اُن کے حسرتِ کمال سے ایسا رویا کہ مگر اُس کی بینائیِ چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی۔ زُلالی ان کے چشمۂ ہُنر کا تشنہ لب اور ابواسحاق اطعمہ ان کے خوانِ استعداد سے نعمت طلب۔ خاقانی اس خسروِ معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اِس بادشاہِ سخن کے آگے سرگرمِ خدمت۔ ملاحتِ کلام سعدی ان کے خوانِ فیض کی نمک خوار اور شیرینیِ زبانِ حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ دار" وغیرہ۔

غالب کا تعلق ایک فوجی خاندان سے تھا اور ان کے ایک تُرک خون نے ان کی شاعری کو بھی گرما دیا تھا۔ ہر چند کہ ان کی شعر گوئی کا آغاز ان کے عنفوانِ شباب کے ساتھ ہی ہو چکا تھا، لیکن ان کے کلام میں پُختہ کاری ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد ہی پیدا ہوئی۔ غالب پر مُغلیہ سلطنت کی تباہی کا بڑا

اثر ہوا تھا جس کے ساتھ اُس کے قوانین و ثقافت بھی ناپید ہو گئے تھے۔ غالب کے ان تاثرات کی ترجمانی ان کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے۔ دُنیا کے بعض دیگر مشاہیر کی طرح۔ غالباً غالب بھی اپنے وقت سے پیشتر پیدا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین میں ان کی پذیرائی اُس حد تک نہیں ہوئی جتنی کہ ہونا چاہیئے تھی۔ غالب اُردو شاعری میں جدید رجحانات کے پیشرو تھے۔ اُردو لٹریچر میں غالب کی غیر معمولی ذہانت و ادبی استعداد کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے اُردو شاعری میں فلسفیانہ خیالات کو متعارف کیا۔ اُن کی شاعری فلسفہ، تصوف، رومان اور دلدوز تغزل کا ایک مسحور کُن گلدستہ ہے۔ اُن کے اسلوب میں بلا کی نغمگی و غنائیت ہے، جو کانوں کو بھلی لگتی ہے اور دل و دماغ دونوں کو فرحت بخشتی ہے۔ اس امر کے باوجود کہ ان کے کلام میں فارسی الفاظ اور بندشوں کا استعمال کثرت سے ہوا ہے، ان کے بعض اُردو اشعار حیرت انگیز طور پر سلیس و سادہ ہیں۔

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اعجاز نے اپنی "تاریخ ادب اُردو" میں لکھا ہے کہ "مرزا غالب کے خاندان کا تعلق ایران سے تھا اور ان کا نسب نامہ شاہِ توران افراسیاب تک پہنچتا تھا، جس پر مرزا غالب نازاں تھے۔" ان کے دادا شہنشاہ شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے تھے۔ اور بادشاہ سے اُنھیں پچاس سو کا پرگنہ جاگیر میں ملا تھا مگر شاہ عالم کے بعد یہ جاگیر باقی نہ رہی۔ مرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں اکبرآباد میں آکر بس گئے تھے جہاں اُنھوں نے شادی کر لی تھی۔ اکبرآباد سے وہ آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے اور لکھنؤ سے حیدرآباد (دکن) گئے تھے۔ دکن سے وہ ریاست الور گئے اور راجہ بختیار سنگھ کی فوج میں بھرتی ہو گئے، جہاں وہ ایک لڑائی میں کام آئے۔ اُس وقت مرزا غالب صرف پانچ سال کے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد غالب اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں کی سرپرستی میں آ گئے جو اکبرآباد کے گورنر تھے۔ پھر ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک نے اُنھیں انگریزوں کی فوجی خدمت کے صلے میں سترہ سو روپے سالانہ کی پنشن اور ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی لیکن غالب ہنوز نو سال کے تھے کہ اُن کے چچا کا سایہ بھی اُن کے سر پر سے جاتا رہا اور غالب کی سالانہ پنشن گھٹ کر صرف سات سو روپے رہ گئی۔

شادی کے بعد مرزا غالب دہلی میں اپنی سسرال میں رہنے لگے۔ سلطنتِ مغلیہ کے آخر ایام میں دہلی میں آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے بھی مرزا کی شاہی مؤرخ کی حیثیت سے خدمات کے صلے میں پچاس روپیہ ماہانہ کی پنشن مقرر کی تھی، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ یہ زمانہ غالب کی انتہائی پریشانی و تنگدستی کا تھا کیونکہ ملک گیر فسادات کے سلسلے میں اُن پر بھی شبہ کیا گیا اور اُن کی وہ پنشن معطل ہو گئی جو اُنھیں دہلی

میں برطانوی خزانے سے وصول ہوا کرتی تھی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر غالب اپنے شاگرد نواب یوسف علی خان ناظم والی ریاست رامپور کے پاس چلے گئے جنھوں نے ان کی پنشن سو روپے ماہوار مقرر کر دی لیکن مرزا رامپور میں نہ ٹھہر سکے اور واپس دلی چلے آئے۔ اس کے تین سال کے بعد ان کی سابقہ پنشن بھی واگذاشت ہو گئی۔ مرزا غالب کا انتقال دلی میں ۱۸۶۹ء میں ہوا اور وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ مولانا آزرده نے مرزا غالب کی تاریخ وفات اس طرح نکالی :۔ "آہ غالب بمرد"۔ غالب کے محبوب شاگرد مولانا حالی نے اپنے استاد کی وفات پر جو دردناک مرثیہ لکھا تھا اُس کے دو اشعار حسب ذیل ہیں :۔

بات بگڑی رہی سہی افسوس　　آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عُرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

علامہ اقبال نے بھی اپنی "بانگِ درا" میں مرزا غالب پر ایک نظم لکھی ہے جس کے دو اشعار ذیل میں نموناً درج ہیں :۔

آہ تو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمرؔ[1] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

مرزا غالب کو فارسی زبان سے فطری شغف تھا اور وہ بلاشک فارسی گویانِ ہند میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں بالکل دو متضاد خصائص تفنن و سنجیدگی کا حیرت انگیز امتزاج پایا جاتا ہے۔ اپنی عام خوش طبعی کے باعث غالب کے احباب کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ اِسی لیے ان کی خط و کتابت بھی بڑے وسیع پیمانے پر تھی جس کے باعث مرزا کے خطوط کا ذخیرہ وافر ہے۔ مرزا کے ان دلچسپ خطوط نے اُردو زبان میں خط نویسی و اسلوبِ مُراسلت کا ایک قطعی نیا باب وا کیا۔

غالب کی ادبی تخلیق کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کا پہلا دورِ شاعری بیدلؔ کے اِتباع کے لیے مخصوص ہے جس میں اُردو الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔ غالب کے اُردو کلام کا یہ حصہ عام

---

[1] [جرمنی میں WEIMAR گوئٹے GOETHE کی آرام گاہ ہے]

فہم نہیں ہے۔ لیکن عام تنقید اور مولوی فضلِ حق خیر آبادی کے مشورے کے باعث، مرزا نے اپنا یہ اسلوبِ شعری بدل دیا۔ مرزا غالب کی اُردو شاعری کا دوسرا دور، عام فہمی کے لحاظ سے بدرجہا بہتر تھا۔ اور تیسرے دور میں تو مرزا غالب کا کلام نہایت صاف وسلیس ہوگیا۔ غالب کے کلام کا یہی حصہ ... مقبول ہے۔ غالب کی اُردو شاعری تخلیقی ہے۔ وہ ایک ایسے اسلوبِ کلام کے بانی تھے جس میں فارسی الفاظ و استعارات کو نہایت دلفریبی کے ساتھ اُردو سے دست وگریباں کر دیا گیا ہے۔ غالب نے اس راہ پر نہ صرف خود بڑی کامیابی وہُنرمندی کے ساتھ گام زنی کی بلکہ اس راہ پر دوسرے چلنے والوں کی بھی رہ نمائی کی۔ علوئے خیال اور نُدرتِ بیان کلام غالب کے خصائص ہیں۔ غالب کے اُردو کلام کے انہی خصائص نے اُردو شاعری کو فارسی شاعری کا ایک سنجیدہ حریف بنادیا۔ ان کے خیالات کی وسعت اور گہرائی بے پناہ تھی اور ان کی قوتِ متخیلہ حیرت انگیز۔ غالب کے کلام کی معنویت ان کے ہمعصروں کے کلام پر فایق اور عام فکری سطح سے بہت بلند تھی۔ مختصر یہ کہ مرزا غالب کی ذات، شخصیت اور کلام سب منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری فکر انگیز ہے اور عقل و دانش کو تازگی بخشتی ہے۔ اپنے کلام میں غالب نے زندگی کے اُلجھے ہوئے مسائل اور انسانی فطرت کا جائزہ لیا ہے اور تاثر و اثر پذیری انھوں نے میر سے مستعار لی ہے۔ غالب کبھی بھی عام سطح پر نہیں اُترے اور اُنھوں نے سستی مقبولیت سے گریز کیا۔ ان کے کلام میں تنوع، انفرادیت و خلوص ہے۔ اُن کی شاعری ساحری سے کم نہیں۔

مرزا غالب کی زبردست مقبولیت کے باعث اُن کے بعض حریف و مخالف بھی پیدا ہو گئے تھے۔ بے نا معقول مخالفت 'آبِ حیات' سے شروع ہو کر خود ہمارے زمانے میں مرزا یاس و یگانہ لکھنوی پر ختم ہوئی، بلکہ مؤخرالذکر تو غالب دشمنی میں اخلاق و شرافت سے بھی گر گئے۔ حد یہ کہ یاس و یگانہ نے مرزا غالب کی مخالفت سے سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر غالب کے مداحین مثلاً مولانا حالی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر صلاح الدین خدا بخش اور بیخود موہانی وغیرہ کی بھی تحقیر و توہین کی۔ غالب کے زیادہ سنجیدہ مخالفین میں ایک عبدالباری آسی لکھنوی تھے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے 'آرگس' کے قلمی نام سے مرزا غالب اور ان کے شعری آرٹ پر سخت تنقید کی تھی۔ لیکن بعض دیگر حضرات، آرگس، کو خود نیاز فتحپوری پر شک کرتے ہیں کیونکہ اس قلمی نام سے غالب کے خلاف مضامین ان کے ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ اس فہرست میں آسی لکھنوی کے علاوہ عبدالمالک آروی اور ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔ نیاز فتحپوری کو بقول اُن کے، اُردو شاعری کے اس زبردست و بے مثال شاعر و ادیب کو "بے نقاب" کرتے میں نہایت مسرت محسوس ہوتی تھی۔

کسی اور اُردو شاعر یا اہل قلم پر اس قدر لٹریچر جمع نہیں ہوا ہے جتنا کہ مرزا غالب پر اور صرف یہی ایک حقیقت اس امر پر دال ہے کہ اُردو لٹریچر میں مرزا کا مقام کس قدر بلند ہے۔ آب حیات کے علاوہ غالب کے کوائف حیات 'یادگار غالب' میں بڑی تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ ایک تیسری کتاب 'دیوان غالب جدید' ہے جس کو زیادہ شہرت 'نسخہ حمیدیہ' کے نام سے ملی۔ اس کے دیباچے 'محاسن کلام غالب' میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے مرزا غالب کے بے نظیر و بے مثال ادبی محاسن کے اعتراف کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ کلام غالب کی شرحوں میں نظم طباطبائی، عبدالباری آسی، سُہا، بیخود دہلوی اور حسرت موہانی کی آراء و افکار زیادہ مشہور ہیں۔ 'گنجینۂ تحقیق' کے نام سے غالب پر بیخود موہانی کے مضامین فکر انگیز ہیں۔ منشی عبدالرحمٰن طارق کا 'صحیفۂ ادب' بھی اسی سلسلے کی ایک کامیاب کوشش ہے غلام رسول مہر نے 'غالب' کے نام سے خود مرزا کے خطوط کی مدد سے اُن کے جو سوانح حیات مُرتب کئے ہیں، وہ ادبی کاوش کا شاہکار ہے۔ اکرام کا 'غالب نامہ' بھی نظر انداز کرنے والی چیز نہیں اور نہ مالک رام کا 'ذکر غالب'۔ عبداللطیف کے 'غالب' کا بھی یہاں ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی اور آخر میں 'مُرقع چغتائی' کا حوالہ دینا ازبس ضروری ہے جس میں ایک آرٹسٹ نے اپنے سے بڑے آرٹسٹ کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا ہے۔

یہاں غالباً اُن عظیم ہستیوں کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو دہلی میں مرزا غالب کی ہمعصر تھیں اور جنہوں نے یقیناً کسی نہ کسی طور پر مرزا کو متاثر کیا ہوگا۔ مثلاً حکیم محمد احسن اللہ خاں، وزیر اعظم شہنشاہ بہادر شاہ ظفر، [جن کی غداری کے باعث شہنشاہ ظفر کو رنگون کو جلا وطن ہونا پڑا تھا] مولوی مملوک علی نانوتوی [دہلی مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر]، حاجی غلام نصیر الدین المعروف بہ 'کالے صاحب'، [مولانا قطب الدین کے فرزند اور حضرت مولانا فخر الدین کے پوتے]، خواجہ محمد نصیر رنج [میر درد کے پوتے، میر اثر کے شاگرد اور شاہ سعد اللہ گلشن کے مُرید]، حضرت سید احمد بریلوی [مُجاہد اعظم]، حکیم غلام نجف خاں [طبیب شاہی] مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی [شاہ ولی اللہ کے فرزند]، مولانا شاہ رفیع الدین [شاہ عبدالعزیز کے برادر خورد]، مولانا شاہ عبدالقادر [شاہ رفیع الدین کے ایک اور بھائی]، مولانا مُفتی محمد صدر الدین خاں آزردہ [دہلی کے چیف جج]، مولانا محمد اسمٰعیل شہید [مُجاہد اسلام حضرت سید احمد بریلوی کے خاص مُرید]، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق خیر آبادی [مولانا فضل امام کے جو رنگون میں مدفون ہیں، بیٹے]، مولانا امام بخش صہبائی [فارسی کے جید عالم و شاعر]، میاں شاہ نصیر، حکیم مومن خاں مومن، میر نظام الدین ممنون [میر قمر الدین منت سونی پتی کے فرزند]، شیخ ابراہیم ذوق، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان المعروف بہ حافظ جیو،

عبداللہ خاں اوجؔ، میر امانی اسدؔ، شہنشاہ بہادر شاہ ظفرؔ، مرزا محمد دارا بخت داراؔ عرف مرزا شبّو (ولی عہد سلطنت)، مرزا فخرالدین عرف مرزا فخرو رمزؔ، مرزا کریم الدین رساؔ، نواب مرزا خاں داغؔ، مرزا علی بیگ نازنینؔ (ریختی کے شاعر)، میر حسین تجلیؔ (میر تقی میر کے پوتے)، محمد ناصر خاں محزوںؔ (خواجہ میر درد کے پوتے)، عبدالرحمٰن ہُدہُدؔ، حکیم سکھانند رقمؔ، منشی نوازش حسین خاں تنویرؔ (جن کی قبر بھوپال میں ہے)، حافظ غلام رسول خاں شوقؔ (ذوق کے اُستاد)، حافظ ویرانؔ، پنڈت امرناتھ آشفتہؔ، لالہ بال مکند حضورؔ، حکیم آغا جان عیشؔ (طبیب دربار)، حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، میر قمرالدین منتؔ، میاں شکیباؔ (میر کے شاگرد) اور سید احمد خاں دہلوی (مصنف "آثار الصنادید") وغیرہ۔

دہلی سے باہر مرزا غالب کے معاصرین:۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مفتی عنایت احمد، مولوی محمد قاسم دیوبندی، مولوی محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا فضل رحمٰن گنج مُرادآبادیؒ اور مولوی عنایت رسول چریاکوٹی وغیرہ۔

یہ حقیقت ریکارڈ پر ہے کہ مرزا غالب نے ۲۵ حضرات سے مُراسلت کی تھی اور اُنھوں نے ۵۴۶ خطوط رقم فرمائے تھے جن میں سے ۲۶۶ خطوط پر تاریخ ثبت ہے۔ حسب ذیل اشخاص کو مرزا نے دس سے زاید خطوط رقم کئے تھے:۔

میر غلام بابا (۱۰)، میاں داد خاں (۲۵)، حبیب اللہ خاں ذکاؔ (۱۵)، منشی ہرگوپال تفتہؔ (۱۲۳)، میر مہدی مجروحؔ (۴۶)، قاضی عبدالجلیل (۱۲)، غلام نجف خاں (۲۳)، سید احمد حسین (۱۱)، خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ (۱۴)، لالہ شیو نراین آرامؔ (۲۳)، مرزا علی علاءُ الدین خاں علائیؔ (۵۳)، سید غلام حسنین (۲۱)، چودھری عبدالغفور (۱۷)، یوسف مرزا (۱۱)، مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ لکھنوی (۱۸) اور انورالدولہ (۱۸)۔

حسب ذیل افراد بھی، وقت کے تھوڑے فرق کے ساتھ، مرزا غالب کے ہمعصر تھے:۔ مُنیرؔ شکوہ آبادی، خواجہ قلقؔ لکھنوی، اسیرؔ لکھنوی، محسنؔ کاکوروی، نظیرؔ اکبرآبادی، علامہ ڈپٹی نذیر احمد، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، امیرؔ مینائی، اکبرؔ الٰہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، مولانا اسمٰعیل میرٹھی، مولوی محمد حسین آزادؔ، مرزا رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی، مولانا غلام امام شہید وغیرہ۔ غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، آتشؔ اور ناسخؔ کے تلامذہ بھی جن کا اوپر ذکر نہیں ہوا، مرزا کے معاصرین ہی تھے۔

آج شائقینِ اُردو مرزا غالب کی اُردو شاعری کو پرستش کی حد تک سراہتے ہیں اور آیندہ بھی جوں جوں اُردو زبان و ادب میں دلچسپی بڑھتی جائے گی کلامِ غالب سے مداحینِ غالب کا لگاؤ بڑھتا جائے گا۔ کلامِ غالب کے بغیر اُردو شاعری بیوقار ہے، وہ ایک ایسی دلہن کی مانند ہے جس کا سہاگ چھن گیا ہو۔ اُردو نثر میں مرزا غالب نے ایک ایسا انقلابی اسلوب اختراع کیا جس کی بنیاد سادگی، سلاست و سہل ممتنع

بہ تمام تکلف اور تصنع سے سرے سے مفقود تھی۔ تعلّی اور روایتی مبالغہ کا شائبہ نہ تھا۔ نثری کلام و مراسلت میں نہ پہلے کبھی اس طرزِ نگارش کو اپنایا گیا تھا اور نہ آج تک اس سے بہتر کوئی اسلوب ادب پیش ہو سکا ہے۔ مرزا غالب اس سادگی و بے تکلفی کے محض بانی ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے اس کی بنیاد پر ایک بلند و بالا عمارت بھی تعمیر کی۔ اس سے زیادہ سہل و بامعنی طرزِ بیان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے رقعات کی تاریخ ۱۸۵۶ء ہے لیکن رقعاتِ غالب کی تدوین سے کوئی چار سال پیشتر خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث اکبرآبادی کے خطوط بالکل ایسی ہی سادہ و سلیس زبان میں مرتب ہو چکے تھے لیکن وہ ۱۸۹۵ء سے پہلے شائع نہ ہو سکے تھے۔ یہ وہی خواجہ غلام غوث ہیں جنہوں نے "عودِ ہندی" کو جمع و مرتب کیا تھا۔ مرزا غالب کے بعض اکبرآبادی معاصرین کے نام یہ ہیں۔ خلیفہ گلزار علی اسیر (میاں نظیر کے فرزند)، مرزا اعظم علی بیگ اعظم، افہام اللہ افہام و ساحر، شیخ نیاز علی پریشان (مصنف "تذکرۂ شعر و سخن")، مولوی نبی بخش حقیر، مولوی سید مدد علی تپش ("خزینۃ القواعد" اور ایک منظوم جغرافیہ کے مصنف)، مہاراجہ بلوان سنگھ (ایک دیوان کے مصنف)، مرزا خانی رنج، غلام محمد رباست، سید باقر رازؔ، قطب الدین خاں باطن ("تذکرۂ گلستانِ بےخزاں" یا "نغمۂ عندلیب" کے مصنف)، احمد خاں شیفتہ، منشی جواہر لال جواہر ["زبدۃ التاریخ" کے نام سے سیر المتاخرین کے ایک منتخب ایڈیشن کے مؤلف]، میر سعادت علی سعید، مولوی اصغر علی اصغر (ذخیرۂ ببانیٔ نثر کتب کے مصنف، مع لغتِ اصغر علی اور وقائع منصور الزماں، سات جلدوں میں۔ "بوستانِ خیال" کے جواب میں، لیکن اس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی)، مرزا رجب علی بیگ سرور ["فسانۂ عجائب" کے مصنف۔ سرور لکھنؤ میں پیدا اور وہیں فوت ہوئے تھے (متوفی ۱۸۶۷ء)۔ وہ نوازش لکھنوی کے شاگرد تھے، لیکن سرور کا آبائی وطن آگرہ تھا] اور شیخ عبدالمجید رسوا۔ بعض دیگر اکبرآبادی شعراء کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دہلی کے ساتھ آگرے کا یہ شاعرانہ و ادبی تعلق مرزا غالب کی وفات کے ساتھ منقطع ہو گیا تھا۔

مرزا غالب کے بعض شاگردوں کا تذکرہ۔ نواب سعید محمد زکریا خاں رضوی ذکی (نواب سید محمد خاں کے بیٹے اور نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ سرور، ایک اردو تذکرے کے مصنف کے پوتے) جو دہلی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئے۔ ذکی مہتابی اور پنڈت رام کشن بسمل کے بھی شاگرد اور "فرہنگِ آصفیہ" کے مصنف سید احمد کے استاد تھے۔ میر مہدی حسن مجروح

۱؎ برلن (جرمنی) سے ایک ادبی جریدہ جرمن اور انگریزی زبانوں میں "ڈیر اسلام" DER ISLAM (THE ISLAM) کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں صفحہ ۹۹ سے صفحہ ۱۲۶ تک نیپلز یونیورسٹی (اٹلی) کے اردو کے پروفیسر

دہلوی (متوفی ۱۹۰۲ء)۔ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی (یہ تخلص فارسی کلام میں اختیار کرتے جس میں وہ مرزا غالب کے شاگرد تھے) اور شیفتہ (اُردو میں مومن کی شاگردی میں)، جو اعظم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں مظفر جنگ والیٔ ریاست جہانگیر آباد کے فرزند تھے۔ شیفتہ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ نواب محمد ضیاء الدین احمد خاں (جانشینِ غالب، رخشاں (اُردو میں) ور نیرّ (فارسی میں)، فخر الدولہ احمد بخش خاں حاکم فیروز پور جھرکہ کے فرزند تھے۔ نیرّ کا انتقال ۱۸۸۳ء میں ہوا جبکہ وہ جوان تھے۔ وہ ایک زبردست نقاد تھے اور اُنھوں نے معروف انگریز مؤرخ ایلیٹ ELLIOT کو اُس کی تاریخ ہند کی تالیف میں مدد دی تھی۔ ان کے فرزند نواب شہاب الدین خاں ثاقب مرزا غالب کے بھتیجے تھے۔ ان کے دوسرے فرزند کا نام نواب مرزا سعد الدین خاں طالب تھا۔ رخشاں کا نمونۂ کلام :-

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گُذرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

شجاع الدین خاں تاباں نواب شہاب الدین خاں ثاقب کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ شاداں اور داغ کے شاگرد تھے۔ تاباں نے مرزا غالب کے مُنہ بولے بیٹے مرزا باقر علی خاں کامل کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ثاقب کے دوسرے بیٹے اور تاباں کے چھوٹے بھائی تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی (پیدائش ۱۸۳۷ء۔ وفات ۱۹۱۴ء)۔ نواب زین العابدین خاں عارف نواب غلام حسین خاں کے بیٹے اور شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ خاں کے پوتے تھے

ڈاکٹر اے باؤسانی کا مضمون بعنوان "اُردو اور انڈو پرشین شاعری کی تاریخ میں غالب (۱۷۹۶ء۔ ۱۸۶۹ء) کا مقام" شائع ہوا ہے۔ اس کے ص۱۰۵ کے فٹ نوٹ میں ڈاکٹر باؤسانی نے ایک نہایت مضحکہ خیز بات لکھی ہے۔ پہلے تو اُنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے ہاں پرندوں کے ذبح کے طریقہ کی مذمت کی ہے اور اُسے "بے رحمانہ" کہا ہے اور پھر لفظ "بسمل" کی حسبِ ذیل مضحکہ خیز توضیح کی ہے جس سے اُن کی لسانی ناواقفیت کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "چونکہ مسلمان ہر جانور کو ذبح کرتے وقت پہلے بسم اللہ کہتے ہیں اس لیے مذبوحہ جانور "بسمل" کہلاتا ہے"۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر باؤسانی جیسے عالم فاضل سے یہ غلطی کیسے سرزد ہوئی جبکہ بسم اللہ عربی اور بسمل، فارسی زبان کے دو مختلف الفاظ ہیں۔ پھر مذبوحہ پرند کو "بسمل" نہیں کہا جاتا بلکہ اُس کی ذبح کے بعد کی کیفیت کو کہا جاتا ہے۔

عارف مرزا غالب کے بھتیجے تھے۔ اور شاہ نصیر کے شاگرد رہے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نواب غلام حسن خاں محو تھے۔ نواب ذوالفقار علی خاں آذر ولد نواب حیات علی خاں۔ نواب علاء الدین خاں علائی۔ سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا انور۔ ظہیر کے چھوٹے بھائی اور ذوق کے شاگرد، ذوق کے انتقال کے بعد انور مرزا غالب کے شاگرد ہوگئے تھے۔ منشی غلام بسمل بریلوی (متوفی ۱۹۰۴ء)۔ مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی، مرزا عالم بیگ کے فرزند، حیدرآباد (دکن) میں ۱۸۲۴ء میں پیدا اور وہیں ۱۸۷۴ء میں فوت ہوئے۔ پہلے وہ قربان تخلص کے ساتھ مومن کے شاگرد تھے مگر مومن کے انتقال کے بعد سالک تخلص اختیار کر کے مرزا غالب کے شاگرد ہوگئے۔ مولوی سیف الحق ادیب دہلوی (پیدائش ۱۸۴۶ء۔ وفات ۱۸۹۱ء) پہلے غالب کے شاگرد مرزا یوسف علی خاں عزیز کے شاگرد تھے، لیکن پھر خود غالب کے شاگرد ہوگئے۔

مخالفین غالب: مرزا یگانہ لکھنوی، عبدالمالک آروی اور آسی لکھنوی وغیرہ نے غالب کی مخالفت ان کی تنگ مزاجی اور اپنے معاصرین کے محاسن کے اعتراف سے انکار کی بنا پر کی ہے۔ ماہنامہ "نگار" لکھنؤ (مارچ ۱۹۳۹ء) میں عبدالمالک آروی نے اپنے مضمون بعنوان "غالب کی اخلاقی کمزوریاں" میں انہی امور کی شکایت کی ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ مرزا فارسی گویانِ ہند کے قائل نہ تھے اور نہ وہ اہلِ ہند کی فارسی کی لیاقت کے معترف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ملا غیاث الدین رامپوری (مصنف "غیاث اللغات")، ملا عبدالواسع ہانسوی اور مرزا قتیل فرید آبادی پر کڑی تنقید کی تھی۔ ملا عبدالواسع ضلع حصار کے قصبہ ہانسی کے رہنے والے اور عربی و فارسی کے عالم فاضل تھے۔ وہ اردو قواعد پر رسالہ عبدالواسع کے مصنف تھے۔ قتیل کشمیری کھتری اور فرید آباد میں پہلے ہندو تھے۔ جن کا نام دیوانی سنگھ تھا۔ بعد کو انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فیض آباد میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی نے انھیں دائرۂ اسلام میں داخل کیا تھا اور اُن کا مسلم نام مرزا محمد حسین رکھا تھا۔ شہید نے انھیں اپنا شاگرد بنا لیا تھا اور فارسی شاعری میں ان کا تخلص قتیل رکھا تھا۔

مرزا غالب عقائدِ دین کے معاملے میں آزاد منش و رند مشرب انسان تھے۔ بعض کے نزدیک وہ سنی حنفی تھے، بعض نے ان کو تفضیلی کہا ہے اور بعض انھیں امامیہ اثنا عشری شیعہ مانتے ہیں۔ حب الوطنی کے معاملے میں بھی مرزا کے متعلق مختلف آرا ہیں۔ بعض نے اُن کو محبِ وطن کہا ہے لیکن بعض نے خود غرض، خود پرست اور غدار۔ اُن کے اُردو کلام کے سلسلے میں بھی بعض نے مرزا کی صوفیانہ و فلسفیانہ شاعری کو عظیم مانا ہے لیکن بعض نے اُنکے کلام کے کچھ حصے کو مُغلق و ناقابلِ فہم کہا ہے۔ بہ ایں ہمہ غالب کا نام زندہ ہے اور ان کا

کلام حیرت انگیز طور پر تازہ درود افزا۔ لیکن سب سے زیادہ متنازعہ فیہ چیز ان کے کلام کی نوعیت ہے۔ بعض اسے رجائی کہتے ہیں اور بعض قنوطی۔ بعض کہتے ہیں کہ مرزا کا فلسفۂ حیات محض خوش باشی تھا، لیکن بعض اسے حاسدانہ ومنتقمانہ کہتے ہیں، بعض اسے یاس وحرماں کا نتیجہ مانتے ہیں، بلکہ بعض دیگر اسے عیش کوشی تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی اسے بے اطمینانی قرار دیتے ہیں اور مرزا غالب کو مشاہیر عالم میں شمار نہیں کرتے۔

دیوانِ غالب اردو میں جسے غالب نے خود مرتب کیا تھا، کوئی اٹھارہ سو[۱۰۰] اشعار ہیں۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق، مرزا غالب نے اپنی اردو شاعری پندرہ[۱۵] سال کی عمر یعنی سنہ ۱۸۱۱ء سے شروع کی تھی اور ابتدائی چند برسوں میں اُن کا تخلص اسد تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنے تبدیلیٔ تخلص کے معاملے میں مستقل طور پر قائم نہیں رہے کیونکہ ان کی بعض بعد کی غزلوں میں بھی ان کا تخلص 'اسد' پایا جاتا ہے۔

غالب پر زمانہ جدید میں جو لٹریچر مرتب ہوا: 'غالب اور اس کی شاعری' از مولوی احمدالدین احمد مارہروی الہ آباد، 'نادر خطوط غالب' از سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی لکھنؤ، 'روحِ غالب' از سید محی الدین قادری زور حیدرآبادی۔ اور 'ادبی خطوط غالب'، از مرزا عسکری۔ ان کے علاوہ حسب ذیل ادیبوں نے غالب کا گہرا مطالعہ کیا ہے: بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر مہیش پرشاد، الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، لکھنؤ یونیورسٹی کے سید مسعود حسن رضوی ادیب، اور عرشی رامپوری وغیرہ۔

ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں کی تحریک سے مرزا غالب کی شادی چودہ[۱۴] سال ہی کی عمر میں سنہ ۱۸۱۰ء میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف (نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی) کی بیٹی سے دہلی میں ہو گئی تھی۔ مرزا غالب کے ایک چھوٹے بھائی (مرزا یوسف خاں) بھی تھے، جو جوانی ہی میں دیوانے ہو گئے تھے۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں، جو غالباً سنہ ۱۸۰۲ء میں راجہ بختاور سنگھ والیٔ ریاست الور کی فوجی ملازمت میں جاں بحق ہوئے تھے، راج گڑھ میں دفن ہوئے تھے۔ راجہ مذکور نے مرحوم کی بیوہ اور لڑکوں کی پرورش کے لیے دو گاؤں جاگیر میں دئے تھے، جس کی آمدنی مدت تک خاندانِ غالب کو ملتی رہی۔ مرزا نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال آگرے میں بسر کئے تھے، جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے دہلی کے ہو رہے۔ لیکن وہ درمیان میں تین سال تک دہلی سے غیر حاضر رہے، جس کے دوران میں وہ کلکتہ، میرٹھ، مراد آباد اور رامپور میں مقیم رہے۔ غالب نے ابتدائی تعلیم آگرے میں شیخ معظم سے حاصل کی تھی۔ اُنھوں نے فارسی

ایک ایرانی پارسی ہرمز نامی سے سیکھی تھی جو بعد کو مسلمان ہو گئے تھے۔ غالب کی فارسی کی لیاقت غیر معمولی و حیرت انگیز تھی، جس کے باعث ان کے حاسدین و مخالفین پیدا ہو گئے تھے۔ مرزا غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک پیدائشی شاعر تھے۔ ان کے بعض نقادوں کے بقول، مرزا کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری سے زیادہ کامیاب و باثر ہے۔ غالب ۱۸۵۷ء تک آرام سے رہے، لیکن پہلی جنگِ آزادی کے بعد ان کے مصائب و آلام کا آغاز ہوا، مگر ان کی وفات سے چند سال پیشتر ان کے بہتر ایام واپس آ گئے اور وہ آسان زندگی بسر کرتے ہوئے فوت ہوئے۔ مرزا کے ان مصائب و آلام کی داستان ان کے خطوط کے دو مجموعوں "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" میں محفوظ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سیاسی فسادات کے دوران میں غالب نے "لغتِ برہانِ قاطع" پر تنقید کر کے اپنے خلاف مخالفت کا ایک طوفان بپا کر لیا تھا۔ اُن کی فارسی مثنوی "بادِ مخالف" جو کلکتہ میں لکھی گئی تھی، اُسی مخالفت کی صدائے بازگشت ہے۔ ["اُردو" از مولوی عبدالحق، ماہنامہ "کارواں"، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۴ء؛ "مختصر تاریخ ادب اُردو" از پروفیسر اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی؛ "تذکرہ معرکۂ سخن" از آسی الدنی؛ "غالب" از ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدر آباد، دکن۔ ماہنامہ "کلیم"، دہلی اگست ۱۹۳۷ء]

نمونۂ کلام:-

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

(الف)

خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

ذوق کے والد کا نام شیخ محمد رمضان دہلوی تھا، جو ایک غریب سپاہی زادے تھے۔ ذوق دہلی میں ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شروع میں وہ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے، لیکن پھر ان کے حریف بن گئے۔ ذوق ابھی اُنیس سال کے تھے کہ شہنشاہ اکبر شاہ ثانی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھنے کے عوض

اُنھیں 'خاقانی ہند' کا خطاب اور دربارِ شاہی میں 'ملک الشعراء' کا منصب عطا ہوا تھا۔ وہ قصیدہ اِس مصرعہ سے شروع ہوتا ہے۔

ع جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن

ابوظفر بہادر شاہ اپنی ولی عہدی کے زمانے ہی سے ذوق کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ذوق اُن ایرانی شعرائے کے پیرو تھے جنہوں نے رطب اللسانی کو ایک فن لطیف بنا دیا تھا۔ اُردو لٹریچر میں اُن کے اُن قصائد کی جو اُنھوں نے آخری سلاطین مُغلیہ کی شان میں نظم کیے تھے بڑی قدر افزائی ہوئی ہے۔ لیکن ذوق کی غزلیں اُن کے قصاید کی طرح مقبول نہ ہو سکیں کیونکہ وہ طبعاً اور ذہنی لحاظ سے اُردو شاعری کی اِس جذباتی صنف سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ ذوق کا انتقال دہلی میں ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ مومن اور غالب ان کے ہمعصر و حریف تھے۔ ذوق کی زبان سہل و سادہ اور ان کا اسلوب شعری باوقار ہے۔ ان کے کلام میں محاورات و ضرب الامثال نہایت خوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ قصیدے میں سودا کے علاوہ کوئی اور شاعر اُن سے بازی نہ لے جا سکا۔ ذوق نے دراصل قصیدے میں سودا کا اتباع کیا ہے۔ 'کلیاتِ ذوق' شائع ہو چکی ہے۔

ذوق کی غزلیں رومان سے معرّا ہیں۔ اُن میں احساسات و جذباتِ محبت کی پُرخلوص حرارت نہیں ہے ان کی غزلوں میں نہ تو روحانی تجربات کی عکاسی ہے، نہ فلسفیانہ ادراک، اور نہ انسانی فطرت کی ترجمانی وہ بیشتر خارجی مناظر کشی کرتے ہیں جو تغزل کی روح سے ناآشنا ہیں۔ وہ اندرونی جذبات سے بے خبر زبان کے الفاظ و محاورات سے کھیلتے ہیں اِسی سبب سے ذوق دہلی میں لکھنؤ اسکول کے ترجمان نظر آتے ہیں اور دہلوی شعرائ کی داخلیت و ماحول سے بیگانہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ذوق محض ایک شاعرِ دربار ہو کے رہ گئے تھے اور اُنھیں نہ تو وقت میسّر تھا، نہ ماحول کہ وہ تغزل کی اندرونی کیفیاتِ انسانی کے تقاضوں کو پورا کر سکتے۔

ذوق میں ایک اچھے غزل گو شاعر کی تمام خصوصیات موجود تھیں، لیکن وہ حسب ذیل وجوہات کے باعث بتدریج ضائع ہو گئی تھیں:۔

۱۔ پہلی تو یہ وجہ تھی کہ شاہ نصیر کی شاگردی کے باعث ذوق کا کلام بھی شاہ نصیر کی خارجیت سے متأثر ہوا۔

۲۔ پھر جب ذوق کا شاہ نصیر سے اختلاف ہوا تو اُنھوں نے مشاعروں میں اپنے سابق اُستاد سے بازی لے جانے کی کوشش کی۔

۳۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ جب ناسخ کا دیوان لکھنؤ سے دہلی آیا اور ناسخ کے اسلوبِ شعری کا چرچا ہوا تو ذوق نے بھی سستی شہرت کمانے کے لیے اس میں طبع آزمائی کی۔

۴۔ ذوقؔ کو کلامِ ناسخؔ کی خارجیت شعر گوئی کے لیے آسان تر معلوم ہوئی، چنانچہ انھوں نے اس طرز کو اپنانے کی کوشش کی، اور

۵۔ درباری زندگی کی مصروفیات کے باعث ذوقؔ کو انسانی فطرت کی عکاسی کے لیے کافی وقت و مہلت نہ مل سکی۔ اُن کو مُغل شہنشاہ کے روز افزوں مطالبات کی انجام دہی سے فرصت ہی نہ ملتی تھی کیونکہ اپنے آقا کی ہمہ وقت خوشنودی کا حصول اُن کا فرض منصبی تھا۔ لہٰذا ان کے لیے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے کلام کو سستی شہرت کی نذر کر دیں، جو اُنھیں وافر وقتی طور پر ملی، لیکن اس میں پائداری نہ تھی۔ بہ ایں ہمہ ہمیں دیوانِ ذوقؔ میں جستہ جستہ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اُردو تغزل کے اعلیٰ معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

آزادؔ نے 'آبِ حیات' میں اس امر کو ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی ہے کہ ذوقؔ کو ظفرؔ کی خوشنودی کے لیے اتنا کچھ کہنا پڑتا تھا کہ اُنھیں اپنے لیے کچھ نہ بچتا تھا۔ بہ ایں ہمہ ذوقؔ کی شاعری میں کہیں کہیں تغزل کی صحیح جاذبیت و داخلیت کے بھی آثار ملتے ہیں، لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ موجود ہے کہ وہ بُنیادی طور پر ایک درباری شاعر تھے اور غزل کی تمام ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہے۔ لیکن ان کی خارجیت فنکارانہ، باوقار، معقول اور شاندار تھی۔ ذوقؔ کی اُردو غزل غالبؔ اور مومنؔ کی معنویت اور گہرائی سے عاری ہو تو ہو، لیکن وہ ناسخؔ کی شاعری کی طرح اُڑتی ہوئی ریت کے بگولوں کی مانند بھی نہیں تھی۔ ذوقؔ ناسخؔ کے اسلوبِ شاعری سے مُتاثر ضرور تھے لیکن پھر بھی وہ ایک دہلوی شاعر تھے۔ اس لیے یہ ایک فطری امر تھا کہ ذوقؔ غالبؔ، مومنؔ اور خود اپنے شاگرد ظفرؔ کی پُرخلوص اور سچی شاعری سے بھی مُتاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ظفرؔ ذوقؔ کی شاعری و شاعرانہ ذہنیت کی فضا مُہیا کرتے تھے۔ ہر چند کہ غالبؔ کی شاعرانہ سحر کاری کا ذوقؔ کی فنکاری سے موازنہ کرنا غلط ہوگا، کیونکہ غالبؔ اُردوئے مُعلّیٰ کے فرماں روا تھے، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ میرؔ کے بعد سوائے ذوقؔ کے کوئی اور اُردو شاعر آج تک ایسی نرم، شیریں اور دھیمی دھیمی شاعری نہ کر سکا، اگرچہ میرؔ اور ذوقؔ کو ایک ہی سطح پر رکھنا قطعی غلط ہوگا۔ زمانۂ جدید میں حالیؔ نے غالبؔ کی ترجمانی کی، حسرتؔ موہانی نے مومنؔ کی، اور داغؔ نے ذوقؔ کی۔ قصیدے میں ذوقؔ نے سوداؔ کی یاد تازہ کر دی ذوقؔ مثنوی میں بھی عاری نہ تھے۔

'آبِ حیات' کے مصنّف مولانا آزادؔ ایک غالی و تبرّائی شیعہ تھے۔ اُنھوں نے ذوقؔ کا مذہب نہیں بتایا، لیکن دیوانِ ذوقؔ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوقؔ شیعہ نہیں، بلکہ تفضیلی سُنّی تھے۔ ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ کے مدیر نیاز فتحپوری کے مطابق "ذوقؔ شیعہ نہیں تھے اور اُن کی تفضیلیت محض روایتی اور اہلِ سُنّت

پر صوفیانہ اثرات کا نتیجہ تھی، جس کا کوئی تعلق شیعوں کے افضلیت علیؓ کے عقیدے سے نہیں ہے۔"

ذوق کے شاگرد سیّد ظہیر الدین ظہیر، مولوی محمد حسین آزاد، بہادر شاہ ظفر، داغ، انور، ادر ... وغیرہ۔

ذوق نے اپنی شاعری کا آغاز حافظ غلام رسول شوق کے مکتب سے کیا تھا جہاں وہ شروع میں پڑھتے تھے۔ اُس وقت شوق ہی ذوق کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ذوق اپنے ہم مکتب کاظم حسین بیقرار کے ساتھ شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو "خاقانِ ہند" کا خطاب عطا کیا تھا۔ ذوق ایک نہایت معقول انسان اور ایک باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ موسیقی، نجوم اور طب میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ ایک متقی مسلمان تھے۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان دہلی میں نواب لطف علی خاں کے نجی ملازم تھے۔ لال قلعہ کے مشاعروں میں ذوق میر کاظم حسین بیقرار کے توسل سے ہی پہنچے تھے۔ اُس وقت بیقرار ولی عہد سلطنت ابوظفر بہادر شاہ کے ملازم تھے، جو شاہ نصیر کے شاگرد تھے جب شاہ نصیر دہلی سے حیدرآباد دکن اور بیقرار میر منشی ہو کر شکارپور (سندھ) چلے گئے تو ذوق ظفر کے اُستاد بن گئے۔ ذوق کے کلام کا اسلوب عام طور پر نصیر اور ناسخ کے طرزِ شاعری سے ملتا جلتا ہے یعنی وہ لکھنؤ اسکول کی شاعری سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن "تذکرہ جلوۂ خضر" اور "آبِ حیات"، دونوں کے مطابق ذوق اپنی آخر زندگی میں بالکل سودا بن گئے تھے [تذکرہ جلوۂ خضر، جلد اول ص ۲۲۳ ۔ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۲۶ء "ذوق کی غزل گوئی پر تبصرہ"، "ذوق کی شاعری میری نظر میں"، از پروفیسر فراق گورکھپوری، ماہنامہ "نگار"، دسمبر ۱۹۳۷ء "ذوق کا مذہب"، از مالک رام، ماہنامہ "نگار"، فروری ۱۹۳۵ء "ملک الشعراء ذوق"، ماہنامہ "جامعہ"، دہلی جنوری ۱۹۴۰ء "ذوق مرحوم"، از احمد علی خاں شاد عارفی، ماہنامہ "ہمایوں" لاہور، اکتوبر ۱۹۳۵ء "دیوانِ ذوق"، از مولانا آزاد دہلوی، رفاہِ عام پریس، لاہور ۱۹۲۲ء ۔ "ذوق دہلوی"، "خمخانۂ جاوید"، جلد سوم] نمونۂ کلام

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے، جو بن کھلے مُرجھا گئے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گُزار یا اِسے رو کر گُزار دے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بُت سے خدا سمجھے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

(۴۲)

حکیم مومن خاں مومنؔ

مومنؔ کا وطن اور مولد دہلی تھا جہاں وہ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ دہلی ہی میں ۱۸۵۱ء میں فوت و دفن ہوئے۔ مومنؔ حکیم غلام نبی خاں کے فرزند اور شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ مومنؔ کے دادا کا نام حکیم نامدار خاں کاشمیری تھا اور وہ دہلی میں محلہ کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ مومنؔ سُنّی تھے اور حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی کے نہایت معتقد مُرید تھے۔ وفات کے بعد مومنؔ دہلی دروازے کے باہر مہندی پورہ میں شاہ عبدالعزیز کے مزار کے قریب دفن ہوئے تھے۔ اُن کا آبائی پیشہ حکمت (طب) تھا۔ مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے ہمعصر و حریف اور اُردو شاعری کے مُسلّم و معتبر اُستاد تھے۔ وہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ وہ "شاہِ تغزل" کہے گئے ہیں اور وہ مثنوی گوئی میں بھی معروف تھے۔ مومنؔ کے بزرگ کشمیر سے دہلی آئے تھے اور شاہ عالم کی سلطنت کے دوران میں انھیں نارنول (پنجاب) کے پرگنہ میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ مومنؔ نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر دہلوی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ انتہائی ذہین و بیدار مغز انسان تھے۔ اُنھوں نے نہایت کامیاب قصائد بھی کہے ہیں۔ مومنؔ کی شاعری میں میرؔ و دردؔ کی سادگی اور سوداؔ کی بلند آہنگی ہے۔ غالبؔ کے بعد مومنؔ کا کلام بہت مقبول ہوا۔ ذوقؔ اور غالبؔ کی مانند اب مومنؔ کے عقائد بھی متنازعہ فیہ بنائے گئے ہیں اور بعض لوگ اُنھیں بھی شیعہ کہتے ہیں لیکن ہماری رائے میں مومنؔ سُنّی تھے۔

مومنؔ ایک کامیاب طبیب، ایک ماہر منجّم اور شطرنج کے ایک بے بدل و شاطر کھلاڑی تھے۔ اُنھوں نے اپنے بعد ایک دیوان اور چھ مثنویاں چھوڑیں۔ وہ تغزل کے مانے ہوئے اُستاد تھے اور اپنی رومان پروری، معاملہ بندی و معنی آفرینی میں بہت کم حریف رکھتے تھے۔ ان کے کلام سے ان کی انفرادیت و غیر معمولی شخصیت نمایاں ہیں۔ وہ معاملاتِ عشق کی تحلیل نفسی کے اظہار میں کمال رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کلام میں نہایت صداقت و خلوص سے انسانی جبلّت و فطرت، جذبات و احساسات کی عکاسی کی ہے۔ ان کے اکثر قصائد مذہبی ہیں کیونکہ وہ خوشامد سے متنفر تھے، یہ قصائد صرف دو انسانوں کے لیے کہے گئے ہیں، ایک تو راجہ اجیت سنگھ والئ پٹیالہ کی مدح میں اور دوسرا نواب ٹونک کی توصیف میں لیکن وہ دونوں کسی انعام کی خاطر نہیں بلکہ اظہارِ تشکر کے لیے کہے گئے تھے۔

مومنؔ کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے جن میں سے بعض کے اسماء اس طرح ہیں: خیرالدین یاسؔ دہلوی، میر

غلام علی خاں وحشت مرادآبادی، مرزا اصغر علی نسیم دہلوی، کاظم علی کاظم منڈاوری (بجنوری)، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، اُمتہ الفاطمہ بیگم سحاب المعروف بہ 'صاحب جی'، مرزا قربان علی بیگ سالک، میر حسین تسکین، شیخ علی بخش بیمار سنبھل مرادآبادی (حسرت موہانی نے انھیں قدرت اللہ شوق کا شاگرد بتایا ہے)، نواب عباس علی خاں بیتاب رامپوری، حکیم مولا بخش قلق میرٹھی، میر عبدالرحمٰن آہی (مومن کے داماد اور اُن کی اردو کلیات کے مدوّن)، حکیم سید منور علی آشفتہ دہلوی، مرزا خدا بخش قیصر دہلوی، راسخ دہلوی وغیرہ [ماہنامہ 'نظارہ'، لکھنؤ، جون سنہ ۱۹۳۱ء، ص ۱۸-۲۷۔ ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور، عید نمبر سنہ ۱۹۳۰ء، ص ۲۳-۱۱۲۔ ماہنامہ 'نگار'، لکھنؤ، مارچ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء، ص ۳۹-۴۶ اور ص ۱۲-۲۵، اسپیشل 'مومن نمبر'، جنوری سنہ ۱۹۲۸ء، اکتوبر، نومبر اور دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء اور مارچ، اپریل اور مئی سنہ ۱۹۳۰ء، رسالہ 'اردو'، اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء، ص ۵۹۲۔ 'ہسٹری آف اردو لٹریچر' (انگریزی) از رام بابو سکسینہ، ص ۱۵۰۔ 'طرازِ عشق' 'طورِ کلیم'، از نورالحسن۔ 'بزمِ سخن'، از علی خاں۔ 'سخن شعرا'، از عبدالغفور نساخ۔ 'بہارستانِ سخن'، از امداد امام اثر۔ اور 'گلِ رعنا'، از سید عبدالحیٔ]۔ مومن کا نمونۂ کلام

بےخود تھے، غش تھے، محو تھے، دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا!
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا، نباہ نہ کی

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعنِ اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

(۳۳)

حضرت ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر

آخری مغل تاجدارِ ہند

ظفر شہنشاہ محمد اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شہنشاہ شاہ عالم کے پوتے تھے۔ وہ شاہ نصیر، ذوق، بیقرار اور غالب کے شاگرد رہے تھے۔ ظفر ۱۷۷۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں وہ تخت نشین ہوئے

۱۸۵۸ء میں اُنھیں انگریزوں نے تخت و تاج سے معزول کر دیا اور وہ پہلے تو کلکتہ کو چلا وطن کئے گئے لیکن پھر وہاں سے رنگون (برما) بھیج دئے گئے، جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں فوت و دفن ہوئے۔ اُنھوں نے چار دیوان چھوڑے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات سلاست و سادگی یاس، قنوطیت و حرماں زدگی ہیں۔
ظفر کا نمونۂ کلام

غم دلدار اب یوں دل میں بیباکانہ آتا ہے | کہ جیسے اپنے گھر میں کوئی صاحب خانہ آتا ہے
ان حسرتوں سے کہدو کہیں اور جا بسیں | ان کی جگہ نہیں ہے دلِ داغدار میں
عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن | دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے | دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

(۲۴)

فخر الشعراء میر نظام الدین ممنون سونی پتی

ممنون ملک الشعراء میر قمرالدین منت کے فرزند تھے۔ وہ اپنے ہی والد کے شاگرد اور شہنشاہ اکبر شاہ ثانی شجاع کے اُستاد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ممنون مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے بھی اُستاد تھے منت اور ممنون دونوں شیعہ تھے۔ ممنون اجمیر میں صدر الصدور (چیف جج) تھے، مگر وہ دہلی واپس آگئے تھے جہاں اُن کا انتقال ۱۸۴۴ء میں ہوا۔ وہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے قرابت دار تھے۔ ممنون لکھنؤ بھی گئے تھے جہاں شاہ اودھ نے ان کی توقیر و مدارات کی تھی۔ اُن کا نمونۂ کلام

رات تھوڑی، حسرتیں دل میں بہت | صلح کیجیے، بس لڑائی ہو چکی
الٰہی وہ جو وعدے ہیں، وفا کس طرح ہوویں گے! | نہ واں خُو یاد آنے کی، نہ یاں شیوہ تقاضا کا
صبا پیغام یہ کہیو ہمارے ہم صفیروں کو | سُنا جایا کرو آواز گاہے ہم اسیروں کو

متاخرین دور پنجم کی خصوصیات

یہ اردو شاعری میں انقلاب کا دَور تھا جس میں ایک صدی کی سادگی و معنی آفرینی کی لکھنؤ اسکول کے تصنع و مُبالغہ نے جگہ لیلی تھی۔ اِس دَور میں اُردو زبان میں زبردست اصلاحات کی گئیں اور اُردو قواعد و عروض

متعین کئے گئے۔ اسی زمانے میں اُردو ادب کے دو مُختلف و مُتضاد لکھنوی اور دہلوی مدارسِ فکر وجود میں آئے بعض اشعارِ آتش کے علاوہ، لکھنوی اسکول کی غزل خصائصِ تغزل سے معرّا تھی۔ ناسخ کا اسلوب شعری بے اثر تھا مگر ان کے تلامذہ نے اُسے بدتر بنا دیا۔ بہ ایں ہمہ اس دَور میں لکھنوی اسکول نے ایک خاص کی چیز' مثنوی گلزارِ نسیم' کی شکل میں پیش کی، دوسری نمایاں شئے امانت کا ناٹک' اِندر سبھا' تھی، اور تیسری خصوصیت مرثیہ کی غیر معمولی ترویج وارتقا تھی جسے انیس و دبیر کی دماغی اُپج نے چار چاند لگا دیئے۔

رہا دہلوی اسکول، تو میر و سودا کے بعد، یہ اُردو شاعری کا سُنہرا دَور تھا۔ اگرچہ میر کا درد و سوز، درد کی روحانیت و تصوف، مصحفی کی معنی آفرینی اور جرات کی ولولہ انگیزی مفقود ہوگئی تھی، لیکن ان کی جگہ داخلیت، تحلیلِ نفسی، وسعتِ تخیّل، دُور بینی، علوئے خیال، باوقار اظہارِ بیان، صداقت وخلوص نے لے لی تھی، جو صحیح، حقیقی اور مؤثر شاعری کے لوازم ہیں۔ قصیدے کو سودا کے بعد ذوق نے ترقی دی اور غزل میں غالب و مومن اس دَور کے نہایت درخشاں ستارے تھے۔

اب دہلی سے لکھنؤ کو مرکزِ اُردو کے منتقل تبادلہ کا وقت آچکا تھا۔ قریبًا ہر دہلوی شاعر لکھنؤ اسکول بالخصوص ناسخ کے اسلوبِ شعری سے مُتاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حتّٰی کہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ ہر دہلوی شاعر نے اس اسلوب میں طبع آزمائی کی (' رفتارِ اُردو'، اسپیشل نمبر ماہنامہ' عالمگیر' لاہور ۱۹۳۶ء؛ ' شعر الہند' جلد اوّل باب دوم، ' اساتذۂ دہلی' ص۲۴۱-۲۶۸؛ ' تذکرۂ گلستانِ سخن'، ' کاشف الحقائق'، ص۱۱۸؛ ' جلوۂ خضر' جلد اوّل ص۲۴۱؛ ' شعر العجم' جلد چہارم ص۲۹؛ ' شرح دیوانِ غالب'، از طباطبائی ص۱۵۵)

⑨

مُتأخّرین - دورِ ششم

از ۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۰ء

مرثیہ کا اِرتقا

اُردو شاعری کا یہ دَور اُن شعراء سے متعلق ہے جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد زندہ تھے، حالانکہ گذشتہ دَورِ پنجم کے بعض شعراء بھی اس کے بعد عرصے تک بقیدِ حیات رہے۔ اِس دَور میں ہماری دلچسپی بیشتر اسیرؔ، ناسخؔ، آتشؔ، شاہ نصیرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور ممنونؔ وغیرہ کے تلامذہ کے مطالعہ میں ہے (ان میں دَورِ پنجم میں بیان کردہ شعراء شامل نہیں ہیں) مع اُن شعراء کے جو تاریخی اعتبار سے اِس دَور سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں اِس باب کو دیگر ابواب سے علیحدہ رکھا گیا ہے تاکہ مرثیہ کا سیر حاصل ذکر ہو سکے۔ مرثیہ مشرقی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے جس میں عرب و ایران دونوں ممالک اور زبانوں کے شعراء نے کافی لٹریچر فراہم کیا ہے۔ موجودہ باب میں متعدد تلامذہ کو ان کے اساتذہ سے جُدا بیان کیا گیا ہے تاکہ ان میں واضح طور پر امتیاز کیا جا سکے۔ مگر بعض تلامذہ کا ذکر گذشتہ باب میں اپنے اساتذہ کے ساتھ کر دیا گیا ہے کیونکہ تاریخی اعتبار سے اُن کا تعلق اُسی دَور سے تھا یعنی ان کی رحلت ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اِس دَور کے بعض شعراء (مثلاً حالیؔ) کا ذکر آیندہ دَور میں کیا جائے گا کیونکہ تاریخی اعتبار سے ان کا تعلق دَورِ جدید اور جدید اُردو شاعری سے ہے۔ موجودہ دَور میں حسبِ ذیل شعراء کا ذکر شامل ہے:-

میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، منیرؔ شکوہ آبادی، ظہیرؔ دہلوی، سحرؔ لکھنوی، سالکؔ دہلوی، ... میرٹھی، بیخودؔ بدایونی، ... قدوائی، قلقؔ لکھنوی، نظمؔ طباطبائی، انورؔ دہلوی، ذکیؔ دہلوی، عارفؔ دہلوی، بسملؔ بریلوی، معروفؔ، ... نظم آبادی، امیرؔ مینائی، داغؔ دہلوی، جلالؔ لکھنوی، تسلیمؔ لکھنوی اور راسخؔ دہلوی۔

... دور میں ہم مرثیہ کی صنف کی اہمیت و خصوصیت پر تفصیل کے ساتھ بات نہیں کریں گے کیونکہ ... تاریخی اعتبار سے بحث کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ اُردو شاعری کی اِس مخصوص صنف کو ... کس کا ہاتھ تھا۔ آیندہ صفحات میں ہم نے ایک علیحدہ باب مرثیہ کے خصائص پر

تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کے لیے مخصوص کیا ہے۔

(۱)

میر ببر علی انیس

انیس میر مُستحسن خلیق کے فرزند، میر حسن کے پوتے اور میر ضاحک دہلوی کے پرپوتے تھے۔ انیس فیض آباد میں ۱۸۰۲ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۷۵ء میں فوت ہو کر سبزی منڈی لکھنؤ میں دفن ہوئے تھے۔ انیس اپنے والد خلیق کے شاگرد تھے۔ وہ عظیم آباد اور حیدرآباد (دکن) اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ انیس کے بزرگ ہرات سے آ کر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ انیس کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ مرزا دبیر ان کے ہم عصر و حریف تھے۔ میر انیس نے اُردو شاعری کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن انھیں مقبولیت صرف مرثیہ گوئی میں ہوئی۔ اُن کے مراثی نے اُردو میں رزمیہ شاعری کی کمی کو پورا کر دیا۔ انیس اور دبیر کے اسالیب بیان میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کے مراثی سادہ، آسان، مؤثر اور پُر جوش زبان میں ہیں جبکہ ثانی الذکر کے مراثی بلند آہنگ اور پُر شکوہ ہیں۔ نولکشور پریس، لکھنؤ نے انیس کا مکمل کلام پانچ جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔

فارسی زبان میں امام حسینؓ کی شہادت پر سب سے زیادہ مشہور مرثیہ محتشم کاشی کا 'ہفت بند' ہے۔ اُردو شعراء نے بھی اس کو ہی اپنے مراثی کا نمونہ بنایا ہے لیکن انیس اور دبیر دونوں نے اُردو میں مرثیہ کا معیار بہت بلند کر دیا۔ مگر یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ امام عالی مقام کی حق پروری، غیر معمولی شجاعت و جرأت کی اوصاف بیانی کے بجائے انیس و دبیر دونوں عورتوں کی طرح ماتم کناں اور ان کے مصائب و شہادت پر نالہ زن و مصروفِ آہ و بُکا ہیں۔ یہ مراثی شہیدِ کربلاؓ کے اُن حقیقی و غیر معمولی اوصاف کی ترجمانی سے قاصر رہے ہیں جو اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ان بُنیادی خامیوں کے باوجود ان کے مراثی نے اُردو شاعری و ادب کو زبان و اظہارِ بیان کے لحاظ سے مالا مال کر دیا ہے۔

انیس آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ وہ ہمیشہ دہلی سے اپنے خاندانی تعلقات پر نازاں رہے۔ وہ خود کو دہلوی سمجھتے اور دہلی اسکول کی زبان کو سراہتے تھے۔ گذشتہ کئی نسلوں سے اُردو شاعری ان کے خاندان میں رہی تھی اور ان کے دادا میر حسن، مصنف 'مثنویٔ سحر البیان' ایک عظیم اُردو شاعر تھے۔ چنانچہ اُردو کے حق کے طور پر ان کے خاندان کی زبان عام مقبولیت کی حامل تھی

انیس نے ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی سے حاصل کی تھی۔ انیس ہی نے اُردو شاعری میں کردار نگاری کو متعارف کیا۔ انھوں نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا۔

لیکن اپنے والد اور اُستاد میر خلیق کے مشورے سے اس کو ترک کر کے اپنی پوری توجہ مرثیہ گوئی کی طرف مرکوز کر دی ۔ نظامی پریس ، بدایوں نے انیس کا کلام تین جلدوں میں شائع کیا ہے ۔ انیس کی حسب ذیل رباعی زبان زد خاص و عام ہے :۔

پر جُھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضُعف پیری نے
چُنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

انیس کے دو بھائی اور بھتے ، میر نواب مونس اور میر مہر علی اُنس ۔ مونس کے کوئی اولاد نہ تھی ۔ اُنس بہت ضعیف العمر ہو کر فوت ہوئے اور ان کے فرزند میر وحید کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہوا ۔ انیس کے تین بیٹے تھے ، میر خورشید علی نفیس ، میر محمد سلیس اور میر عسکری رئیس ۔ نفیس کی دو اولادیں تھیں ۔ بیٹے کا نام میر خورشید حسن عُرف دولہا صاحب عروج تھا اور بیٹی کی شادی سید محمد حیدر سے ہوئی تھی ، جن سے سید علی محمد عارف پیدا ہوئے تھے ۔ انیس کی واحد بیٹی کی شادی سید احمد مرزا صابر سے ہوئی تھی ، جن کے فرزند سید محمد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید ایک معروف مرثیہ گو تھے ۔ رشید کے علاوہ انیس کے ایک اور نواسے میر احسن علی رئیس تھے ۔

اُردو میں رزمیہ شاعری کے لحاظ سے انیس ہومر اور فردوسی کے ہم پلہ تھے خاقانی اور ملٹن کے شعری کارنامے مشکل زبانوں میں ہیں ، لیکن ان کے برعکس انیس کی زبان سہل ، سادہ و آسان ہے اور اس میں شیکسپیئر ، ہومر اور فردوسی کے پیرایۂ بیان کی سی اثر اندازی ہے ۔ یوروپ میں فطری شاعری کو تمام دیگر اسالیب شاعری سے بلند تر مقام دیا گیا ہے ۔ ورڈز ورتھ ، سر والٹر اسکاٹ وغیرہ نے اپنی شاعری کو عکاسیٔ فطرت کے لیے مخصوص کر دیا تھا ۔ یہ مخصوص صفت نظیر اکبر آبادی کے علاوہ صرف انیس کے کلام و مراثی میں پائی جاتی ہے ۔ حسب ذیل شعر میں خود انیس نے اپنی اس صفت کی نشاندہی کی ہے ؎

میری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

مشرق و مغرب کے بہترین شعراء کی فہرست میں حسب ذیل عظیم شعراء کے نام لیے جاتے ہیں ۔ فردوسی (فارسی) ، کالیداس (سنسکرت) ، اعشیٰ (عربی) ، ہومر (یونانی) ، ورجل (لاطینی) گوئٹے (جرمن) ، اور شیکسپیئر (انگریزی) وغیرہ ، اور شاہنامہ ، شکنتلا ، ایلیڈ ILIAD ، اینڈ AENID ۔

'فاؤسٹ'، (FAUST) 'ہیملٹ'، وغیرہ قدیم عالمی ادب کے شاہکار ہیں، لیکن ان میں سے کوئی شہ پارہ داخلی شاعری کا نمونہ نہیں، گویا قدیم عالمی ادب کے وہ تمام شاہکار محض خارجی شاعری کے مظہر تھے۔ مرزا سلطان احمد نے اپنی 'فنِ شاعری' میں انیس ودبیر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور موازنہ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ مغربی شعرائے کے کارناموں پر فایق تھیں۔ اپنے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں مولانا حالی نے انیس کو اُردو کا بہترین شاعر مانا ہے۔ ڈاکٹر گراہم بیلی (DR. GRAHAM BAILEY) نے اپنے 'اُردو لٹریچر' (URDU LITERATURE) میں انیس، غالب اور میر کو اُردو کے بہترین شعراء تسلیم کیا ہے۔ علامہ شبلی بھی اپنے 'موازنہ انیس ودبیر' میں انیس کو اُردو کے تمام شعراء میں سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں۔

ایک ہی زمانے کے دو شعراء کا باہمد گر موازنہ کیا گیا ہے، جو ایک بے سود کوشش ہے۔ امامی ہروی کو سعدی کا حریف کہا گیا۔ غالب کے مقابل ذوق کو اور داغ کے مقابل امیر مینائی کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح انیس کا حریف دبیر کو بتایا گیا ہے، لیکن اگرچہ دبیر بھی بہت اچھے شاعر تھے، مگر انیس سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انیس فطری طور پر ایک عظیم شاعر تھے۔ انیس اور دبیر میں وہی فرق تھا جو فردوسی اور نظامی میں تھا۔ پروفیسر شہباز نے اپنی 'زندگانیٔ بے نظیر' میں نہایت قابلیت کے ساتھ نظیر اکبر آبادی کی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا ہے اور بلا شک نظیر اپنی متنوع شاعرانہ خوبیوں، اپنی سادگیٔ بیان اور اپنی انفرادیت کے باعث اُردو کے ایک باکمال شاعر تھے، لیکن وہ انیس کے ایک کامیاب حریف نہیں کہے جا سکتے۔ ڈاکٹر فیلن FELON، علامہ شبلی ('موازنہ انیس ودبیر') اور مولانا حالی ('مقدمہ شعر و شاعری')، سب نظیر پر انیس کی برتری کے معترف ہیں۔ ایک قدیم یونانی کہاوت کے مطابق "نقاشی خاموش شاعری ہے اور شاعری خاموش نقاشی" اس لیے اگر شاعری بولتی ہوئی نقاشی ہے تو انیس ایک عظیم آرٹسٹ تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں — جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

شمس العلماء مولوی امداد امام اثر نے اپنی تصنیف 'کاشف الحقایق' کی دوسری جلد میں میر انیس کے مذکورہ بالا دونوں اشعار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جہاں تک فطری شاعری کا تعلق ہے، اگر انیس کا فارسی شاعری میں کوئی حریف پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف قاآنی تھے۔ انیس کا حسب ذیل شعر ملاحظہ ہو:۔

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰؑ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

انیس کے پردادا، میر ضاحک، دہلی سے ترکِ وطن کر کے مستقلاً فیض آباد چلے گئے تھے جہاں نواب شجاع الدولہ نے اُن کی نگہداشت کی۔ ضاحک پھر واپس دہلی نہیں گئے۔ انیس کے دادا میر حسن بھی دہلی سے فیض آباد آگئے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی فیض آباد اور لکھنؤ میں بسر کر دی۔ میر خلیق اور ان کے تینوں بیٹے، انیس، مونس اور اُنس، سب فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر وہ سب لکھنؤ چلے آئے جہاں ان کا انتقال ہوا اور وہ سب وہیں دفن ہوئے۔ لکھنؤ کی تباہی کے بعد انیس مرثیہ خوانی کے لیے عظیم آباد اور حیدر آباد (دکن) جاتے رہتے تھے۔ انیس کی مرثیہ خوانی کا انداز بھی نرالا تھا جس سے سامعین مسحور ہو جاتے تھے [اُردو انٹر میڈیٹ کورس، از مولانا عبدالباری آسی اور عبدالشکور بریلی کالج ۱۹۳۶ء۔ ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ، جنوری۔ فروری ۱۹۲۵ء۔ 'اُردو کا بہترین شاعر۔ میر انیس' انعامی مضمون، ماہنامہ 'ہمایوں'، لاہور، جولائی ۱۹۳۶ء۔ رسالہ 'زمانہ'، کانپور، جنوری ۱۹۳۰ء از نقاد الہ آبادی اور سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی۔ ماہنامہ 'نیرنگ خیال'، لاہور از پروفیسر زور، جون۔ اگست ۱۹۲۶ء۔ ماہنامہ 'مخزن'، لاہور 'موازنۂ انیس و دبیر' از شبلی نعمانی، انوار المطابع، لکھنؤ]

(۲)

مرزا سلامت علی دبیر

دبیر مرزا غلام حسین دہلوی کے بیٹے، مرزا غلام محمد کے پوتے اور مرزا رفیع کے پرپوتے تھے۔ مرزا رفیع مُلّا اہلی شیرازی، مصنف 'مثنوی سحر حلال' کے بڑے بھائی مُلّا ہاشم شیرازی کے بیٹے تھے۔ دبیر کے مذکورہ بالا بزرگ دہلی میں مغل بادشاہوں کے میر منشی تھے۔ دبیر محلہ بلی ماران دہلی میں ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ وہ لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۸۷۵ء میں فوت ہو کر محلہ نخاس کے کوچۂ دبیر میں اپنے ہی گھر کے اندر دفن ہوئے۔ دبیر میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ دبیر کے مراثی کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ انیس کے مقابلے میں دبیر کہیں زیادہ لائق انسان تھے۔

میر انیس کی سادگی، سلاست، روانی، داخلیت، اثر انگیزی اور جذبات نگاری کے مقابلے میں دبیر کی شاعری کی خصوصیات اس کی بلند پروازی، شان و شکوہ، تفاخر و دبدبہ ہیں۔ انیس و دبیر دونوں حریف تھے لیکن وہ شریف و باوقار حریف تھے اور ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انیس کی وفات کے بعد دبیر نے محفلوں میں جانا اور مرثیہ خوانی ترک کر دی تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ

"طورِ سینا ہے کلیم اللہؑ و منبر ہے انیسؔ"

دبیرؔ نے انشاؔ کی نواسی سے شادی کی تھی۔ جب وہ دہلی میں مشہور ہوئے تو پہلے شاہِ اودھ نواب غازی الدین حیدر نے انکو طلب کرکے اپنے خاص محل میں ان کے مراثی سُنے۔ محل کی متعدد بیگمات اور شہزادیاں دبیرؔ کی شاگرد تھیں، مثلاً نواب ملکہ زمانیہ اور سلطانہ عالیہ وغیرہ۔ جب انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو اُس وقت فرمانروائے اودھ امجد علی شاہ تھے۔ ۱۸۵۷؁ء کے ہنگاموں کے دو سال کے بعد نواب امام بندی بیگم نے دبیرؔ کو عظیم آباد (پٹنہ) بُلایا۔ اس کے بعد دبیرؔ ہر سال عظیم آباد جاتے رہے۔ اپنی رحلت سے ایک سال قبل دبیرؔ نابینا ہوگئے تھے۔ لیکن واجد علی شاہ نے جو اُس وقت جلاوطنی کے عالم میں مٹیا برُج کلکتہ میں مقیم تھے، اُنھیں اپنے پاس بُلایا اور معزول بادشاہِ اودھ کے جرمن ماہر امراضِ چشم نے ان کا علاج کیا اور وہ صحت یاب ہوگئے۔ دبیرؔ کے بیٹے اوجؔ بھی عمدہ مرثیہ گو شاعر تھے، نیز ان کے پوتے مرزا رفیعؔ۔ [خُم خانۂ جاوید، جلد سوم، دبیرؔ لکھنوی۔ موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، از شبلی نعمانی، لکھنؤ]۔ تلوار کی صفت میں دبیرؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

شانے پہ جو چمکی تو بغل سے نکل آئی　　جاں ڈر کے تنِ زشت عمل سے نکل آئی
گاہ حُر کی طرح فوجِ دغل سے نکل آئی　　دریا میں جو تیری تو جبل سے نکل آئی
ہلتی زمیں گاو زمیں کانپ رہی تھی
ساتھ اُس کے جو پھرتی تھی اجل کانپ رہی تھی

(۳)

منشی سیّد محمد اسمٰعیل حسین مُنیرؔ شکوہ آبادی

مُنیرؔ سید احمد حسین شادؔ شکوہ آبادی کے فرزند اور رشکؔ اور دبیرؔ کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۱۳؁ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۰؁ء میں اُنھیں کالے پانی (بحرِ ہند کے جزائر انڈمن کو جلا وطنی) کی سزا ہوئی تھی لیکن ۱۸۶۵؁ء میں اُنھیں وہاں سے رہائی مل گئی تھی۔ مُنیرؔ ۱۸۸۱؁ء میں رامپور میں فوت و دفن ہوئے۔ وہ نواب باندہ کے ملازم تھے لیکن ان کی زندگی کے آخری ایام نواب کلب علی خاں نواب والیٔ ریاست رامپور کے دربار میں بسر ہوئے تھے۔ مُنیرؔ کا نمونۂ کلام:-

دل بیتاب کا خُدا حافظ!
آنکھیں لڑتی ہیں تیر پڑتے ہیں

کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن اُن کا
دو دغا بازوں کے نبھنے میں ہے جوبن اُن کا

وصل نے لُوٹ لیا دونوں کو تنہا پاکر
آج میرا ہے گریباں نہ دامن اُن کا

(۴)

راقم الدولہ سیّد ظہیر الدین ظہیر

ظہیر اصلاح الدولہ مرصع رقم خاں بہادر سید جلال الدین حیدر خوشنویس شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے خوشنویسی میں استاد کے فرزند اور ذوق کے شاگرد تھے لیکن وہ مومن کی طرزِ شاعری کے متبع تھے۔ ظہیر دہلی میں ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ نجف آباد، رامپور، بلند شہر، جے پور اور ٹونک وغیرہ میں مقیم رہے اور حیدرآباد دکن میں ۱۹۱۱ء میں فوت و دفن ہوئے۔ ظہیر نے اپنی زندگی عسرت و فلاکت میں بسر کی۔ انھوں نے اپنے بعد تین مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ دیوان چھوڑے۔ نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ان کے شاگرد تھے۔ ظہیر کا نمونہ کلام:-

ہے یاد ظہیر ان کا شب وصل بگڑنا
وہ نمکیں دشنام کی لذت نہ کہیں گے

کیا بُری شے ہے محبت بھی، الٰہی توبہ
جُرم ناکردہ، خطاوار بنے بیٹھے ہیں

(۵)

شیخ امان علی سحر

سحر شیخ محمد امین لکھنوی کے بیٹے تھے اور پہلے ناسخ کے اور پھر برق کے شاگرد ہوئے تھے۔ سحر صفیر بلگرامی کے اُستاد تھے۔ اُنھوں نے رشک اور بہادر کے ساتھ مل کر زبانِ اُردو کی اصلاح میں حصّہ لیا تھا۔ امجد علی شاہ کے دَورِ حکومت میں وہ دربارِ لکھنؤ سے وابستہ رہے تھے۔ سحر ۱۸۵۸ء میں فوت ہوئے۔ صفیر بلگرامی کے علاوہ ان کے حسبِ ذیل دیگر شاگرد تھے:۔ آشفتہ لکھنوی اور نواب محمد تقی خاں حسام لکھنوی (واجد علی شاہ کے داماد)۔ سحر کا نمونۂ کلام ؎

رنج و غم ہجر کے گذر بھی گئے
اب تو وہ دھیان سے اُتر بھی گئے

(۶)

مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے۔ وہ پہلے قربان تخلص کے ساتھ مومن کے شاگرد تھے۔ مومن کے بعد وہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا۔ ان کا مولد و مدفن دونوں حیدرآباد (دکن) تھے۔ وہ ۱۸۲۴ء میں پیدا اور ۱۸۷۴ء میں فوت ہوئے۔ سالک مدتِ دراز تک ریاست الور میں رہے تھے۔ ان کے دیوان کا نام "ہنجارِ سالک" ہے۔ سالک کا نمونہ کلام :۔

پھرتے ہیں داد خواہ تیرے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

ہے بُرائی نصیب کی کہ مجھے
تم سے اُمید ہے بھلائی کی

تم آگئے تو ہوش کہاں، میزباں ہو کون
آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم

(۷)

سیّد مُرتضیٰ بیان میرٹھی (متوفی ۱۹۰۰ء)

بیان کی نظم بعنوان "اُمید سے خطاب" کے دو اشعار :۔

کلیسہ میں بت کی ادا بن گئی تو | حرم میں پہنچ کر خدا بن گئی تو
لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے | اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

(۸)

مولوی عبدالحیٔ بے خود بدایونی

بیخود مولوی غلام سرور صدیقی بدایونی کے فرزند تھے۔ وہ بدایوں میں ۱۸۵۰ء میں پیدا

ہوئے تھے اور پہلے حالی اور پھر داغ کے شاگرد ہوگئے تھے۔ اُنھوں نے شروع میں شاہجہان پور میں وکالت کی، لیکن بعد کو وہ جودھپور میں مجسٹریٹ ہوگئے تھے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں فوت ہوئے۔ اُن کا نمونۂ کلام:-

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے! ۔۔۔ دوستی دشمنی نہ ہو جائے
اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں ۔۔۔ عاشقی بندگی نہ ہو جائے

(۹)

شیخ احمد علی شوقؔ قدوائی

شوقؔ شیخ کاظم علی قدوائی کے فرزند اور جگور (ضلع بارہ بنکی) میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی تھی۔ شاعری میں وہ امیرؔ کے شاگرد تھے اور اُن کا پیشہ صحافت تھا۔ اُنھوں نے لکھنؤ سے اخبار 'آزاد' نامی نکالا تھا۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کے بعد شوقؔ 'حامداللغات' کی تدوین کے سلسلے پرتاب گڑھ، بھوپال اور رامپور میں ملازم رہے۔ اردو شاعری میں شوقؔ نے اپنے لیے ایک ممیّز و منفرد اسلوب وضع کیا یعنی اُنھوں نے اپنے کلام میں ہندی فضا و ماحول کو جگہ دی اور نسوانی جذباتِ محبت کی بھرپور ترجمانی کی۔ اِس نہج پر اُن کی 'مثنوی ترانۂ شوقؔ' ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اپنا منظوم ڈرامہ 'قاسم و زہرہ' ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا، لیکن وہ مقبول نہ ہوا۔ اِسی طرح ان کی 'مثنوی ترانۂ شوقؔ' بھی 'مثنوی گلزارِ نسیم' کے بالمقابل ایک ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ اُن کی بہترین نظم 'عالمِ خیال' تھی جس میں ایک بیوی نے اپنے خاوند کی جدائی میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ شوقؔ کو عورت کے جذباتِ محبت کی ترجمانی کا خاص ملکہ حاصل تھا، اِس ضمن میں وہ اس نظم میں بہت کامیاب رہے ہیں، جس کے باعث اُن کی یہ نظم کئی طرح سے اُردو کی ایک بے مثال نظم تسلیم کی گئی ہے۔ اُردو کے مشہور نقاد جسٹس سرشاہ محمد سلیمان نے اس نظم کے بارے میں کہا تھا کہ اس نظم میں "ایک مرد کے قلم سے ایک عورت کا دل بول رہا ہے۔" ۱۸۸۹ء میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' میں شوقؔ نے 'مسدسِ حالی' کے اسلوب پر اپنا مُسدس بعنوان 'لیل و نہار' پڑھا تھا۔ لیکن اس میں 'مسدسِ حالی' جیسی سحرکاری و اثر آفرینی کہاں شوقؔ کی غزلوں میں بھی ان کی نظموں کے خصائص موجود ہیں۔ شوقؔ ۱۹۲۸ء میں فوت ہوکر گونڈہ میں دفن ہوئے (جدید اردو شاعری، ص ۱۷۴-۱۸۲) شوقؔ کے تغزل کا نمونہ:-

دیکھ کے ایک بار اُنھیں، دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھیے کیا گذرتی ہے، دوسری بار دیکھ کر

وصل سے گذرے اے خدا، ہاں یہ شگون چاہیئے
صبح کو ہم اٹھا کریں، رُوئے نگار دیکھ کر

دے رہی ہے شہ جوانی خُودسری کو آج کل
اپنے آگے وہ نہیں گِنتے کسی کو آج کل!

جس ستمگر نے کیا لاکھوں تمنّاؤں کا خُون
یاد کرتی ہے تمنّا پھر اُسی کو آجکل

(۱۰)

آفتاب الدولہ ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد اللہ قلق لکھنوی

قلق خواجہ بہادر حسین فراق لکھنوی کے فرزند اور خواجہ وزیر کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ وہ واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ گئے تھے لیکن لکھنؤ واپس آ گئے تھے جہاں اُن کا انتقال ۱۸۸۱ء میں ہوا۔ قلق کا نمونۂ کلام ؎

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گِلہ دِل کا
بس ایک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دِل کا

(۱۱)

سیّد علی حیدر نظم طبا طبائی لکھنوی

نظم میر مصطفیٰ حسین طبا طبائی کے بیٹے تھے اور لکھنؤ میں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم مُلّا طاہر نحوی سے حاصل کی تھی اور شاعری میں وہ مینڈو لال زار کے شاگرد تھے۔ کلکتہ میں وہ واجد علی شاہ کے شہزادوں کو عربی و فارسی پڑھاتے اور خود علّامہ قائم الدین مرزا محمد علی مجتہد سے دینی تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ واجد علی شاہ کی وفات کے بعد وہ عربی و فارسی کے پروفیسر ہو کر نظام کالج، حیدرآباد (دکن)، چلے گئے، جہاں اُنھیں نظام حیدرآباد نے نواب حیدر یار جنگ کا خطاب عطا کیا۔ وہ کچھ عرصے تک نظام حیدرآباد کے ولی عہد کے اتالیق بھی رہے تھے۔ عثمانیہ

یونیورسٹی حیدرآباد دکن اکے قیام کے بعد نظم اس کے دارالترجمہ کے مہتمم بھی رہے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، مولانا سُہا علیگ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نظم کے شاگرد تھے۔ عربی و فارسی کے متبحر عالم ہونے کے علاوہ، نظم اردو شاعری و ادب کے مسلمہ نقاد بھی تھے۔ وہ ایک مشہور شرح دیوانِ غالب کے مصنف بھی ہیں۔ نظم کا انتقال ۱۹۳۳ء میں ہوا۔ اُنھوں نے 'گورِ غریباں' کے نام سے اردو نظم میں مشہور انگریز شاعر گرے GRAY کی نظم GRAY'S ELEGY کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح اُن کی ایک اور نظم شراب نوشی کے خلاف بعنوان 'ساقی نامۂ شفقتیہ' بہت مقبول ہوئی۔ نظم نے بہت سی دوسری نظمیں اور قصیدے لکھے تھے۔ اُنہوں نے نظم مُعرّا BLANK VERSE پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ اُن کا دیوان انکے مرنیکے بعد طبع ہوا۔ اُن کا اسلوبِ شعری سنجیدہ و باوقار ہے۔ اُن کی نظم 'گورِ غریباں' کو جدید اُردو شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ جو انگریزی شاعری کے مخصوص طرز STANZA پر لکھی گئی تھی اور اس طرح وہ اُردو میں ایک مُنفرد چیز ہے۔ وہ بین الاقوامی حیثیت سے دُنیا کے اُن معدودے چند تراجم میں سے ہے جو اپنے اصل سے بھی زیادہ فایق و ممتاز ہیں۔ نظم کا نمونۂ کلام:-

اس چھیڑ میں کوئی جو نہ مرتا ہو تو مر جائے
وعدہ ہے کہیں اور، ارادہ ہے کہیں اور

حسرت سہی، اُمید سہی، آرزو سہی
مونس تو کوئی عالمِ وحشت میں چاہیئے

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہوکر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں، کُھلا وہ چہرے کا رنگ ہوکر

(۱۲)

سید شجاع الدین عرف اُمراؤ مرزا انور دہلوی

انور، ظہیر دہلوی کے چھوٹے بھائی اور ذوق اور غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے والد مشہور خوشنویس یاقوت رقم ثانی میر جلال الدین حیدر تھے۔ بہت پُرگو تھے۔ لالہ سری رام نے ان کا دیوان مرتب کرکے افادہ عام پریس لاہور سے شائع کیا تھا۔ دیوانِ ذوق کا جو اڈیشن ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوا تھا اس کی ترتیب میں بھی شریک تھے۔ ان کا انتقال جے پور میں ۱۳۰۲ھ میں ہوا۔ انور کا نمونۂ کلام

جالِ شکر لبی تو کھلے گا وصال میں !
وعدے سے ہاں سمجھتے ہیں شیریں زباں ہو آج

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے !

بدمستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

تم آج ہی چل پھر کے مٹا دو نہ یہ جھگڑا
کیوں کل پہ رکھو شورشِ غوغائے قیامت

(۱۴۳)

نواب حافظ سیّد محمد زکریا خاں ذکی دہلوی

ذکی عبدالاحد خاں، وزیر شاہ عالم ثانی کے قرابت دار تھے۔ ان کے والد سید محمود خاں بھی شاعر تھے اور ان کے دادا میر محمد خاں سرور صاحب دیوان اور ایک "تذکرۂ شعرائے اُردو" کے مصنف تھے۔ ذکی زینت باڑی دہلی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ غالب کے بڑے ہونہار شاگرد تھے اور اپنے اُستاد کے کلام کا بڑی کامیابی سے اتباع کرتے تھے۔ اُنھوں نے طب پڑھی تھی اور وہ فارسی کے اچھے ادیب و شاعر تھے۔ وہ عربی، فارسی، منطق اور ریاضی وغیرہ میں پنڈت رام کشن بسمل اور شیخ امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کے فسادات کے بعد وہ روزگار کی تلاش میں میرٹھ، بریلی، بدایوں، الٰہ آباد اور گورکھپور وغیرہ میں سرگرداں رہے۔ وہ صوبۂ یو پی (انڈیا) میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے منصب پر فایزرہ کر پنشن پر سبکدوش ہوئے اور بدایوں میں مقیم ہو گئے، جہاں آخر زندگی میں وہ سب رجسٹرار بھی رہے تھے۔ ذکی کی رحلت بدایوں میں ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ اُن کا "دیوانِ ذکی" اُن کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان کے شاگردوں میں حسب ذیل شعراء شامل تھے:۔ سید احمد دہلوی "فرہنگِ آصفیہ" کے مؤلف، مولوی حشمت اللہ حشمت (یو پی میں کلکٹر)، پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی دہلی، اختر صدیقی، اور اسیر بدایونی (خمخانۂ جاوید، جلد سوم)۔ ذکی کا نمونۂ کلام:۔

کس نے حیا سے نیچی نظر کی کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا مجھے، دُشوار دیکھنا

میں نے جو کہا وصل کا خواب اُن سے تو ہنس کر
وہ کہتے ہیں اب خواب میں تعبیر کو دیکھو

ہم جان و دل تو نذرِ غم عشق کر چکے
حیراں ہیں اب لٹائیں گے راہِ وفا میں کیا

تیرِ نگاہِ یار کی اللہ رے شوخی
بیٹھا ہی تھا دل میں کہ ہوا پار جگر سے

(۱۴)

نواب زین العابدین خاں عارف دہلوی

عارف نواب غلام حسین خاں بہادر کے بیٹے اور شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ خاں بہادر سہراب جنگ کے پوتے تھے۔ عارف غالب کے شاگرد تھے۔ غالب نے انہیں متبنّیٰ بنا لیا تھا ان کی وفات پر غالب نے وہ دردناک نوحہ لکھا جو اردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا مطلع ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔ اُن کا نمونۂ کلام :-

ہم نے اِس تدبیر سے اُس کو کیا شب بے حجاب
کچھ کہا ایسا کہ وہ جامے سے باہر ہو گیا

غصّے میں اُن کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اُٹھائے عتاب میں

(۱۵)

منشی غلام بسم اللہ بسمل بریلوی

بسمل منشی سرفراز علی کنبوہ کے بیٹے، بریلی (روہیلکھنڈ، یوپی، انڈیا) کے باشندے اور غالب کے شاگرد تھے۔ وہ گورنمنٹ پنشنر تھے اور حج کر آئے تھے۔ غلام بسم اللہ تاریخی نام ہے (۱۲۲۹)ھ تعلیم، رہرہ، اور بریلی میں ہوئی بعد میں عربی کی تعلیم نقی محمد سلطان حسن خاں سے حاصل کی۔ مظفر نگر اور

میرٹھ میں ناظر عدالت رہے شاہ عبدالرحمن گنج ؒ سے بیعت تھے آخری عمر میں نعت خوانی سے خاصا شغف رہا ۱۳۱۵ء میں وفات پائی ۔ بسمل کا نمونۂ کلام :-

اُن کو یاں ننگ دامنگیر، مجھ کو یاں ورعِ !
وہ اُدھر بیتاب تھے، اور میں اِدھر بیتاب تھا

(۱۶)

نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی

معروف فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر، والیٔ ریاست لوہارو کے چھوٹے بھائی اور غالب کے سسر تھے ۔ معروف شاہ نصیر کے شاگرد تھے ۔ اُن کا ۱۸۲۶ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہ گاؤ گھاٹ میں دفن ہوئے [رسالہ اُردوئے معلّٰی، کانپور جولائی ۱۹۲۵ء 'انتخاب دیوانِ معروف دہلوی'] ۔
معروف کا نمونۂ کلام :-

ہائے اُس شوخ کا وہ رُوٹھ کے جانا معروف
اور یہ کہنا کہ ہمیں اب نہ منائے کوئی

ایسے بھُولے کہ یہ بھی یاد نہیں
ہم کو دل سے بھُلا دیا کس نے

(۱۷)

سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی

شاد سیّد محمد عباس مرزا کے فرزند تھے اور محلّہ حاجی گنج عظیم آباد (پٹنہ) میں ۱۸۴۶ء میں پیدا اور وہیں ۱۹۲۷ء میں فوت ہوئے تھے ۔ وہ 'تذکرۂ نوائے وطن'، 'حیاتِ فریاد'، 'فکرِ بلیغ' اور 'مرأۃ الخیال' وغیرہ کے مصنف تھے ۔ وہ عربی، فارسی اور پنگل (ہندی عروض) کے زبردست ادیب تھے ۔ ۱۸۹۱ء میں حکومت ہند نے اُردو میں ادبی خدمات کے صلے میں اُن کو 'خان بہادر' کا خطاب اور ۱۸۹۳ء میں اہالیانِ صوبۂ بہار نے اُن کو "سید الشعراء" کا لقب دیا تھا ۔

شاد کو اپنے عہد کا میر کہا گیا ہے ۔ شاعری میں وہ ناظر وزیر علی عبرتی، مولانا تصدق حسین زخمی اور سید شاہ اُلفت حسین فریاد (خواجہ میر درد کے شاگرد وارث علی کے شاگرد اشک کے شاگرد) کے

شاگرد تھے۔ شادؔ مدت تک اعزازی مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر رہے تھے اور اُنھیں ایک ہزار روپیہ سالانہ کا حکومت سے وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم مولانا رمضان علی، میر فرحت حسین اور میر سید سے حاصل کی تھی۔ عربی اُنھوں نے مولوی عبداللہ اور مولوی شیخ آغا جان سے پڑھی تھی۔ اُنھوں نے عربی وفارسی کی اعلیٰ تعلیم مولانا سید اعظم پھلواروی، حافظ لطف علی عظیم آبادی، سید اُلفت حسین فریادؔ اور حاجی محمد رضا شیرازی سے حاصل کی تھی۔ وہ ایک اخبار نسیم سحر کے اعزازی مدیر بھی تھے۔ اُن کا اُردو دیوان شائع ہو چکا ہے اور اُن کی نظم و نثر دونوں کی کُلیات بھی مُرتب ہو چکی ہیں۔ شادؔ ایک عمدہ مرثیہ گو بھی تھے اور اُنھوں نے مثنویاں بھی کہی ہیں۔ مرثیہ گوئی میں وہ دبیرؔ کے شاگرد مگر انیسؔ کے مُتبع تھے۔ اُن کا صفیرؔ بلگرامی کا شاگرد ہونا مختلف فیہ ہے۔ شادؔ کی مثنویوں کی تفصیل یہ: نالۂ شاد، (جواب ناپید ہے)، ثمرۂ زندگی (شائع شدہ)، فغانِ دلکش (فارسی۔ غیر مطبوعہ)، چشمۂ کوثر (اردو، شائع شدہ) اور مادرِ ہند (سابق نوید ہند)۔ شادؔ نے بہت سی رُباعیاں بھی کہی تھیں۔ وہ تصوف میں گہری دلچسپی لیتے تھے [ماہنامہ عالمگیر، لاہور، اکتوبر ۱۹۳۸ء شادؔ، از آرزو عظیم آبادی]۔ ذیل میں چند اشعارِ شادؔ درج کیے جاتے ہیں۔

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں

نازسے دامن اپنا سنبھالے، دوش پہ کالی زُلفیں ڈالے
اب نہ بچے گی جان ہماری، ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے
کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھان دوپٹے، لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن، آپ نہ آئیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

اُٹھتی جوانی، عضو مُناسب، سانولی رنگت، ہائے ستم
آنکھیں نشیلی، باتیں بھولی، چال قیامت، ہائے ستم
وہ چشمِ مست، وہ ترچھی نظر معاذ اللہ
حیا ہزار بھری ہے مگر معاذ اللہ
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے
مُرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہو اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم
ایک ستم اور لاکھ ادائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں، تنگ قبائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

(۱۸)

منشی امیر احمد امیر مینائی

امیر مولوی کریم احمد لکھنوی کے فرزند (تذکرۂ یادگارِ ضیغم میں ان کا نام مولوی کرم محمد لکھا ہے) اور شاہ مینا لکھنوی کی اولاد میں تھے۔ امیر ایک مینائی شیخ زادے، حنفی سُنّی، اور بڑے عالم و فاضل شخص تھے وہ اسیر کے شاگرد تھے۔ وہ شاہ نصیر الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ میں ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے اور حیدر آباد (دکن) میں ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے دو دیوان چھوڑے، ایک مرآۃ الغیب اور دوسرا صنم خانۂ عشق جن میں سے اول الذکر ۱۸۷۳ء میں اور ثانی الذکر ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔

امیر نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہدِ حکومت میں ۱۸۵۸ء میں رامپور گئے تھے۔ جب ۱۸۶۴ء میں نواب کلب علی خاں نواب رامپور کے حکمراں ہوئے تو امیر کی ترقی بہت بڑھ گئی۔ لیکن نواب کی وفات کے بعد امیر رامپور چھوڑ کے حیدر آباد (دکن) چلے گئے، جہاں اُن کا انتقال ہو گیا۔ امیر کا تیسرا دیوان نعت میں ہے۔ امیر کے تلامذہ میں جلیل مانک پوری، حفیظ جونپوری اور ریاض خیر آبادی نے نہایت مقبولیت حاصل کی۔ امیر بہر کیف لکھنوی اسکول کی (اس کے جملہ معایب کے ساتھ) پیداوار تھے، اور تغزل میں ان کا مقام داغ سے پیچھے ہے۔

امیر نے اپنی ابتدائی تعلیم علمائے فرنگی محل لکھنؤ سے حاصل کی تھی۔ اُنھوں نے واجد علی شاہ کے لیے دو کتابیں لکھی تھیں 'ارشاد السلطان' اور 'ہدایت السلطان'۔ امیر نے رامپور میں شیخ وحید الزماں لکھنوی کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ امیر نے چالیس سال کی طویل مدت رامپور ہی میں گذاری۔ داغ نے امیر کو حیدر آباد (دکن) بلا لیا تھا، جہاں پہنچ کر وہ علیل اور آخر کار فوت ہو گئے۔ امیر ایک جلیل القدر عالم تھے۔ اُنھوں نے دو مثنویاں بھی لکھی تھیں، 'نورِ تجلی' اور 'ابرِ کرم'۔ امیر نے چار مسدس اور چھ واسوخت تصنیف کئے تھے۔ اُنھوں نے 'سرمۂ بصیرت' کے نام سے ایک کتاب عربی و فارسی لسانیات پر بھی رقم کی تھی۔ امیر کا سب سے بڑا ادبی شاہکار اُن کی لغت 'امیر اللغات' ہے، لیکن ابھی وہ حروفِ تہجی میں اس کی الف کی تختی بھی مکمل نہ کر پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ امیر کی ابتدائی شاعری ناسخ کے رنگ میں ہے۔ جب اُنھوں نے داغ کا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی کوشش کی (صنم خانۂ عشق) تو اُن کا معیارِ شعری پست تر ہو گیا۔ داغ کے علاوہ امیر نے دیگر شعرا کے طرزِ کلام کی بھی نقل کرنا چاہی، مثلاً امیر نے اپنے صنم خانۂ عشق میں دو ضمیموں کا اضافہ کیا، یعنی 'گوہرِ انتخاب' اور 'جوہرِ انتخاب'، جن کے متعلق اُنھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ میر اور درد کے طرز

کلام پر کیے گئے ہیں، لیکن اُن کا یہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا۔ اس طرح امیر تغزل میں داغ کے ایک کامیاب حریف نہیں کہے جا سکتے۔ اُن کی ناکامی کا سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے لکھنؤ اسکول کے اثرات سے اپنے آپ کو غیر متعلق رکھے بغیر داغ کے طرزِ کلام کے اتباع کی کوشش کی۔ لیکن جب کبھی وہ دہلوی شعرائے کے اسلوب کو اپناتے ہیں کامیاب ہوکے ان کا کلام دلچسپ و قابلِ مطالعہ ثابت ہوا (شعر الہند، جلد اوّل باب سوم ص ۳۰۱-۱۲ امیر ہا۔ امیر کا نمونۂ کلام

لپک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں — بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں
وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھنے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے

(۱۹)

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی

داغ نواب شمس الدین خاں کے فرزند اور نواب احمد بخش خاں (حاکم فیروز پور جھرکہ) کے پوتے تھے ان کے والد کی وفات کے بعد ان کی بیوہ ماں نے مرزا فخرو (مرز شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہدِ سلطنت) سے دوسری شادی کرلی تھی۔ داغ ذوق کے شاگرد تھے۔ نظام حیدر آباد (دکن) نے داغ کو سپہ سالار، یار وفادار، مقربِ السلطان، بلبلِ ہندوستان، جہاں اُستاد، ناظم یار جنگ اور دبیر الدولہ کے خطابات دیئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے فسادات کے بعد داغ رامپور چلے گئے جہاں وہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلبِ علی خاں نواب دونوں کے مصاحب و درباری رہے۔ داغ کا مولد دہلی میں محلہ بلی ماران تھا، جہاں وہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور حیدر آباد (دکن) میں ۱۹۰۵ء میں فوت و دفن ہوئے۔ اُن کی قبر امیر مینائی کی قبر کے پاس یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں موجود ہے۔ داغ کے بعض معروف شاگرد حسب ذیل تھے:۔

مولوی حسن رضا خاں حسن بریلوی، محمود خاں محمود رامپوری، سید حسین احمد بیباک شاہجہانپوری، سید عبدالوحید قدا گلاوٹھوی، سید امیر حسن دبیر مارہروی، صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، نسیم بھرتپوری، بیخود بدایونی، نوح ناروی، آغا شاعر دہلوی، سیماب اکبر آبادی، علامہ اقبال سیالکوٹی، حضور نظام، احسن مارہروی، وغیرہ وغیرہ۔ داغ کے تینوں دیوان گلزارِ داغ، آفتابِ داغ،

'ماہتابِ داغ'، شائع شدہ اور مقبول ہیں۔ ان کی مثنوی 'فریادِ داغ' بھی معروف ہے۔ داغ نے تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے، قصیدہ، رباعی اور مثنوی، لیکن اُن کو مقبولیت و کامیابی صرف غزل میں حاصل ہوئی۔ داغ کی شاعری کے خصائص سادگیٔ زبان و سلاست و روانیٔ اظہارِ بیان ہیں۔ اُن کے آرٹ کی رُوح مادی جذباتِ محبت کی عکاسی ہے۔ مگر ان کے بعض اشعارِ تغزل معیارِ اخلاق سے گرے ہوئے، مُبتذل اور سخت عامیانہ ہیں۔ داغ کی شاعری میں گہرائی کم ہے۔ اُن کے اظہارِ محبت میں سپردگی اور والہانہ شیفتگی تو ضرور ہے لیکن اس میں روحانیت کا عنصر غائب ہے۔ ان کی وارفتگی محض جسمانی لذت کوشی ہے اور کچھ نہیں۔ اس میں اچھوتا پن بھی نہیں، لیکن جس چیز کو تغزل کہتے ہیں وہ داغ کے کلام میں وافر طور پر موجود ہے اور امیر کے کلام میں خال خال۔ داغ کے کلام میں عشق و محبت، حُسن و زیبائی بے لحاظ ہو کر کھل کھیلے ہیں۔

داغ نے فارسی مولوی غیاث الدین، مُصنّف 'غیاث اللغات' سے رامپور میں سیکھی تھی۔ جب داغ کی بیوہ ماں نے ولی عہدِ سلطنت مرزا فخرو سے دوسری شادی کی تو ۱۸۴۴ء میں داغ بھی قلعۂ معلّٰی میں داخل ہوئے، جہاں میر تقی میر کے شاگرد میر غلام حسین شکیبا کے بیٹے مولوی سید احمد حسین داغ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ داغ رامپور میں چالیس سال تک رہے جس کے دوران میں اُنھوں نے نواب کلب علی خاں کے ساتھ فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ داغ لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ، لاہور، آگرہ، علی گڑھ، متھرا، جے پور، اجمیر، ریاست مانگرول (کاٹھیاواڑ)، بنگلور اور امرتسر وغیرہ بھی گئے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد، جنرل اعظم الدین خاں کی سرکردگی میں رامپور میں حکومت و ملک کی نگرانی کے لیے ایک 'کونسل آف ریجنسی' مقرر کی گئی تھی جس سے داغ کی نہ بنی اور وہ دہلی واپس آ گئے۔ ۱۸۸۷ء میں داغ حیدر آباد (دکن) گئے اور حضور نظام کی خدمت میں راجہ گردھاری پرشاد عُرف بنسی راجہ باقی کی معرفت درخواست ملازمت پیش کی۔ اس کے تین سال کے بعد آصف جاہ ششم میر محبوب علی خاں نظامِ دکن داغ کے شاگرد ہوئے۔ شروع میں داغ کی ماہانہ تنخواہ چار سو پچاس روپیہ تھی جو بڑھ کر ایک ہزار روپیہ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر داغ کو جاگیر میں ایک موضع اور تحفے تحائف بڑی رقوم سرکارِ نظام سے وصول ہوتی رہیں۔ داغ حیدر آباد (دکن) میں اٹھارہ سال تک ٹھیرے۔ اُن کے پہلے دونوں دیوان 'گلزارِ داغ' اور 'آفتابِ داغ'، رامپور میں شائع ہوئے تھے، تیسرا 'مہتابِ داغ'، حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوا۔ داغ کا چوتھا دیوان 'یادگارِ داغ'، ان کی وفات کے بعد لاہور سے سید علی احسن نے شائع کیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ داغ نے جرأت اور انشا کے اسالیبِ کلام کو ترقی دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا طرزِ کلام

آتش کے شاگردوں کے کلام سے ملتا جلتا ہے اور نفاست و وقار سے معرّا ہے [" شعرالہند" حصّہ اوّل باب سوم صفحہ ۲۲۳-۲۱۴ ۔ "خمخانۂ جاوید" جلد سوم، داغ دہلوی] داغ کا نمونۂ کلام

میرے قابو میں نہ پہروں دل ناشاد آیا — وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
اِدھر آ کلیجہ سے تجھ کو لگا لوں — تجھی پر تو دل آگیا ہے کسی کا
میں ہوں بیتاب، وہ بدمست، فسانہ ہے دراز — دل کو تھاموں تو کہوں، آنکھ سنبھالوں تو کہوں
وعدے پہ میری اُن کی قیامت کی ہے تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج
داغ اِس فکر میں دن رات گھلا جاتا ہوں — مجھ سے راضی میرے سرکار ہوئے ہیں کہ نہیں

(۲۰)

حکیم سیّد ضامن علی جلالؔ لکھنوی

جلالؔ حکیم اصغر علی لکھنوی داستان گو کے بیٹے رشکؔ، برقؔ اور امیر علی خاں ہلالؔ کے شاگرد، چار دیوانوں اور متعدد دیگر کتب مثلاً سرمایۂ زبانِ اُردو، مفید الشعراء اور مصطلحاتِ اُردو، وغیرہ کے مصنّف تھے۔ وہ ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں ۱۹۰۹ء میں فوت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے فسادات کے بعد وہ رامپور گئے اور وہاں نواب ناظم اور نواب کلب علی خاں نوابؔ دونوں کے عہدِ حکومت میں مقیم رہے۔ پھر وہ لکھنؤ آگئے اور وہاں فوت ہوگئے۔ لکھنؤ میں اُنھوں نے امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ دونوں کا دورِ حکومت دیکھا تھا۔ جلالؔ کے شاگردوں میں انور حسین آرزو لکھنوی اچھے شاعر ہوئے۔ جلالؔ کو ریاست مانگرول (کاٹھیاواڑ) سے پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار وظیفہ ملا کرتا تھا۔

لکھنؤ اسکول کے دورِ متاخرین میں جلالؔ ایک مخصوص مقام کے اس لحاظ سے مالک ہیں کہ اُن کے کلام میں "داخلیت و خارجیت" دونوں طرح کی شاعری پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کے لکھنوی اور دہلوی دونوں مدارسِ شعری میں مکمل دسترس حاصل کرلی تھی۔ ان کی غزلوں میں دونوں اسالیب تغزل کی عکاسی موجود ہے۔ جلالؔ کے دیوانوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں مصحفیؔ اور آتشؔ کا رنگ صاف جھلکتا ہے لوگوں نے امیرؔ و داغؔ کے اسالیبِ کلام کا موازنہ کرنے کی کوشش میں محض تضیعِ اوقات کی ہے۔ دراصل موازنہ داغؔ اور جلالؔ کے کلام کا ہونا چاہیئے، جن کے راستے بڑی حد تک یکساں ہیں [ماہنامہ "نگار" لکھنؤ، فروری ۱۹۳۹ء "مکتوباتِ نیاز"، "جلالؔ لکھنوی"] جلالؔ کا نمونۂ کلام

تمھاری بزم میں ہم خود سنبھل جاتے یہ مشکل تھا
تم ہی بیتاب کرتے تھے تم ہی پھر تھام لیتے تھے
کب آئے گا کوئی مجھ تک، جواب دیتا جا
تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا
وہ پھر کے آپ تو آتا، اگر جواب نہ تھا
پیام بر تھا الٰہی، میرا شباب نہ تھا

(۲۱)

شیخ امیر اللہ تسلیم فیض آبادی

تسلیم کا اصل نام احمد حسین تھا مگر وہ امیر اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی عبد الصمد انصاری تھا۔ تسلیم نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۱۵ء میں فیض آباد کے قریب موضع منگلیسی میں پیدا ہوئے تھے، وہ لکھنؤ میں رہے اور انھوں نے ۱۹۱۱ء میں رامپور میں وفات پائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تسلیم لکھنؤ میں دفن ہوئے تھے۔ وہ کاٹھیاواڑ کی ریاست مانگرول اور رامپور میں ملازم رہے اور انھوں نے ریاست ٹونک کا بھی ناکام سفر کیا تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کے بعد نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہدِ حکومت میں رامپور گئے اور وہاں نواب حامد علی خاں کے زمانے میں فوت ہوئے۔ تسلیم نے اپنی غزلوں کے پانچ دیوان چھوڑے جن میں سے تین شائع ہو چکے ہیں۔ وہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ دونوں کے دورِ حکومت میں لکھنؤ میں رہے۔ تسلیم کے معروف ترین شاگرد حسرت موہانی تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام

اللہ رے اضطرابِ تمنائے دید یار
اک فرصتِ نگاہ میں سو بار دیکھنا
جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح، جب خاموش ہوتا ہے
نالہ کھنچا ہے، دل ہے خفا، شوق ہے اُداس
تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

(۲۲)

خلّاق المعانی مولانا عبد الرحمٰن راسخ دہلوی

راسخ مولوی محمد حسین فقیر کے بیٹے (فقیر دہلی کے مدرسۂ حسینیہ کے بانی تھے) اور ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ راسخ کا مولد پانی پت کے قریب تھا لیکن وہ رہے دہلی میں۔ وہ "افضل الاخبار"، "بے مثال پنچ"، "دہلی پنچ"، "چلتا پرزہ"، اور "خیر خواہ عالم" کے مدت دراز تک مدیر رہے۔ راسخ بڑے عالم و فاضل اور بذلہ سنج شخص تھے۔ وہ مذہبی مناظر اور مبلّغ بھی تھے۔ انھوں نے مثنوی مولانا رومؒ کی شرح بھی لکھی

تھی جو نہایت مقبول ہوئی تھی۔ راسخ مرزا ارشد، سیف الحق ادیب اور پنڈت جواہر ناتھ ساقی کے ہمکار اور مولانا شوکت میرٹھی کے حریف رہے تھے۔ راسخ کے دو دیوان تھے، ایک 'مرآۃ الخیال' ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا تھا، مگر دوسرا غیر مطبوعہ رہا۔ راسخ دہلی میں ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۷ء تک اُستادانہ مقبولیت کے ساتھ رہے۔ ۱۹۰۷ء میں اُن کا دہلی میں انتقال ہوا۔ اُن کے معروف تلامذہ بالمکند ایک پرشاد طالب بنارسی، چندی پرشاد شیدا اور پیارے لال رونق دہلوی تھے ['خمخانۂ جاوید' جلد سوم 'راسخ دہلوی']

راسخ کا نمونۂ کلام:-

الٰہی حُور ہو حصّہ کسی سیدھے مسلماں کا
ہمیں وہ چاہیے معشوق جو بانکے سے ہو بانکا

کچھ دکھاتا ہے، کچھ چھپاتا ہے
شُعبدہ ہے یہ اُن کے آنچل کا

ہے چھوٹی سی عمر میں قیامت
فتنہ ہے وہ چودھویں صدی کا

نوجوانی ہے، نئے تم ہو، نرا لا جوبن
بالا بالا نہ اُڑا لے کوئی بالا جوبن

بشر کو چاہیے پاسِ دلِ بشر رکھے
کسی کا ہو کے رہے، یا کسی کو کر رکھے

متأخرینِ دورِ ششم کے خصائص

یہ دَور ایک نوع کا گذشتہ دَورِ پنجم کا ضمیمہ تھا۔ اِس دَور میں دہلوی اسکول کی شاعری غالب کے عُلوئے تخیل اور مومن کی معاملہ بندی سے مُعرا تھی۔ جس کی جگہ داغ کے ایک جدید طرزِ تغزل نے لے لی تھی جو نہ تو پورے طور پر دہلوی تھا، نہ حقیقتاً لکھنوی۔ یعنی اس میں دہلی کی جذبات نگاری تو تھی لیکن اس میں گہرائی و تاثر مفقود تھے، اس میں لکھنؤ کا ابتذال تھا، گو وہ لفاظی نہ تھی۔ اِس دَور کی شاعری میں شہوانیت و عُریانیٔ جذباتِ ہوسرانی تغزل کے اعلیٰ و باوقار اسلوب پر غالب آگئے تھے۔ لکھنوی اسکول کی شاعری پر ناسخ کا اسلوب چھا گیا تھا۔ امیر کی فنکاری نے بڑی حد تک اس طرزِ شاعری کو سنوارا لیکن اس میں صحیح اور سچے تغزل کا فقدان تھا۔ جلال نے کسی حد تک لکھنوی اسکول کی شاعری کی عزت و وقار

بحال کئے، کیونکہ ان کی شاعری میں داخلیت کی عکاسی موجود ہے۔

اِس دور میں امیرؔ مینائی اور مُنیرؔ شکوہ آبادی نے نہایت عمدہ قصاید کہے، نیز مراثی کو انیسؔ و دبیرؔ کے پیرودُں نے مزید ترقی دی۔ امیرؔ، داغؔ، مُنیرؔ اور تسلیمؔ وغیرہ نے مثنویاں لکھیں لیکن وہ سوائے نواب مرزا شوقؔ کی مثنوی کے، بے اثر وغیر مقبول رہیں۔ بعض لوگوں نے سید صاحب تعشقؔ کو اِس دَور کی لکھنوی شاعری کا صحیح نمایندہ کہا ہے [ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور، خصوصی اشاعت، ۱۹۳۶ء 'رفتارِ اُردو' از پروفیسر مولانا حامد حسن قادری، 'شعر الہند' جلد اوّل باب دوم 'تلامذۂ مومنؔ وغالبؔ'، صہ ۸۷-۲۸۳ اور باب سوم 'متاخرین کا پہلا دَور'۔ ریاست رامپور صہ ۹۷-۲۸۸]۔

تعشقؔ کا نمونۂ کلام :-

ہے خزاں باغوں میں، روتے ہیں یہ کہہ کر باغباں
گُل یہاں تھے اِس جگہ تھا آشیانِ عندلیب

وہ اپنے در کے فقیروں سے پوچھتے بھی نہیں
کہ تم لگائے ہوئے کس کی آس بیٹھے ہو؟

(۱۰)

جدید اُردو شاعری۔ دورِ ہفتم

اُردو شاعری میں مستقل نظمیں:

اِس باب میں اُن اُردو شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے جدید اُردو شاعری کی بنا ڈالنے میں حصّہ لیا اور جو ۱۸۵۷ء کے فسادات کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ اگرچہ موجودہ باب کے بعد والے باب (دورِ ہشتم) میں یہ شعراء بقیدِ حیات نہ رہے، لیکن تاریخی اعتبار سے اُن کا مقام وہی ہے۔ جدید اُردو شاعری کے شعراء نے اُردو شاعری کو غزل اور تغزل کی حدود سے باہر نکالا اور اس میں انسانی دلچسپی کے وسیع تر مضامین کو متعارف کرکے اس کا رتبہ دنیا کی بڑی زبانوں اور ان کے لٹریچر کے برابر کر دیا۔

ادبی زوال کے اِس دَور میں جبکہ اُردو شاعری قدیم شعراء کے کلام کی محض کاربن کاپی بن کے رہ گئی تھی برِصغیر ہند و پاکستان کے دانشوروں کی ذہنی زندگی کو مغربی تخیلات و علوم نے متاثر کرنا شروع کیا۔ چنانچہ قدیم روایات پس پُشت چلی گئیں اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے خارجی فنون کی معرفت ذاتی احتساب کے تعارف کے لیے راہ ہموار کی۔ سادگی اور لٹریچر کے فطری اظہار کے حق میں دُشوار عربی و فارسی الفاظ و مصطلحات کو خارج کر دیا گیا۔ غرضیکہ اُردو ادب و علوم میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

ہندوستان پر برطانوی تسلّط سے پیشتر اُردو زبان کافی حد تک ترقی کر چکی تھی، لیکن اُس نے مقبولیت ۱۸۶۰ء سے حاصل کرنا شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کے فسادات کے بعد اُردو زبان نے اہمیت اختیار کرنا شروع کی، اور سرسید گروپ نے اس کی سرپرستی کا بیڑا اُٹھایا جس میں خود سرسید احمد خان، مولانا شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی اور شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی شامل تھے۔ اُس زمانے میں 'زمانہ'، 'تہذیب الاخلاق'، اور 'نیرِ چودھویں صدی'، وغیرہ اُردو رسائل نے جو تعمیری لٹریچر ملک کے طول و عرض میں پھیلایا اُس نے لوگوں کی ثقافتی و معاشرتی زندگی کو بڑی حد تک مستحکم کیا۔ مزید یہ کہ برِصغیر میں مغربی قوانین کو متعارف کرنے میں اُردو نے بڑی مدد دی۔ بین الاقوامی میدان میں، مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی، حکیم محمد علی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ادبی شہ پاروں نے ایشیائی ذوق کو اُستوار کیا۔ اُن سے پیشتر 'فسانۂ عجائب'، 'سروشِ سخن'، ۔

'بہار درویش'، 'حاتم طائی'، 'طلسمِ ہوش رُبا'، 'داستان امیر حمزہ' اور 'بوستانِ خیال'، وغیرہ طویل ولایعنی افسانوں کا رواج تھا، جن کی برطانوی حکام نے اس لیے حمایت کی تھی کہ عوام کی توجہ اپنے ملکی مسائل سے ہٹ جائے اور وہ دماغی و ذہنی طور پر مفلوج ہو کے رہ جائیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جب برِصغیر میں ایک نئے شعوری عہد کی بُنیاد پڑی تو اس کی استواری کے لیے نئے شعرا نے جنم لیا۔ یہ شعرا حالی، شبلی، آزاد، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال تھے۔

اُردو نثر کی اصلاح کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے ہاتھوں ہوئی۔ پھر سر سید اور ان کے رفقا نے اپنے اخلاقی مباحث اور ادبی مضامین سے اُردو ادب میں ایک دَورِ جدید کا آغاز کیا۔ اُردو شاعری اپنی اصلاح کے لیے آزاد اور حالی کی منتظر تھی۔ پنجاب میں آزاد نے ایک علمی انجمن کے قیام کے ذریعہ سے اُردو شاعری کو از سرِ نو سنوارنے کا بندوبست کیا۔ اس کے ماتحت کانفرنسوں کا انعقاد ہوا جن میں حالی نے بھی اپنی نظمیں (مثلاً 'برکھا رُت'، وغیرہ پڑھیں۔ اِس طرح حالی اور آزاد دونوں نے اُردو شاعری میں ایک نئی رُوح ڈال دی [ماہنامہ 'کنول'، آگرہ، ستمبر ۱۹۳۶ء 'عہدِ جدید کی تعمیر و تہذیب میں ادبِ اُردو کا عملی حصّہ'، از مولانا سیماب اکبر آبادی ماہنامہ 'نگار'، لکھنؤ، جولائی ۱۹۳۷ء 'دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی'، از فراق گورکھپوری صفحہ ۳۰]۔ موجودہ باب میں ہم مولانا حالی، مولانا آزاد، علامہ شبلی نعمانی، چکبست لکھنوی، اکبر الہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، محسن کاکوروی اور سلیم پانی پتی کا ذکرِ خیر کریں گے۔

(۱)

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

حالی خواجہ ایزد بخش انصاری پانی پتی (یا خواجہ ملک علی ایزد بخش یا خواجہ مالک علی، 'جدید اُردو شاعری' از سُروری) کے فرزند تھے۔ ۱۹۰۱ء میں نواب عماد الملک بلگرامی کی فرمائش پر خواجہ حالی نے مختصراً اپنے سوانح حیات رقم کئے تھے، جن سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔ ان میں مولانا حالی نے اپنے والد کا نام خواجہ ایزد بخش لکھا ہے۔ حالی پانی پت (ضلع کرنال، مشرقی پنجاب) میں ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی، مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مولوی نوازش علی، مولوی قاری عبدالرحمٰن محدّث، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی سے تعلیم پائی تھی اور فارسی، عربی، منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں حالی کو حصار کے کلکٹر کے دفتر میں کلرکی کی جگہ مل گئی تھی، مگر ۱۸۵۷ء میں وہ بے روزگار ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء میں وہ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (دہلی کے رئیس اور جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر، یوپی کے زمیندار) کے مصاحب ہو گئے جن کے ساتھ حالی دہلی میں آٹھ سال تک رہے۔ اِس دوران میں وہ اُردو شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہو گئے۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد، حالی کو حکومت پنجاب کے بُک ڈپو لاہور میں مُصحح کے طور پر نوکری مل گئی، جس پر اُنھوں نے چار سال تک کام کیا۔ اس دوران میں اُنھوں نے چار مثنویاں 'برسات'، 'اُمید'، 'رحم و انصاف'، اور 'حُبِّ وطن' لکھیں۔ ۱۸۶۶ء میں مولانا حالی نے ایک ضخیم کتاب 'تریاقِ مسموم' کے نام سے ایک عیسائی پادری عماد الدین (جو مسلمان سے مُرتد ہو کر عیسائی ہو گیا تھا) کے اسلام کے خلاف الزامات کے جواب میں لکھی تھی، جو نثر میں تھی۔ لاہور ہی میں حالی نے علم طبقات الارض پر عربی کی ایک کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا، جس کا کاپی رائٹ اُنھوں نے بلا معاوضہ پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا تھا یہ کتاب دراصل فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی جس کا عربی ترجمہ ایک مصری اہلِ قلم نے کیا تھا۔ لاہور ہی میں حالی نے ایک کتاب 'مجالس النساء' کے نام سے تعلیم نسواں کی موافقت میں لکھی تھی جس پر اُنھیں حکومت نے انعام دیا تھا اور کتاب نصاب میں داخل کر لی گئی تھی۔ حالی نے دہلی میں اپنی مشہور کتاب 'حیاتِ سعدی' لکھی، جس کے بعد اُنھوں نے اپنا معرکۃ الآرا 'مقدمۂ شعر و شاعری' لکھا، جو اُن کے دیوان کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے بعد حالی کی 'یادگارِ غالب' شائع ہوئی اور اس کے بعد سر سید احمد خاں کے حالاتِ زندگی 'حیاتِ جاوید' کے عنوان سے منصۂ شہود پر آئے۔ ۱۸۸۷ء میں حیدر آباد (دکن) سے حالی کی ماہانہ پنشن پچھتر روپیہ مقرر ہوئی جو بعد کو بڑھ کر سَو روپے ماہوار ہو گئی۔ ۱۸۷۹ء میں سر سید احمد خاں کی ترغیب سے حالی نے اپنی شہرۂ آفاق قومی نظم 'مدّ و جزرِ اسلام' لکھی جو 'مسدسِ حالی' کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا حالی نے پادری عماد الدین کی 'تاریخِ محمدی پر مُنصفانہ رائے' کے جواب میں ایک مختصر رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ حالی کی 'سوانح عمری حکیم ناصر خسرو علوی بلخی' فارسی زبان میں ہے اور غالباً ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ 'حیاتِ سعدی' ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی اور 'یادگارِ غالب' ۱۸۹۶ء میں۔ حالی کا 'مقدمہ' اُن کی 'حیاتِ جاوید'، 'شکوۂ ہند'، مثنوی 'مناجاتِ بیوہ'، اور 'مسدسِ حالی' ان کی بہترین ادبی تخلیق شمار ہوتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ حالی کا اسلوب آزاد اور شبلی کے اسالیب کے مقابلے میں چنداں دلکش و خوشگوار نہیں۔ اگر انگریزی لٹریچر کو سامنے رکھا جائے تو ہم حالی کو اُردو کا لارڈ مورلے MORLEY اور آزاد کو لارڈ میکالے MACAULAY کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وہ حالی ہی تھے جنھوں نے اُردو ادب میں سوانح نگاری اور فنِ تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ حکومت ہند نے اُنھیں ۱۹۰۴ء میں 'شمس العلماء' کا خطاب دیا۔ ۱۹۰۷ء میں حالی

نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے کراچی سیشن کی صدارت کی، اور ۱۹۱۴ء میں ان کی وفات ہوئی۔

جب حالی دہلی میں تھے تو اُس وقت مشہور 'دہلی کالج' کا بڑا شہرہ تھا۔ اسی دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبہ بعد کو اُردو ادبا کے لیڈر ثابت ہوئے، مثلاً ذکاء اللہ، نذیر احمد اور آزاد، جو اُردو ادب کی شاندار عمارت کے بنیادی ستون ہیں (مرحوم دہلی کالج، از مولوی عبدالحق)، لیکن قربت کے باوجود حالی دہلی کالج سے چنداں مستفید نہ ہو سکے۔ حالی نے ۱۸۷۴ء میں لاہور کے تاریخی مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ اسی مشاعرے نے بالکل پہلی بار روایتی اُردو شاعری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور جدید اُردو شاعری کی عمارت تعمیر کی تھی، جہاں غزلوں کے بجائے نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور حالی نے بھی اپنی نظمیں 'برسات'، 'اُمید'، 'انصاف' اور 'حُبِ وطن' وہیں پڑھی تھیں۔ اس مشاعرے کے بانی مولانا آزاد تھے اور وہ خود بھی اس میں اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں حالی نے ایک رسالہ 'مولود شریف' پر بھی لکھا تھا، جسے ان کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔ حالی کے متعدد مضامین مشہور اُردو رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے تھے۔ حالی پر سعدی کی شاعری کا بڑا اثر تھا لیکن وہ اسے اُردو میں اپنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سیکسینہ نے اپنی 'ہسٹری آف اُردو لٹریچر' میں لکھا ہے کہ "حالی سرسید کے زیرِ اثر ملّت اسلامیہ کے نقیب شاعر تھے اور انھوں نے اپنے کلام میں اسلام کے زوال کا رونا رویا ہے"، لیکن ان کا خیال غلط ہے کیونکہ حالی نے اسلام کے زوال کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے زوال کا رونا رویا ہے، جو دراصل حالی کی جدید اُردو شاعری کا موضوع ہے۔ ذیل میں حالی کے اُس مشہور قطعہ کے چند اشعار نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے جو انھوں نے خود شعر کو مخاطب کر کے کہے ہیں :-

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تُو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تُو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تُو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تُو

حالی شاعر و نثر نگار دونوں تھے اور اُنھوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کی شاعری ملّتِ اسلامیہ کے لیے خود شناسی و اصلاح کا پیام تھا۔ اس اصلاح ملّی کی خاطر اُنھوں نے رنگین بیانی و خوش گوئی کو ترک کر دیا تھا۔ اسی لیے اُن کی شاعری ضرورتاً سادہ اور بعض

مقامات پر غیر دلچسپ ہے۔ حالی ایک مشن لے کر اُٹھے تھے جس کی تکمیل اُنھوں نے دینی فرائض کی ادائیگی کی طرح کی۔ وہ نام نہاد آفاقی ادب، کے مدعی نہیں تھے اور اُن کی شاعری میں میر، غالب اور اقبال کی سحر کاریوں کی جھلکیاں بھی نہیں ہیں۔ بایں ہمہ حالی کی شاعری لافانی ہے کیونکہ اس نے اُردو شاعری میں ایک ایسے دور کا آغاز کیا جس نے اس کو بین الاقوامی لٹریچر کی حیثیت دے دی ہے [ماہنامہ کارواں، لاہور، سالنامہ، ۱۹۳۴ء۔ اُردو، از ڈاکٹر عبدالحق۔ مولانا شبلی، از سعید انصاری، لکھنؤ ۱۹۲۵ء۔ تنقیدی مقدمہ بر مسدس حالی، از مولوی عبدالحق، کانپور ۱۹۲۹ء۔ مختصر تاریخ ادب اُردو، از پروفیسر اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۵ء۔ نگار، لکھنؤ فروری ۱۹۳۹ء۔ حالی، از پروفیسر فراق گورکھپوری۔ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر، جنوری ۱۹۳۹ء۔ عالی ظرف حالی، از خواجہ انعام حسین انصاری۔ تذکرۂ حالی، از محمد ابواللیث صدیقی بدایونی، مُسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ جدید اُردو شاعری، از عبدالقادر سروری ۱۹۳۲ء۔ تذکرۂ حالی، ص ۳۷-۱۱۰]۔ حالی کا نمونۂ کلام

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے ایک شخص سمایا جاتا

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم، وہ بات نہیں

(۲)

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

آزاد مولوی باقر علی دہلوی کے فرزند اور ذوق اور حکیم آغا جان عیش کے شاگرد تھے۔ وہ دہلی میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور لاہور میں ۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے۔ اُنھوں نے دکن، لکھنؤ اور کلکتہ کے سفر کئے تھے اور بیرونِ ملک وہ کابل، بخارا اور ایران جا چکے تھے۔ اُن پر ۱۸۹۰ء میں دیوانگی کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسی افسوسناک حالت میں بیس سال کے بعد فوت ہوئے۔

اپنے قدیم ہم سبق ماسٹر پیارے لال آشوب کی وساطت سے آزاد کا رابطہ میجر فُلر FULLER صوبۂ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات سے قائم ہو گیا جو عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کے بڑے قدردان تھے۔ اُنھوں نے آزاد کا تقرر فارسی اور اردو میں نصابی کتب کی تیاری کے لیے کر دیا۔ فارسی اور اُردو کی یہ نصابی کتب آزاد نے لکھی تھیں جنھیں حکومت نے ابتدائی درجات کی تعلیم کے لیے رائج کیا اور جو مدت دراز تک رائج رہیں۔ وہ اپنی قسم کی پہلی اُردو ریڈرز تھیں جو انگریزی کتب کے انداز پر مرتب

کی گئی تھیں۔ بعدازاں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی اُردو ریڈرز آزاد کی اُنھیں نصابی کتب کو سامنے رکھ کر مُرتب کیں۔ آزاد نے لاہور میں 'انجمن پنجاب' قائم کی جو ایک ادبی محفل تھی اور جس کے ماتحت مشاعروں میں غزلوں کے بجائے وہ ابتدائی نظمیں پڑھی گئیں جو آگے چل کر جدید اُردو شاعری کی بُنیادیں بن گئیں۔ اس انجمن کی ۱۸۶۷ء کی نشست میں آزاد نے ایک خُطبہ دیا تھا، جس میں اُنھوں نے اپنے نئے شاعرانہ نظریے کی تفصیل بیان کی تھی، اور جو اُردو شاعری کی تنقید نگاری میں ایک نئے دَور کا نقطۂ آغاز کہا گیا ہے۔

میجر فُلر کی جگہ کرنل ہولرائیڈ HOLROYD نے لی تھی، جو اپنے پیشرو سے بھی زیادہ مشرقی زبانوں کے دلدادہ تھے۔ وہ 'انجمن پنجاب' کے مُربّی بن گئے۔ ان کی اعانت سے آزاد نے اپنا 'جدید اُردو شاعری' کی اسکیم کی تکمیل کی، جس کا نقطۂ آغاز 'انجمن' مذکور کا پہلا مشاعرہ تھا۔ مولانا حالی نے ان نئے طرز کے مشاعروں کو کامیاب بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اُنھوں نے آزاد کے ساتھ مل کر اُردو شاعری کی اصلاح کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ۱۸۶۵ء میں حکومت وقت نے آزاد کو ایک سفارتی مشن پر کابل بھیجا، جہاں سے وہ بخارا بھی گئے۔ ۱۸۸۳ء میں آزاد فارسی زبان میں تحقیقِ علمی کی خاطر ایران گئے۔ شروع شروع میں آزاد لاہور میں اسکول کے ایک اُستاد تھے۔ بعدازاں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ کرنل ہولرائیڈ نے آزاد کو سرکاری اخبار 'اتالیقِ پنجاب' کا سب ایڈیٹر مقرر کیا تھا، جس کے ایڈیٹر منشی پیارے لال آشوب تھے۔ اِس اخبار کے بند ہونے کے بعد ایک اور سرکاری جریدہ 'پنجاب میگزین' کے نام سے جاری ہوا۔ آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر رہے اور حالی نے بھی یہ خدمت انجام دی تھی۔

تقریباً ۱۸۸۸ء میں آزاد کی محبوب بیٹی فوت ہو گئی۔ اس صدمہ سے اُن کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ آیندہ سال دیوانے ہو گئے۔ اُن کی یہ افسوسناک حالت ان کی وفات (۱۹۱۰ء) تک قائم رہی۔ آزاد ایک اچھے شاعر، ایک اچھے اہلِ قلم اور ادیب تھے۔ وہ مانے ہوئے نقاد تھے۔ وہ ایک بے مثال ماہر لسانیات تھے۔ وہ جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ اپنے ہمعصروں میں آزاد کو فنونِ لطیفہ سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اُن کا شاہکار 'آبِ حیات' ان کی ادبی قابلیتوں کا مظہر ہے۔ ہر چند کہ اب 'آبِ حیات' کی تاریخی حیثیت مجروح ہو چکی ہے لیکن اپنی ادبی خوبیوں کے باعث اس کا شمار آج بھی اُردو ادب کی بہترین کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری میں آزاد کا مقام وہی ہے جو انگریزی شاعری میں اِسکاٹ SCOTT کا تھا۔ آزاد ہی کے

ذریعہ سے لوگوں کو فطری شاعری کی اہمیت کا احساس وشعور ہوا۔ میر حسن، نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے بعد آزاد فطری شاعری کے بہترین نقیب تھے۔ اگرچہ آزاد کی شاعری فلسفیانہ گہرائی سے معرّا ہے، لیکن لفاظی کے معاملے میں سودا کے بعد آزاد سے کوئی بازی نہ لیجا سکا۔ مثنویوں میں آزاد نظیر سے متاثر نظر آتے ہیں، مثلاً آزاد کی مثنوی 'شب قدر' میں رات کی منظر کشی نظیر کی فنکاری کے عین مماثل نظر آتی ہے۔ چونکہ آزاد کا خاص مقصد اُردو شاعری کی اصلاح تھی، اس لیے وہ فطری مناظر کی عکاسی کے معاملے میں میر حسن اور میر انیس کی فنکاریوں کی بلندی تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ بہ ایں ہمہ، آزاد کی شاعری میں حالی کے کلام کے مقابلے میں زیادہ رنگینی ودلچسپی ہے۔ پھر بھی آزاد کی شاعری اُن کی نثری سحر کاری کا مقابلہ نہ کرسکی بعض مقامات پر تو آزاد کی شاعری مصنوعی، پھس پھس اور غیر دلچسپ ہے۔ اُن کی اچھی مثنویاں 'شبِ قدر' 'صبح اُمید' اور خاص کر 'خوابِ امن' ہیں۔ حالی اور شبلی کے برعکس آزاد کی جدید اُردو شاعری میں زیادہ یکسانیت ہے۔ اپنی مثنوی 'خوابِ امن' میں آزاد 'خسروِ امن کا دربار' کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں :۔

خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرحت تھی دل وجاں کو ہوائے دربار
اُس کے آگے تھا مُرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھولوں میں پڑا جھول رہا
نیند کا جھونکا تھا جھولوں کو جُھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا
گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا
دُھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا

مگر آزاد نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ کامیاب اور مشہور ہوئے اور ان کی شگفتہ بیانی کا کوئی اور ادیب حریف نہ ہو سکا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ یونیورسٹی) کسی حد تک آزاد کے طرزِ تحریر کو اپنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ۱۸۵۶ء میں آزاد کے والد مولوی باقر علی نے دہلی سے پہلا 'اُردو اخبار' شائع کیا۔ اُردو نثر میں 'آبِ حیات' کے علاوہ 'آزاد کے دیگر نثری کارنامے حسبِ ذیل ہیں' 'نیرنگِ خیال'، 'سخندانِ فارس'۔ اور 'دربارِ اکبری'۔ آزاد پہلے اُردو شاعر تھے جو مغربی لٹریچر میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اُنھیں 'شمس العلماء' کا خطاب حکومت سے ۱۸۸۷ء میں ملا تھا۔ شروع شروع میں لکھنوی اسکول کے شعراء نے آزاد کی جدید فطری شاعری کا بڑا مذاق اُڑایا لیکن آخرکار وہ کامیاب ہوئی

(۱) 'حدیقۂ اردو' از پروفیسر ڈاکٹر زبیدہ احمد، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۵ء؛ 'جدید اردو شاعری' از پروفیسر عبدالقادر سروری؛ 'تذکرۂ آزاد'۔

(۴)

شمس العلماء علامہ محمد شبلی نعمانی شبلی اعظم گڑھی

شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڑھ (یوپی انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ میں وکیل تھے۔ مولانا فاروق چریاکوٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شبلی نے حدیث مولوی عبدالحق خیرآبادی، مولوی ارشاد حسین اور مولوی احمد علی سہارنپوری سے پڑھی۔ پھر شبلی مولوی فیض الحسن سے مزید ادبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور گئے۔ ۱۸۷۶ء میں شبلی نے حج کیا۔ واپسی کے بعد انھوں نے قانون پڑھا اور کچھ عرصے تک وکالت کی۔ انھیں سرکاری ملازمت مل گئی تھی جسے انھوں نے علم و ادب کی تحصیل کی خاطر چھوڑ دیا۔ ۱۸۸۲ء میں شبلی علی گڑھ گئے جہاں وہ سرسید سے ملے اور علی گڑھ تحریک کے ایک سرگرم رکن بن گئے۔ وہ علی گڑھ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، جہاں ان کا پروفیسر آرنلڈ ARNOLD سے قریبی رابطہ قائم ہوگیا۔ شبلی علی گڑھ میں حالی سے بھی ملے اور اردو شاعری کی اصلاح کی مہم میں حالی کے مساعدین گئے۔ شبلی کی معروف مثنوی 'صبح امید' اسی زمانے (۱۸۸۴ء) میں لکھی گئی تھی۔ انھوں نے اپنی ایک اور مشہور اردو نظم 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' اسی زمانے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں پڑھ کر سنائی تھی۔

نذیر احمد کی طرح شبلی بھی اردو شاعری میں اپنی سنجیدہ تاریخی تحقیقات سے کچھ مہلت پانے کی خاطر دلچسپی لیتے تھے۔ علاوہ ازیں حالی کی غیر معمولی کامیابی سے انھیں بھی جدید اردو شاعری کے میدان میں اترنے کی ترغیب ہوئی۔ حالی کے معاصرین میں صرف شبلی نے اپنی شاعری کو مسلمانوں کے زوال پر آہ و زاری کرنے کے لیے ہی استعمال نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس نہج پر تعمیری خیالات کے لیے بھی مواد فراہم کیا۔

پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت و صحبت نے بھی شبلی پر بڑا اثر ڈالا، جنھوں نے فرانسیسی اور انگریزی زبانیں آرنلڈ سے سیکھیں اور شبلی کی مدد سے آرنلڈ نے اپنی عربی کو بہتر بنایا۔ اس رفاقت باہمی سے آرنلڈ کی اسلام فہمی میں اتنی ترقی ہوئی کہ انھوں نے اسلام کو مغرب کے سامنے بڑی خوبی کے ساتھ اپنی مشہور تصنیف 'دی پریچنگ آف اسلام' (دعوتِ اسلام) کے ذریعہ سے پیش کیا۔ ۱۸۹۲ء میں شبلی نے آرنلڈ کے ساتھ مشرق

وسطیٰ کے مسلمان ممالک ترکی، مصر اور شام کا دورہ کیا۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید وفات پا گئے اور شبلی نواب سرو قار الامرا کی دعوت پر حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں وہ دائرۃ المعارف کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ شبلی نے اس منصب پر چار سال تک کام کیا۔

علامہ شبلی جدید تعلیم یافتہ مسلم سوسائٹی سے نہایت مایوس ہو گئے تھے جو برصغیر میں سرسید کی مساعی سے عالمِ وجود میں آئی تھی، کیونکہ شبلی نے مشاہدہ کیا کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان محض نقلی نقال تھے۔ وہ تعلیم و تربیت کے ان حقیقی و مفید اثرات سے عاری تھے جو تمام مغرب میں بالعموم نمایاں اور جاری و ساری تھے۔ انھیں خاص طور پر یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ جدید مسلم سوسائٹی اپنے دین سے بے تعلق اور اپنی روایات سے منحرف تھی۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ میں ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد مسلمانوں کی تعلیم کے جدید طریقوں کی اصلاح تھا لیکن قدیم خیال کے مولویوں کی مخالفت کے باعث شبلی کو اس دارالعلوم میں دلچسپی نہ رہی۔ اس لیے انھوں نے اسے چھوڑ کر ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ میں 'دارالمصنفین' کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی ۱۹۱۴ء میں شبلی وفات پا گئے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ شبلی ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی وفات بھی ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کے آغاز میں ہوئی۔

اگر شبلی نے خود کو محض اردو شاعری کے لیے وقف کر دیا ہوتا تو وہ یقیناً حالی سے بہتر شاعر ہوتے۔ وہ اگر دوسرے خسرو نہ سہی، لیکن وہ پہلے اقبال ضرور ہوتے۔ اگر وہ علی گڑھ تحریک میں سرتاپا غرق نہ ہو گئے ہوتے تو ان کی شاعرانہ تخلیق کہیں بہتر اور اعلیٰ ہوتی۔ شبلی کی شاعری کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں:-

(۱) پہلے دور میں شبلی سرسید کے رفیق اور حالی کے ہمکار تھے۔ ان کی لافانی مثنوی 'صبحِ امید' اسی رفاقت و صحبت کا نتیجہ تھی۔ اس مثنوی کا نفسِ مضمون بھی وہی ہے جو 'مسدسِ حالی' کا تھا۔ سوائے اس کے کہ 'مسدس' میں قنوطیت ہے لیکن 'صبحِ امید' میں رجائیت ہے، جو مسلمانوں کو ایک شاندار مستقبل کی نوید سناتی ہے۔ مزید براں شبلی کی مثنوی نے سرسید کی ایسی شاندار تصویر کھینچی ہے اور ان کی ایسی زبردست کردار نگاری کی ہے جو حالی کی 'حیاتِ جاوید' سے بھی نہ ہو سکی تھی۔ مثنوی 'صبحِ امید' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

وہ گشتۂ قوم وہ فدائی — اٹھا لیے کاسۂ گدائی

ایک ایک سے عرضِ حال کرتا — در در پہ وہ پھر اسوال کرتا

ہر بزم ہر انجمن میں پہنچا   ہر باغ میں ہر چمن میں پہنچا!
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی   آہ اُس کی کہاں کہاں نہ پہنچی!

(۲) شبلی کی شاعری کا دور۔ اِ دور وہ تھا جبکہ اُنھوں نے علی گڑھ تحریک کو خیر باد کہہ کے خود کو اسلامی تاریخ جدید تعلیم کے غیر اسلامی اثرات کی اصلاح اور سیاست کے لیے وقف کر دیا تھا۔ شبلی علی گڑھ کالج کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ اُن غلط اُصولوں اور طریقِ کار کے مخالف تھے جو اس ناقص تعلیم کی بنیاد تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان اپنے دین و روایات سے ناواقفیت اور غلط فہمی کے باعث گمراہ ہو گئے تھے۔ شبلی ایک روشن خیال عالم تھے۔ جسمانی قید سے زیادہ وہ مسلمانوں کو دماغی و ذہنی غلامی سے بچانا چاہتے تھے۔ حسب ذیل اشعار میں وہ اپنی نظم ' مذہب یا سیاست ' میں اس طرح کہتے ہیں :۔

آپ نے ہم کو سکھلائے ہیں جو یورپ کے علوم   اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اِس طرز سے بھی ممکن تھا   کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار

شبلی مسلمان قوم میں زندگی کی روح پھونکنے میں علی گڑھ تحریک کے منکر نہیں تھے، لیکن وہ قومی عزت و وقار کی قیمت پر مغربیت کے مضرت رساں نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مگر ان کے معاصرین نے اُنھیں غلط سمجھا اور باور کیا کہ وہ اُس تحریک سے ہی منحرف ہو گئے تھے جس کو اُنھوں نے دل و جان سے فروغ دیا تھا۔ وہ نام نہاد جدیدیت و مغربیت کے مُضر اثرات کے خلاف شبلی ہی کا تخیل تھا جسے بعد ازاں اکبر اور اقبال نے اپنایا۔ حالی اور شبلی دونوں نے مسلمانوں کے زوال پر نوحہ خوانی کی ہے، لیکن حالی نے اس کا سبب ان کی مادی وسائل میں پس ماندگی بتایا ہے جبکہ شبلی نے اس کا سبب ان کے دینی اصول اور اسلامی روایات سے انحراف قرار دی ہے اور اکبر اور اقبال دونوں نے شبلی کے اس نظریے کی توثیق کی ہے۔ شبلی کی نظمیں ' مساواتِ اسلام '، ' عہد فاروق رضؓ کے عدل کا ایک نمونہ '۔ اور ' جرأت و صداقت ' وغیرہ غالباً اقبال کی نظموں ' صدیق اکبر رضؓ ' اور ' جنگ یرموک کا واقعہ ' وغیرہ کی پیشرو نظمیں۔ شبلی کی اس نوع کی نظموں میں مقبول نظمیں ' ہمارا طرزِ حکومت ' اور ' عدل جہانگیری ' تھیں۔ شبلی کو ' نیشنلسٹ مسلمانوں ' کا پیش رو کہا گیا ہے کیونکہ اُنھوں نے سیاسی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی تھی، جبکہ سر سید اس نظریے کے سخت مخالف تھے۔ ذیل میں شبلی کی مشہور نظم ' جزر و مد ' کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو اُنھوں نے ' الہلال ' کلکتہ میں اپنے خلاف ایک تنقید کے جواب میں کہی تھی۔

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید   سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں

رہ نماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام　　　اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں

سرسید اور آزاد کی طرح شبلی کے گرد بھی ان کے پیروؤں کا ایک گروپ جمع ہو گیا تھا جو شبلی کی طرح ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے میں لٹریچر رکھتے تھے۔ شبلی شاعر بھی تھے، نقاد بھی، ادیب بھی، عالمِ دین بھی اور فلسفی بھی۔ شبلی کے ادبی اسلوب میں آزاد کی رنگین بیانی بھی ہے، نذیر احمد کے محاورات بھی اور حالی کی سادگی بیان بھی۔ شبلی کی معروف ترین تصانیف کی فہرست یہ ہے: کلیاتِ شبلی، شعر العجم، (پانچ جلدیں)، "المامون"۔ "الغزالی" "الفاروق"، "النعمان"، "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر"، "موازنۂ انیس و دبیر"، "سیرۃ النبیؐ"، "الکلام"، "الجزیہ"، "تاریخ الاسلام"، اور "سوانح عمری مولانا روم"۔ ۱۸۹۲ء میں شبلی کشمیر گئے تھے۔ اسی سال انھیں حکومتِ ہند نے شمس العلماء کا خطاب دیا تھا اور "تمغۂ مجیدیہ" سلطان ترکی نے (افاداتِ مہدی، از ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی ص ۱۰۳-۱۰۴، اردو انٹرمیڈیٹ کورس از عبدالشکور اور آسی، ۱۹۳۶ء، جدید اردو شاعری، از پروفیسر عبدالقادر سروری، مولانا شبلی نعمانی، ص ۳۸-۱۳۰)۔
شبلی نے اپنی "سیرۃ النبیؐ" کے بارے میں یوں لکھا ہے:۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی　　　مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ　　　خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

شبلی سے ایک خوبرو سلیمانی بوہرہ خاتونِ بمبئی (عطیہ بیگم فیضی رحمین) کے ساتھ رومان بھی وابستہ کیا جاتا ہے، جن سے علامہ اقبال کے بھی مراسم رہے تھے۔ جب بمبئی کے اس معروف سابق یہودی آرٹسٹ (فیضی رحمین) نے اسلام قبول کر کے عطیہ سے شادی کی تو شبلی نے حسبِ ذیل شعر کہا تھا ؎

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج ایک کافر مسلماں ہے

(۴)

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی

چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، لکھنؤ میں رہے اور رائے بریلی میں ۱۹۲۶ء میں فوت ہوئے۔ وہ کشمیری برہمن تھے اور وکالت کرتے تھے۔ شروع میں انھوں نے غزل گوئی کی اور افضل سے اصلاح لی۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ چکبست لکھنؤ میں اردو میگزین "صبحِ امید" کے ایڈیٹر تھے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُردو شاعری میں چکبست کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ وہ غزل میں آتش کا اور مُسدس میں انیس کا اتباع کرتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ ان کا شاعرانہ کلام بیشتر مُسدس کی شکل میں ہے جن کا مجموعہ "صبحِ وطن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ چکبست ایک اچھے نثرنگار اور نقاد بھی تھے۔ اُن کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات اور حسن و محبت کے جذبات کی عکاسی نہیں ہے۔ اُن کی شاعری کا مقصد اپنے اہلِ وطن کو خوابِ غفلت سے جگانا تھا۔ یہی موضوع اُن کی غزلوں میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ مغرب کی اندھی تقلید کے مُخالف تھے۔ اُنھوں نے ملک کے قومی و سیاسی حالات کو مؤثر طور پر منظوم کرنے کی سعی کی۔ لیکن ان کے اظہارِ بیان میں گہرائی کا فقدان ہے۔ بہ ایں ہمہ ان کا شمار جدید اُردو شعراء کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ مولانا شررؔ لکھنوی کے ساتھ مثنوی "گلزارِ نسیم" پر تنازعہ کے باعث مشہور ہوئے۔ وہ اُردو میں برِّصغیر کے ایک مُحبِّ وطن شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ چکبست اپنے کلام میں زبان کی صحت اور طرزِ ادا میں سلاست کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ وہ لکھنؤ میں اپنے زمانے کے بڑے کامیاب وکیل تھے۔ چکبست کا نمونۂ کلام :-

چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی\
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

زندگی کیا ہے ؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب\
موت کیا ہے ؟ ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی\
اسی پر ختم ہے افسانۂ دردِ والم میرا

(۵)

لسان العصر مولوی سیّد اکبر حسین اکبرؔ رضوی الٰہ آبادی

اکبرؔ ایک عالم میر تفضّل حسین رضوی کے فرزند تھے جو تصوف میں حضرت شاہ محمد قاسم داناپوری کے مُرید تھے اور جن کے زیرِ اثر سیّد تفضّل حسین تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کا گھرانا فلاکت زدہ تھا اور غُربت کے باعث اکبرؔ اعلیٰ تعلیم سے بھی محروم رہے تھے۔ اکبرؔ کے دادا سیّد فضل محمد آصف الدولہ کے زمانے کے ایک مشہور عالم تھے۔ اکبرؔ ضلع الٰہ آباد میں بارہ کے مقام پر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے اور الٰہ آباد میں ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے تھے۔ تنگ دستی کے باعث اکبرؔ کو پندرہ

سال کی عمر ہی میں نوکری کرنا پڑی تھی۔ ۱۸۶۴ء میں اُنھیں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ انجینیرنگ میں بہت حقیر مشاہرے پر ملازمت ملی لیکن اُنھوں نے اُسے جلد ترک کرکے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے 'مختار کاری' کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۶۹ء میں وہ نائب تحصیل دار بن گئے اور پھر ۱۸۸۱ء میں وہ ایک مُنصف ہوگئے۔ اس کے بعد وہ ترقی کرکے عدالتِ خفیفہ کے جج مقرر ہوئے اور بالآخر ۱۸۹۴ء میں وہ قائم مقام سشن جج بن گئے، جہاں سے وہ ۱۹۰۳ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ اُن کی قابلِ قدر خدمات کے صلے میں حکومت نے اُنھیں 'خان بہادر' کا خطاب عطا کیا۔ اکبر مدّت تک الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے تھے۔ ان کی 'کلیاتِ اکبر' شائع ہو چکی ہے۔ اکبر کی طنزیہ شاعری کے خاص ہدف مغرب کی مضرت رساں طرزِ زندگی اور اس کے مُقلّد ہیں۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے علی گڑھ تحریک کو بھی نہیں بخشا۔

اُردو شاعری میں اکبر کے اُستاد وحیدالدین وحید الہ آبادی آتش کے ایک پیرو بشیر کے شاگرد تھے۔ افسوس کہ اکبر کی زندگی کے آخری ایام نہایت غم واندوہ میں گذرے۔ اُن کی اہلیہ اور محبوب بیٹے دونوں کی وفات نے اکبر کو زندہ درگور کر دیا چنانچہ وہ ۱۹۲۱ء میں فوت ہوگئے۔ اکبر ایک عمدہ شاعر اور برّصغیر میں جدید مُسلم تہذیب کے بے مثال نقاد تھے۔ اُن کی طنزیہ شاعری ہمیں مدّت دراز تک ہنساتی اور رُلاتی رہے گی۔ اُردو کے تمام بڑے شعرا کی طرح اکبر نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا اور آخر تک وہ غزل کہتے رہے مگر اکبر کی غزلوں میں بتدریج ایسے مسائل نے درخور پا لیا جن سے تغزّل کا دُور کا بھی تعلق نہیں مثلاً اخلاقیات، تصوّف، فلسفہ اور سیاست۔ یہی وجہ ہے کہ بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی "اکبر کو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے کبھی عام مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔"

اکبر کی شاعری 'عہدِ اصلاحات' اور موجودہ زمانے کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔ ایک طرف تو وہ حالی اور خصوصاً شبلی کی شاعری سے متاثر ہے اور دوسری طرف اُس کا گہرا تعلق اقبال کی شاعری سے ہے۔ اکبر اپنے عہد کی صحیح اور سچی پیداوار تھے۔ اُن کی شاعری اُن تمام ادبی و مجلسی رُجحانات اور تحریکوں کی ترجمان ہے جو مُسلم ہند پر مغرب کے ابتدائی اثرات کے ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آئی تھیں۔ عہدِ اصلاحات ہندوستانی خیالات و ثقافت پر مغربی اثرات کے زمانے سے متصادم ہوا۔ اکبر کا زمانہ اُنھیں مغربی اثرات کے خلاف ردِّ عمل کا دَور تھا، جس کا آغاز شبلی کر چکے تھے اور جس کا اختتام اقبال کی شاعری سے ہوا۔ اکبر کے کلام کے موضوعات وہ مختلف و متنوع حالات و واقعات تھے جو مغرب کی مادّی و ذہنی غلامی کے نتیجہ میں ہندوستان پر مستولی تھے۔ اکبر کی شاعرانہ تخلیق نے بڑی وفاداری اور

صداقت کے ساتھ اُس زمانے کی ہندوستانی مسلم سوسائٹی کی ذہنیت و اعمال کی عکاسی کی ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ 'کلام اکبر' کے نام سے چار جلدوں میں موجود ہے۔

اِس طرح اکبرؔ کی شاعری ان کے عہد کے حوادث کا ایک لافانی ریکارڈ ہے۔ جس کا مقصد ہندوستان میں ایک ایسی جدید قومیت کا انعقاد تھا جو، جدید روشن خیالی کے دوش بدوش، اپنے عقاید دینی اور قومی روایات کی محافظ و علم بردار ہو۔ اِس لحاظ سے اکبرؔ قدیم اور اصلی دینی مدرسۂ فکر کے حامی و مُبلّغ تھے اور بنیادی اسلامی مسائل و اُصول میں کسی ردّ و بدل کے حق میں نہیں تھے۔ وہ مغربی تعلیم و علوم کے مُخالف نہیں تھے لیکن مغرب کی ذہنی غلامی کے خلاف تھے اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کو ردّ ہوتے ہوئے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جو حقیقتاً 'جدید' مسلمانوں کا وطیرہ تھا۔ اِس معاملے میں اکبرؔ شبلیؔ سے بھی بہت آگے تھے۔ 'اودھ پنچ' لکھنؤ ٹھیک اُسی وقت شروع ہوا تھا، جس کے ایڈیٹر منشی سید سجاد حسین تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، چکبستؔ اور مولانا عبدالحلیم شرؔر وغیرہ اس کے مضمون نگار تھے۔ اپنے قلمی نام 'ا۔ ح' کے ماتحت اکبرؔ نے بھی اس میں ۱۸۷۷ء سے لے کر ۱۸۸۰ء تک اپنے مضامین شائع کرائے۔ 'اودھ پنچ' میں اس ادبی مشق کے باعث اکبرؔ کی شہرت و مقبولیت ایک طنز نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ اکبرؔ سب سے بڑے سماجی نقاد تھے، جن کا مکمل سرمایۂ ادب 'خود شناسی' تھا۔ مشہور انگریز ادیب ایڈیسن EDISON نے بھی اکبرؔ کا جیسا اسلوبِ تحریر اپنی سوسائٹی کی اصلاح کے لیے اختیار کیا تھا۔ اکبرؔ کا مزاح اور طنز سب محض ایک مقصد کے لیے تھے یعنی مُسلم سوسائٹی کی اصلاح [کاروان۔ لاہور، سالنامہ ۱۹۳۴ء 'اُردو' از مولوی عبدالحق۔ سہ ماہی جریدۂ اُردو، اپریل ۱۹۲۳ء 'اکبر' از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ 'جدید اُردو شاعری' از پروفیسر عبدالقادر سروری 'اکبر الہ آبادی' ص ۷۳-۱۶۱۔ ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ اپریل ۱۹۲۶ء 'اکبر الہ آبادی' از سید شاہ ولی الرحمٰن۔ 'اکبر الہ آبادی' از طالب الہ آبادی انوار احمدی پریس، الہ آباد ۱۹۳۶ء۔ ماہنامہ 'مخزن' لاہور دسمبر ۱۹۲۷ء 'اکبر' از ڈاکٹر اعظم کریوی]۔ اکبرؔ کا

نمونۂ کلام

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

وصل کی شب میں نے اُس بُت سے لڑائی تھی زباں
یہ اثر اُس کا ہوا اُردو سے ہندی لڑ گئی

اس انجمن میں ہم بھی ایک رات جل چکے ہیں
تم شمع بن رہے ہو اور ہم پگھل چکے ہیں

بیتابیاں نصیب میں تھیں ورنہ ہم نشیں
یہ کیا ضرور تھا کہ اُٹھی پر نظر پڑے

(۶)

مولوی محمد اسمٰعیل اسمٰعیل میرٹھی

اسمٰعیل میرٹھ میں ۱۸۴۴ء میں پیدا اور وہیں ۱۹۱۷ء میں فوت ہوئے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں سہارنپور اور آگرے میں مقیم رہے تھے۔ اُن کی کلیات شائع ہو چکی ہے۔ نامساعد حالات نے اُنھیں کم عمری ہی میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ عرصۂ دراز تک میرٹھ اور سہارنپور کے اسکولوں میں فارسی کے اُستاد رہے تھے۔ اُن کی شاعری کا آغاز فارسی سے ہوا تھا، گو وہ کبھی کبھار اُردو میں بھی کہہ لیتے تھے۔ اُن کی غزلیں قدیم روایتی طرز پر تھیں۔ ۱۸۸۸ء میں وہ فارسی کے ٹیچر ہو کر سنٹرل نارمل اسکول آگرے میں متعین ہوئے، جہاں وہ بعد کو ترقی پا کر ہیڈ مولوی ہو گئے تھے۔ وہ ۱۸۹۹ء میں پنشن پا کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

اسمٰعیل حالی اور شبلی کے اسالیب سے متاثر تھے کیونکہ ان کی نظمیں 'قلعۂ اکبر آباد' اور 'جریدۂ عبرت' حالی کے رنگ میں اور 'مسلمانوں کی تعلیم' اور 'مسلمان اور انگریزی تعلیم' شبلی کے طرز پر ہیں۔ اسمٰعیل نے اپنا ایک علحدہ و منفرد طرز ایجاد کیا تھا جو اُردو شاعری کے لیے بالکل انوکھا تھا۔ اُردو میں کسی نے سوائے آزاد کے بچوں کی تعلیم کے لیے پرائمری کتابیں نہیں لکھی تھیں۔ چنانچہ اپنے آگرے میں قیام کے دوران، اسمٰعیل نے اُردو میں بچوں کے لیے اسکول کی کتابیں لکھیں۔ اُن میں اُنھوں نے اپنی ہی طبعزاد چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور نظمیں لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد اُنھوں نے میرٹھ میں جدید خطوط پر ایک اُردو گرامر لکھی، جس کا خلاصہ 'مختصر قواعدِ اُردو' کے نام سے شائع ہوا۔ اُن کا دوسرا کارنامہ جسے وہ مکمل نہ کر سکے، ایک ضخیم اُردو ڈکشنری کی تالیف تھی۔ اُن کا تیسرا ادبی شاہکار ایک 'تاریخ ادبِ اُردو' کی تدوین تھی جو اُن کی وفات کے باعث نامکمل رہ گئی۔ اسمٰعیل کے تینوں ادبی کارناموں کی تکمیل کا مولوی عبدالحق نے بیڑا اُٹھایا تھا لیکن وہ بھی اُنھیں مکمل نہ کر سکے۔

مولوی اسمٰعیل حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مُرید تھے اور اُنھی کے زیرِ اثر وہ آخر عمر میں ایک صوفی بن گئے تھے۔ وہ امیر خسرو کے حالاتِ زندگی بھی لکھنا چاہتے تھے، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ 'قِران السعدین' پر تنقید کی تکمیل کے فوراً بعد اسمٰعیل کا ۱۹۱۷ء میں انتقال ہو گیا۔ وہ پہلے اُردو شاعر تھے، جنھوں نے حالی اور شبلی کے کارناموں سے متاثر ہو کر بعض انگریزی نظموں کا تقریباً ۱۸۶۷ء میں اُردو میں منظوم ترجمہ کیا، جن میں سے معروف ترین 'ایک قانع مفلس'، 'حُبِّ وطن' اور 'انسان کی خام خیالی' ہیں۔ لیکن اسمٰعیل مشہور و مقبول بچوں کے

بیے اپنی اُردو ریڈرز کے باعث ہی ہوئے۔ اسمٰعیل کا شعری انداز زیادہ تر نظیر اور آزاد کے طرز پر تھا اور کمتر حالی کے اسلوب پر۔ ان کے اکثر موضوعات دیہی مناظر و زندگی اور وہاں کا ماحول تھے۔ اس ضمن میں ان کی حسبِ ذیل نظمیں خوب ہیں:-

"تاروں بھری رات"، "خدا کی صنعت"، "برسات"، "گرمی کا موسم"، "رات"، "شفق"، "صبح کی آمد"، "پن چکی"، "ہماری گائے"، اور "اسلم کی بلی" وغیرہ۔ اس طرح اسمٰعیل کی شاعری نے اُردو شاعری پر اس الزام کی تردید کر دی کہ اس میں مقامی رنگ کا فقدان ہے (" جدید اُردو شاعری" از پروفیسر عبد القادر سروری "اسمٰعیل میرٹھی" صفحہ ۱۵۰-۱۴۶ - "مختصر تاریخ ادب اُردو" از پروفیسر اعجاز، الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۵ء)۔

اسمٰعیل کا نمونۂ کلام:-

تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا ورنہ دیارِ حسن میں رسمِ ستم نہیں

سب جتا یا کئے نیازِ قدیم وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا

ہیں بیقرار، منزلِ مقصود بے نشاں رستے کی انتہا، نہ ٹھکانا مقام کا

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے پھر چمن اور آشیانہ اور ہے

شمع بھبکی، رات کم، محفل اُداس اب مُغنّی کا ترانہ اور ہے

(۷)

مولوی محمد محسن کاکوروی

محسن کاکوری، اودھ، یو پی، انڈیا، میں ۱۸۲۶ء میں پیدا اور مین پوری میں ۱۹۰۵ء میں فوت ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی حسن بخش کاکوروی تھا اور ان کے دادا مولوی حسین بخش عربی و فارسی میں کئی مفید کتابوں کے مصنف تھے اور اٹاوہ میں فوت ہوئے تھے۔ محسن علوی سید تھے اور اپنا سلسلۂ نسب حضرت عبد القادر جیلانی رح بغدادی سے ملاتے تھے۔ محسن کا بچپن مین پوری میں گذرا تھا جہاں اُنھوں نے اپنے والد اور مولوی عبد الرحیم سے تعلیم حاصل کی تھی۔ شاعری میں وہ مولوی ہادی علی اشک کے شاگرد تھے۔ شروع میں محسن نے ناظر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ پھر اُنھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کرکے آگرے میں وکالت کی۔ وہ متھرا میں منصف مقرر کئے گئے تھے لیکن اُنھوں نے آگرے میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے رہنے کو ترجیح دی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں وہ آگرہ چھوڑ کر کاکوری چلے گئے تھے۔ اس کے بعد جب ملک میں پھر امن ہو گیا تو وہ مین پوری میں مستقلاً رہ کر وہاں وکالت کرتے رہے۔ تصوف میں محسن

حضرت شاہ کرامت علی قلندر کاکوروی کے مُرید تھے۔ اُنھوں نے اپنی نعتوں کے ذریعہ سے اُردو شاعری میں ایک نئی اور مستقل صنف کا آغاز کیا۔ وہ رسولِ کریمؐ کی شانِ اقدس میں اپنے قصائد کے باعث معروف ہیں ["کُلیاتِ نعت مولوی محمد محسن کاکوروی" از مولوی محمد نُور الحسن، یوسفی پریس، فرنگی محل، لکھنؤ ۱۹۱۵ء، "جدید اُردو شاعری"، از پروفیسر عبدالقادر سروری "محسن کاکوروی"، ص ۱۸۷]۔ محسن کا نمونۂ کلام :-

کسی کو منزلِ دلبر کا راستہ نہ ملا ہزاروں کھو گئے اِس راہ میں پتہ نہ ملا

حالت تباہ کس کی ہے دَورِ حضور میں ایماں کی، عقل کی، دلِ خانہ خراب کی

(۸)

مولانا سیّد وحید الدین سلیمؔ پانی پتی

سلیمؔ پانی پت میں ۱۸۶۹ء میں پیدا اور حیدر آباد (دکن) میں ۱۹۲۸ء میں فوت ہوئے تھے۔ ان کے والد حاجی فریدالدین ایک نہایت متقی بزرگ اور شاہ شرف بُو علی قلندر کی خانقاہ کے مُجاور تھے۔ سلیمؔ نے اپنی عربی و فارسی کی تعلیم لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا عبداللہ ٹونکی سے حاصل کی تھی۔ وہ کچھ انگریزی بھی جانتے تھے۔ سلیمؔ ایک سند یافتہ طبیب تھے اُنھوں نے قانون پڑھنے کی بھی ناکام کوشش کی تھی۔ اُنھیں ایجرٹن کالج بہاولپور میں ملازمت مل گئی تھی مگر وہ اپنے سرپرست جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کے بعد پانی پت واپس آگئے، جہاں اُنھوں نے باقاعدہ طور پر طبابت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اِس اثنا میں سرسید نے پانی پت کا دورہ کیا، جہاں مولانا حالیؔ نے سلیمؔ کو اُن سے متعارف کیا۔ چنانچہ سرسید نے سلیمؔ کو اپنے ادبی نائب کی حیثیت سے ساتھ رکھ لیا۔ سلیمؔ اس منصب پر عرصۂ دراز تک فائز رہے اور اِس طرح وہ سرسید کے آخری معاون بنے۔ سرسید کی وفات کے بعد سلیمؔ نے اُردو میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اُن کے پہلے اخبار کا نام "معارف" تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد، سلیمؔ نے اپنی ادارت میں "علی گڑھ گزٹ"، "مسلم گزٹ"، اور "زمیندار" نکالے۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں جو فسادات ہوئے اُن سے متعلق سلیمؔ نے اپنے اخبار "زمیندار" میں بڑے اشتعال انگیز مضامین شائع کئے، جن کے نتیجہ میں حکومت نے "زمیندار" کا زرِ ضمانت ضبط کر لیا۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن) کے قیام کے بعد، وہ وہاں بلائے گئے اور دارالترجمہ میں مقرر کئے گئے، جہاں اُنھوں نے اُردو میں تکنیکی مُصطلحات کی اختراع و ایجاد کا نہایت دشوار اور قابلِ یادگار کام انجام دیا۔ اس کے بعد سلیمؔ حیدر آباد یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ اُن کا انتقال سرطان کے لاعلاج مرض میں ۱۹۲۸ء میں ہوا۔

سلیم کا مضمون 'اصلاح زبان اُردو' نہایت مشہور ہے۔ اُنھیں جدید اُردو شاعری کا معمار بھی کہا گیا ہے۔ وہ نظیر اکبر آبادی سے بہت مُتاثر تھے۔ اقبالؔ کی طرح سلیمؔ کی شاعری بھی بڑی حد تک رجائی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری غیر شعوری طور پر اقبالؔ کے آرٹ سے مُتاثر تھی۔ سلیمؔ کا شعورِ شعری سرسید، حالیؔ اور شبلیؔ کے آخر ایام میں بیدار ہوا تھا۔ اُن کی ابتدائی نظمیں اُن کے قلمی نام 'لبرل مسلمان' کے ماتحت شائع ہوئی تھیں سلیمؔ اُردو کے دہلوی اور لکھنوی مدارسِ فکر کی تقسیم کو زبان کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور اُنھوں نے اُردو زبان کو مقامی اثرات کے تسلّط سے آزاد کرنے کی سعی کی۔ سلیمؔ کی ادبی کاوشوں کا رجحان عربی و فارسی کی نسبت ہندی کی طرف زیادہ تھا۔ اُن کی جدید شاعری قدیم اور روایتی اسالیب کے خلاف ایک بغاوت تھی عظمت اللہ خاں کی شاعری سلیمؔ ہی کے طرزِ بیان سے مُتاثر ہے۔ افسوس کہ سلیمؔ کا مکمل پیغامِ شعری اپنی تکمیل و توضیح کے ساتھ منصۂ شہود پر نہ آسکا؛ کیونکہ ان کی شعری تخلیقات بلحاظِ کیفیت دیگر اُردو شعرا سے کم ہیں۔ وہ ایک لبرل اور آزاد خیال شاعر تھے۔ جنھوں نے جامد روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا [ماہنامہ 'کنول' آگرہ، فروری ۱۹۳۷ء 'سلیم پانی پتی' از عرشؔ تیموری ۔ 'جدید اُردو شاعری' از پروفیسر سروری، 'سلیم پانی پتی' ص ۵۷-۲۴۹] سلیمؔ کا نمونۂ کلام:۔

جب نیم کی شاخیں ٹھنڈی ہوا کھا کھا کے تھرکنے لگتی ہیں
پھر زرّیں کرنیں سُورج کی پتوں پہ چمکنے لگتی ہیں

پتوں کی رگوں میں نیم کا رس ہے دوڑتا پوری سُرعت سے
یہ رنگینہ دوائی دیکھ کے میں تصویر بنا ہوں حیرت سے

کرنا ساحل کی خموشی کو نہ زِنہار پسند
تم کو اے دوستو ہنگامۂ طوفاں کی قسم
بحر سے گر تمھیں ملنا ہے تو بیتاب رہو
موجِ رقصاں کی قسم، سیلِ شتاباں کی قسم

میں راکھ ہوں اُن انگاروں کی، جو سینۂ عشق میں ہیں دبے
میں لہر ہوں اُن طوفانوں کی، جو اُٹھتے ہیں دل کے سمندر میں

تیری نگاہِ شوخ کی تاثیر کیا کہوں ۔۔۔ جسموں میں زلزلے ہیں تو رُوحوں میں لرزشیں
پھونکا ہے تیرے شوق نے کیا نغمۂ فریب ۔۔۔ دل کی فضا میں ناچتی پھرتی ہیں خواہشیں

جدید اردو شاعری دورِ ہفتم کی خصوصیات

اس جدید عہد میں اُردو شاعری مغربی سائنس، علوم اور فلسفہ سے بہت متاثر ہوئی۔ اس لیے اس دور کے اُردو شعرائے نے حقیقت نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی اور مبالغہ آرائی و تصنع سے اجتناب کیا۔ ان کی یہ حقیقت نگاری احساسات و جذبات کے اظہار میں بھی سرایت کر گئی۔ مزید برآں شاعری کے عنوانات وسیع تر ہو گئے اور مستقل نظموں کا ذخیرہ وافر ہو گیا۔ مرثیہ کے ماتحت انیس و دبیر اور ان کے تلامذہ نے اُردو میں مستقل نظموں کا انبار لگا دیا۔ بعد ازاں آزاد، حالی اور اسمٰعیل نے اپنی مستقل نظموں کا اضافہ کیا جو بہت متنوع تھیں۔ اس طرح جدید اُردو شاعری کے دور میں، اتنی مستقل نظمیں کہی گئیں جتنی کہ اُردو شاعری کے پورے زمانے میں نہیں کہی گئی تھیں۔ مزید یہ کہ انگریزی نظموں کے مطالعہ اور سیاسی، اور سماجی بیداری نے اُردو شعرا کے لیے وسیع تر و تازہ تر مواد فراہم کیا۔ ہر چند کہ علامہ اقبال کا تعلق جدید اُردو شاعری کے دور سے تھا، لیکن ہم نے اُن کے کلام کی اثر اندازی کے لحاظ سے اُن کو آئندہ دورِ حاضر میں جگہ دی ہے۔

جدید اُردو شاعری میں تین شخصیتیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں، یعنی غالب، حالی اور اقبال۔ غالب کا اعلیٰ تخیل اور فلسفیانہ تصور قدیم اسلوبِ شاعری سے متاثر تھے لیکن ان کی شاعری کی گہرائی میں جدت پوشیدہ تھی۔ حالی پہلے اُردو شاعر تھے جنھوں نے مسلمانوں کی عظمتِ گذشتہ کے کھنڈروں پر کھڑے ہو کر آنسو بہائے، لیکن اس کے ساتھ وہ اُس عظمتِ گذشتہ کی بازیافت کی شدید خواہش بھی رکھتے تھے۔ ہر چند کہ اقبال کے کلام میں غالب کی سی رفعتِ نظر اور حالی کی سی نرمی و افتادگی نہیں ہے، لیکن اس میں غیر معمولی وسعت جرأت مندی ہے۔ اقبال مغرب کے پیرو نہیں تھے مگر انھوں نے بہت کچھ مغربی ذرائع سے مستعار لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں بین الاقوامی تاثر موجود ہے۔ اس موقع پر مزید دو ہستیوں کا حوالہ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، یعنی شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی اور مولوی عبدالحلیم شررؔ لکھنوی۔

اپنی کہانیوں کی کامیابی و مقبولیت کے بعد، حافظ نذیر احمد حالی کی شاعرانہ شہرت سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کے آخر میں اُردو شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوئے تھے، لیکن وہ اس میدان کے مرد ثابت نہ ہو سکے۔ نذیر احمد اپنی کہانیوں کے باعث اُردو ادب میں زندہ ہیں، لیکن ان کی شاعری ان کے نام کے باعث زندہ ہے۔

یہ بھی حالی کے اثر کے باعث تھا کہ شرر بھی اُردو شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ شرر نے حالی کے 'مسدس' کی نقل میں اپنا مسدس، 'زمانہ اور اسلام' کے نام سے لکھا تھا جو بالکل ناکام رہا۔ لیکن شرر نے اُردو شاعری

میں ایک نئے اسلوب کا اختراع کیا۔ اُنھوں نے شیکسپیر کے قوافی و بحر سے معرّا ڈراموں کی نقل میں بحور و قوافی سے معرّا اُردو نظمیں لکھیں۔ اُنھوں نے اپنے معروف ماہنامہ 'دلگداز' لکھنؤ میں (۱۹۰۰ء میں) اپنی 'فلپانا' نامی ناول اُسی آزاد شاعری کے طرز پر شائع کی۔ اِس طرح شرؔر اُردو شاعری میں نظمِ آزاد کے بانی تھے۔
['جدید اُردو شاعری' از پروفیسر سروری 'نذیر احمد اور شررؔ'، ص ۲۹-۱۲۸۔ ماہنامہ 'کارواں'، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۴ء 'اُردو' از مولوی عبدالحق]۔

(۱۱)

دورِ ہشتم

ترقی پسند شاعری حقیقت نگاری

عہدِ جدید میں بے شمار اچھے اُردو شعراء برِصغیر جنوبی ایشیا میں موجود رہے ہیں مگر ان سب کا ان اوراق میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہم نے صرف حسب ذیل شعراء کو تفصیلی ذکر کے لیے منتخب کیا ہے، دیگر شعراء کا محض حوالہ دینا ممکن ہو سکے گا۔ اس باب کے آخر میں ہم ترقی پسند شعرائ کا ذکر کریں گے یعنی فیض، ن م راشد، مجاز، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، جذبی، میراجی، مجنوں گورکھپوری اور جان نثار اختر وغیرہ۔ حسب ذیل غزل گو شعراء جو معروف نظم نگار بھی ہیں، امتیازی حیثیت کے حامل ہیں:-

(۱) علامہ اقبال، (۲) احسان دانش (۳) ریاض خیرآبادی۔ (۴) مضطر خیرآبادی۔ (۵) دل شاہجہانپوری (۶) عزیز لکھنوی، (۷) ثاقب اکبرآبادی (۸) جلیل مانک پوری (۹) یاس عظیم آبادی (۱۰) جوش ملیح آبادی (۱۱) حسرت موہانی (۱۲) اصغر گونڈوی (۱۳) فانی بدایونی (۱۴) جگر مراد آبادی (۱۵) سیماب اکبرآبادی (۱۶) حفیظ جالندھری (۱۷) فراق گورکھپوری، ناصر کاظمی وغیرہ۔ جگہ کی تنگی کے باعث ہمیں بعض دیگر معروف اُردو شعرائ کے ذکر کو چھوڑنا پڑا، مثلاً اثر لکھنوی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، سائل دہلوی، آغا شاعر دہلوی، احسن مارہروی، نوح ناروی، افسر میرٹھی، آسی الدنی، جوہر رامپوری، حفیظ جونپوری، ثاقب بدایونی، محشر لکھنوی، وحشت کلکتوی، صفدر مرزاپوری، حکیم آشفتہ لکھنوی، قمر بدایونی، بیخود دہلوی، اختر شیرانی، طالب باغپتی، اکبر حیدری، الطاف مشہدی، نیرنگ انبالوی، اختر جوناگڈھی، روش صدیقی، کیفی دہلوی، جوالا پرشاد برق لکھنوی، دُرگا سہائے سرور، تلوک چند محروم، نوبت رائے نظر، علی سردار جعفری، اثر صہبائی، علی اختر حیدرآبادی، مرزا ارشد گورگانی دہلوی، فاروق احمد، محشر بدایونی، وغیرہ مُندرجہ صدر شعرا کی ایک کثیر تعداد موجودہ بیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے میں فوت ہو چکی اور بعض شعراء دوسرے نصف حصے کے شروع کے برسوں میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سید محمد جعفری مزاحیہ شاعری میں معروف تھے۔

(۱)

ڈاکٹر علامہ شیخ محمد اقبال سیالکوٹی

علامہ اقبال سیالکوٹ میں ۱۸۷۲ء (۱۲۸۹ھ ہجری) میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایم اے، پی ایچ ڈی (فلسفہ) اور بار ایٹ لا کی ڈگریوں کے حامل تھے۔ اقبال اُردو شاعری میں ایک ایسے ممتاز دور کے بانی ہیں جس کی خصوصیات علوئے تخیل اور فلسفیانہ انداز فکر ہیں۔ وہ اپنے زمانے کی مع اُس کے جملہ خصائص کے پیداوار تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک جدید فکری اسلوب، ذہنی ارتفاع اور ادب لطیف کے عہدِ نو کے معمار بھی تھے۔ اُنھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان عربی اور انگریزی میں اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اقبال نے اسی کالج میں عربی اور فارسی شمس العلما مولوی سید میر حسن سے پڑھی تھیں۔ اور فلسفہ میں بی اے کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے لی تھی۔ اُس وقت اُس کالج میں فلسفہ کے پروفیسر علی گڑھ کی شہرت والے معروف پروفیسر آرنلڈ تھے، جو بعد کو سر آرنلڈ کہلائے۔ علی گڑھ میں پروفیسر آرنلڈ نے مولانا شبلی کے ادبی ذوق کو پختہ کرنے میں مدد دی تھی اور بعد کو لاہور میں اُنھوں نے وہی کام اقبال کے ساتھ کیا۔ اس طرح اُردو کے دو عظیم مفکرین آرنلڈ سے متاثر ہوئے تھے جس کا ثبوت 'اقبال کی نظم 'نالۂ فراق' ہے۔ اقبال کی فلسفیانہ شخصیت آرنلڈ ہی کی صحبت میں استوار ہوئی تھی۔ اُس وقت بعض دہلوی و لکھنوی شعرا لاہور میں جمع ہوئے تھے، جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی بھی تھے، اور جن کی تحریک و ترغیب سے لاہور کے بازار حکیماں میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں اقبال نے بھی شرکت کی تھی۔ اقبال کے بذریعہ خط و کتابت داغ کے شاگرد ہونے سے پیشتر، وہ ارشد گورگانی سے متاثر ہوئے تھے۔ اقبال کی شاعری بڑی حد تک غالب سے متاثر ہے۔ داغ کے انتقال کے بعد، اقبال نے اپنے مرحوم اُستاد کی توصیف میں ایک نہایت عمدہ نظم کہی تھی، لیکن اس سے بھی کہیں بہتر نظم اقبال کی 'مرزا غالب' ہے۔

اقبال کی قومی شاعری کا آغاز اُن کی نظم 'نالۂ یتیم' سے ہوا تھا جس کو اُنھوں نے خود ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے اسی انجمن کے بعد کے سالانہ جلسوں میں اپنی بعض اور نظمیں مثلاً 'ابر گہر بار' اور 'فریاد اُمت' وغیرہ پڑھ کر سنائیں۔ گرامی نے حسب ذیل عمدہ فارسی شعر اقبال کی تعریف میں کہا تھا ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال پیمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اسی زمانے میں اقبال کی ملاقات مشہور اُردو ماہنامہ 'مخزن' لاہور کے مدیر سر شیخ عبدالقادر سے ہوئی تھی۔ جب اقبال یورپ میں تھے تو اُنھوں نے شاعری ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن وہ سر عبدالقادر ہی کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے اس سے باز رہے تھے۔ اقبال کی بعض بہترین نظمیں مثلاً 'ہمالہ' اور 'تصویرِ درد' وغیرہ پہلے رسالہ 'مخزن' ہی میں شائع ہوئی تھیں۔ اقبال پہلے اورینٹل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ گئے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون 'ایران اور مابعد الطبیعیات' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، نیز بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اُنھوں نے خصوصیت سے شوپنہار، ہیگل، کانٹ، برگساں، لاک، شیکسپیئر، بائرن اور براؤننگ کا مطالعہ کیا تھا۔ یورپ ہی میں اقبال کی ملاقاتیں پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر نکلسن سے ہوئی تھیں۔ ثانی الذکر ہی نے 'اسرارِ خودی' کا انگریزی ترجمہ کر کے اقبال کو مغرب سے متعارف کرایا تھا۔ اور یورپ ہی سے اقبال کو فارسی شاعری میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

اقبال نے بہترین شاعری فارسی میں کی ہے۔ اُردو میں، فطری طور پر اس کے محدود ہونے کے باعث، ان کی شاعری کا اسلوب مجبوراً کچھ ہندی پاکستانی سا رہا۔ لیکن اس کے برعکس اپنی فارسی شاعری کے ذریعہ سے اقبال نے تمام ملّتِ اسلامیہ کو مخاطب کیا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال برِصغیر کو واپس آئے اور قانونی پیشہ اختیار کیا۔ سر عبدالقادر نے اقبال کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) ان کی شعر گوئی کے آغاز سے لے کر ۱۹۰۵ء میں ان کے یورپ کو جانے تک (۲) اُن کا زمانہ قیامِ یورپ، اور (۳) ۱۹۰۸ء کے بعد سے لے کر، جبکہ وہ یورپ سے واپس آئے تھے، آخر تک۔ اقبال نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ وہ داغ اور غالب دونوں کے اسالیب میں کامیاب تھے۔ اپنی ابتدائی قومی اور وطنی نظموں، مثلاً 'ہندوستاں ہمارا'، 'صدائے درد'، 'ہمالہ' اور 'تصویرِ درد' وغیرہ میں اقبال نے قوم پرستی کا اظہار شدت سے کیا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ، اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ مغربی شعرا، مثلاً ٹینی سن، ایمرسن اور گوئٹے کے کلام سے متاثر رہا ہے۔ اُنھوں نے ایسی نظمیں خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی تھیں۔

اقبال نے اُردو شاعری میں فطرت نگاری کے مضامین کو بڑی وسعت دی، جس کا آغاز میر حسن، میر انیس، نظیر اکبر آبادی، حالی، آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے کیا تھا۔ اقبال کی ایسی نظموں کی بہترین مثالیں ان کی نظمیں 'ہمالہ'، 'گلِ رنگین'، 'ابرِ کہسار'، 'آفتابِ صبح'، 'پیامِ صبح'، 'چاند' اور 'صبح کا ستارہ'، وغیرہ ہیں۔ ان کی جذباتی نظموں میں بہترین 'مرزا غالب'، 'داغ'، 'تصویرِ درد' اور 'کنارِ راوی' ہیں۔ اقبال عظیم

مفکر تھے اور ان کے فکر کی گہرائی ان کی مختصر ترین نظموں سے بھی آشکار رہے۔ اقبال نے کچھ مزاحیہ نظمیں بھی کہی ہیں جن سے اُن پر اکبر کے اثر کا پتا چلتا ہے۔ اگرچہ آزاد فی الحقیقت جدید اُردو شاعری کے بانی تھے، لیکن ان کی نظموں میں قومی عنصر کے فقدان کے باعث، اُن کی نظمیں حالی کی نظموں سے کمتر درجے کی شمار ہوتی ہیں۔ اُردو تذکروں کے ماسوا، موجودہ اور بعد کو آنے والی نسل شاید آزاد کو شاعر کی حیثیت سے قبول بھی نہ کرے، لیکن آزاد کے برعکس حالی کی شاعری، اس کی سادگی اور پھیکے پن کے باوجود، ہمیشہ زندہ رہے گی کیونکہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس طرح حالی ایک نئی قوم کے معمار تھے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری کی روح بھی وہی ہے جو حالی کی شاعری کی تھی۔ لیکن اکبر ایک قدامت پسند شاعر تھے اور جدتِ خیال و بیان کے معاملے میں حالی کے ہم نوا نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید طرزِ زندگی کی پیروی میں اپنی بنیادی روایات کو من وعن قائم رکھیں۔ وہ ماحول کے ہر تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی نقالی کے سخت مخالف تھے۔ اپنی ابتدائی شاعری میں اقبال نے حالی کی شاعری کو اپنے لیے نمونہ بنایا، جبکہ وہ ایک قومی شاعر تھے۔ قومی نظموں کے علاوہ، اقبال کی نظمیں 'گلِ رنگیں'، 'خفتگانِ خاک سے استفسار'، 'شمع'، 'ماہِ نو'، 'انسان'، 'بزمِ قدرت'، اور 'بچہ اور شمع'، وغیرہ ساری کائنات سے مخاطب ہیں۔ اقبال کی شاعری کا یہ دَور اُن کی نظم 'التجائے مسافر' کے ساتھ ختم ہو گیا۔

اقبال کی شاعری کے دوسرے دَور کا تعلق یورپ سے ہے۔ اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے اُنھیں صحیح اسلام اور اس کی عظمت سے رُوشناس کرایا۔ اُن کے وسیع مطالعہ نے ان کے ہندوستانی قومیت کے تنگ نظریے کو بدل کر ان کو وسیع تر بین الاقوامی اسلامیت کا ترجمان بنا دیا۔ اپنے ان خیالات کے اظہار کی خاطر، اقبال نے فارسی زبان کا سہارا لیا کیونکہ اس میں وسعتِ بیان بہت تھی۔ یورپ سے واپسی کے بعد، اقبال نے فارسی شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی، اگرچہ اُنھوں نے اُردو شاعری کو بالکل ترک نہیں کیا۔ آخر کار اقبال سیرتِ رسول آخر الزماں ﷺ اور نظریۂ اسلام کی جانب پلٹے اور مستقلاً وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ یہ نظریہ اقبال کی نظموں کا مستقل موضوع بن گیا جس کی ترویج اُن کا مقصدِ حیات تھا۔ اُن کی شاعری کے آخری دَور میں ہمیں اُردو کی چار یا پانچ طویل نظمیں ملتی ہیں، باقی چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان سب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) قومی اور وطنی (۲) معاشرتی و اخلاقی (۳) فلسفیانہ اور (۴) تاریخی۔ پہلی مد کی بڑی نظمیں 'شکوہ'، 'جوابِ شکوہ'، 'خضرِ راہ'، اور 'طلوعِ اسلام'، ہیں۔ ذکر کے قابل چھوٹی نظمیں 'ترانۂ ملی'، 'وطنیت'، 'خطاب بہ نوجوانانِ اسلام'، اور 'مسلم'، ہیں۔

اقبال مغربی تہذیب سے مُتنفر تھے، لیکن اُنھوں نے اپنی نظموں میں مغربی مفکرین مثلاً شوپنہار، نٹشے، ٹالسٹائے، کارل مارکس، ہیگل، آئنسٹائن، بائرن، ہٹلر، آگسٹس، کومیٹ، گوئٹے، برگساں، لاک، کانٹ، براؤننگ اور شیکسپیئر کے خلاف تنگ نظری و تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اقبال کا مذہب کائنات سے

محبت تھا۔ انسانی معاملات میں، وہ نہ کسی کے دوست تھے، نہ دشمن۔ جہاں تک عقاید کا تعلق تھا، وہ صوفی مشرب رکھتے تھے۔ ان کی زندگی ایک مسلمان کی زندگی تھی۔ یورپ سے اقبال نے عمل کا سبق سیکھا جسے اُنھوں نے اپنی قوم کو اپنی فارسی اور اُردو شاعری کے ذریعہ سے پہنچایا۔ اقبال کی آخری شاعری مولانا رومؒ کے اسلامی فلسفہ سے بہت متاثر تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کی ذہنیت ہی 'مثنوی معنوی' اور 'دیوانِ شمس تبریز' پر استوار ہوئی تھی۔ وہ رومی سے اس حد تک متاثر تھے کہ اُنھوں نے اپنی دونوں مثنویوں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بیخودی' کو 'مثنوی معنوی' ہی کی بحر میں لکھا ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی بھی رومی کے فلسفہ سے ماخوذ تھا۔

۱۹۰۸ء میں لندن سے واپسی پر اقبال نے نظریۂ پان اسلام کو، جس کی پہلے سید جمال الدین افغانی، مرزا آقا خاں کرمانی، الشیخ محمد عبدہٗ اور سلیم حلیم پاشا نے ترویج کی تھی، فروغ دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۶ء میں اُنھوں نے اپنی پہلی فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' شائع کی، جس کی اشاعت سے اقبال کے خلاف احتجاج کا ایک طوفان برپا ہوگیا، نتیجتاً انھیں اس میں سے بعض قابلِ اعتراض اشعار حذف کرنے پڑے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی دوسری [illegible] مثنوی 'رموزِ بیخودی' شائع ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں اقبال کو 'سر' کا خطاب ان کی ادبی خدمات کے صلے میں حکومت [illegible] کی جانب سے عطا ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں اُن کا تیسرا فارسی دیوان 'پیامِ مشرق' کے نام سے شائع ہوا، جس کو اقبال نے شاہِ افغانستان امان اللہ خان کے نام معنون کیا تھا۔ اُن کے باقی ماندہ دونوں فارسی کارنامے 'زبورِ عجم' اور 'جاوید [illegible]' بعد کو شائع ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال نے لندن میں گول میز کانفرنس میں اور بیت المقدس میں پان اسلامک [illegible] تحریک میں شرکت کی۔ بعدازاں افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے اپنے ملک میں تعلیمی اصلاحات کے بارے [illegible] میں مشورے کے لیے کابل آنے کی علامہ اقبال کو دعوت دی جس کے شکریہ کے طور پر اُنھوں نے اپنی نسبتاً مختصر نظم [illegible] جنون مسافر ۱۹۳۴ء میں شائع کی۔ اپنی زندگی کے آخر میں، اقبال روز بروز ہندوستان میں اسلامی سیاست [illegible] متوجہ ہوتے گئے، جس کی گرماگرمی میں اُنھوں نے برطانوی ہند کی حکومت کو اپنا 'سر' کا خطاب بھی واپس کر دیا تھا [illegible]۔ اقبال عربی، فارسی، اُردو، انگریزی اور جرمن زبانوں کے علاوہ تھوڑی بہت سنسکرت بھی جانتے تھے۔ علامہ [illegible] اقبال کے اُردو کارنامے حسبِ ذیل ہیں :-

[illegible] درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، اور 'ارمغانِ حجاز'۔ علامہ اقبال نے شاعری میں سے جمالیاتی عنصر کو [illegible] سے انسانی زندگی سے قریب تر کر دیا، حتّٰی کہ اُنھوں نے اپنی غزلوں سے بھی نظموں کا کام لیا۔ اقبال [illegible] تجریدی شاعری کے موجد تھے۔ وہ تصوف کے خلاف نہیں تھے بلکہ اسلامی تصوف میں نوافلاطونیت [illegible] مخالفت کرتے تھے جو اسلامی جدوجہد کی مانع تھی۔ اس کے برعکس وہ تو خود ایک اسلامی صوفی شاعر تھے، جو [illegible] غیر متحرک تصوف کے خلاف باعمل و متحرک تصوف کی تبلیغ کرتے تھے۔ علامہ اقبال کی وفات ۱۹۳۸ء

میں ہوئی اور وہ لاہور کی شاہی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے [ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور سالنامہ ۱۹۳۹ء 'اقبال اور تصوف'، از مولوی ساجد حسن قادری۔ ماہنامہ 'سہیل'، علی گڑھ سالنامہ ۱۹۲۶ء 'جبریل مشرق'، از آل احمد سرور صدیقی۔ ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۸ء مضمون از پروفیسر حامد حسن قادری' آگرہ۔ 'جدید اُردو شاعری'، از پروفیسر عبدالقادر سروری 'اقبال'، ص ۲۰۰-۲۴۸ 'رسالہ 'اُردو'، نئی دہلی'، 'اقبال نمبر' اکتوبر ۱۹۳۸ء 'ترقی پسند ادب'، از عزیز احمد' حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء ص ۱۰۹-'] علامہ اقبال کا نمونۂ کلام

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اَوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے — عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

تیری بندہ پروری سے میرے دن گذر رہے ہیں — نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

فلک نے اُن کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں — خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(۲)

احسان دانش کاندھلوی

احسان دانش کاندھلہ ضلع میرٹھ (یوپی انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے لیکن اُنھوں نے زندگی لاہور میں بسر کی۔ احسان دانش کو یہ غیر معمولی عظمت حاصل تھی کہ وہ ایک ادنیٰ اور معمولی مزدور رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے ایک ایک حرف سے خلوص، صداقت و حقیقت ٹپکتی تھی۔ اس طرح وہ مزدوروں اور غریبوں کے سچے ترجمان تھے۔ ان کے جذبات و احساسات حقیقی اور ان کے ذاتی تجربات پر مبنی تھے، جن کو اُنھوں نے اپنی نظموں مثلاً 'مزدور کی عید'، 'مزدور کی دیوالی'، اور 'برسات اور مزدور' وغیرہ میں بیان کیا ہے۔ اپنی نظم 'باغی کا خواب' میں احسان نے دُنیا دار مولوی کی اس طرح خبر لی ہے :۔

اُن کے ایمانوں میں رخنے تھے وفا میں داغ تھے — دل تھا ناقص، دامنِ صدق و صفا میں داغ تھے

خانقاہوں میں دلوں کا مُدعا بکتا رہا — مُدتوں اُن کی دُکانوں میں خُدا بکتا رہا

اِسی طرح اپنی نظم 'اپنے شکاری دوست' میں احسان انسانی سوسائٹی کے درندوں سے جنگل کے درندوں کو یہ کہہ کر بہتر بتاتے ہیں :۔

یہ کبھی آبادیوں میں آ کے غُرّاتے نہیں — یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں

اِن سے بڑھ کر وہ درندے ہیں شقی دل گرگ خُو — چُوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہ رگ کا لہو
اِن سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو عشرت کے لیے — دام پھیلاتے ہیں بیواؤں کی عصمت کے لیے

احسان دانش فطرت نگار بھی تھے، حقیقت نگار بھی اور انقلابی بھی۔ اُن کا مشاہدہ نہایت تیز تھا اور اُنہوں نے اقتصادی نامساوات، حق شناسی اور عدل و انصاف کے فقدان اور غیر انسانی بے تعلقی و بے حسی پر کڑی ضرب کاری کی ہے۔ اسی لیے احسان 'ترقی پسند' دانشوروں میں چنداں مقبول نہیں رہے۔ لیکن وہ اپنے اِن ناقدین سے کہیں زیادہ سچے اور پُرخلوص 'ترقی پسند' شاعر تھے۔ سجے سجائے کمروں میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر محنت کش طبقے کی رہ نمائی کا دعویٰ کرنا اور بات ہے اور احسان دانش کی طرح خود مزدوروں میں شامل ہو کر حقیقت نگاری بالکل دوسری چیز ہے۔ احسان کے تغزل کا نمونہ :-

ہماری رضا جو بُتوں کو دعا دے ! — ترے ناز کو بے نیازی سکھا دی
مری آرزو ہے وہ تعمیرِ خستہ ! — وفا نے بنائی، تغافل نے ڈھا دی
ترے حُسن کی آتشیں چشمکوں کو ! — جگر نے سراہا، نظر نے دعا دی
رہا گرچہ احسان دشمن زمانہ ! — مٹے اس طرح اُن پہ، ہستی مٹا دی

احسان دانش کا ستر سال کی عمر میں لاہور میں اتوار ۲۱ر مارچ ۱۹۸۲ء اور پیر ۲۲ر مارچ ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب کو انتقال ہو گیا۔

اُن کا مزید نمونہ کلام

"حدیثِ ادب" :-

سیماب وار ہے نگہ بیقرار کیوں؟ — اللہ کون زینتِ محفل نہیں رہا
ہر رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے اضطراب — زندگی کا راز پاتا ہوں تمہاری یاد میں
جبیں پہ گردِ رہِ عشق، لب پہ مہرِ سکوت — دیارِ غیر میں پھرتا ہوں آشنا کے لیے
یہ بات کہاں بزمِ شبستانِ حرم میں — احسان جو ناکردہ گناہوں میں مزا ہے

"آتشِ خاموش" :-

وہ شوق کیا جو رہے رہِ تمنا تک — وہ درد کیا جسے دل پر بھی اختیار نہ ہو
وہ کیا حیات جو مجبوریٔ حیات نہیں — وہ موت کیا ہے جو ہستی کی یادگار نہ ہو
جو سانس رُک کے نہ آئے وہ تنگ سینہ ہے — وہ دل جنازۂ دل ہے جو بیقرار نہ ہو
سُپردِ بیخودی کر دے فرائض عقلِ خود بیں کے — ہٹا دے اس سیہ باطن کا پہرا خانۂ دل سے

'چراغاں'،۔

اُن کے جاتے ہی کیا ہوا دل کو — شمع سی جھلملائی جاتی ہے

وہ سو کر اُٹھ رہے ہیں اللہ اللہ کیا نظارا ہے — قیامت نے ابھی کروٹ بدل کر سر اُبھارا ہے

معطر سانس، چہرہ رشکِ گل، مستی بھری آنکھیں — جوانی ہے کہ ایک سیلاب رنگ و بو کا دھارا ہے

ہماری رضا جوئیوں کو دعا دے — تیرے ناز کو بے نیازی سکھا دی

رہا گرچہ احسان دشمن زمانہ — مٹے اس طرح اُن پہ ہستی مٹا دی

(۳)

خیام العصر منشی سید ریاض احمد ریاضؔ خیر آبادی !

ریاضؔ مولوی سید طفیل احمد کے بیٹے تھے اور خیر آباد (ضلع سیتا پور، یوپی، انڈیا) میں ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۳۴ء میں فوت ہوئے۔ وہ امیر مینائی کے معروف شاگرد تھے۔ اُنھیں ریاست محمود آباد (اودھ) سے وظیفہ ملتا تھا اور وہ 'ریاض الاخبار' اور 'گلکدۂ ریاض' کے ایڈیٹر رہے تھے۔ اگرچہ ریاضؔ امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد تھے لیکن اُنھوں نے پیروی داغؔ دہلوی کی کی۔ وہ رجائی شاعری کے اُستاد اور خمریات کے ترجمان تھے۔ حالانکہ ریاضؔ ذاتی طور پر عسرت و افلاس میں رہے لیکن ان کی شاعری انبساط و نشاط کی مظہر تھی۔ اُن کے کلام میں شروع سے آخر تک مسرت و شادمانی، بے فکری و زندہ دلی ہے اُنھوں نے جوانی، حُسن، محبت و وارفتگی کے گیت گائے۔ وہ اردو شاعری کے مسلّمہ شاعرِ خمریات تھے، لیکن اُنھوں نے خود کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے نہایت ہٹ دھرمی و بے انصافی سے اپنے 'تذکرہ شعر الهند' میں اس حقیقت سے انکار کیا ہے کہ ریاضؔ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ وہ ایک بڑے نثر نگار بھی تھے، جس کی شاہد اُن کی تصانیف 'ریاض الاخبار'، 'گلکدۂ ریاضؔ'، 'صلحِ کل'، 'فتنہ'، اور 'عطرِ فتنہ' وغیرہ ہیں۔ شروع میں ریاضؔ اسیرؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اکبرؔ الہ آبادی کی طرح ریاضؔ خیر آبادی بھی سرسید کی پالیسیوں کے مخالف تھے ['مختصر تاریخ ادب اردو' از پروفیسر اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی، ۱۹۲۵ء۔ ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ، فروری ۱۹۲۶ء۔ ماہنامہ 'الناظر' لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۳۴ء۔ ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۹ء]۔

ریاضؔ کا نمونۂ کلام

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اُڑا دیئے — جس غنچہ پر نگاہ پڑی، دل بنا دیا !

ہم بند کئے آنکھ تصوّر میں پڑے ہوں — ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو!

اِس طرح کہ گھنگھرو کوئی چھاگل کا نہ بولے　　جب چھم سے چلیں، گود میں چپکے سے اٹھالے
عالم ہُو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے　　چُپکے چُپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

(۴)

افتخارالشعرا سید افتخار حسین مُضطر خیرآبادی

مولانا سید حافظ احمد حسین رضوی کے فرزند مُضطر خیرآباد (ضلع سیتاپور، یوپی، انڈیا) میں ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور گوالیار میں ۱۹۲۶ء میں فوت ہوئے تھے۔ مُضطر کی والدہ مشہور صوفی بزرگ مولانا فضل حق خیرآبادی کی دختر اور شمس العلماء عبدالحق خیرآبادی کی چھوٹی بہن تھیں۔ مُضطر اپنی ہی فاضلہ و شاعرہ والدہ کے شاگرد تھے اور کچھ عرصے تک وہ امیر مینائیؔ کے بھی شاگرد رہے تھے۔ وہ ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کے نواب ابراہیم علی خاں کے اُستاد رہے۔ جنہوں نے مُضطر کو کئی خطابات دیے تھے۔ مُضطر بھوپال، اندور، گوالیار اور رامپور کی ریاستوں میں مجسٹریٹ رہے۔ وہ نہایت عمدہ شاعر اور ماہر موسیقی تھے [ماہنامہ سہیل، علی گڑھ، سالنامہ ۱۹۳۶ء مضطر خیرآبادی، از سید جان نثار حسین اختر (مُضطر کے بیٹے)] مُضطر کا نمونۂ کلام

کسی کے دردِ محبت نے عمر بھر کے لیے　　خدا سے مانگ لیا انتخاب کرکے مجھے
مصیبت اور لمبی زندگانی　　بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا
دل چُرائے ہوئے دُزدیدہ نظر جاتا ہے　　کوئی لُوٹے ہوئے اللہ کا گھر جاتا ہے

(۵)

اعتبارالملک لسان العصر حکیم الشعرا حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہانپوری

دلؔ احمد حسن خاں کے بیٹے تھے اور شاہجہانپور (روہیلکھنڈ، یوپی، انڈیا) میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ امیر مینائیؔ کے شاگرد تھے، لیکن اُن کے کلام پر لکھنوی طرزِ شاعری کا اثر نہیں ہے۔ اُن کی غزلیں دلچسپ اور پُراثر ہیں اور اُن کا اسلوبِ بیان عامیانہ نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں داخلیت، سوز و ساز و غنائیت ہے۔ وہ اپنے عہد کے نہایت عمدہ و مقبول غزل گو شاعر تھے اُن کے مطبوعہ دیوان کا نام "نغمۂ دل" ہے۔ دلؔ کا نمونۂ کلام ہے

رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر وہ مصیبت ہوتی ہے　　میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دُنیا غافل سوتی ہے
راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی　　کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجیے!

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن ! کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے
چند آبلہ پا وحشی کہتے ہوئے گذرے ہیں کانٹا کوئی صحرا کا بیکار نہیں ہوتا

(۶)

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

مرزا محمد علی کے فرزند، عزیز لکھنو میں ۱۸۸۲ء میں پیدا اور ۱۹۳۴ء میں فوت ہوئے تھے۔ وہ صفی لکھنوی کے شاگرد تھے اور عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ لکھنؤ میں اسکول ٹیچر تھے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن) میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ آخر عمر میں عزیز لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد کی اورینٹل لائبریری کے مہتمم ہو گئے تھے۔ وہ لکھنوی مدرسۂ فکر کے معروف شاعر تھے اور اردو غزل میں ید طولی رکھتے تھے۔ وہ لکھنؤ میں اپنے عہد کے مسلّمہ اُستاد تھے۔ اُن کے دیوان 'گلکدہ' کے علاوہ، ان کا دوسرا مطبوعہ کارنامہ ان کے قصاید کا مجموعہ ہے جس کا نام 'صحیفۂ ولا' ہے۔ علاّمہ اقبال نے اُن کے حسبِ ذیل شعر کو اُردو کے بہترین پانچ اشعار میں شمار کیا ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن
بھُولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا

اکبر الہ آبادی عزیز کے حسبِ ذیل شعر کے عوض اپنا پورا دیوان دینے کو تیار تھے ؎

اور آثار عیاں چہرۂ بیمار سے ہیں
جائے جائے اب آپ پشیماں ہوں گے

عزیز نہایت بدصورت انسان تھے لیکن وہ اُتنے ہی باکمال اُردو شاعر تھے۔ اُنھوں نے لکھنوی طرزِ شاعری کو زبردست سہارا دیا [''مذاکراتِ نیاز'، از نیاز فتحپوری، 'لکھنؤ' موجودہ اکابرِ لکھنؤ'] ۔ عزیز لکھنوی کا نمونۂ کلام

وارفتگانِ حُسن پہ کیا جانے کیا بنے اُٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے
عرضِ مطلب یہ تمنا سکونِ دل ہے وہ سُنیں یا نہ سُنیں، ہم تو سُنا جاتے ہیں
ہے اُن کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں کسی کا حال کسی پر عیاں نہیں ہوتا

(۷)

مرزا ذاکر حسین ثاقب اکبر آبادی قزلباش

ثاقب آگرے میں پیدا ہوئے تھے لیکن رہے وہ لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے۔ وہ بہترین اردو غزل گو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا نمونۂ کلام

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے
کہنے کو منت پر کی اسیری تو تھی مگر — خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا
گلشن بہار پر تھا، نشیمن بنا لیا — میں کیوں ہوا اسیر، میرا کیا قصور تھا؟
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کچھ نہ کچھ لے گئے سب اس در سے — دینے والے میرا بھلا نہ ہوا
مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

(۸)

نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری

مولوی حافظ عبد الکریم کے فرزند جلیل مانک پور (ضلع الہ آباد) میں ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور امیر مینائی کے شاگرد اور جانشیں تھے۔ کچھ عرصے تک جلیل رامپور میں 'امیر اللغات' کے آفس سیکریٹری رہے تھے۔ پھر وہ حیدر آباد (دکن) جا کر شاعری میں نظام کے اُستاد مقرر ہو گئے۔ جلیل دو مطبوعہ دواوین کے مالک تھے۔ اُردو غزل میں جلیل امیر مینائی کے اسلوب کے پیرو تھے۔ اپنی سلاست، سادگی، سہل انگاری و روانی کے باعث جلیل کی غزلیں نہایت مقبول ہوئیں۔ جلیل کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا۔ اُن کا نمونہ کلام۔

جاتے ہو خدا حافظ، ہاں اتنی گذارش ہے — جب یاد ہم آ جائیں، ملنے کی دعا کرنا
اب تو وعدے کی بھی مُدّت ہو چکی — کب غریبوں کی دعا لے جائے گی؟
دل آنکھوں سے آزردہ ہے آنکھیں ہیں نظر سے — جس دن سے میری جان تیری صورت نہیں دیکھی

---

(۹)

مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی

(یگانہؔ لکھنوی چنگیزی)

یاسؔ کے والد کا نام پیارے مرزا تھا اور وہ مولوی سید علی خاں بیتابؔ عظیم آبادی، شادؔ عظیم آبادی اور پیارے صاحب رشیدؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ یاسؔ کی تصانیف کے نام یہ ہیں: آیاتِ وجدانی، نشترِ یاس، ترانہ، اور غالب شکن۔ یاسؔ عظیم آبادی میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں وہ لکھنؤ آئے اور وہیں مستقلاً قیام پذیر ہو گئے۔ پھر وہ حیدرآباد (دکن) جا کر سب رجسٹرار ہو گئے۔ شروع میں اُن کا تخلص یاسؔ تھا، لیکن بعد کو اُسے تبدیل کر کے یگانہؔ رکھ لیا۔ ۱۹۰۴ء میں وہ مٹیا برج کلکتہ بھی گئے تھے۔

یاسؔ جب لکھنؤ میں تھے تو اپنی انا، ناپسندیدہ عادات اور غرور کے باعث بدنام ہو گئے اور جب لکھنوی شعراء نے ان کی اور ان کی شاعری کی جانب سے مُنہ موڑا تو اُنھوں نے انتقام کا ایک عجیب طریقہ نکالا۔ اُنھوں نے غالبؔ اور ان کی شاعری کے خلاف ایک نہایت نازیبا، اور غیر شریفانہ مہم کا آغاز کیا جس سے ہر کہ ومہ ان کا مخالف ہو گیا۔ اس طرح سے اُنھوں نے گویا غالبؔ کے مداحین اور اپنے مخالفین کے جذبات کو مجروح کرنے کی سبیل نکالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عام طور پر رسوا ہو گئے اور اُن کا نام معقول اُردو شعراء کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ ورنہ یگانہؔ عہدِ جدید کے بہترین اُردو غزل گو شعراء میں سے ایک تھے۔ ان کے کلام میں گہری معنویت، داخلیت، خیال آفرینی، زبان پر قدرت، روانگی، سادگی و سلاست بیانی موجود ہیں۔ ان کی غزلوں میں غضب کا طنز اور تیکھا پن ہے۔ اُن کو رباعی نویسی میں بڑی مہارت حاصل تھی جو بیحد معنی خیز ہیں۔ اُن کی بعض غزلیں کلامِ آتشؔ کی طرح نہایت مؤثر و کامیاب ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کے ظریفؔ لکھنوی اور احمق پھپھوندوی کی طرح یگانہؔ نے بھی شاعری میں روزمرہ کی عامیانہ زبان کو متعارف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا نمونۂ کلام

ہوتا ہے بند ایک در کھلتے ہیں صد ہزار در — اپنی طرف سے شک نہ کر نیّتِ کارساز میں

ہر رات ہوئی صبح کو ایک خوابِ فراموش — دُنیا ہی دُنیا ہے تو کیا یاد کریں گے

(۱۰)

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی

جوشؔ ملیح آباد کے قریب قصبہ کنول ہار (یوپی، انڈیا) میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۸۸ سال کی عمر میں اسلام آباد کے ہسپتال میں دوشنبہ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو فوت ہوئے۔ وہ اردو کے بہترین غزل گو اور نظم گو شعراء میں سے ایک اور نہایت جدت طراز تھے۔ اردو شاعری میں وہ 'جدیدیت' کے معماروں میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام نواب بشیر احمد خاں بشیرؔ، دادا کا نواب محمد احمد خاں احمدؔ اور پردادا کا نام نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویاؔ (خواجہ وزیر شاگرد) تھا۔ اس طرح شاعری کئی نسلوں سے ان کی وراثت میں چلی آتی تھی۔ شروع میں برائے چندے جوشؔ عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد رہے۔ ہر چند کہ جوشؔ کو عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم نہیں ملی تھی لیکن انھوں نے سینٹ پیٹرز کالج آگرہ میں سینیئر کیمبرج تک انگریزی پڑھی تھی۔ ان کے تمام مذکورہ بالا بزرگ صاحبانِ دیوان تھے۔

دس سال سے زیادہ عرصے تک جوشؔ حیدرآباد (یونیورسٹی دکن) میں دارالترجمہ کے ادبی ناظر رہے تھے۔ نظم طباطبائی نے بھی پہلے اس جگہ پر کام کیا تھا۔ لیکن جوشؔ بالآخر حیدرآبادی سوسائٹی کی سازشی روایات کو برداشت نہ کر سکے اور استعفا دے کر واپس چلے آئے۔ حیدرآباد (دکن) سے واپس آکر وہ دھولپور گئے جہاں سے انھوں نے ایک اردو ماہنامہ جاری کیا جس کو وہ دہلی لے گئے اور اس کا نیا نام 'کلیم' رکھا اور جو آخر میں ملیح آباد سے شائع ہوا۔ جوشؔ کی شاعری دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے (۱) غنائی اور (۲) فلسفیانہ۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کی رائے میں جوشؔ کا کلام صوفیانہ ہے لیکن اس کے برعکس شررؔ لکھنوی کی رائے میں وہ محض سرور و شادمانی کا پیام ہے اور بس۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جوشؔ کی شاعری دعوتِ عیش و ہوس رانی دیتی ہے۔ جوشؔ نے غزلوں کی نسبت نظموں پر زیادہ توجہ دی جن کے باعث وہ مقبول ہوئے۔ جوشؔ عکاس فطرت تھے۔ انھوں نے علامہ اقبالؔ کی طرح دعوتِ عمل بھی دی ہے۔

جوشؔ نے اپنی شاعری میں ناامیدی اور بزدلی کو للکارا اور امید و خود اعتمادی کی حمایت کی ہے۔ ان کے شائع شدہ کارنامے یہ ہیں: 'روحِ ادب' (۱۹۲۰ء)، 'نقش و نگار'، 'فکر و نشاط'، اور 'شعلہ و شبنم' ['جدید اردو شاعری از پروفیسر سروری، جوشؔ ملیح آبادی، ص ۲۹۴-۲۹۷، روحِ ادب'، 'مختصر تاریخ ادب اردو'، 'ترقی پسند ادب'، از عزیز احمدؔ، حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء]۔ جوشؔ نے حبِ منفعت کی خاطر فلم انڈسٹری بمبئی کو اپنا کلام فروخت کر کے اپنی شاعرانہ و ادبی شخصیت کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس زمانے

میں اُنھوں نے ہندوستانی فلموں کے لیے مخربِ اخلاق گانے لکھے اور اپنی شاعری کا وقار برباد کر دیا۔ جوشؔ نے حکومتِ ہند کی ملازمت میں رہ کر اس کے سرکاری اُردو آرگن 'آجکل' ہفتہ وار، دہلی کی ادارت بھی کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ کراچی چلے آئے۔ اپنی آخر زندگی میں اُنھوں نے 'یادوں کی بارات' جیسی بیہودہ کتاب شائع کر کے اپنے بچے کُھچے شاعرانہ وادبی وقار کو دفن کر دیا۔ اُن کا نمونۂ کلام

کس حد کا دل نشیں ہے محبت کا بھی سبق ایک بار جس کو یاد ہوا، بھولتا نہیں

ہوئی جاتی ہے زندگی برباد اے میرے دیرآشنا فریاد

یاد اُن کی بہت نہیں آتی شاید اب دل کی زندگی کم ہے

(۱۱)

رئیس المتغزلین سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی

سید اظہر حسین کے فرزند حسرتؔ موہان (ضلع اُناؤ، یوپی، انڈیا) میں ۱۸۸۰ء (مطابق ۱۲۹۸ ہجری) میں پیدا ہوئے اور شاعری میں تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ حسرتؔ نے ابتدائی تعلیم عربی و فارسی وغیرہ میں پہلے موہان میں مولوی غلام علی موہانی اور میاں جی بُلاقی سے اور پھر فتحپور ہسوہ میں مولانا سید ظہور الاسلام، مولوی حبیب الدین اور مولانا خلیل احمد اسرائیلی سے حاصل کی تھی۔ حسرتؔ نے اپنی شاعری کا آغاز بھی ہسوہ سے مولانا سید محمد ہاشم کی ہمت افزائی و ترغیب سے کیا تھا۔ اُنھوں نے ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کی حوصلہ افزائی سے ریاضی میں بی اے کا امتحان ۱۹۰۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے پاس کیا تھا۔ علی گڑھ ہی سے حسرتؔ نے اپنا مشہور ماہنامہ 'اُردوئے معلّٰی' شائع کیا۔ شاعری میں وہ مومنؔ کے اسلوب کے پیرو تھے اور سیاست میں وہ انتہا پسند ہندوستانی سیاسی رہنماؤں بال گنگا دھر تلک اور بابو اربندو گھوش کے متبع تھے۔ ہندوستانی کانگریس سے اُن کے گہرے لگاؤ کے باعث، مولانا شوکت علی حسرتؔ کو، 'دیوانہ مُلّا' کہا کرتے تھے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ حسرتؔ کے ایک سیاسی رفیق سید حیدر رضا دہلوی کو مولانا ابوالکلام آزادؔ 'سودیشی مُلّا' کہتے تھے، لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بعد ازاں مولانا آزادؔ خود 'سودیشی مُلّا' بن گئے۔

سُورت کے تاریخی اجلاس تک تو حسرتؔ انڈین نیشنل (ہندو) کانگریس کے ساتھ رہے، لیکن اس اجلاس میں حسرتؔ نے مع تلک کے کانگریس کو خیر باد کہدیا۔ اور ۱۹۱۶ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس میں حسرتؔ مُسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مولوی عبدالودود بریلوی حسرتؔ کے سیاسی

رفیق تھے۔ ۱۹۰۸ء میں حسرت پر اپنے رسالہ "اُردوئے معلّٰی" میں "مصر میں برطانوی پالیسی" کے موضوع پر مضمون شائع کرنے کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں دو سال کی قید با مشقت کی سزا ہو گئی۔ دراصل وہ مضمون علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم نے لکھا تھا لیکن حسرت نے مضمون نگار کی نشان دہی نہ کر کے ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی۔ حسرت پر بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا۔ سزائے قید کے علاوہ حسرت کو پانچ سو روپے جرمانہ کی بھی سزا دی گئی تھی، جس کی ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں برطانوی حکومتِ ہند نے اُن کی ہزاروں روپیوں کی بیش قیمت لائبریری کو محض ساٹھ روپے کی حقیر رقم پر نیلام کر دیا تھا۔ جیل میں حسرت کے ساتھ ایک عام اخلاقی مجرم کی طرح نہایت غیر انسانی سلوک کیا گیا اور اُن سے چکّی پسوائی گئی۔ انھیں علی گڑھ اور الٰہ آباد کی جیلوں میں رکھا گیا، لیکن انھیں ایک سال کی مدتِ قید کے بعد رہا کر دیا گیا۔

جب حسرت نے اپنی انتہا پسندانہ سیاست کا آغاز کیا تو اُس وقت برِصغیر ہند و پاکستان میں ایک مسلمان سیاست داں بھی اُن کا ہم خیال موجود نہ تھا۔ بعد کو ایک مسلم سیاست داں مظہر الحق ہوئے جو اُس وقت چھپرہ میں ایک جوڈیشیل افسر تھے۔ رامپور کے مولانا محمد علی جوہر کے حسرت سے سیاسی اختلافات ۱۹۱۴ء تک قائم رہے۔ صرف علامہ شبلی نے شروع ہی سے حسرت کی سیاست کی حمایت کی۔ حسرت نے وزیر حسن اور امیر علی کی مشہور سیاسی مخالفت میں مولانا محمد علی کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں للت پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے حکم عدولی کی بنا پر حسرت پر دوبارہ مقدمہ چلا کر انھیں دو سال کی قیدِ بلا مشقت کی سزا دی تھی، جس کی مدت حسرت نے پوری کی تھی۔

حسرت کی شادی ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ اُن کی باوفا اہلیہ مسلم خواتین کے لیے ایک نمونہ اور صنفِ نازک کے لیے باعثِ فخر تھیں۔ حسرت نے نہایت مشکل و صبر آزما زندگی گذاری۔ وہ ایک انتہا پسند سیاست داں تھے اور اُصولوں کے معاملے میں بالکل سمجھوتہ نہ کرتے تھے، اِسی لیے ان کی زندگی کا کافی حصہ قید میں گذرا۔ وہ برِصغیر میں اُن اوّلین سیاست دانوں میں سے تھے جو برطانوی سامراج سے مکمل آزادی کے علم بردار تھے۔ ہندوستان میں سودیشی تحریک کے حقیقی بانی گاندھی جی نہیں بلکہ حسرت موہانی تھے۔ اس تحریک کے فروغ کے لیے حسرت نے علی گڑھ میں ایک سودیشی اسٹور کھولا تھا، اور اس عملی پیش قدمی کے سلسلے میں وہ پہلے شخص تھے۔ حسرت نے اپنے چاروں دیوان قید خانے کی چار دیواری کے اندر ہی مکمل کیے تھے۔ جیل سے رہائی کے بعد بھی پولس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی تھی۔ حسرت علی گڑھ سے دخلافت سودیشی بھنڈار کے مینجنگ ڈائرکٹر ہو کر کانپور گئے تھے۔ حسرت ہی کے قیام کے باعث کانپور مسلم لیگ کا گڑھ بن گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں حسرت نے مسلم لیگ کے احمد آباد کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اُن کے

اُس صدارتی خطبہ کو ہندوستان کی برطانوی حکومت نے باغیانہ قرار دیا تھا اور حکومت کو اُلٹنے کی کوشش کے الزام میں اُن کو بیس سال کے کالے پانی (بحرِ ہند کے جزائر انڈمان کو جلاوطنی) کی سزا ہوگئی تھی لیکن بمبئی کی ہائی کورٹ نے وہ سزا مسترد کردی تھی۔ مگر اُسی سال حسرت نے کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی فوری و مکمل آزادی کی قرارداد پیش کی جس پر اُنھیں اور گاندھی جی کو دو دو سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ حسرت نے یہ مدتِ قید بھی پوری کی تھی۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ احمد آباد میں اپنے مذکورہ بالا خطبۂ صدارت میں، حسرت نے تشدّد کے جواب میں تشدّد کی حمایت اور برطانی حکومتِ ہند کے خلاف گوریلا جنگ کی تجویز پیش کی تھی۔ اُس وقت کانگریس کے اجلاس میں گاندھی جی نے حسرت کی مکمل آزادیٔ ہند کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔ حسرت ۱۹۵۱ء میں فوت ہوئے تھے۔

حسرت ہندوستان میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرح کی ایک مکمل آزاد قومی حکومت کے قیام کے حق میں تھے، لیکن گاندھی جی برطانیہ سے مکمل قطع تعلق کے خلاف تھے اور بجائے ایک آزاد جمہوریہ کے برطانیہ کے ماتحت ایک وحدانی حکومت کے حامی تھے۔ اسی وجہ سے حسرت کے گاندھی جی سے شدید اختلافات ہوگئے جو اُن کے کانگریس سے مستعفی ہوتے پر منتج ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں کانگریس کا کشمیر میں اجلاس منعقد ہوا۔ اُسی زمانے میں حسرت نے اپنی انقلابی کمیونسٹ کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد کیا، جس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت اُنھوں نے خود کی۔ اس کے بعد سے ان کی سیاسی تحریکوں کا رُخ سوشلزم اور کمیونزم کی طرف مُڑ گیا۔ حسرت 'کانگریس سوشلسٹ' کی اصطلاح کا مذاق اڑایا کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں جو شخص نیشنلزم کے اُصولوں کا عامل اور گاندھی جی کے طرزِ عمل کا پیرو ہو، وہ سوشلسٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ حسرت ہی کے زیرِ اثر مسلم لیگ نے اپنے لکھنؤ کے اجلاس میں مکمل آزادی کی قرارداد منظور کی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے ذاتی قربانیوں کے معاملے میں حسرت کا عظیم و محترم نام گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر رامپوری، لاجپت رائے اور تلک وغیرہ کے ناموں کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حسرت نے ایسے وقت میں غزل کو سنوارنا شروع کیا جبکہ وہ بدنام ہو چکی تھی اور اردو شعرا اس سے قطع نظر کرکے دیگر اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے۔ ایسے آزمائشی وقت میں حسرت نے اپنے بے مثال طرزِ تغزّل سے اُردو غزل کی کھوئی ہوئی دل آویزی و وقار کو بحال کیا۔ حسرت کی غزلیں بہت کچھ میر کے اسلوبِ تغزّل سے متاثر معلوم ہوتی ہیں، شاید اس لیے بھی کہ میر کی طرح حسرت کی زندگی بھی پُر آشوب اور مصائب و آلام کا شکار رہی۔ حسرت سے متاثر ہوکر بہت سے اچھے اردو غزل گو

شعرا نمودار ہوئے، مثلاً جلیل احمد قدوائی وغیرہ۔ حسرت بلاخوفِ تردید عہدِ جدید کے بہترین غزل گو شاعر تھے۔ اُن کا تغزّل مثالی بن چکا ہے۔ حسرت کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ حسرت نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی تھی۔ حسرت نے میر، مصحفی، مومن، غالب اور نسیم کی پیروی کی کوشش کی اور بڑی کامیابی سے کی، اسی کے ساتھ اُنھوں نے اپنا ایک منفرد طرزِ تغزل بھی پیدا کیا جو بیک وقت دلکش، مؤثر و دلفریب ہے ["مقدمہ انتخاب کلام حسرت موہانی، از جلیل احمد قدوائی، جامعہ ملیہ پریس دہلی۔ علی گڑھ میگزین، "علی گڑھ نمبر، جنوری ۱۹۳۹ء "حسرت" از حبیب الرحمٰن حبیب۔ سلسلۂ حالاتِ نظربندانِ اسلام نمبر ۳ "حسرت موہانی، صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام، دہلی ۱۹۱۸ء۔ ترقی پسند ادب، از عزیز احمد، حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء ص ۱۱۰-۱۱۱] حسرت کا نمونۂ کلام

عقل صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا ۔۔۔ شوق کی بیقراریاں نہ گئیں
سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں ۔۔۔ دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دُونا کر دیا
اُمید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند ۔۔۔ آنکھوں سے مگر شوقِ تماشا نہیں جاتا
بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں ۔۔۔ الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں!

(۱۲)

اصغر حسین اصغر گونڈوی

اصغر گورکھپور میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گونڈہ (یو پی، انڈیا) میں قانون گو تھے، جہاں اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد، وہ مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اصغر باقاعدگی سے تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے، نہ وہ اسکول گئے تھے، لیکن اپنے نجی مطالعہ کے ذریعہ سے اُنھوں نے عربی، فارسی اور انگریزی میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اُردو شاعری میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی اور منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ روزی کمانے کی خاطر اصغر نے گونڈے میں عینکوں کی دُکان کھولی تھی اور وہ برائے چندے اردو مرکز، لاہور میں بھی ملازم رہے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے آخر ایام "ہندوستانی اکادمی، الہ آباد" میں اس کے مشہور سہ ماہی اُردو رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بسر ہوئے۔ اصغر ایک نہایت دیندار و متقی مسلمان تھے۔ وہ تصوّف کے شیدائی اور حضرت قاضی شاہ سید عبدالغنی منگلوری کے مرید تھے۔ اصغر عہدِ جدید کے بہترین غزل گو شعرا میں سے ایک ہیں۔ اُنھوں نے اپنے تغزّل سے اردو غزل کے تن مُردہ میں ایک تازہ روح پھونکی۔ اصغر کا کلام بہت کچھ غالب کے کلام سے ملتا جلتا ہے،

جس میں رجائیت و قنوطیت کے مابین نہایت عمدہ توازن پایا جاتا ہے۔ اصغر کے کلام کی خصوصیات اُن کی فلسفیانہ و صوفیانہ غزلیں ہیں، جن میں نہایت گہری جذباتیت اور پُراثر داخلیت ہے۔ اُن کا پیرایۂ بیان انوکھا ہے جس میں بڑا تیکھا پن ہے اور ان کے تغزّل کا انداز اُردو شاعری میں نایاب اور بالکل خاصے کی چیز ہے۔ سوائے حسرت موہانی کے اصغرؔ کی اس مخصوص فنکاری کا کوئی دوسرا اُردو شاعر حریف نہیں ہے۔ غالب کے اسلوب کی پیروی میں صرف فانی بدایونی اصغر کے معیار تک پہنچ سکے ہیں۔ اصغر کے دو دیوان نشاطِ رُوح، اور سرودِ زندگی، شائع ہو چکے ہیں۔ جن کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے اپنے اُردو نصاب میں داخل کر لیا تھا شعراء اور شاعری کی مذمت کرتے ہوئے افلاطون نے کہا تھا کہ "کسی قوم کے گیت اور شاعری اُس قوم کی تعمیر اخلاق کی عکاسی کرتے ہیں"۔ اِس طرح گویا افلاطون نے بالواسطہ طور پر ایک قوم کی ملّی تعمیر میں شاعری کی اہمیت کو تسلیم کیا تھا۔ اس لیے اصغر کی اُردو شاعری قوم کے جمالیاتی ذوق کے ارتقا کی مظہر ہے۔ اصغر ۱۹۳۶ء میں فوت ہوئے تھے۔ [ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، اصغر گونڈوی کی نشاطِ روح، نمبر ۱، جلد ۱۸ ص ۵۰۔۶۰۔ ماہنامہ 'نیرنگِ خیال، لاہور 'نشاطِ روح، از اقبال احمد سہیل، مئی ۱۹۲۶ء۔ ماہنامہ 'شاعر' آگرہ 'سرودِ زندگی' ستمبر ۱۹۳۶ء۔ ماہنامہ 'فاران'، الہ آباد 'سرودِ زندگی، اپریل ۱۹۳۵ء۔ ماہنامہ 'سہیل'، علی گڑھ، سالنامہ، 'سرودِ زندگی' ۱۹۳۶ء۔ ماہنامہ 'تاج'، لاہور، دسمبر ۱۹۳۷ء 'اصغر گونڈوی کی شاعری'۔ ماہنامہ 'نیرنگِ خیال'، لاہور 'اصغر کی شاعری'، از پروفیسر رشید احمد صدیقی، علی گڑھ یونیورسٹی، سالنامہ ۱۹۳۶ء]۔ اصغر کا نمونۂ کلام

ہوا کو موجِ شراب کر دے، فضا کو مست و خراب کر دے
یہ زندگی کو شباب کر دے، نظر تمہاری نظر نہیں ہے

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

خبر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اور بھی دُور ہو گئے آکے تیرے حضور میں

(۱۳)

شوکت علی خاں فانی بدایونی

فانی ۱۸۷۹ء میں قصبہ اسلام نگر (ضلع بدایوں، یوپی، انڈیا) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) میں فوت ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بدایوں میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور بریلی کالج سے ۱۹۰۱ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اُنھوں نے میور سینٹرل کالج الہ آباد میں قانون پڑھا اور ایل ایل بی کی ڈگری ۱۹۰۸ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے لی۔ اُنھوں نے بدایوں، بریلی، اٹاوہ، لکھنؤ اور آگرے میں

وکالت کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ اُنھیں وکالت کے پیشہ سے دلچسپی نہ تھی ۔ وہ اُردو اور فارسی شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے ۔ فانی کے والد محمد شجاعت علی خاں پولس انسپکٹر تھے، جو فانی کی شاعری میں دلچسپی کے مخالف تھے ۔ ۱۸۹۸ء تک فانی شوکت تخلص کرتے تھے لیکن اس کے بعد سے زندگی میں کسی سنگین حادثے کے باعث، فانی تخلص کرنے لگے ۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۷ء تک فانی شاعری سے دستکش رہے لیکن اس کے بعد سے پھر شاعری شروع کر دی ۔ اپنی بے پروائی کے باعث اُنھوں نے دو مرتبہ اپنا دیوان ضائع کیا ۔ اپنے بعد فانی نے دو بیٹے چھوڑے ۔ اُن کی واحد بیٹی ۱۹۳۲ء میں لڑکپن ہی میں فوت ہو گئی تھی ۔ ۱۹۳۲ء سے فانی چادر گھاٹ ہائی اسکول، حیدر آباد (دکن) کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے ۔ اپنے خانگی مصائب کے علاوہ، اپنی بیوی کی وفات نے فانی کو اسقدر صدمہ پہنچایا کہ وہ خود ۱۹۴۱ء میں فوت ہو گئے ۔ اُنھوں نے تین دیوان چھوڑے ہیں (۱) 'دیوانِ فانی'، جو ۱۹۲۰ء میں نقیب پریس بدایوں نے شائع کیا (۲) 'باقیاتِ فانی'، جو آگرہ پریس نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا، اور (۳) 'عرفانیاتِ فانی'، جو ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ۔ فانی نے اپنا دوسرا دیوان 'باقیاتِ فانی'، وزیرِ اعظم حیدر آباد (دکن) مہاراجہ سر کشن پرشاد کے نام منسوب کیا تھا ۔ فانی ایک فطری شاعر تھے ۔ وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے تھے ۔ حسرت اور اصغر کے بعد وہ عہدِ جدید کے بہترین غزل گو شاعر ہیں ۔ اُن کی غزلیں حسرت و یاس کے نمونے ہیں، اس طرح وہ 'مصوّرِ غم' اُردو شاعر ہیں ۔ اُن کی پوری شاعری غم و اندوہ اور حرماں نصیبی کی ترجمان ہے ۔

['مقدمہ باقیاتِ فانی'، از پروفیسر رشید احمد صدیقی، علی گڑھ یونیورسٹی صـ۳۳ ۔ ماہنامہ 'شاعر' آگرہ، جنوری ۱۹۴۴ء ۔ 'دیوانِ فانی'، نقیب پریس، بدایوں، ۱۹۲۰ء ۔ ماہنامہ 'ایشیا'، دہلی، فروری ۱۹۴۲ء 'فانی بدایونی'، از احتشام حسین ۔ ماہنامہ 'قوسِ قزح'، لاہور 'باقیاتِ فانی'، جون ۱۹۲۷ء 'مختصر تاریخ ادب اُردو'، از پروفیسر اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی 'فانی بدایونی'، ۱۹۳۵ء] ۔ فانی کا نمونۂ کلام

جینا نہیں ہے صبر کو رخصت کئے بغیر
کام اُن کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، اِن داموں تو سستی ہے

تم جانِ بخشے نوجوانِ مدعا کیوں ہو گئے ؟
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے ؟

یہ زندگی کی گھڑیاں تیری دھن میں خوب گذریں
میری عمر کیسے کٹتی، تیری یاد اگر نہ ہوتی !

(۱۴)

علی سکندر جگر مُرادآبادی

جگر مُرادآباد (روہیلکھنڈ، یوپی، انڈیا) میں ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں فوت ہوئے تھے۔ اُن کے والد مولوی علی نذر نذر، اُن کے چچا مولوی علی ظفر ظفر اور اُن کے دادا حافظ محمد نُور نور سب شاعر تھے۔ جگر کے چھوٹے بھائی علی مظفر دل بھی شاعر تھے۔ ان کے والد کے دیوان کا نام باغ نذر' تھا اور وہ خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جگر اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے، لیکن وہ فارسی بخوبی جانتے تھے، اور انھوں نے میٹرک تک جُوبلی اور مشن اسکول لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی۔ شاعری جگر کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ داغ دہلوی، تسلیم لکھنوی اور منشی حیات بخش رسا کے شروع میں شاگرد تھے لیکن بعد کو انھوں نے اپنی غزلیں اصلاح کے لیے کسی کو نہیں دکھائیں۔ جگر بھی عینکوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ مُرادآباد چھوڑنے کے بعد جگر مدت دراز تک آگرہ، گونڈہ، مین پوری، لکھنؤ، الہ آباد اور بھوپال میں مقیم رہے۔ آگرے کی ایک لڑکی سے اُن کی پہلی شادی ایک رومان کا نتیجہ تھی لیکن وہ جلد فوت ہوگئی۔ اُس وقت جگر پینے پلانے کے عادی تھے۔ اس کے بعد اُن کا رابطہ اصغر گونڈوی سے قائم ہوگیا، جنھوں نے جگر کو ترغیب دے کر مولانا سید قاضی عبدالغنی منگلوری کا مُرید کرادیا اور جگر کی شادی اپنی سالی سے کردی۔ اصغر سے قریبی رابطے کے باعث جگر کی کایا پلٹ ہوگئی، جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ جگر حُسن کے شیدائی تھے اور جمالیاتی دل و دماغ رکھتے تھے۔ جگر ایک فطری اُردو شاعر تھے اور ان کا شمار حسرت، اصغر اور فانی کے ساتھ دَورِ جدید کے بہترین غزل گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ یہ اُردو شاعری کا المیہ ہے کہ اُس کے مذکورہ بالا بہترین غزل گو شعرا فوت ہوچکے، جن کی جگہ اُسی پایہ کے غزل گو شعرا نے ابھی تک نہیں لی ہے۔ جگر کا پہلا دیوان اعظم گڑھ سے 'داغِ جگر' کے نام سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا جس پر دیباچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جگر کا دوسرا دیوان 'شعلۂ طور' کے نام سے مکتبۂ جامعہ، دہلی، نے شائع کیا تھا، جو میجر نواب زادہ محمد رشید الظفر خاں بھوپالی کے نام معنون کیا گیا ہے۔ جگر خالصتاً دُنیاوی و مادی محبت، حُسن و جوانی کے شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں نشہ آور و غنائی ہیں۔ جگر اپنی غزلیں نہایت مسحور کُن اندازِ ترنم سے پڑھا کرتے تھے، اور اُن کا یہ انداز بیحد مقبول و مشہور ہوا۔ [ماہنامہ 'یادگار'، لاہور 'جگر کی شاعری'، مئی ۱۹۲۳ء۔ ماہنامہ 'زمانہ'، کانپور 'شعلۂ طور' پر تبصرہ، فروری ۱۹۳۶ء۔ ماہنامہ 'ندیم'، گیا، نومبر ۱۹۳۷ء اور ماہنامہ 'کلیم' دہلی، اپریل ۱۹۳۷ء]۔ جگر کا نمونۂ کلام

دھڑکنے لگا دل ، نظر جھک گئی — کبھی اُن سے جب سامنا ہو گیا
سفاک چتونیں بھی ہیں ، قاتل نظر بھی ہے — کیا چیز ہو گئے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے ؟
نگاہوں سے چھپکر کہاں جایئے گا ! — جہاں جایئے گا ، ہمیں پایئے گا !
یاد ظالم کو تم اپنی روک لو — لوٹے لیتی ہے میری تنہائیاں

(۱۵)

ابوالفخر شیخ عاشق حسین سیماب اکبرآبادی

سیماب آگرے میں ۱۸۸۰ء میں پیدا اور ۱۹۵۱ء میں فوت ہوئے اور اُنہوں نے بذریعہ مُراسلت ۱۸۹۶ء میں داغ سے تلمذ حاصل کیا۔ وہ عربی ، فارسی اور انگریزی بخوبی جانتے تھے۔ سیماب اُردو شاعری کے اُستاد اور کامیاب اُردو صحافی تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اُنھوں نے ایک نہایت عمدہ ادبی اُردو رسالہ اپنے محبوب شاگرد ساغر نظامی کی 'برائے نام' ادارت میں 'پیمانہ' کے نام سے نکالا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں سیماب نے آگرے سے ایک ہفتہ وار اخبار 'تاج' کے نام سے نکالا۔ اس کے بعد اُنھوں نے ایک ادبی ماہنامہ 'کنول' کے نام سے اپنے بڑے بیٹے منظر صدیقی کی اور ماہنامہ 'شاعر' اپنے چھوٹے بیٹے اعجاز صدیقی کی زیر ادارت نکالا۔ سیماب ہی نے مشاعروں میں خطبۂ صدارت کی رسم ایجاد کی، جس کے لیے اُنھیں برِصغیر کے طول و عرض سے دعوتیں آیا کرتی تھیں۔ یہ صدارتی خطبات جو اُنھوں نے اور دوسروں نے دیئے ، اُردو ادب کی ترقی میں نہایت مددگار ثابت ہوئے۔ سیماب نے آگرے میں ایک دارالاشاعت 'قصر الادب' کے نام سے قائم کیا جہاں سے اُردو کی مفید کتابیں شائع ہوئیں۔ اُن کی اپنی تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

نیستان (سیماب کے ابتدائی ادبی اُردو کارناموں کی کُلیات) 'کارِ امروز' (اُن کی ابتدائی شاعری کا مجموعہ) 'کلیم عجم' (اُن کی غزلیات اور خطبات کا پہلا مجموعہ) 'پیامِ فردا' (سیماب کی نظموں کا دوسرا مجموعہ) 'توریتِ مشرق' (اُن کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ) 'آیات الادب' (سیماب کی اُردو رباعیات کا مجموعہ) 'شاہراہ' (عروض کی کتاب) 'مراۃ الغالب' (دیوانِ غالب کی ایک نئی شرح) اور 'رازِ عروض' (عروض کی دوسری کتاب) وغیرہ۔
سیماب کا انتقال قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں ہوا۔ سیماب کا نمونۂ کلام :۔

کہانی کہنے والے ہائے کیوں ذکرِ جوانی ہے — جوانی کی کہانی کیا، جوانی خود کہانی ہے
نہیں بنتی دلِ تنہا نشیں سے — کسی کو بھیج دے یارب کہیں سے
کہانی میری رُوداد جہاں معلوم ہوتی ہے — جو سُنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

آ اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا — شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو
وہی یورشِ شبِ تار ہے وہی بارشِ غمِ یار ہے — کوئی فرق ہو تو بتاؤں میں نہ قرار تھا نہ قرار ہے
دل ہے تو کسی کا اُسے کاشانہ بنا دے — کعبہ نہیں بنتا ہے تو بُت خانہ بنا دے
کہدو کہ بہار آئے تو بیکار نہ بیٹھے — دیوانہ بنے یا مجھے دیوانہ بنا دے
دیوانگیِ عشق بڑی چیز ہے سیمابؔ — یہ اُس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

(۱۶)

فردوسیِ ہند خان صاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھر (ہندوستانی پنجاب) میں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ اُنھیں اسکول کی تعلیم تو بس برائے نام ہی ملی، لیکن شاعری میں وہ ایک مشہور فارسی ٹیچر اور شاعر ملک الشعرا مولانا غلام قادر گرامی جالندھری کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں حفیظ نے ایک ادبی ماہنامہ 'اعجاز' نامی جالندھر سے مولانا گرامی کی زیرِ سرپرستی نکالا لیکن وہ پانچ اشاعتوں کے بعد ہی بند ہو گیا۔ اب حفیظ لاہور کو منتقل ہو گئے جہاں وہ ایک اور اُردو ماہنامہ 'شباب اُردو' کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہو گئے اور جہاں اُنھیں سر شیخ عبدالقادر کی سرپرستی نصیب ہو گئی۔ اس کے بعد حفیظ ماہنامہ 'ہزار داستان' لاہور کے مدیر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بالترتیب 'پھول' اور 'تہذیبِ نسواں' کے ایڈیٹر رہے۔ اُسی زمانے میں حفیظ کا رابطہ شمس العلما مولوی ممتاز علی، سید امتیاز علی تاج، مولانا عبدالمجید سالک اور پروفیسر بخاری 'پطرس' سے قائم ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں نواب صاحب خیر پور (سندھ) نے حفیظ کو اپنے ہاں بطور شاعرِ دربار تین سو روپے ماہوار مشاہرے پر آنے کی دعوت دی۔ مگر حفیظ زیادہ عرصے تک خیر پور میں نہ رہ سکے اور واپس لاہور چلے آئے۔ اُن کی نظم 'رقاصہ' اُسی زمانے میں کہی گئی تھی۔ خیر پور سے واپسی کے بعد حفیظ کے شاعرانہ کلام کا پہلا مجموعہ، جس میں اُن کی وہ تمام غزلیں نظمیں اور گیت شامل تھے، جو اُنھوں نے ۱۹۲۵ء تک کہے تھے 'نغمہ زار' کے نام سے شائع ہوا اور جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیے اس کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ سید احمد شاہ بخاری 'پطرس' نے اور دوسرے ایڈیشن کا پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا تھا۔ 'نغمہ زار' کے اب تک چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اُسی زمانے میں 'دارالاشاعت پنجاب، لاہور' نے حفیظ کی اُن نظموں اور گیتوں کو شائع کیا جو اُنھوں نے بچوں کے لیے اُنھی کی زبان اور ذہنیت کی مناسبت سے کہے تھے۔ اس مجموعہ کا نام 'بہار کے پھول' تھا، جس کا دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا تھا۔ حفیظ کی ویسی ہی دوسری کتاب 'پھول مالا' ہے جس کا دیباچہ

مولانا عبدالمجید سالک مدیر اُردو روزنامہ 'انقلاب' لاہور، نے لکھا ہے۔ بچوں کے لیے حفیظ کی تیسری کتاب تاریخی کہانیوں کا ایک منظوم مجموعہ ہے جس کا نام 'ہندوستان ہمارا' ہے اور جس کا دیباچہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے لکھا ہے۔ حفیظ کا تعلق اُردو شاعری کے اُس مدرسۂ فکر سے تھا جو عظمت اللہ خاں دہلوی کے نقطۂ نظر کی اشاعت کے بعد معرضِ وجود میں آیا۔ جدید اُردو شاعری کے اِس مخصوص اسکول کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ اُردو شاعری میں ہندی بحروں کو رائج کرنا چاہتا ہے۔ حفیظ پر علامہ اقبال کا بھی کافی اثر تھا۔ حفیظ نے 'انجمن حمایتِ اسلام، لاہور' کے ادبی آرگن کی بھی ادارت کی تھی جس کے بعد اُنھوں نے مشہور قدیم اُردو میگزین 'مخزن' کا دوبارہ اجرا کیا، لیکن وہ اس کے مالکوں سے تعاون نہ کر سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ 'مخزن' پھر بند ہو گیا۔ اُسی زمانے میں حفیظ نے اپنے سات مختصر افسانوں کا مجموعہ 'ہفت پیکر' کے نام سے شائع کیا جس کا تعارف سید امتیاز علی تاج نے لکھا۔

'نغمہ زار' کے بعد حفیظ نے اپنے معروف 'شاہنامۂ اسلام' کی تدوین شروع کر دی تھی ۱۹۲۸ء میں پہلی بار حیدرآباد (دکن) کے ایک جلسۂ عام میں جس کی صدارت خواجہ حسن نظامی نے کی تھی، حفیظ نے مسلسل دو گھنٹے تک 'شاہنامۂ اسلام' کے ابتدائی اشعار پڑھ کر سنائے اور خوب دادِ تحسین وصول کی۔ چند ماہ کے بعد اُنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے 'یونین ہال' میں زیرِ صدارت سید سجاد حیدر یلدرم، ایک ہی نشست میں مسلسل پانچ گھنٹوں تک 'شاہنامۂ اسلام' کے ابتدائی ایک ہزار اشعار پڑھ کر سنائے۔ ۱۹۲۹ء میں 'شاہنامہ' کی پہلی جلد شائع ہوئی جس میں غزوۂ بدر تک کے تاریخی کوائف کو دو ہزار اشعار میں منظوم کیا گیا ہے اور جس کا دیباچہ سر شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے۔ 'شاہنامۂ اسلام' کی پہلی جلد کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ان کامیابیوں کے بعد حفیظ نے اپنا گھر ماڈل ٹاؤن، لاہور میں بنایا جہاں وہ مستقلاً اقامت پذیر ہے۔ یہاں سے حفیظ نے 'کارزار' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں ایک اخبار نکالا، مگر اُسے دو سال کے بعد بہت نقصان اُٹھا کر بند کرنا پڑا۔ اُسی سال حفیظ کو نواب بہاولپور نے اپنے دربار میں طلب کیا۔ ۱۹۳۴ء میں 'شاہنامۂ اسلام' کی دوسری جلد شائع ہوئی جس میں غزوۂ اُحد تک محمول دو ہزار سے زاید اشعار ہیں اور جس کو سر شیخ عبدالقادر اور پروفیسر ڈاکٹر تاثیر نے متعارف کیا۔ اب حفیظ نے اپنے کلام کا دوسرا مجموعہ 'سوز و ساز' کے نام سے شائع کیا جس میں اُن کے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان میں کہے ہوئے اشعار ہیں جس کا دیباچہ پنڈت ہری چند اختر نے تحریر کیا ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے حفیظ کے اس مجموعہ کو 'یہ وقت کی بہترین اشاعت کے طور پر اپنا پہلا انعام عطا کیا۔ حفیظ کی نظمیں، 'زندگی'، اور 'آزادو وادی'، اور

ان کی بعض غزلیں صاف طور پر اقبال کے اسلوب سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت ہند نے حفیظ کو ان کی ادبی خدمات کے صلے کے طور پر 'خان صاحب' کا خطاب دیا۔ اُسی سال حفیظ نے نواب بہاولپور کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۹۳۶ء میں وہ ریاست ٹونک گئے جس کے نواب نے حفیظ کو ملک الشعراء حسان الملک بہادر کے خطابات سے نوازا۔ ۱۹۳۷ء میں اُن کو حیدر آباد (دکن) آنے کی دعوت دی گئی، جہاں نظام نے حفیظ کا 'شاہنامۂ اسلام' کو مکمل کرنے کے لیے، تین سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کیا۔ اس طرح حفیظ کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان ہوگیا۔ اُسی زمانے میں ایک عظیم مشاعرے میں اپنی مشہور نظم 'تصویر کشمیر' پڑھ کر سنانے کے لیے حفیظ سری نگر (کشمیر) گئے۔ اس نظم کا دیباچہ سر سید احمد خاں، بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پوتے سر راس مسعود نے لکھا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اپنے علاج کے لیے حفیظ لندن گئے۔ جیسے کہ علامہ اقبال کی آخر حصے کی شاعری کا موضوع 'اسلامی تہذیب' ہے، اسی طرح حفیظ کے 'شاہنامۂ اسلام' کا اسلوب بھی ہے، جس نے اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ افسوس کہ بروز منگل ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو لاہور کے ایک ہسپتال میں حفیظ کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔ حفیظ عصر جدید کے چوٹی کے اُردو شعرا میں تھے۔ [ماہنامہ 'نیرنگ خیال' لاہور، سالنامہ، جنوری ۱۹۳۹ء، 'حضرت حفیظ اور اُن کی ادبی زندگی' از ایم شفیع امرتسری۔ 'جدید اُردو شاعری' از پروفیسر عبدالقادر سروری، 'حفیظ جالندھری'، ص ۲۱۹-۲۲۴] حفیظ کا نمونۂ کلام:-

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے — تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے
رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں — دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے
عجز سے اور بڑھ گئی برہمیِ مزاجِ دوست — اب وہ کرے علاجِ دوست، جس کی سمجھ میں آسکے

نظم 'افرنگ کی دُنیا' (۱۹۳۸ء)۔ 'افرنگی عورت':-

بازار میں ہے گرمیِ بازار اُسی سے — آتے ہیں دُکانوں میں خریدار اُسی سے
سودا ہے یہی، چلتا ہے بیوپار اُسی سے — اشرفیوں کی جیبوں میں ہے جھنکار اُسی سے
ہر کوچہ و برزن میں ہے تشہیر اُسی کی — دیکھی در و دیوار پہ تصویر اُسی کی

(۱۷)

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

عبرت گورکھپوری کے فرزند، فراق الہ آباد یونیورسٹی (انڈیا) میں انگریزی کے پروفیسر اور درجۂ

اوّل کے اُردو شاعر اور نقاد تھے۔ وہ عہدِ جدید کے بہترین غزل گو شعرائیں سے تھے۔ اُن کا انتقال دہلی میں مارچ سنہ ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ اُن کا نمونۂ کلام :۔

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اِس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مُدتیں گذریں، تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھُول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں، نہ سمجھانے کی
زندگی اُچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

غرضکہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں، یا تجھے بھُلانے میں

تُو نہ چاہے تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں
تُو جو چاہے تو غمِ ہجر بھی آساں ہو جائے

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا
وہ ایک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں!
بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

ہیں شاد کام دید بھی، محرومِ دید بھی
ہوتا ہے جب وہ سامنے، کچھ سُوجھتا نہیں

اُبھر کر کھنچ چلا اوپر کو عالم
کوئی انگڑائیاں لیتا اُٹھا کیا؟

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تُونے تو خیر بیوفائی کی

عہدِ جدید کے متعدد دیگر اچھے شعراؑ کا، جن کا ذکر یہاں نہ ہو سکا، نمونۂ کلام آیندہ صفحات میں دیا گیا ہے۔ ان میں بعض معروف شعرا جان نثار اختؔر، آرزو لکھنوی، آسی الدنی، اثؔر لکھنوی، بیخود دہلوی، حلی اختر۔ اختؔر شیرانی متوفی سنہ ۱۹۴۸ء، پنڈت آنند نراین مُلاؔ، ثاقبؔ لکھنوی، مرزا رُسواؔ، نیرنگؔ انبالوی، بیدؔم وارثی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفؔی دہلوی، پنڈت ہری چند اختؔر، ناصؔر کاظمی، شبنؔم رومانی، جمیل جالبی، راغبؔ مُرادآبادی، مُنیرؔ نیازی، احمدؔ مشتاق، غالبؔ احمد، انجم اعظمی، عزیز حامد مدنی، ظفؔر اقبال، ابن انشا وغیرہ ہیں۔

(۱۸)

جان نثار اختؔر

گرلز کالج کی لاری :۔

ہے سڑکوں پہ پھر صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گرلز کالج کی لاری

گئی ہے ابھی گونجتی گنگناتی
زمانے کی رفتار کا گیت گاتی

ہوا کی طرح بانپتی سنسناتی
یونہی دوڑتی، جھومتی، ڈگمگاتی

اُچھلتی ہوئی سی، لچکتی ہوئی سی
چھلکتی ہوئی سی، مہکتی ہوئی سی

وہ سڑکوں پہ پھولوں کی دھاری سی بنتی
اِدھر سے اُدھر سے حسینوں کو چُنتی

جھلکتے وہ شبنموں میں شاداب چہرے
وہ کلیاں سی کھلتی ہوئی منہ اندھیرے

وہ ہاتھوں پہ ساری کے رنگیں کنارے
سحر سے نکلتی شفق کے اشارے

وہ بکھری سی زلفیں، وہ بکھری سی خوشبو
وہ چھایا ہوا منہ اندھیرے کا جادو

کسی کی جبیں صبح کی اوّلیں لو
کسی نرم چہرے پہ شبنم کا پرتو

(۱۹)

سید انور حسین آرزو لکھنوی

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا
بڑی چوٹ کھائی، ارے مار ڈالا !!

معصوم نظر کا بھولا پن للچا کے لبھانا کیا جانے
دل آپ نشانہ بنتا ہے، وہ تیر لگانا کیا جانے !

جس نالے سے دُنیا بیکل ہے، وہ جلتے دل کی مشعل ہے
جو پہلا لو کا خود نہ سہے، وہ آگ لگانا کیا جانے !

رہنے دو تسلی تم اپنی دُکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہونا ہے کیا، جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

لطفِ بہار کچھ نہیں، گو ہے وہی بہار
دل کیا اُجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا !!

وفا کا نقش ہے وہ نقش جو مٹ کر اُبھرتا ہے
جنہیں دل سے بُھلاؤ گے، وہ پیہم یاد آئیں گے

(۲۰)

عبدالباری آسی اُلدنی

عرصۂ حشر میں تھی بھیڑ بہت کچھ لیکن
مجھ کو پہچان کے چھوڑا مری رُسوائی نے

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چُن رہا ہوں میں

جینا پڑا اُمیدِ وفا پر تمام عمر
حالانکہ جان دینے میں کوئی زیاں نہ تھا

نقشِ ہستی بنی نظر تیری
نہ گئی یاد عمر بھر تیری

(۲۱)

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اِدھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا
پھر اُن کی طرف ایک نظر دیکھ لینا

یہاں تک ہو لے دل خراب محبت — کہ آنکھوں سے چھلکے شراب محبت

دُور سے گاہ گاہ ایک نگاہ — ن و بھی مدتِ مدید ہوئی

کہتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو — بھلے ہے ذ اپنی باتیں

جیسے اُنسے آنکھ لڑی ہے، آنکھوں میں اپنی خواب نہیں — اُس پہ سبیت یہ ہے ہمدم، صبر کی دل کو تاب نہیں

(۲۲)

سیّد وحیدالدین بیخود دہلوی

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں — تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

پھر بیوفا سے عہدِ وفا لے رہے ہیں ہم — بے اعتباریوں کا نہیں اعتبار آج

چوٹ کھا کر ہی تو انسان بنا کرتا ہے — دل تھا بیکار اگر درد نہ ہوتا پیدا

غافل ہے وہ مجھ سے مجھے کس طرح یقیں ہو — آنکھوں میں پھرا کرتا ہے ہر وقت کہیں ہو

(۲۳)

علی اختر اختر حیدرآبادی

دل میں اب تابِ ضبط بھی تو نہیں — آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں

دل کے اکثر فسانہ ہائے جمیل — آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

سلامت میرے دل میں گھر کرنے والے — میرے غم کو پابندہ تر کرنے والے

(۲۴)

اختر شیرانی ٹونکی

نہیں زندگی کو وفا ورنہ اختر — محبت سے دُنیا کو معمور کر دوں

جوانی ہو گر جاودانی تو یارب — تری سادہ دُنیا کو جنت بنا دیں

اُن رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے — دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے

میرے پردیسیو، سیکھی ہے یہ کس دیس کی ریت — جو تمہیں یاد کرے، تم نہ اُسے یاد کرو

عشق کا موسم، غم کی ہوائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
دل میں تمنا، لب پہ دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

(۲۵)

پنڈت آنند نراین مُلّا لکھنوی

میری اُلفت نے اُنھیں کر تو لیا ہے اپنا
اب فقط شرم کی سینہ سپری باقی ہے

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمہیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی، یاد تمہیں نہ آسکے

مہر وہ ہے خاک کے ذرّے جو کردے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نُور برسانے سے کیا

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

(۲۶)

مرزا رُسوا لکھنوی

سر سے ٹلتی ہیں شبِ غم کی بلائیں کیونکر
یا خُدا، ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر؟

مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ناز و کرشمہ کیا ہے
قتل کی اپنے بتا دوں تمہیں راہیں کیونکر؟

ضد بھی ایک وضع ہے، چاہت وہ نباہیں کیونکر
جو اُنھیں چاہے بھلا وہ اُسے چاہیں کیونکر؟

ہم نشینوں سے چُھپا کر تمہیں چاہیں کیونکر
چُھپ سکیں گی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر؟

(۲۷)

میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی

پھر ہوا ہم کو دل و دیں کا بچانا مشکل
نگہ ناز کا پھر ہم سے تقاضا ہے وہی

محبت اُٹھ گئی، کچھ رنگِ ہستی ہی نرالا ہے
وہ اگلی صحبتیں، وہ اگلے انساں یاد آتے ہیں

تری جفاؤں سے اُکتا کے دل کو سمجھایا
یہ نامراد نہ مانے تو کیا کرے کوئی

کہہ گئی دُور سے نگہِ شوق وہ پیام
الفاظ جس کو کہہ نہیں سکتے قریب سے

تیری توفیق یاور ہو تو سارے کام سیدھے ہیں
یہ ناکامی کا کھٹکا میری سعیِ رائیگاں تک ہے

تازہ کر جاتے ہو تم دل میں پرانی یادیں
خوابِ شیریں سے تمنا کو جگا جاتے ہو

(۲۸)

بیدم شاہ وارثی

ہم کو بھی پائمال کر عمر تیری دراز ہو
مست خرامِ ناز اِدھر مشقِ خرامِ ناز ہو

دردِ فراق، زخمِ جگر، داغ ہائے دل
آیا ہوں اُن کی بزم سے کیا کیا لیے ہوئے

بیگانگیٔ دل کے افسانے کو کیا کہیے
اپنا نہ ہوا اپنا، بیگانے کو کیا کہیے

تم جو چاہو تو میرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل میری آساں ہو جائے

میرے آغوشِ تصور سے نکلنا ہے محال
اب خیالِ یار تو سانچے میں ڈھل کر رہ گیا

مجھے شکوہ نہیں برباد رکھ، برباد رہنے دے
مگر لِلّٰہ میرے دل میں اپنی یاد رہنے دے

ترقی پسند اُردو شاعری

"ترقی پسندی" خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں، ادب یا آرٹ میں، دین سے انحراف اور روایات سے بغاوت کا دوسرا نام ہے، جسے زیادہ شائستہ الفاظ میں "حقیقت نگاری" بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے "ترقی پسند" عموماً سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہیں، جنکا یہ مشرب ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ "ترقی پسندی" میں عریانی وفحاشی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جن کا کھلا ثبوت جوشؔ ملیح آبادی کا کلام اور اُن کی "یادوں کی بارات" نیز منٹو کے افسانے اور رشید جہاں اور احمد علی کے "شعلے" اور "انگارے" ہیں۔ اِس شاعری کا ایک نمونہ "پریم پجاری" کے حسب ذیل اشعار ہیں جو "سچی کہانی" کے عنوان سے ماہنامہ "ساقی" دہلی میں جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکے ہیں:-

وہ شوقِ ناشکیب کی گستاخ دستیاں ۔۔۔ اُٹھنا وہ درمیان سے پردہ حجاب کا
وہ حسنِ شرمگیں کی ادائے سپردگی ۔۔۔ وہ ارتعاشِ کیف لبِ کامیاب کا
ارماں بھرے دلوں کی وہ خاموش گفتگو ۔۔۔ وہ ہمدگر فشار علاجِ اضطراب کا
وہ چاندنی سی چاکِ گریباں سے ضَوفگن ۔۔۔ وہ نوشِ لب میں کیف بہشتی شراب کا
چھایا ہوا حواس پہ وہ کیفِ بیخودی ۔۔۔ تکمیلِ ہر ہوس وہ تقاضا شباب کا

شاعری میں روایتی قواعدِ عروض، بحر اور قافیہ سے نجات حاصل کرنا بھی "ترقی پسندی" ہے اور نظم ونثر میں وہ کچھ کہہ ڈالنا بھی "حقیقت نگاری" ہے جن کا نہ کہنا پاسداریٔ اخلاق سے عبارت ہے۔

اُردو شاعری میں، ترقی پسندی وحقیقت نگاری کے سرخیل جوشؔ ملیح آبادی اور مجنوںؔ گورکھپوری ہیں۔ ان کے بعد یہ سہرا بالترتیب فیضؔ احمد فیضؔ، ن م راشدؔ، مجازؔ، مخدوم محی الدین، خدیجؔ احمد ندیم قاسمی اور احمد فرازؔ وغیرہ کے سر بندھا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی اس میدان کے مرد ہیں۔

(۱)

مجنوںؔ گورکھپوری

مجنوںؔ ۱۹۰۴ء میں گورکھپور (یو پی، انڈیا) میں پیدا ہوئے اور وہیں اُنھوں نے تعلیم پائی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھپور اور مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگریزی کے اُستاد

رہے ہیں۔ وہ پاکستان ۱۹۶۸ء میں آئے اور ۱۹۷۹ء تک کراچی یونیورسٹی سے بطور اعزازی پروفیسر ملحق رہے۔ گذشتہ کئی سال سے وہ کراچی میں خانہ نشیں اور علیل ہیں۔ اب (۱۹۸۳ء میں) وہ ۸۰ سال کی عمر کے بوڑھے اور ضعیف شخص ہیں۔ مجنوں چوٹی کے 'ترقی پسند' شاعر، ادیب و نقاد ہیں۔ 'ترقی پسند' تنقید نگاری میں وہ انتہا پسند ہیں، جس کا آغاز انہوں نے ۶۲ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں اپنے ایک مضمون سے کیا تھا اور جس نے اردو ادب میں 'ترقی پسندی' کے بیج بوئے۔ اردو ادب و شاعری میں 'ترقی پسندی' کی تحریک کو مستحکم ہونے میں اس کے بعد قریباً پندرہ سال لگے۔ فراق اور مہدی الافادی بھی مجنوں کے ہم وطن ہیں۔

(۲)

فیض احمد فیض

مجنوں گورکھپوری کی طرح فیض بھی چوٹی کے 'ترقی پسند' اردو شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لاہور ان کا مستقر رہے۔ وہ پاکستان میں معروف کمیونسٹ سمجھے جاتے ہیں جنہیں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ماسکو سے 'لینن پرائز' مل چکا ہے۔ انھیں غیر ملکی ممالک سے اردو پروفیسر کے دعوت نامے ملتے رہے ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے فیض ایک ماہر تعلیم اور صحافی ہیں۔ وہ عرصے تک بیرونِ ملک، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ میں مقیم رہے ہیں۔ اب ۱۹۸۳ء میں ان کی عمر ۷۲ سال ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر فیض کی نظم 'تنہائی' کے دو اشعار ذیل میں درج ہیں:

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار — لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گیا راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذر — اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ

فیض کا مجموعۂ کلام 'شہر یاراں' چنداں مقبول نہ ہوا۔ ان کا چھٹا مجموعۂ کلام 'میرے دل میرے مسافر' مکتبہ 'دانیال' کراچی نے شائع کیا۔ فیض سابقہ پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ' لاہور کے 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' وغیرہ روزناموں کے ایڈیٹر ان چیف رہ چکے ہیں اور وہ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ لاہور میں ان کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوا۔ وہ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء میں موضع کالا قادر ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔

(۳)

ن م راشد

'ترقی پسند' اردو شعراء کے دائرے میں راشد اردو شاعری میں 'بلینک ورس' کے حامی کی حیثیت

سے معروف ہیں۔ اُن سے پہلے اِس میدان میں طبا طبائی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری طبع آزمائی و خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔ لیکن اسے 'شاعری' کہنا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ راشد کی نظم 'خودکشی' کا نمونہ ذیل میں پیش ہے:۔

آتا جاتا ہوں بڑی مُدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ درخشاں لہو!
بُوئے مے میں بُوئے خوں اُلجھی ہوئی

نذر محمد راشد (ن م راشد) ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو لندن میں فوت ہوئے۔ حسب وصیت اُن کی نعش بغیر نماز جنازہ کے بجائے دفنانے کے نذرِ آتش کر دی گئی۔ فاعتبروا یا اُولوالابصار۔

(۴)

مجاز

اسرارالحق مجاز نے انقلاب و بغاوت کی رَو میں روایتی شاعری کو بالکل خیر باد نہیں کہا، کیونکہ ان کی شاعری کا آغاز غزل سے ہی ہوا تھا۔ اُن کا کلام رومان کے لیے وقف ہے۔ اُن کی ابتدائی غزلوں میں شاد کا اثر جھلکتا ہے۔ اُن کی نظم 'نوجوان خاتون سے'، کے دو اشعار بطور نمونہ یہاں درج ہیں:۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے تُو اِس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تُو نے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

(۵)

مخدوم محی الدّین

مخدوم محی الدین کی شاعری کو وہ آتش فشاں کی سی حدّت اور خون آشام انقلابی کیفیت کے باعث مُمیّز ہے۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ 'سُرخ سویرا' اس کا شاہد ہے۔ اُن کی بعض نہایت معروف نظمیں حسبِ ذیل ہیں
طُور، سجدہ، انتظار، وہ، لمحۂ رخصت، نامۂ حبیب، باغی، جنگ، مشرق، موت کا گیت،

مُسافر، سپاہی، جنگِ آزادی، بنگال، رُوحِ مغفور، اندھیرا اور انقلاب وغیرہ۔ ان کی نظم 'لمحۂ رخصت' کے دو اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج ہیں :۔

کچھ سُننے کی خواہش کانوں کو، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بیتاب تمنّا باہوں میں
وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک ادائے زُلیخائی
اندازِ تغافل تیور سے، رُسوائی کا ساماں آنکھوں میں

اُن کی نظم 'مشرق' کے دو اشعار :۔

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام   پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
ایک مُسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں   خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

(۶)

جذبی

جذبی کی نظمیں بھی غزلیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ فانی کی اُداسی و مایوسی سے مُتاثر نظر آتے ہیں۔ جذبی کا نمونۂ کلام :۔

خیالِ بے اثریٔ دعا معاذ اللہ
کہ ہاتھ اُٹھکے اُٹھے رہ گئے دعا کے لیے
مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنّا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا، اب خواہشِ دُنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنّا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے

['ترقی پسند ادب'، از عزیز احمد، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۱۰]

دورِ جدید میں 'ترقی پسند' اُردو شاعری کے ضمن میں ایک نئی اُپج 'نثری نظم' کے عنوان سے وجود میں آئی، جس پر انیس ناگی نے ایک کتاب 'نثری نظمیں' کے نام سے شائع کی۔ اس سلسلے میں کشور ناہید کا نام بھی لیا جاتا ہے، جن پر ناگی نے تنقید کی ہے۔ لیکن یہ اُپج چنداں مقبول نہ ہوئی۔

عہدِ جدید کی اُردو شاعری کی خصوصیات

دَورِ ہشتم

عہدِ جدید میں اُردو غزل کا دہلوی اسلوب ختم ہوگیا۔ داغ کا طرزِ کلام اُنھی تک محدود تھا کیونکہ اُن کے صدہا شاگردوں میں سے کوئی بھی اُن کا صحیح جانشیں ثابت نہ ہوا، گوکہ اُن کے بعض تلامذہ نے اپنے اُستاد کے اسلوبِ شاعری کو بڑی حد تک نبھانے کی کوشش کی۔ مگر امیر مینائی کے شاگردوں نے اپنے اُستاد کی طرزِ شاعری کو بہت کچھ سنبھالا دیا۔ ہرچند کہ جلال ایک لکھنوی شاعر تھے، لیکن اُنھوں نے دہلوی اسلوبِ شاعری اختیار کیا، داغ کا اِتباع نہیں۔ اس طرح لکھنوی طرز کی اُردو شاعری دہلوی طرز کی شاعری پر غالب آگئی۔ دورِ جدید میں، ریاض خیرآبادی کی بڑی شہرت ہوئی، جنہوں نے اپنے اُستاد امیر مینائی کا نام روشن کیا، لیکن داغ کے اپنے تلامذہ سے مقابلے میں ریاض نے داغ کے اسلوبِ شاعری کے اتباع میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ دورِ جدید میں شاہ عبدالعلیم آسی سکندرپوری نے صوفیانہ شاعری میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ اُردو شاعری کا یہ دورِ اصلاحات وانقلاب کا دَور ہے۔ اُردو غزل میں پہلا انقلاب ناسخ کے عہد میں وقوع پذیر ہوا اور دوسرا موجودہ بیسویں صدی عیسوی میں۔ دونوں انقلابات لکھنوی مدرسۂ فکر کے شعراء کے ہاتھوں ہوئے۔ جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی حقیقی غزل گو شعرا ہوئے۔ مغربی سائنس اور فلسفہ کے زیرِ اثر نیز انگریزی شاعری سے متاثر ہوکر، اُردو شاعری میں بھی نئی طرز کی غزل کے دَور کا آغاز ہوا، جو انسانی نفسیات کے راس کے فطری وحقیقی ماحول میں مطالعہ پر مبنی ہے ["دَورِ حاضر کی اُردو شاعری" از پروفیسر حامد حسن قادری، آگرہ، ماہنامہ "عالمگیر" لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۶ء]۔

اُردو شاعری کے جدید دَور میں ایک دلچسپ ادبی طبقہ وجود میں آیا، جن کے تخلص تو ہیں لیکن وہ شاعر نہیں ہیں، گوکہ وہ اپنے انھی تخلصوں کے باعث مشہور ہیں۔ مثلاً اُردو کے نہایت معروف صحافی میر بشارت حسین جالب دہلوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، اور نیاز فتح پوری ["شعرائے تخلص" از ارشد تھانوی، رسالہ "ندیم"،

ہفتہ وار بھوپال، یکم اگست ۱۹۳۷ء)۔ یہاں نیاز فتحپوری کا ایک شعر درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

چاہتے ہیں وہ کہ اظہارِ شکایت چھوڑ دوں
یعنی اُلفت چھوڑ دوں، اس کی حکایت چھوڑ دوں

(۱۴)

مرثیہ

رزمیہ شاعری

مرثیہ کا رواج قدیم عربی اور فارسی شاعری میں بھی تھا۔ لیکن اُردو شاعری میں مرثیہ اُس نظم سے مخصوص ہے جس میں امام حسینؓ، ان کے اعزّہ ورفقاء کے تاریخی جنگِ کربلا (عراق) میں ۶۸۰ء (۶۱ ہجری) میں سانحۂ شہادت کا ذکر ہو۔ اس معمول کے علاوہ اگر کوئی مرثیہ کہا گیا تو جس کے لیے وہ کہا گیا اُس شخص کا نام لینا ضروری ہوا، مثلاً 'مرثیۂ غالب'، وغیرہ۔ اس طرح مرثیہ کی صنف ماتم ونوحہ خوانی کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن چونکہ اُردو میں رزمیہ شاعری کا فقدان ہے اس لیے مرثیہ کے اُس حصے نے جس میں جنگ و تیغ زنی وغیرہ کا بیان ہو، اس کمی کو پورا کر دیا۔ قصیدہ و مرثیہ ایک طرح سے ایک ہی چیز ہیں، سوائے اس فرق کے کہ اول الذکر میں اپنے زندہ ممدوح کی مدح سرائی ہوتی ہے، جبکہ ثانی الذکر میں مرنے والے کے محاسن بیان ہوتے ہیں اور اس کی یاد میں ماتم ونوحہ خوانی ہوتی ہے۔ ابتدا میں مرثیہ محض ماتم ونوحہ خوانی کے لیے مخصوص تھا، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُردو مرثیہ میں بہت سی خارجی چیزیں بھی شامل ہوتی گئیں۔ مثلاً مناظر کشی، فطرت کی عکاسی اور موسم کا بیان وغیرہ۔ آخر میں جب مرثیہ نے مزید ترقی کی تو اس کے تعارفی اشعار کو 'چہرہ'، کہا گیا اور عام طور پر اُس مرثیہ کو جو 'مستزاد' کی بحر میں کہا جائے 'نوحہ'، کہا گیا، جبکہ غزل کی بحر میں اُسے 'سلام'، کہا گیا، جس میں 'مجرئی'، کو متواتر مخاطب کیا جاتا ہے۔

ہر چند کہ اس سے خود مرثیہ کو چنداں فائدہ نہ پہنچا، لیکن اس کے مضامین کی توسیع و تنوع نے اُردو شاعری میں اس نئی صنفِ مرثیہ کو اہمیت بخشی اور اُردو ادب میں اس کا مقام متعین کیا۔ مغربی ادب میں کسی شاعر کے محاسن کو اس میزان پر تولا جاتا ہے کہ اس کو زبان پر مکمل قدرت حاصل ہو اور وہ الفاظ کے وسعتِ استعمال و موزونیٔ اظہار پر قادر ہو۔ اِس پیمانے پر ہر چند کہ نظیر اکبر آبادی کا نام سرِ فہرست ہے، تاہم میر انیس اُن سے نہ صرف قادر الکلامی میں بلکہ تطہیر و نفاستِ بیان میں بھی بازی لے گئے ہیں۔ مرثیہ کو کسی خاص بحر میں محدود نہیں کیا گیا۔ پہلے بھی مرثیہ ہر بحر میں رائج رہا اور آج بھی ہے۔ مولانا حالی نے اپنے 'مرثیۂ غالب' کے

لیے چھوٹی بحر استعمال کی، بحر اس قدر مقبول ہوئی کہ احسن مارہروی نے داغ دہلوی پر اپنا مرثیہ اور راز رامپوری نے مولانا محمد علی جوہر رامپوری پر اپنا مرثیہ اسی چھوٹی بحر میں لکھا۔ ابتدائی مراثی ہر طرز، صنف و اسلوب میں لکھے گئے تھے، یعنی قصیدے، مثنوی، مثلث، مربع، مستزاد، مخمس اور مسدس وغیرہ کے طرز پر۔ لیکن پہلے پہل سودا دہلوی نے اور پھر میر ضمیر لکھنوی نے مرثیہ کو مسدس کے طرز پر قائم کر دیا۔ اُس وقت سے آج تک مرثیہ مسدس کے طرز پر ہی کہا جاتا ہے۔ اردو مرثیہ کے مسلّمہ حصوں کے نام یہ ہیں:۔ (۱) تمہید یا چہرہ، تعارف، جو دعا یا ثنا وغیرہ سے شروع ہوتا ہے۔ (۲) سراپا۔ (۳) واقعاتِ جنگ، جو مرثیہ کا خاص حصہ ہے۔ اور (۴) شہادت، جو ہر مرثیہ کا آخری حصہ ہوتا ہے۔

انیس و دبیر کے بعض بہترین مراثی مشہور بین الاقوامی رزمیہ نظموں کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں، مثلاً فردوسی کا 'شاہنامہ'، اور ہومر کا 'ایلیڈ' (ILIAD) وغیرہ۔ عہدِ حاضر تک، حفیظ جالندھری کے 'شاہنامہ اسلام' سے پہلے اردو شاعری میں، سوائے مرثیہ کے، رزمیہ شاعری کا وجود نہ تھا۔ ذیل میں اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا کے مختلف مدارج درج ہیں:۔

- مغل شہنشاہ جہانگیر کے عہدِ سلطنت میں دکن میں اردو مرثیہ نگاری کی بنیاد پڑی جبکہ شجاع الدین نوری نے دکنی اردو میں مرثیہ نویسی کا آغاز کیا، دکن میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی بادشاہتوں کے دور میں بھی مرثیے لکھے گئے۔ جس کے ثبوت میں ہاشم علی برہانپوری ہاشم اور کاظم کے مراثی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخر عہدِ سلطنت میں، تانا شاہ کے ہمعصر شاہ قلی خاں شاہی مرثیہ گو شاعر تھے۔ اولین مرثیہ گو شاعر غالباً نوری نہیں بلکہ محمد قلی قطب شاہ تھے۔
- اردو مرثیہ نگاری کا دوسرا دور دکن (جنوبی ہند) سے منتقل ہو کر دہلی پہنچا، جہاں ابتدائی مرثیہ گو شعرا میاں مسکین، گدا، سکندر، فضلی، امانی اور یکرنگ وغیرہ تھے۔
- یہ زمانہ اردو شاعری پر میر اور سودا کے تسلط کا تھا۔ مرزا علی ندیم نے بڑی حد تک مرثیہ کو سنوارا اور سودا نے مسدس کے طرز پر اپنے مرثیئے کہے جو آنے والے مرثیہ گو شعرا کا مستقل طرز بن گیا۔
- اب میر ضمیر اور میر خلیق کی مرثیہ گوئی کا دور آیا۔ اوّل الذکر مرزا دبیر کے اُستاد تھے اور ثانی الذکر میر انیس کے والد۔ میر ضمیر نے ہی مرثیہ کے لیے مسدس کا طرز مستقلاً اختیار کیا جو بالعموم رائج ہو گیا۔ میر ضمیر ہی نے سراپا کے اضافے کے ساتھ مرثیہ کو اردو شاعری کی ایک مستقل صنف بنا دیا۔
- یہ مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کے عروجِ کلام کا دور تھا، جس میں اوّل الذکر نے وہ ترقی کی کہ اس سے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔

ہمیں معلوم ہو گیا کہ اردو میں مرثیہ نگاری کا آغاز دکن سے ہوا اور کہ دکنی اردو میں اولین مرثیہ گو شعرا غالبًا شجاع الدین نوری اور محمد قلی قطب شاہ تھے۔ پروفیسر دتاسی Prof de Tassy نے بھی اردو شاعری کے اولین مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے نوری کے نام کی تصدیق کی ہے۔ لیکن اس نام کے دو مختلف اردو شعرا ہوئے ہیں۔ ایک نوری مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئے تھے اور دوسرے دکن کی بادشاہت گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں۔ ثانی الذکر نوری کا نام شجاع الدین تھا جو گجرات کے باشندے تھے لیکن حیدر آباد (دکن) میں رہتے تھے اور تانا شاہ کے وزیر سید مظفر کے بیٹے کے اتالیق تھے۔ انھی کو اردو مرثیہ کا بانی تصور کیا گیا ہے۔ لیکن شجاع الدین نوری پہلے مرثیہ گو شاعر نہیں تھے کیونکہ ان سے قریبًا نصف صدی پیشتر سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب ہو چکا تھا (۱۶۱۴ء میں) جس میں دکنی اردو میں مراثی موجود تھے۔ اس طرح نوری کو نہیں بلکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا اولین مرثیہ گو شاعر باور کرنا چاہیئے۔ ان کا نمونۂ کلام :-

دو جگ اِمامن دُکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے

تن رون کی لکڑیاں جل کر کرتی ہیں خواری وائے وائے

یک پوت کو دیتے زہر، یک پوت پر کھینچے خنجر

کافر کئے کیسے قہر یو زخم کاری وائے وائے

قطب شاہی عہد کے دوسرے مرثیہ گو شاعر شاہ قلی خاں شاہی تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر زور کے مطابق شاہی کے دو مرثیے ایڈنبرا یونیورسٹی (برطانیہ) کی لائبریری میں موجود ہیں۔ صاحب تذکرۂ اردوئے قدیم نے شاہی کے متعلق صرف یہ ایک فقرہ لکھا ہے کہ اُن کے "مرثیے اچھے ہیں"۔ نساخ اور میر حسن دونوں نے اپنے تذکروں میں شاہی کا حوالہ دیا ہے۔ شاہی حیدر آباد (دکن) میں رہتے تھے اور قطب شاہ کی فوج میں بھرتی تھے۔ اپنی زندگی کے آخر میں وہ تانا شاہ کے مصاحب ہو گئے تھے۔

مرثیہ گوئی کی ترقی کے لیے عادل شاہی دورِ حکومت زیادہ اہم ہے کیونکہ وہ حکمران بذاتِ خود اردو شاعری کی اس صنف کی سرپرستی کرتے تھے۔ محمد عادل شاہ شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے جبکہ علی عادل شاہ خود شاعر تھے اور شاہی تخلص کرتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری کے متذکرہ بالا دو مرثیے جو شاہی کے زیرِ تخلص وہاں موجود ہیں یا تو علی عادل شاہ شاہی کے ہیں یا ان میں سے ایک تو قطب شاہی عہد کے شاہی کا ہے اور دوسرا علی عادل شاہ کے عہد کے شاہی کا۔

اُس زمانے کا دکنی اردو کا ایک اور اہم مرثیہ گو شاعر مرزا بیجاپوری تھا جو علی عادل شاہ ثانی کا

معاصر تھا۔ اس کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

الوداع اے الوداع، شاہِ شہیداں الوداع　　الوداع ابنِ علیؓ، دو جگ کے سلطاں الوداع
یہی نہ تنہا لباس نیلا ہے سب محباں کے تن میں غم ہیں
سیاہ پھیرا ہے پتلیوں نے ازل سوں جگ کے نین میں غم ہیں

مرزا کے معاصرین میں ایک اور معروف مرثیہ گو شاعر سید میراں ہاشمی بیجاپوری تھے جو ایک دیوان اور مثنوی 'یوسف زلیخا' کے مصنف تھے۔ ان کا انتقال ۱۶۸۸ء یا ۱۶۹۷ء میں ہوا تھا۔ مرزا اور ہاشمی کے ایک اور ہمعصر مرثیہ گو شاعر گلبرگہ اور بیجاپور کے سیوا تھے، جنھوں نے ۱۶۸۱ء میں واقعاتِ کربلا پر مبنی ایک مکمل کتاب 'روضۃ الشہدا' از مولانا کمال الدین حسین الواعظ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔

۱۶۸۶ء میں بیجاپور کی عادل شاہی بادشاہت کا اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈے کی قطب شاہی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ دکن (ہندوستان) کی ان مسلمان بادشاہتوں کے خاتمے کے بعد بھی وہاں اچھے مرثیہ گو شعراء ہوئے، مثلاً ذوقی، بحری اور احمد وغیرہ۔ ذوقی غالباً ۱۶۹۸ء میں فوت ہوئے۔ وہ خالصتاً ایک مذہبی شاعر تھے جنھوں نے رسول کریمؐ پر مرثیہ کہا تھا۔ ان کا نمونۂ کلام:۔

اے شمع بزمِ مرتضیٰؓ گھر آج آتے کیوں نہیں؟　　تاریک ہے تم بن جہاں، جلوہ دکھاتے کیوں نہیں؟
وہ شمع بزمِ مصطفیٰؐ بادِ اجل سوں گل ہوا　　سب سوز دل سوں تن سدا یاراں جلاتے کیوں نہیں!

اُسی زمانے کے ایک اور شاعر قاضی محمود بحری تھے، جو علی عادل شاہ کے درباری شاعر اور ایک دیوان اور مثنوی 'من لگن' کے مصنف تھے۔ غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ ان کے دیوان میں چار مرثیے بھی ہیں۔ اُن کا نمونۂ کلام:۔

جب شاہ کے وجودِ مبارک پہ غم ہوا　　تب سب جہاں تے حرفِ خوشی کا عدم ہوا
بحری مدام شاہ کے ماتم میں یوں گلے　　جوں چاند آسمان پہ گل گل کے کم ہوا

بحری، ذوقی اور احمد کے بعد ہمیں سید محمد فیاض ولی ویلوری کا نام ملتا ہے۔ مُلا باقر آگاہ نے اپنی تصنیف 'مرأۃ الخیال' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ 'ولی ویلوری شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں زندہ تھے اور ایک امیر حراست خاں کے ملازم تھے۔ وہ اپنے 'قصۂ رتن پدم' کے اور 'روضۃ الشہدا' کے ترجمہ کے باعث مشہور ہیں، جو بمبئی سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ وہ ۱۷۰۳ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں دس ابواب ہیں جن میں رسولِ کریمؐ کے وصال سے لے کر امام حسینؓ کی شہادت تک کا ذکر ہے۔

ولیؔ دکنی کے بعد ہم ایسے دکنی مرثیہ گو شعرائے سے متعارف ہوتے ہیں جو یا تو ان کے معاصر تھے یا شاگرد۔ ان کے مراثی اپنے پیش رَو شعرائے سے کہیں بہتر تھے۔ ان میں بہترین شاعر اشرفؔ تھے۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی نے اپنی تصنیف 'گلشن گفتار' میں ان کے متعلق اس طرح لکھا ہے کہ "محمد اشرف اشرفؔ تخلص، گجراتی، بلا واسطہ شاگردِ ولی محمد"۔ شفیقؔ نے بھی اپنے تذکرہ 'چمنستانِ شعرأ' میں لکھا ہے کہ 'اشرفؔ ولی کے ہمعصر تھے۔ ولیؔ نے اشرفؔ کے ایک شعر کی تضمین کی تھی۔ اشرفؔ ایک مثنوی 'جنگ نامہ' کے بھی مصنف تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی ایڈنبرا یونیورسٹی سے مرتب کردہ 'بیاض' میں اشرفؔ کے تیرہ مرثیوں کا حوالہ دیا ہے، جن میں ۱۴۰ اشعار ہیں۔ اشرفؔ کے ایک مرثیہ میں امام حسینؓ کی بیوہ شہر بانو اس طرح کہتی ہیں :۔

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا؟ کہاں ہے وہ حسین ابنِ علیؓ صفدر شکن میرا؟
اگن سوں ماتمِ شاہ کے جلا ہے تن بدن میرا برنگِ برقِ خرمن سوزِ دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بسکہ تیرِ ماتمِ شاہ دل منے کاری شہیدِ کربلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا

'اردو شہ پارے' میں ولیؔ کے ایک اور شاگرد رضیؔ کا ذکر ہے۔ 'تذکرۂ گلشنِ گفتار' میں ان کے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے، "محمد رضی رضیؔ تخلص، نیز متوطن احمد آباد، از شاگردانِ رشیدِ ولی محمد، ہم در آں جوابِ ریختہ محمد اشرفؔ مذکور موزوں ساختہ"۔ رضیؔ کے مرثیہ کا نمونہ :۔

تم سوں ہے بیقرار میرا دل دُکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشنِ غم میں ہے شہیداں کے لالہؔ دا غدار میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جب سینے تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل

'شہ پارے' میں ایک اور مرثیہ گو شاعر امامیؔ (۱۷۲۵ء) کا حوالہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ان کے مراثی کے اسلوب اور طرزِ بیان کی تعریف کی ہے۔ امامیؔ سے پہلے مرثیے رباعی کے انداز میں نہیں کیے گئے تھے۔ امامیؔ کے مرثیہ کا نمونہ :۔

کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج
اِس غم سوں مومناں کوں ہوا پیچ و تاب آج گویا علیؓ کے گھر کا کھلا غم کا باب آج

رضیؔ اور امامیؔ کے معاصرین میں غلامیؔ (۱۷۲۵ء) بھی تھے۔ ان کے مراثی بھی رباعی کی صنف میں ہیں۔ غلامیؔ کے کلام کا نمونہ :۔

بانو پہ کربلا میں کیسا دُکھ پڑا ہے گودوں میں پیارا اصغر بن دودھ مر چلا ہے

ہو رانڈ بیٹھی بیٹی ، داماد مر چکا ہے   سر کا چَتر بھی ڈھلتا کوئی دم کو آرہا ہے

اُسی زمانے کے ایک اور دکنی مرثیہ گو شاعر قادر تھے۔ ان کا نمونۂ کلام :۔

ہوا شہرہ محرم میں یو غم ہے شاہِ عالی کا !

کہ ہے فرزند پیارا وہ دونوں عالم کے والی کا

چھوپا ہے دین کا شہرہ کہ جس کے سوگ سوں جگ پر

فلک پر ملک ہیں تانے شامیانہ رات کالی کا

اُس دَور کے ایک اور دکنی مرثیہ گو شاعر کاظم تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام :۔

گلزارِ احمدی پہ چلی صرصرِ خزاں   کانٹوں پر سو گزار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں

ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں   بیدل صنوبراں کی خبر لو علیؑ ولی

اُسی زمانے کے ایک اور اچھے دکنی مرثیہ گو شاعر سیدن تھے، جن کے دو مرثیے ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اُن کا طرزِ کلام :۔

ماہِ محرم میں دیکھو ہر چندا مالی آئیا

تارے گگن کے گوُندکے سہرا جو شاہ کوں لائیا

کنگن ستم کا باندکر رو کیہ کا اُوٹنا کوں لگا

حیرت کی چوکی کے اوپر آنجھاواں سے تن نہلائیا

ولی کے زمانے میں، زبان کے دو اسالیب رائج تھے۔ وہ شعرائے دکن، جو ولی کے طرزِ کلام سے متاثر تھے، ایسی شاعری کرتے تھے جو دکنی سے زیادہ اُردو تھی۔ دیگر دکنی شعرا اپنی مقامی زبان و محاورات استعمال کرتے تھے۔ ہاشم علی برہانپوری نے اُس عہد کے دو مزید دکنی مرثیہ گو شعرا کی نشاندہی کی ہے، یعنی رُوحی اور نظر۔ "شہ پارے" میں ان دونوں کے مراثی موجود ہیں۔ ایڈنبرا یونیورسٹی میں رُوحی کے پانچ مراثی محفوظ ہیں جن میں ۷۹ اشعار ہیں۔ رُوحی کے مراثی کا نمونہ :۔

آج غمناک ہیں چمن کے گُل   بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گُل

غمزدہ، سینہ داغ، حیراں ہیں   نرگس و لالہ یاسمن کے گُل

نظر کا نمونۂ کلام :۔

یاراں ہزار حیف، رسولِ خداؐ نہیں   اور فاطمہؓ، علیؓ و حسنؓ مجتبیٰ نہیں

تنہا حسینؑ رَن میں، کوئی آشنا نہیں   بازو نہیں، رفیق نہیں، دلربا نہیں

ہاشم علی بُرہانپوری اُردو مرثیہ نگاری کے اوّلین عہد کے آخری اور نہایت پُرگو شاعر تھے، جو ولی کے ہمعصر تھے۔ ان کے مراثی کے مجموعہ کا نام 'دیوانِ حسینی' ہے، جس میں ۲۴۰ مراثی ہیں۔ ان کا نمونۂ کلام :-

دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین ۔۔ گلوہ سیں اُٹھکے رن چلا تب کہی دو طعن

تم بِن رہے گا ہائے یہ سُونا بھوَن میرا ۔۔ مت چھوڑ کر سدھار و تم اس حال میں ہمن

اس وقت تک مرثیہ میں بڑی اصلاح ہو چکی تھی۔ عکاسیٔ جذبات، کردار نگاری، اثر اندازی و داخلیت اس اصلاح کے بعض نمایاں پہلو ہیں، جن کی بُنیاد پر شمالی ہند میں بعدازاں سوؔدا، میرؔ اور سکندرؔ نے اپنی مرثیہ گوئی کی عمارت تعمیر کی۔ بعد کو ضمیرؔ، خلیقؔ اور دلگیرؔ نے اس عمارت کو بلند تر کیا اور آخر میں انیسؔ اور دبیرؔ نے اس کو اُن بلندیوں تک پہنچا دیا جن سے اوپر جانا ناممکن ہو گیا۔ عبدالغفور خاں نسّاخ نے اپنے 'تذکرۂ سخنِ شعرا' میں ندیم تخلص کے چھ شعرا کا حوالہ دیا ہے، جن میں سے دو میرؔ اور سوؔدا کے ہمعصر تھے۔ ان میں سے ایک کا نام مرزا علی تھا اور دوسرے کا شیخ علی جو مرثیہ گو بھی تھے۔

محمد قُلی قطب شاہ کے وقت سے لیکر ہاشمؔ کے زمانے تک، قریباً ۱۵۰ سال کی مدت کے دوران' کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ دکن میں مرثیہ گوئی نہ ہوئی ہو۔ مگر یہ ابتدائی اُردو مراثی محض مذہبی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ قُلی قطب شاہ کے بعد اُردو مراثی میں مذہبیت کے غلبہ کا عنصر پوری ایک صدی تک جاری و ساری رہا، جس کی قاضی محمود بحریؔ کے چار مرثیوں سے توثیق ہوتی ہے۔ لیکن بحریؔ کے بعد مرثیہ کے مضامین میں توسیع ہوتی گئی، جیسا کہ عُزلتؔ کہتے ہیں ؎

خام مضموں مرثیہ کہنے سوں چُپ رہنا بھلا
پُختہ درد آمیز عُزلتؔ بت تُوں احوالات بول

اس کے بعد دیگر شعرا نے بھی عُزلتؔ کی پیروی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرثیہ میں ہر طرح کا مضمون نظم ہونے لگا اور وہ بتدریج اُردو شاعری و ادب کی ایک اہم صنف بن گیا۔ دکن میں قُلی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر بحریؔ کے عہد تک مراثی عام طور پر غزل کی طرز پر کہے جاتے تھے۔ چنانچہ قُلی قطب شاہؔ، مرزاؔ، ذوقیؔ اور بحریؔ سب کے مرثیے غزل ہی کے طرز پر ہیں۔ لیکن بحریؔ کے بعد جو مرثیے لکھے گئے وہ 'مسلسل غزل' کی طرز پر تھے۔ چنانچہ اشرفؔ، رضیؔ، سیدنؔ اور رُوحیؔ وغیرہ کے مراثی مؤخرالذکر طرز پر کہے گئے تھے۔ ابتدائی اُردو مراثی کے دوسرے دَور میں، غزل کی طرز کی جگہ چار مصرعہ والا طرز رائج ہوا۔ امامیؔ، غلامیؔ، رضاؔ، قادرؔ، کاظمؔ اور ہاشمؔ وغیرہ نے اپنے مراثی اس جدید طرز پر کہے ہیں۔ دکن میں ابتدائی دَور کے پہلے حصے میں اُردو مراثی میں کردار نگاری سرے سے مفقود تھی۔ مزید برآں چونکہ ابتدائی اُردو مراثی محض بیانیہ تھے،

ان میں نہ تو مکالمے تھے اور نہ حقیقت نگاری۔ لیکن بعد کو جو مرثیے لکھے گئے ان میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ان ابتدائی مراثی میں داخلیت کا بھی فقدان ہے۔ بعد کو میر ضمیر نے اردو مرثیہ میں بہت سی نئی چیزیں داخل کردیں جنہیں عام مقبولیت حاصل ہوگئی اور وہ مستقل طور پر اختیار کرلی گئیں۔ موجودہ اردو مرثیہ کے آٹھ اجزا ہوتے ہیں :۔

(۱) چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶) جنگ (۷) شہادت اور (۸) بین۔ مذکورہ بالا اجزائے مرثیہ کا اہتمام میر ضمیر کے ہی زمانے سے ہوا تھا۔ مگر ایک خاص بات جو ابتدائی مرثیہ گو شعرا کو بعد کے مرثیہ گویوں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ابتدائی مرثیہ گو شعرائے اس مبالغہ سے احتراز کیا جس کی سرحد جھوٹ سے ملتی ہے، لیکن ان کے برعکس بعد کے، بالخصوص لکھنوی، مرثیہ گو شعرائے نے زبان، جذبات اور تخیلات پر واقعات کو قربان کردیا۔

مسلّمہ و معروف مرثیہ گو شعراء کے علاوہ بعض مشہور غزل گو شعراء نے بھی مراثی کہے ہیں، مثلاً مرزا غالب نے زین العابدین خاں عارف اور اپنی محبوبہ کے غم میں مرثیے کہے۔ اسی طرح مومن نے بھی اپنی محبوبہ کا ایک طویل مرثیہ کہا۔ ان کے بعد متاخرین میں سے داغ، امیر اور جلال کسی نے بھی مرثیہ نہ کہا۔ عہد جدید کے شروع میں ریاض خیر آبادی نے اپنے جوان بیٹے کا مرثیہ کہا۔ مولانا حالی کا مرزا غالب پر بے مثال مرثیہ اردو ادب میں ایک کلاسیکی چیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا شبلی نے بھی اپنے بھائی کا مرثیہ لکھا تھا۔ منشی نوبت رائے نظر نے اپنے بیٹے کی موت پر جو مرثیہ کہا تھا وہ بہت مشہور ہے :۔

ہزار ناز سے اس لخت دل کو پالا تھا　　کبھی نہ دھوپ میں باہر اسے نکالا تھا
اسی سے خانۂ تاریک میں اُجالا تھا　　قمر تھا یہ تو نظر اس قمر کا ہالا تھا
مجھے بھی دفن کرو اسکے ساتھ تربت میں　　یہ کس طرح سے اکیلا رہے گا غربت میں!

دورِ جدید میں، اثر، آشفتہ اور شاعر نے نہایت عمدہ مرثیے لکھے ہیں اور چکبست کا مرثیہ تو اردو شاعری میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد، اردو شاعری میں بھی زبردست انقلاب رونما ہوا۔ شہر آشوب اور واسوخت لکھے گئے جن کی آخر میں مراثی نے جگہ لے لی۔ ذیل میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی کے نمونے تبرکاً دیئے جاتے ہیں۔ میر انیس :۔

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح　　ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح　　ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

نقارہ وغا پہ لگی چوب یک بیک　　اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شاہ پُور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک　　قرنا پھُنکی کہ گونج اُٹھا دشت دُور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

مرزا دبیرؔ:-

باہر نیام سے سرِ تیغ رواں ہوا　　یا آستیں سے ید بیضا عیاں ہوا
اژدر نکل کے غار سے شعلہ فشاں ہوا　　بے پردہ قہرِ خسروِ کون و مکاں ہوا
جوہر نہ تھے وہ تیغِ شہِ خوش خصال میں
دن کو چمک رہے تھے ستارے ہلال میں

["مقدمۂ شعر و شاعری"، ص ۱۹۸-۲۱۳ ؛ ماہنامہ "کنول"، آگرہ، سالنامہ جنوری ۱۹۳۷ء، "تنقیدِ نظم اُردو" از پروفیسر حامد حسن قادری۔ "اُردوئے قدیم" از حکیم شمس اللہ قادری۔ "دکن میں اُردو" از نصیر الدین ہاشمی۔ سہ ماہی رسالۂ اُردو، جلد اول ۱۹۲۲ء مضمون از مولوی عبدالحق۔ "تذکرۂ شعرائے اُردو" میر حسنؔ، ص ۱۲۴۔ "اُردو شہ پارے"، از پروفیسر زورؔ۔ "اُردو کے ابتدائی مرثیے اور ان کا ارتقا" از سید وقار عظیم ماہنامہ "ہمایوں"، لاہور، فروری۔مارچ ۱۹۳۴ء۔ ماہنامہ "ہمایوں"، لاہور، جولائی ۱۹۳۶ء۔ ماہنامہ "ندیم"، بھوپال، جولائی ۱۹۳۷ء۔ "لکھنوی اسکول کی شاعری"، از ناظر کاکوروی۔ "شعر الہند"، جلد دوم، باب اول و دوم "مرثیہ"، ص ۹۳-۱۰۰ ؛ ص ۹۸-۲۵۴۔ "تذکرۂ قدرت اللہ شوقؔ"۔ "دریائے لطافت"، ص ۳۲۔ "تذکرۂ گلشنِ ہند" ص ۳۷]

(۱۴)

قصیدہ

قصیدہ اُردو شاعری کی وہ صنف ہے جس میں کسی کی مدح سرائی ہوتی ہے۔ یہ نظم اُردو ادب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ لیکن تعداد کے لحاظ سے اُردو قصائد عربی اور فارسی سے نسبتاً کم ہیں۔ علاوہ ازیں اُردو قصیدے کا اس کے پیروؤں کے لیے کوئی اصُول بھی مُرتب نہیں ہوا۔ صرف دو اُردو شعراء سوداؔ اور ذوقؔ نے پہلے پہل ایرانی قصیدہ گویوں کے طرز پر طبع آزمائی کی۔ اسلوب کے لحاظ سے قصیدہ غزل کی مانند ہو تو ہو، لیکن نفس مضمون کے لحاظ سے یہ اُردو شاعری کی ایک قطعی علیٰحدہ صنف ہے۔ غزل کی طرح سے قصیدہ بھی مطلع سے شروع ہوتا ہے، جس کے دونوں مصرعے قافیہ بند ہوتے ہیں۔ غزل ہی کی مانند اس کے بقیہ اشعار کا ہر مصرعۂ ثانی قافیہ بند ہوتا ہے۔ قصائد دو طرح کے ہوتے ہیں:۔ (۱) خطابیہ، جس میں عرضِ مُدعا شروع سے ہی کیا جاتا ہے' اور (۲) تمہیدیہ، جس میں پہلے تمہید اور پھر مدعا بیان ہوتا ہے۔ اس تمہید کو تشبیب اور شیب بھی کہتے ہیں۔ قصائد بہاریہ ہوتے ہیں نیز عشقیہ اور عزمیہ۔ بہاریہ قصائد کو مجدّدیہ اور مکابرہ بھی کہا گیا ہے۔ عشقیہ اور عزمیہ قصائد میں دعا اور مقطع کے علاوہ' ان کا اہم ترین حصّہ حسنِ طلب یا مُدعا ہوتا ہے۔

عام طور پر اُردو میں مدحیہ اور تمہیدیہ قصائد ہوتے ہیں۔ ایسے قصائد کے یہ اجزا ہوتے ہیں: (۱) تشبیب (۲) گُریز، جس کو تخلیص یا رُجوع (یعنی قصیدہ کے اصل مطلب۔ مدح۔ کا بیان) بھی کہا جاتا ہے۔ (۳) مُدعا یعنی مدح، اور (۴) خاتمہ، جس میں دعا شامل ہے۔ اگر یہ دعا مشروط ہو تو ایسے قصیدے کو شرطیہ کہتے ہیں۔ اگر قصیدہ کسی کی تعریف میں ہو تو وہ مدحیہ کہلاتا ہے اور اگر وہ قصیدہ گو کی اپنی شان کے اظہار کے طور پر کہا گیا ہو تو اسے فخریہ کہتے ہیں۔ قصیدے کی یہ تمام مصطلحات عربی اور فارسی قصائد سے مستعار لی گئی ہیں۔ قصیدہ کسی عظیم مقصد کے لیے کہا جاتا ہے' وہ طویل بھی ہوتا ہے اور مسلسل بھی۔ خارجی بھی ہوتا ہے اور داخلی بھی۔ اس کی زبان اور طرزِ اظہار دونوں بلند بانگ ہوتے ہیں، لیکن سادہ اور مؤثر۔ قصیدہ گوئی سے شاعر کی ادبی صلاحیتوں کا اچھا خاصا امتحان ہو جاتا ہے۔

اُردو قصیدے کی تاریخ:۔ پہلا دَور۔ اُردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی قصیدہ گوئی بھی

شروع ہو گئی تھی۔ سترھویں صدی کے شروع میں شاہِ گولکنڈہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے دکنی اردو میں قصاید کہے۔ دیگر دکنی شعراء نصرتی وغیرہ نے بھی قصیدے لکھے۔ لیکن وہ مقامی دکنی زبان کی کثرتِ استعمال کے باعث اردو کے لیے چنداں اہم نہیں۔

دوسرا دور:۔ اس دور کے بہترین قصیدہ گو شاعر شمالی ہند میں سوداؔ تھے، جنھوں نے بے شمار قصاید حمدِ باری تعالیٰ، نعتِ رسول مقبولؐ، ابتدائی مشاہیرِ اسلام کی ثنا میں، اپنے ممدوحین کی مدح میں لکھے، نیز ہجو و شہر آشوب وغیرہ۔ مرزا سوداؔ کے قصاید ادبی اعتبار سے ہر طرح سے مکمل ہیں۔ سوداؔ کے بعد مصحفیؔ اور انشاؔ نے بھی قصاید لکھے۔ لیکن سوداؔ کے بعد اردو میں بہترین قصیدہ گوئی ذوقؔ دہلوی نے کی۔ ان کے معاصرین، مومنؔ اور غالبؔ نے بھی بعض اچھے قصاید لکھے۔

تیسرا دور:۔ یہ زمانہ لکھنؤ اسکول کے قصیدہ گو شعراء کا تھا جن میں زیادہ معروف منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی، اور جلالؔ لکھنوی تھے، جنھوں نے نہایت عمدہ قصاید لکھے۔ داغؔ دہلوی نے بھی قصیدہ گوئی کی۔ لیکن اس دور کے بہترین قصیدہ گو شاعر محسنؔ کاکوروی تھے، جو اپنی نعت گوئی کے باعث مشہور ہیں۔

چوتھا دور:۔ قصیدہ گوئی کے اس آخری عہد میں اس صنف کا زوال شروع ہوا کیونکہ بیسویں صدی کے تقاضے اس صنف کے احیا و ارتقا کے لیے سازگار ثابت نہ ہوئے۔ بہ ایں ہمہ بعض شعرائے اردو مثلاً عزیزؔ لکھنوی اور نجمؔ اکبر آبادی وغیرہ نے ائمۂ اہلِ تشیع کی شان میں قصاید لکھے لیکن وہ چنداں مقبول نہ ہوئے۔

مولوی غلام علی آزادؔ نے اردو قصیدے کے اشعار کی تعداد ۳۱ تک محدود کر دی تھی، لیکن دیگر شعراء نے اس کو سنتر تک بڑھا دیا۔ بعض اردو اور فارسی قصاید میں دو سو تک اشعار ہیں اور عربی قصاید میں تو ان کی تعداد پانچ سو تک پہنچی ہے۔ قصاید اپنے ردیف اور قافیہ کے باعث بھی جانے جاتے ہیں مثلاً حرف لام پر ختم ہونے والا قصیدہ (قصیدۂ لامیہ)، وغیرہ۔

محمد فقیہہ دردمند دکنی (متوفی مرشد آباد ۱۱۷۶ھ) جو محمد آباد بیدر (دکن) کے قریب اودگیر کے رہنے والے تھے، بیشتر دہلی، عظیم آباد اور مرشد آباد میں مقیم رہے۔ مرزا علی لطف نے اپنے تذکرے میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ "دردمند اچھے قصیدہ گو تھے"۔ وہ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور مرید نیز صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے مشہور ساقی نامہ کا نمونہ درج ذیل ہے:۔

ارے ساقی، اے جانِ فصلِ بہار   یہی تھا ہمارا و تیرا قرار؟
ہمارے بسرنے کی یہ فصل تھی   فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟

ادا سے بہکنے کی تجھ کو قسم
نشے سے بہکنے کی تجھ کو قسم

تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم
تجھے خود پرستی کی اپنی قسم

مرزا سودا (امام موسیٰ رضا کی توصیف میں) :-

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا
تو آب و دانے کو لے کر گہر نہ ہو پیدا

ز سنگ پا ہے یہ دل اے خدا نہیں یہ حنا
بتاں کریں ہیں اسے پائمال کیوں اتنا؟

ثنا کروں تیری ہر درجہ میں قلم آسا
جو سر کٹے تو گریباں سے کر زباں پیدا

کہاں زباں کو ہے طاقت اگر بیاں کیجے
تیرے دیار کے چیونٹے کا حدِ استغنا

مصحفی (شہزادہ سلیمان شکوہ کی شان میں) :-

سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب
جو ہے تو شاہ سلیماں شکوہ عرش سریر

مزاج میں تیرے صفائی کہ کر لیا باور !
کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر

سوتابِ ذرّہ کہاں، نورِ آفتاب کہاں
کہاں وہ سطوتِ شاہی، کہاں غرورِ فقیر

انشا (جارج سوم، شاہِ انگلستان، کی تعریف میں) :-

بگھیاں پھولوں کی تیار کرائے بوئے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

عالمِ اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور
گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسیِ ناز پہ جلوے کے دکھاویگا پھبن

مومن :-

ملے ہیں خاک میں کیا کیا میرے فنون و علوم
خدا کسی کو نہ دے ایسے طالع منکوس

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل
نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس

کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بینی
فدا ہو وجد میں آکر روانِ بطلیموس

ذوق (جشنِ نوروز پر) :-

خسروا سنکے تیرا مژدۂ جشنِ نوروز
آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عیش تیری دی ہے چمن کو جا کر
زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر پارنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا ایک موج
تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چینِ شکنج

محسن کاکوروی (نعتِ رسولِ کریمؐ) :-

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی　　ہند کیا، ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ　　کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل
شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اُٹھائے گھونگھٹ　　چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

["خم خانۂ جاوید"، جلد سوم، محمد فقیہہ دردمند۔ "شعر الہند"، حصۂ دوم، باب اوّل، "قصیدہ"، صـ ۹۲-۱۰۹، باب دوم صـ ۳۲۴-۳۵۱، "مقدمۂ شعر و شاعری"، از مولانا حالی صـ ۱۹۵، ۲۱۳۔ ماہنامہ "کنول"، آگرہ، جنوری ۱۹۳۷ء، "نقدِ نظمِ اردو"، از پروفیسر حامد حسن قادری]

۱۵

مثنوی

(بزمیہ شاعری)

اُردو نظم کی وہ صنف، جس کے ہر شعر کا قافیہ مُختلف ہو، مثنوی کہلاتی ہے۔ اُردو شاعری کی اِس شاخ میں اشعار کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے اور اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مثنوی کی نظم مسلسل ہوتی ہے جس میں کسی مخصوص کہانی، واقعہ یا مضمون کو نظم کیا جاتا ہے۔ ابتدا ہی سے مثنوی کے لیے مختصر بحر استعمال کی گئی، جیسی کہ مثنوی میر حسن ہے اور "مثنوی گلزارِ نسیم" نیز مولانا حالی کی مثنویاں "حُبِ وطن"، "برکھارُت"، اور "بیوہ کی مُناجات"، وغیرہ یا علامہ شبلی کی مثنوی "صبح اُمید"، وغیرہ لیکن مولانا آزاد دہلوی نے اس کے لیے زیادہ طویل بحریں استعمال کیں۔ ان کے بعد شوق قدوائی نے مختصر بحروں میں بھی مثنویاں لکھیں (مثلاً "ترانۂ شوق"، اور "قاسم و زہرہ"، وغیرہ) اور بڑی بحروں میں بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں کہیں (مثلاً "بہار"، اور "عالمِ خیال" وغیرہ)۔ موجودہ زمانے میں حفیظ جالندھری نے طویل بحر میں اپنی مشہور اور تاریخی مثنوی "شاہنامۂ اسلام" کہی ہے۔ مثنوی کے لوازمات میں موضوع سے خلوص، حقیقت نگاری، واقعات کی فطری اور سچی ترجمانی، حالات کی صحیح پیشکش اور اثر اندازی وغیرہ ہیں۔ مثنوی میر حسن مندرجہ بالا تمام اُمور کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی صفات حفیظ جالندھری کے "شاہنامۂ اسلام" میں موجود ہیں۔ چونکہ مثنوی میں وسعتِ بیان غیر محدود ہے، لہٰذا اس کو طویل مضامین، کہانیوں، صوفیانہ اور اخلاقی مذاکرات اور رزمیہ سوانح وغیرہ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ فارسی شاعری نے مثنوی نگاری ہی کے باعث عربی شاعری پر فوقیت حاصل کی۔ چونکہ عربی شاعری میں اس صنف کا فقدان ہے، لہٰذا عربی ادب میں فارسی ادب کے طرز کی کتابوں کا وجود نہیں۔ اسی لیے عربوں نے فردوسی کے شاہنامہ کو "قرآن العجم" کہا اور "مثنویِ معنوی" کو "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" قرار دیا گیا۔ صنفِ مثنوی کے بانی بھی ایرانی ہی کہے جاتے ہیں۔

اساتذۂ مثنوی نے سات بحریں اس صنف کے لیے مخصوص کی ہیں، ان کے ماسوا کوئی اور بحر مثنوی کے لیے مقبول نہ ہو سکی۔ چونکہ اس میں اشعار کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں اظہارِ بیان

کی بڑی وسعت موجود ہے اور وہ خارجی و داخلی دونوں طرح کی شاعری کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کے عظیم شعرائے اپنے شاہکار مثنوی ہی کی شکل میں پیش کئے ہیں، فردوسی، والمیک، ویاس، تلسی داس سب نے اپنی لافانی نظمیں اسی طرز پر کہی ہیں۔ عام طور پر مثنوی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی رزمی، بزمی، حکیمانہ، صوفیانہ اور متفرق۔ مثنوی کے پہلے دو حصوں میں فطری موضوعات داخل ہیں۔ ہومر کی الیڈ ILIAD کی خصوصیت بھی یہی ہے جو یوروپ کے جدید ڈرامہ کا ماخذ ہے۔ حکیمانہ (فلسفیانہ) اور صوفیانہ مثنویوں میں زیادہ سنجیدہ مضامین ہوتے ہیں اور ان میں مبالغہ آمیزی کی گنجائش نہیں۔ متفرق مثنویوں میں بھی فطرت نگاری اور صداقت بیان کی حاجت ہے۔

ایران کی جملہ رزمی نظموں میں فردوسی کے 'شاہنامہ' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو ایران کی اصنامیاتی منظوم تاریخ ہے۔ چونکہ اس کے مندرجات محض خیالی ہیں، فردوسی کا مقام ہومر یا والمیک کے مساوی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں فردوسی کردار نگاری میں بھی ہومر سے کم ہے۔ ایران کی بزمیہ مثنویوں میں نظامی، خسرو، جامی اور فیضی وغیرہ کے شاہکار قابل تعریف ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی فطرت نگاری کے معاملے میں اردو میں 'مثنوی میر حسن' کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حکیمانہ مثنویوں کا ذکر کرتے ہوئے سعدی کی 'بوستاں' کا نام لینا کافی ہے۔ اسی طرح سے صوفیانہ مثنویوں میں مولانا روم کی مثنوی کا تو جواب ہی نہیں۔ اردو میں رزمیہ شاعری کے خلا کو انیس اور دبیر کے مراثی نے بحسن احسن پُر کر دیا ہے۔ پہلے پہل ریختہ میں محض بزمیہ مثنویاں نظم ہوئیں۔ اسی لیے دکن کے ابتدائی ریختہ گویوں میں مثنویاں ملتی ہیں۔ اردو کی بیشتر بزمیہ مثنویاں رومانی ہیں۔ اردو غزل کے شاعر اعظم، میر تقی میر نے ۴۱یا ۵ ا مثنویاں لکھی تھیں، جن میں خارجیت برائے نام تھی۔ وہ غزلوں کی مانند سب کی سب داخلی تھیں، سوائے اُن دو مثنویوں کے جن میں گھر کی خستہ حالی اور برسات کی فراوانی کا رونا رویا گیا ہے۔ خارجیت اگر ہے تو بس ان مثنویوں میں ہے۔

حکیم مومن خاں مومن نے چھ مثنویاں لکھی تھیں، جو سب داخلی اور میر کی مثنویوں کے مقابلے میں کم درجے کی ہیں۔ وہ رومانی مضامین پر مبنی اور عسیر الفہم ہیں۔ مزید برآں وہ اخلاقی طور پر بھی پست اور بعض جگہ پر غیر فطری ہیں۔ اسی لیے وہ مقبول نہ ہوئیں۔ اردو کے بہترین مثنوی گو شعرا میر حسن، میر اثر، نسیم اور مرزا شوق تھے۔ میر حسن ان سب میں چوٹی کے مثنوی گو ہوئے کیونکہ ان کی مثنوی ہر طرح سے مکمل اور مثالی ہے۔ ان کے بعد مرزا شوق لکھنوی کا مقام ہے، جو واجد علی شاہ کے آخری دورِ حکومت کے شاعر ہیں۔ اُن کی مثنویاں 'بہارِ عشق'، 'فریب عشق'، اور 'زہرِ عشق'، بہت معروف ہیں، لیکن وہ اُتنی ہی اخلاق کُش، شہوانیت انگیز اور ہیجان پرور ہیں۔ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر دہلوی کی مثنوی، 'خواب و خیال'،

اور نسیم لکھنوی کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ بالخصوص ثانی الذکر کا شرر اور چکبست کے درمیان ادبی نزاع کے باعث۔

فارسی شاعری کے بہترین شاہکار اس کی مثنویوں میں محفوظ ہیں۔ رزمیہ مثنویوں 'شاہنامہ، سکندر نامہ' اور 'حملۂ حیدری'، وغیرہ ہیں۔ رومانی مثنویوں 'یوسف وزلیخا' اور 'شیریں وخسرو' وغیرہ ہیں۔ کہانیوں 'ہفت پیکر' اور 'ہشت بہشت'، وغیرہ ہیں۔ اخلاقیات مثلاً 'بوستان' ہیں اور تصوف مثلاً 'مثنوی مولوی معنوی' ہیں۔ اردو ادب میں بہت کچھ فارسی سے مستعار لیا گیا ہے۔ یعنی خود اردو شاعری، عروض، اصنافِ شعری، استعارات وتشبیہات، تخیلِ شعری حتیٰ کہ بحور تک سب کچھ فارسی شاعری کے مرہونِ منت ہیں۔

اردو شاعری میں، غزل، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح مثنویاں بھی بالکل شروع ہی سے کہی جانے لگی تھیں۔ اردو مثنوی کا آغاز غالباً مذہبی معتقدات سے ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ افضل میرٹھی نے ایک اردو مثنوی مغل شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں لکھی تھی لیکن اس کی تصدیق نہ ہوسکی۔ ۱۶۰۹ء میں قطب شاہ، والیٔ گولکنڈہ نے غالباً پہلی مثنوی دکنی اردو میں 'نعتِ رسول مقبولؐ' میں لکھی تھی، جس کا مسودہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائبریری میں محفوظ تھا۔ اس کے بعد غواصی کی مثنوی 'سیف الملوک وبدیع الجمال' ۱۶۲۵ء میں لکھی گئی۔ بعد ازاں [illegible] نے ایک طویل مثنوی 'خواب وخیال' کے نام سے ۱۶۴۹ء میں رقم کی جو حضرت علیؓ کی منقبت میں تھی۔ [illegible] سلطان علی عادل شاہ کے دورِ حکومت میں نصرتی نے اپنی مثنوی 'گلشنِ عشق' لکھی جس میں منوہر کنور اور [illegible] کے درمیان عشق ومحبت کا فسانہ بیان کیا گیا ہے۔ نصرتی نے ایک اور مثنوی، فردوسی کے 'شاہنامہ' کے طرز پر، علی عادل شاہ کی فتوحات کی توصیف میں 'علی نامہ' کے نام سے بھی لکھی تھی۔ اس اثناء میں [illegible] ہاشمی نے اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' نظم کی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں خواجہ محمود بحری نے [illegible]ء میں ایک صوفیانہ مثنوی 'من لگن' کے نام سے لکھی۔ اُسی زمانے میں ابنِ نشاطی نے [illegible] اپنی مثنویاں رقم کیں۔ میر شمس الدین ولی اورنگ آبادی نے ۱۷۲۸ء میں ایک مثنوی شہدائے کربلا پر [illegible]۔ مغل شہنشاہ محمد شاہ کے زمانے میں شاہ مبارک آبرو نے کئی مثنویاں لکھی تھیں جن میں سے ایک 'موعظۂ [illegible] معشوق' قابلِ ذکر ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ منشی سید محمد حیدر بخش حیدری نے اردو میں ایک [illegible] شاہنامہ، اور دکنی اردو میں 'بہرام وگل اندام' کا منظوم افسانہ لکھے، نیز نظامی کی مثنوی 'ہفت پیکر' [illegible] نظم میں ترجمہ کیا۔ شہنشاہ شاہ عالم نے ساقی کو 'شاہنامۂ اسلام' نظم کرنے پر مامور کیا تھا مگر وہ [illegible]۔ سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی 'بوستانِ خیال' (۱۷۴۷ء) آج بھی پڑھنے

کے قابل ہے۔ اس کا ر باغ کی سیر کا بند ملاحظہ ہو:۔

ہر ایک سمت پانی کی نہروں کی سیر — وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
ہزارہ اناروں کے تختوں کی سیر — نئی کونپلوں کے درختوں کی سیر
نپٹ جھوم آیا تھا ابرِ بہار
برستی تھی باریک جھم جھم بہار

عارف الدین عاجز کی مثنوی ’قصۂ لال وگوہر‘ (۱۱۶۷ء) اُس دور کی ترقی یافتہ اردو کی ایک اچھی مثال ہے :۔

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یاقوت معانی
سخن کے دُر کا مجھ کو جوہری کر — سخن سنجوں کو میرا مُشتری کر

اُردوئے معلّیٰ میں منظوم کہانیاں لکھنے والے پہلے شاعر میرؔ تھے لیکن اُن کی مثنویوں اور غزلوں میں چنداں فرق نہ تھا۔ میر تقی میرؔ نے کئی مؤثر مثنویاں لکھیں جو مقبول ہوئیں۔ اُن کی مثنویاں لائقِ ذکر ہیں ’شعلۂ شوق‘ اور ’دریائے عشق‘۔ ’شعلۂ شوق‘ کا نمونہ :۔

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا! — لہو اُس کی آنکھوں سے جاری ہوا
گئے ہوش و صبر اُس کے یک بارگی — طبیعت میں آئی ایک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اِس طرح جیسے بھُولا ہوا

’دریائے عشق‘ :۔

ایک دن بیکلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
ایک غُرفہ سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اُس کے گرمِ نظارہ
پڑگئی اُس پہ اک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

میرؔ کی تیسری مثنوی ’دربیانِ دُنیا‘ میں بڑھاپے کا حال سُنئے :۔

جوانی گئی، موسم شیب ہے — شہود ایک دو روز کو غیب ہے
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مُشام — مزہ کچھ نہیں، ہو چکی صبح شام
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی — سفیدی مُو سے سحر ہو گئی

سوداؔ نے ۲۴ چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی تھیں، لیکن وہ مقبول نہ ہوئیں۔ میر دردؔ کے برادرِ خورد میر اثرؔ کی عمدہ مثنوی 'خواب و خیال' بہت مقبول ہوئی :۔

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا　　کھلنے جانے میں ڈھانپتے جانا

ہجر میں جی سے میرے پاس کہاں　　وصل میں گر جیا، حواس کہاں

درد کوئی کسی کا کیا جانے　　اُس کا دل جانے یا خدا جانے

رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے　　بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے

میر تقی میرؔ نے بھی ایک مثنوی 'خواب و خیال' کے نام سے لکھی تھی۔ میر اثرؔ کی ہمنام مثنوی میں سراپا کی تعریف میں صدہا اشعار ہیں، لیکن میرؔ کی مثنوی میں محبوب کے سراپا کی توصیف میں جو ایک شعر کہا گیا ہے وہ اثرؔ کی مثنوی کے سیکڑوں اشعار پر بھاری ہے، یعنی ؎

سراپا میں جس جا نظر کیجیے

وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

سوداؔ کے شاگرد حافظ فضل علی ممتازؔ نے ایک مذاقیہ مثنوی 'لاٹھی نامہ' لکھی تھی :۔

ہوتی ہے دُنیا میں جو کچھ تحفہ چیز　　سب سے ہے ممتازؔ کو لاٹھی عزیز

کوچ و مقام اُس کا ہے اپنے ہاتھ　　جب کہیں چلیے تو ہے یہ عُذر ساتھ

گدا علی بیگ بسملؔ فیض آبادی نے ایک مثنوی 'دیمک نامہ' کے نام سے لکھی تھی جس کے چند اشعار میر حسنؔ نے اپنے 'تذکرۂ شعرائے اُردو' میں نقل کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میر حسنؔ نے اپنی مشہور مثنوی 'سحر البیان' فضائل علی خاں بیقیدؔ کی مثنوی سے اخذ کی تھی، جو بیقیدؔ نے شہنشاہ محمد شاہ کے عہد میں اپنے ذاتی معاشقہ پر مبنی تصنیف کی تھی۔ میر حسنؔ دہلوی کی مثنوی 'سحر البیان' زیادہ تر 'مثنوی بدرِ منیر' کے نام سے معروف ہے۔ جو قبولِ عام اِس مثنوی کو حاصل ہوا وہ نہ اُس سے پیشتر، نہ اُس کے بعد کسی اور اُردو مثنوی کو حاصل ہو سکا۔ بہت سی کوششیں اس مثنوی کے انداز پر لکھنے کی کی گئیں، لیکن ناکام رہیں۔ 'مثنوی بدرِ منیر' نواب آصف الدولہ، والیٔ اودھ (ہندوستان) کے عہدِ حکومت میں ۱۷۸۴ء (۱۱۹۹ھ) میں تصنیف ہوئی تھی۔ اِس مثنوی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا اُردو شاعری میں ایک بے مثال شاہکار ہے۔ میر حسنؔ نے اس کے علاوہ دس مثنویاں اور لکھی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی 'مثنوی بدرِ منیر' کے معیار تک نہ پہنچ سکی۔

میر حسنؔ دہلوی نے دہلی میں مُغل شہنشاہوں محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کے

ادوارِ حکومت دیکھے، نیز اُنھوں نے دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ دُرّانی کے حملے دیکھے اور مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کی یلغار کے مشاہدات کیے۔ اُردو کے مشہور شعرا، مرزا مظہر جانجاناں، میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، اور جرأتؔ وغیرہ میر حسنؔ کے ہمعصر تھے۔ اُنھوں نے اپنی ابتدائی تربیت دہلی میں خواجہ میر دردؔ کے ماتحت پائی تھی۔ دلّی کی تباہی کے بعد، میر حسنؔ اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دہلی سے فیض آباد آ گئے تھے، جہاں ان کا خاندان سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ لیکن جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل کیا تو میر حسنؔ بھی لکھنؤ چلے آئے اور وہیں مستقلاً رہ گئے۔ دہلی سے فیض آباد جاتے ہوئے میر حسنؔ نے چند ماہ راستے میں ایک مقام 'ڈیگ' نامی میں صرف کیے تھے، جہاں سے وہ حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے میلہ کے ساتھ ساتھ مکن پور آئے تھے۔ اپنی 'مثنوی گلزارِ ارم' میں، جو میر حسنؔ نے فیض آباد کی تعریف میں نظم کی تھی، اس دلچسپ میلہ کا ذکر کیا ہے۔

میر حسنؔ ایک کلیات کے بھی مصنف تھے جس میں سات ہزار اشعار تھے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ مصنف 'تذکرہ آبِ حیات' کو اس کا علم نہ تھا۔ علی گڑھ کے مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اس کا لکھنؤ میں پتہ لگایا تھا، جو میر حسنؔ کی وفات کے نصف صدی بعد ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ ہجری) میں مُرتّب کی گئی تھی۔

میر حسنؔ کی مثنویاں ان کے دورانِ قیامِ لکھنؤ میں مُرتّب کی گئی تھیں۔ اُن کی صوفیانہ مثنوی 'رموز العارفین' اب ناپید ہے جو اُنھوں نے ۱۷۷۴ء (۱۱۸۸ھ ہجری) میں نظم کی تھی۔ اُن کی مثنوی 'گلزارِ ارم' ۱۷۷۸ء (۱۱۹۲ھ ہجری) میں لکھی گئی تھی۔ مثنوی 'بدرِ منیر' اور 'گلزارِ ارم' دونوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

'مثنوی سحر البیان' حمدِ الٰہی سے شروع ہوتی ہے (جس میں ۴۰ اشعار ہیں)۔ اس کے بعد نعتِ رسولِ کریمؐ ہے (جس میں ۲۷ اشعار ہیں)۔ اس کے بعد چار اشعار مدح صحابہؓ میں اور ۲۵ اشعار منقبتِ حضرت علیؓ میں ہیں۔ اس کے بعد ۱۴ اشعار میں خدا سے دعا ہے، پھر شہنشاہ شاہ عالم اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں اشعار ہیں۔ اس کے بعد اصل کہانی شروع ہوتی ہے، جس کے ہر حصہ کے آغاز میں ایک 'ساقی نامہ' ہے۔ ایک 'ساقی نامہ' کا نمونہ :۔

پلا ساقیا مجھ کو ایک جامِ مُل جوانی میں آئے ہیں ایّامِ گُل
خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب
جوانی کہاں اور کہاں پھر یہ دن مثل ہے کہ ہے "چاندنی چار دن"

'مثنوی سحر البیان' متعدد بار شائع ہوئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج 'کلکتہ' نے اسے ۱۸۰۵ء میں شائع کیا۔ ۱۸۵۰ء میں یہ بمبئی سے نہال چند لاہوری کی 'گل بکاؤلی' اور مہدی علی خاں کی 'یوسف زلیخا' کے

ساتھ ایک ہی جلد میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے حسب ذیل ایڈیشن شائع ہوئے: کانپور سے ۱۸۶۳ء میں، کانپور ہی سے پھر ۱۸۶۴ء میں، میرٹھ سے ۱۸۷۶ء میں، پھر تیسری بار کانپور سے ۱۸۷۹ء میں، لکھنؤ سے ۱۸۹۵ء میں، اور ۱۸۹۵ء ہی میں مخزن پریس، دہلی نے اسے 'مثنوی گلزارِ ارم' کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد سے آج تک اس کے اور بہت سے ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'مثنوی سحرالبیان' کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا اور اسے اردو نثر میں بھی ڈھالا گیا ہے۔

(۱) جان گلکرائسٹ کے ایما سے میر بہادر علی نے 'مثنوی سحرالبیان' کو اردو نثر میں منتقل کیا، تاکہ اس سے فورٹ ولیم کالج، 'کلکتہ' کے طلبہ مستفید ہوں۔ اس نثری 'سحرالبیان' کا نام 'نثرِ بے نظیر' رکھا گیا اور وہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔

(۲) اس کا انگریزی ترجمہ سی ڈبلیو ڈی بڈولریل C.W.D. BADOLREL نے کیا جو کلکتہ سے (HULL کمپنی) ۱۸۷۱ء میں 'دی نثرِ بے نظیر' THE NASR BENAZEER کے نام سے شائع ہوا۔

(۳) پھر میجر ہنری کورٹ COURT کا انگریزی ترجمہ اسی نام سے کلکتہ سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا۔

(۴) پھر اسی نام سے لفٹننٹ کرنل رینکنگ RANKING نے ٹیکسٹ بک کے طور پر اسے اردو کے اعلیٰ امتحان (اردو فاضل) کے لیے ایڈٹ کیا، جو کلکتہ سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔

اگر میر حسن نے اپنی 'مثنوی بدرِ منیر' میں جنوں اور پریوں کو استعمال کیا ہے، تو یورپ کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ مثلاً 'مڈسمر نائٹس ڈریم' "Midsumwer Nights Dream" کی پریاں، شیکسپیئر کی 'ہیملٹ' HAMLET میں بدروحیں، 'ایلیڈ' ILIAD اور 'اینڈ' AENID دونوں کے دیو، 'پیراڈائز لاسٹ' "paradise Lost" میں فرشتوں اور شیطان کی آویزشیں، گوئٹے GOETHE کے 'فاؤسٹ' FAUST کا شیطان، مُور MOORE کی پریاں، اور ایڈگر ایلن پو "Edgar Allan Poe" کی روحیں وغیرہ۔

سنسکرت میں کالیداس، بھاشا میں تلسی داس، عربی میں امراؤالقیس، فارسی میں قاآنی، اور اردو میں انیس سب نے اپنے اپنے کلام میں بڑی خوبی کے ساتھ فطرت نگاری کی ہے، لیکن وہ میر حسن کی فنکاری تک نہ پہنچ سکے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے 'تذکرہ شعر الہند' کی دوسری جلد میں دو ابواب صنف مثنوی پر لکھے ہیں، لیکن جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اُس کا بیشتر حصہ مولانا حالی کے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں مثنوی پر اُن کے اظہار رائے کی صدائے بازگشت ہے۔ مولانا امداد امام اثر نے اپنے معروف تذکرہ 'کاشف

المقالق'، کی دوسری جلد میں نہایت عمدگی کے ساتھ 'مثنوی سحر البیان' پر ۹۵ صفحات میں تبصرہ کیا ہے، جو اُردو ادب میں بے مثال تنقید نگاری ہے۔ 'مثنوی سحر البیان' کا نمونہ :-

وہ گورا بدن اور بال اُس کے تر　　　کہے تُو کہ ساون کی شام و سحر
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک　　　برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
نہا دھو کے نکلا وہ گُل اس طرح　　　کہ بادل سے نکلے ہے ماہ جس طرح
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا　　　اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر　　　نشے کا سا عالم گلستان پر
چمن آتشِ گُل سے دہکا ہوا　　　ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
پڑے اُس میں فوارے چھُٹتے ہوئے　　　ہوا بیچ موتی سے لُٹتے ہوئے
غرض اِس طرح سے سواری چلی　　　کہے تُو کہ بادِ بہاری چلی
نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی　　　نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن　　　جوانی کی راتیں، مُرادوں کے دن
وہ اُجلا سا میداں، چمکتی سی ریت　　　اُگا نُور سے چاند تاروں کا کھیت
تجھے فصل کرتے نہیں لگتی بار　　　نہ ہو تجھ سے مایوس اُمید وار
وہ گھٹنا، وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ　　　دکھانا وہ رُک رُک کے چھاتی پہ ہاتھ
چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی　　　کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

جراَت کے مُربّی نواب محبت خاں محبتؔ (ابن نواب حافظ رحمت خاں، والیٔ بریلی، روہیلکھنڈ، یوپی، انڈیا) نے مثنوی اسرارِ محبت، ۱۷۸۲ء (۱۱۹۷ھ ہجری) میں لکھی تھی، جو نہایت مقبول ہوئی تھی۔ بت پرستی اور بتوں کے فسانۂ عشق پر مبنی ہے۔ اس کی زبان مصحفی کی اور اندازِ بیان جراَت کا ہے۔ نمونہ :-

جنونِ عشق جب ہوتا زیادہ　　　نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
کبھی گھبرا کے اُٹھ واں سے چلتی　　　اُٹھا کر خاک اپنے منہ سے ملتی
غرض دشوار تھا آرام پانا　　　کبھی اُٹھنا، کبھی پھر بیٹھ جانا

اگرچہ سید انشا نے اپنی تصنیف 'دریائے لطافت' میں ان الفاظ میں 'سحر البیان' کی تنقیص کی ہے لیکن وہ خود صنفِ مثنوی میں ناکام رہے۔ " بدرِ منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ " انشا نے خود کئی مثنویاں کہی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی لائقِ ذکر نہیں ہے۔ ان کے دوست سعادت

یار خاں رنگین نے بھی ایک مثنوی ریختی میں لکھی تھی، جس میں اُنھوں نے نسوانی زبان میں میر حسن کے طرزِ بیان کی نقل کی کوشش کی ہے، لیکن وہ انتہائی اخلاق سوز ہے اور ایک ناکام وغیر مقبول کوشش۔ اس کا نمونہ:۔

یہ جو ملنے میں اُس سے شرماتی   وہ اُسے چھیڑ چھیڑ گرماتی
آگئیں خوب اُس کے جب بس میں   پھر تو دینے لگیں اُسے قسمیں

مصحفی نے بھی میر کی 'دریائے عشق' کے جواب میں ایک مثنوی 'بحر المحبت' کے نام سے لکھی تھی۔ لیکن وہ ایک ناکام کوشش تھی۔ اس میں بھی ایک ہی کہانی تھی، جو ایک ہی بحر میں کہی گئی تھی، لیکن اس میں میر کے سے نشتر کہاں تھے۔ اپنی مثنوی میں مصحفی نے میر کی مثنوی کے ہر شعر کی ناکام نقل کی تھی۔ کسی نے مصحفی کی اِس سعیٔ لاحاصل کا اس طرح مذاق اُڑایا تھا: "کہاں چاندنی چوک کی سلونی زبان اور کہاں یہ امروہہ کا پھیکا پکوان"۔ 'بحر المحبت' کا نمونہ:۔

ہجر میں وصل جاودانی ہے   ہجر عاشق کی زندگانی ہے
نہ کوئی آشنا، نہ ہمدم ہے   ہے جو مونس تو بس ترا غم ہے

مصحفی کے شاگرد طالب علی خاں عیشی نے بھی ایک چھوٹی سی مثنوی 'سوز و ساز' کے نام سے لکھی تھی، جو مصحفی کی مثنوی سے کہیں بہتر تھی۔ نظامی کی فارسی مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' کا اردو ترجمہ منظوم کئی اردو شعرائے نے کیا۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دو تاسی GARCIN DE TASSI نے اس کے پانچ مختلف منظوم اردو تراجم دریافت کئے ہیں۔ ان میں سے میر تقی میر کے بھتیجے میر محمد حسن تجلی کی مثنوی بعض لائبریریوں میں محفوظ ہے۔ ایک اور، جو شاہ محمد عظیم دہلوی کی مثنوی کا محض نمونہ ہے، حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکرے میں مذکور ہوئی ہے۔ لیکن 'لیلیٰ مجنوں' کا بہترین منظوم اردو ترجمہ مصحفی کے ایک شاگرد میر تقی ہوس نے کیا جو اثر انگیزی میں میر تقی میر کی مثنوی 'دریائے عشق' پر بھی بازی لے گیا۔ اس کا نمونہ:۔

از بہرِ تجسّسِ دل آرام   جھک جھک کبھی دیکھتا در و بام
کرتا کبھی آپ ہی آپ باتیں   کرتا کبھی دیکھنے کی گھاتیں
رک رک کے گاہے زار زار روتا   اٹھ بیٹھتا گاہ سوتا ہوتا

تجلی کی مثنوی ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی، جس کا ایک نسخہ سابق ریاست رامپور کی سرکاری لائبریری میں محفوظ ہے۔ مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرہ 'طبقاتِ شعرائے اردو' میں اس کے متعلق اچھی رائے نہیں دی۔ نواب اعظم الدولہ سرور دہلوی نے سات مثنویاں 'سبعہ سیارہ' کے نام کے ماتحت لکھیں (مثلاً 'شیریں فرہاد'، 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں'، وغیرہ)، لیکن وہ اب ناپید ہیں۔ ان کے اسلوب

کا نمونہ :۔

اگر حاصل ہو عمرِ جاودانی نہیں بن عشق لطفِ زندگانی

اگرچہ عشق میں آفت ہے یکسر نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر

مہدی علی خاں عاشقؔ دہلوی نے 'حملۂ حیدری'، 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں' اور 'خسرو شیریں' کا فارسی سے اُردو نظم میں ترجمہ کیا تھا، لیکن ان میں سے کوئی اب موجود نہیں ہے۔ اسی طرح شاہ محمد عظیم المعروف بہ شاہ جھُولن دہلوی نے کئی مثنویاں، مع 'لیلیٰ مجنوں' کے، لکھی تھیں، جو اب نایاب ہیں۔ اس کا نمونہ :۔

لٹکتی تھی بدھی کمر گاہ پاس مہکتی بدن میں تھی پھولوں کی باس

ہیں کھولے تھی بال اپنے بالی تھی میں سج اپنی نرالی نکالی تھی میں

میر ضیاء الدین عبرتؔ دہلوی نے مشہور ہندی کہانی 'پدماوت' کا منظوم اُردو ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن اسے مکمل سید غلام علی مشہدی عشرتؔ بریلوی نے، جو سوداؔ کے شاگرد مرزا علی لطفؔ کے شاگرد تھے، ۱۷۹۶ء (۱۲۱۱ھ ہجری) میں کیا، اور 'مصطفائی پریس' کانپور نے 'پدماوت اُردو' کے نام سے ۱۸۵۹ء (۱۲۷۶ھ ہجری) میں شائع کیا۔ اصلاً یہ کہانی پوربی بھاشا میں، نثر میں، مولانا ملک محمد جائسی نے لکھی تھی جس میں راجہ رتن سین اور پدماوتی کے درمیان معاملاتِ عشق کا بیان ہے۔ عشرتؔ بریلوی کے حصّہ مثنوی 'پدماوت اُردو' کا نمونہ :۔

غرض سے ساتھ کتنی ماہ پارہ لبِ بام آئی وہ بہرِ نظارہ

دریچہ سے جو تھی چلمن اُٹھائی سراپا صورت آئینہ میں آئی

وہ صورت تھی کہ تھا کچھ سحر و افسوں کہ بس شاہ کی ہوئی حالت دگرگوں

میر دردؔ کے شاگرد مرزا جان تپشؔ دہلوی نے فارسی کہانی 'بہارِ دانش' کو اُردو مثنوی کی صورت میں منتقل کیا۔ اُسی زمانے میں شیخ غلام علی راسخؔ عظیم آبادی نے ایک مثنوی 'راز و نیاز' کے نام سے لکھی۔ اس کا نمونہ :۔

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

ہیں عجب اس کے تصرف کے ڈھنگ موم سے نرم کئے اس نے سنگ

۱۸۱۰ء میں شاہ نصیرؔ دہلوی کے شاگرد لالہ منشی مُولچند نے نو ہزار اشعار پر مشتمل ایک طویل اُردو مثنوی لکھی جو فردوسی کے 'شاہنامہ' کے کرداروں پر مبنی تھی۔ تذکرہ 'مجموعۂ نغز' کے بیان کے مطابق، اس مثنوی کی فرمائش مغل شہنشاہ اکبر ثانی نے کی تھی۔ کئی شعراء نے 'یوسف زلیخا' کی کہانی کو

فارسی سے اردو میں نظم کیا۔ گارساں دتاسی نے اپنی تصنیف میں 'یوسف زلیخا' کے چھ مختلف ایڈیشنوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک امین کا جو ۱۸۰۰ء میں لکھا گیا تھا، دوسرا تپش کا، جس کو اس نے قید خانے میں مرتب کیا تھا، تیسرا فدوی لاہوری کا، چوتھا محبت کا، پانچواں مہدی علی خاں عاشق کا، جو 'عشق نامہ' کے نام سے مشہور ہوا، اور ۱۸۴۷ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ لیکن دتاسی نے مرزا قطب علی بیگ دہلوی فگار کی مثنوی، 'یوسف زلیخا' کا ذکر نہیں کیا، جو ۱۷۹۸ء میں لکھی گئی اور ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرہ میں فگار دہلوی کے بارے میں اچھی رائے دی ہے، یعنی "بسیار پُرگو، بغایت شیریں زبان"۔ 'عشق نامہ' کا نمونہ :۔

ہوا تیار جب وہ عیش خانہ   نظر آئی عجب جائے شہانہ
کیا فرش اس میں مخمل اور زری کا   بنا آرامگاہ گویا پری کا

اُسی زمانے میں سید حیدر بخش حیدری، مصنف 'آرائش محفل'، 'قصہ حاتم طائی' نے ایک مثنوی 'ہفت پیکر' نامی نظامی کی فارسی مثنوی، 'ہفت پیکر' کے جواب میں لکھی، لیکن وہ اب نایاب ہے۔ سید بلاقی دکنی نے بھی ایک مثنوی 'معراج نامہ' کے نام سے ۱۸۰۰ء میں لکھی تھی، لیکن وہ بھی اب کہیں نہیں ملتی۔ شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے ایک مثنوی 'عاشق وصنم' کے نام سے ۱۸۰۳ء میں لکھی تھی۔ اسی زمانے میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دہلوی (مصنف تذکرہ 'مجموعۂ نغز') نے ایک اردو مثنوی معراج پر مثنوی مولانا روم کی بحر میں لکھی تھی جس میں ۲۵۰۰ اشعار تھے اور دوسری مثنوی حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں 'بوستان سعدی' کی بحر میں لکھی تھی۔ دونوں مثنویاں اب عسیر الحصول ہیں۔ ثانی الذکر مثنوی میں ۵۲۰۰ اشعار تھے۔ شیخ قلندر بخش جرأت کے شاگرد شاہ حسین حقیقت نے اپنی مثنوی 'ہشت گلزار' ۱۸۱۰ء میں لکھی تھی، جس میں ۴۷۶۵ اشعار تھے، مگر وہ اب نایاب ہے۔ اس کا نمونہ :۔

نخل بند اس چمن کا جب میں ہوا   'ہشت گلزار' نام اس کا رکھا
گو کہ ہے خوب، یا کہ ہے یہ زشت   لیک قصہ یہ ہے بہ ہشت بہشت

حکیم مومن خاں مومن دہلوی نے متعدد مثنویاں کہی تھیں، جن میں سے تین لائق ذکر ہیں: (۱) 'شکایت ستم' (۱۸۱۰ء)، (۲) 'قصۂ غم' (۱۸۱۹ء) اور (۳) 'قول غمیں' (۱۸۲۰ء)۔ غالب نے صرف ایک چھوٹی سی مثنوی آم کی تعریف میں کہی تھی ؎

آم کا کون مرد میداں ہے   ثمر و شاخ گوی و چوگاں ہے

مومن کی مثنوی 'قولِ غمیں' کا نمونہ :-

کیا ہائے ڈھب سے ملاقات ہوئی کہ نہ کچھ بولے، نہ کچھ بات ہوئی
کام دل رنج و بلا کو سونپا تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا

'قصۂ غم' کا نمونہ :-

پلا ساقیا جام کوثر مجھے خراب شراب ہُدیٰ کر مجھے
وہ ذوق آشنا لذت افزا شراب کہ تسنیم ہو شرم سے جس کی آب

اُسی زمانے میں لکھنؤ کے ایک ہندو شاعر بھگونت سہائے راحت کاکوروی نے فیضی کی فارسی مثنوی 'نل دمن' کو اُردو نظم میں منتقل کیا، جو منشی مولچند دہلوی کے 'اُردو شاہنامہ' سے کہیں بہتر کوشش تھی۔ راحت کاکوروی کی 'اُردو نل دمن' ۱۸۲۸ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں راحت نے اپنا پورا نام نہیں لکھا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مجیدی پریس، کانپور، نے اسے ۱۹۲۴ء میں طبع کیا، تو انھوں نے اس پر یہ عبارت لکھی کہ "یہ نو بستہ لکھنؤ کے تاج بہادر ناتج کا کارنامہ ہے۔" البتہ مولوی عبدالغفور نساخ (مصنف 'تذکرۂ سخن شعرا') نے اپنی تصنیف میں اس غلطی کا ازالہ کر دیا۔ راحت نے ایک اور مثنوی 'بہارستانِ کلام عرف قصہ زہرہ و بہرام' کے نام سے ۱۸۳۱ء میں لکھی تھی جس میں راحت نے مشہور مسلم صوفی ابراہیم ادھم بلخی کے فسانے کو منظوم کیا تھا۔ یہ مثنوی صوفیہ میں تو مقبول ہوئی لیکن اس کی ادبی حیثیت تسلیم نہیں کی گئی۔ یہ اب مشکل سے دستیاب ہے۔ 'نل دمن' کا نمونہ :-

وہ کافر زلف رکھتے ہیں کمر تک پھنسے جس میں دل اسلام بیشک
جہاں ایسے بتوں کی ہو خدائی کریں کیونکر نہ واں سب جبہ سائی

مصحفی کے شاگرد شیخ عبدالرؤف شعور نے ایک چھوٹی سی مثنوی 'شبِ ہجر' کے نام سے ۱۸۳۷ء میں لکھی تھی۔ اس کا نمونہ :-

تھی شبِ ہجر دن قیامت کا سامنا تھا نئی مصیبت کا
ایک جانب چراغ جلتا تھا ایک طرف دل کا داغ جلتا تھا

راحت کاکوروی کی طرح ایک اور اُردو شاعر نے غالباً ۱۸۴۰ء سے قبل اُردو میں 'مثنوی نل دمن' منظوم کی تھی، جو نواب رامپور احمد علی خاں کے دورانِ حیات میں لکھی گئی تھی اور جس کی ایک کاپی رامپور کی اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے۔ نواب احمد علی خاں والئ ریاست رامپور کا

انتقال ۱۸۴۰ء میں ہوا تھا۔ اِس مثنوی پر اس کے مصنف کا نام درج نہیں ہے، لیکن ماہرین کے خیال میں اس کے مصنف نصیر دہلوی کے شاگرد مرزا نیاز علی بیگ نکہت دہلوی تھے۔

شیخ ناسخ لکھنوی نے بھی کئی مثنویاں لکھی تھیں، جو مقبول نہ ہوئیں۔ ان کی ایک مثنوی 'نظم سراج' ۱۸۳۸ء میں لکھی گئی تھی۔ ۱۷۹۶ء میں ایک غیر معروف شاعر ریحان الدین خاں ریحان نے 'گل بکاولی' کے مشہور قصیہ کو اردو نظم میں منتقل کیا تھا، جس کا ایک نسخہ موجودہ صدی کے شروع میں دریافت ہوا تھا۔ اس پر ایک مفصل تبصرہ ماہنامہ 'مخزن' لاہور کی نومبر ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔ لیکن یہ مثنوی مقبول نہ ہوئی اور اس مثنوی کا کوئی اور نسخہ بھی دستیاب نہ ہوا۔ گارساں دوتاسی نے اس کا نام 'خیابانِ ریحان' بتایا ہے، لیکن 'مخزن' کے تبصرہ نگار نے اس کا نام 'باغ و بہار' لکھا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو شاعر میاں دلگیر نے بھی ایک مثنوی شاہِ اودھ امجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں امین آباد کی تعریف میں لکھی تھی، لیکن وہ اب دستیاب نہیں ہے لیکن اس کا ایک نسخہ ریاست رامپور کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہے۔ ۱۸۵۰ء میں منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی نے راماین اور بھگوت گیتا دونوں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا، لیکن وہ تراجم مقبول نہ ہوئے۔ اُسی سال حسین بخش واقف لکھنوی نے ہنود کی رسوم شادی پر مبنی ایک مثنوی 'بہارستانِ شادی' کے نام سے لکھی تھی۔ ۱۸۵۰ء ہی میں باندے کے حکمراں نواب علی بہادر نے ایک مثنوی 'مہر و ماہ' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا نمونہ ؎

پیاری پیاری ہنسی کی کیا کہیے
ہونٹ دانتوں سے کاٹتے رہیے

خواجہ وزیر کے شاگرد ہادی علی خاں بیخود لکھنوی نے ایک مختصر مثنوی آخری شاہِ اودھ واجد علی شاہ کے 'جلسہ رہس' (رقص و موسیقی کی محفل) کی تعریف میں لکھی تھی۔ اس دور میں برق لکھنوی کے شاگرد شیخ امان علی ساحر لکھنوی نے بھی ایک مثنوی لکھی۔ منشی گوبند پرشاد فضا لکھنوی کی اُردو مثنوی 'شیریں خسرو' کئی بار شائع ہوئی۔ شاہِ اودھ واجد علی شاہ اختر نے بھی کئی مثنویاں لکھیں، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئیں۔ ان میں سے ایک 'دریائے تعشق' کو الفت خاں حباب نے لکھنؤ میں اسٹیج ڈرامہ بنایا تھا، لیکن مثنوی ناکام رہی:-

تسبیح گلے میں ایک ڈالی — اور مانگ بھی بالوں میں نکالی
بالوں کو بھی کر دیا پریشاں — حسن اس سے ہوا مگر دوچنداں

اختر کی دوسری مثنوی 'افسانۂ عشق' کا نمونہ ؎

بہت دھیان گھر کا کر تھوڑا کیا
وہیں اپنے گھوڑے کو کوڑا کیا!

اختر کی ایک اور مثنوی 'سحر الفت' کا نمونہ :-

مہر کی ہے یہ روشنی جب تک　　رات کی ہے یہ تیرگی جب تک
جب تک نور اس سحر میں ہے　　جب تک یہ ضیا قمر میں ہے

مظفر علی خاں اسیر لکھنوی نے اپنی مثنوی 'دُرّۃ التاج' ۱۸۵۳ء میں لکھی تھی۔ اس کا نمونہ :-

راتوں کو ہمیشہ شغل زاری　　دن بھر تپ غم سے بیقراری
طالع سے تمام روز لڑنا　　شب خواب میں چونک چونک پڑنا

ملک الشعراء قاضی صادق علی خاں اختر نے ایک مثنوی 'سراپا سوز' نامی لکھی تھی۔ آتش کے ایک شاگرد صبا نے اپنی مثنوی 'سعیدیہ' نامی اپنے مُربی نواب محسن الدولہ کی تعریف میں لکھی تھی۔ آتش لکھنوی کے ایک شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے اپنی نہایت عمدہ اور مشہور مثنوی 'گلزار نسیم' ۱۸۳۸ء میں لکھی تھی۔ میر حسن کی بے مثال مثنوی 'سحر البیان' کے بعد اس کا شمار اردو شاعری کی بہترین مثنوی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ نسیم پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے تھے۔ نسیم لکھنؤ میں ۱۸۱۲ء میں پیدا اور وہیں ۱۸۴۴ء میں صرف ۳۲ سال کی عمر میں جوان فوت ہوئے تھے۔ مثنوی 'گلزار نسیم' کا نمونہ :-

ایک شب راجہ تھا محفل آرا　　یاد آئی بکاولی دل آرا!
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے؟　　شہزادی بکاولی کدھر ہے؟
مُنہ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک
جُھک جُھک کے بدن چُراتی آئیں　　رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں
جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے　　اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

آغا حسن نظم لکھنوی نے ایک مثنوی 'لذتِ عشق' کے نام سے 'سحر البیان' کے جواب میں لکھی تھی، جو اُسی بحر میں تھی اور قصہ بھی کم و بیش وہی تھا، لیکن وہ انتہائی مخربِ اخلاق، عُریاں اور فحش تھی۔ اس کا ایک شعر ؎

سحر تک نہ سوئی، نہ سونے دیا
نہ موتی میں دھاگا پرونے دیا

اسی طرح سے خواجہ اسد علی خاں قلق لکھنوی کی مثنوی 'طلسم الفت' تعلقاتِ جنسی پر ایک فحش کتاب کی حیثیت رکھتی ہے :-

کیا کہیں تم سے کون ہیں، کیا ہیں　　　بلبلِ گلشنِ تمنا ہیں
محوِ روئے حبیب کہتے ہیں　　　عاشقِ بدنصیب کہتے ہیں
سرگذشت بلاکشاں نہ سنو　　　نہ سنو میری داستاں نہ سنو

نواب بادشاہ محل عالم لکھنوی نے بھی ایک مثنوی لکھی تھی لیکن وہ دستیاب نہیں۔ نواب مرزا شوق لکھنوی نے تین مثنویاں لکھی تھیں۔ 'زہرِ عشق'، 'فریبِ عشق' اور 'بہارِ عشق' فنکاری کے لحاظ اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے ان کا درجہ مثنوی 'بدرِ منیر' کے بعد ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ مثنویاں اتنی گری ہوئی ہیں کہ عرصے تک ان کی اشاعت سرکاری طور سے بند رہی تھی۔ بعض لوگ تو انھیں 'سحرالبیان' سے بھی بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر یہ مثنویاں اس قدر اخلاق سوز، عریاں اور فحش نہ ہوتیں تو یقیناً ان کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا۔ حکیم نواب مرزا شوق لکھنوی نے یہ مثنویاں واجد علی شاہ کے آخری دورِ حکومت میں لکھی تھیں۔ 'زہرِ عشق' کا نمونہ :-

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو　　　آج دل کھول کر گلے مل لو!
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں　　　ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں
یار اتنی نہیں ولاتے جائیں　　　پان کل کے لیے لگاتے جائیں
ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا　　　کل بسائیں گے قبر کا کونا

'فریبِ عشق' :-

بیوفائی میں، دل جلانے میں　　　تو تو مشہور ہے زمانے میں
جعل سازی یہ تجھ کو کیونکر آئی؟　　　ایک کو ساتھ، دوسرے کو بدھائی

'بہارِ عشق' :-

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا　　　چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا
چاق چوبند سینہ زوری میں　　　پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
حسن کے دن، جوانی زوروں پر　　　رات کی باسی مہندی پوروں پر

حکیم نواب مرزا شوق کے داماد حکیم آغا حسن ازل لکھنوی نے بھی ایک مثنوی 'سحرِ عشق' کے نام سے 'زہرِ عشق' کے جواب میں لکھی تھی، مگر وہ ناکام رہے۔ شیخ امان علی ساحر کے شاگرد سید غلام حسین

قادر بلگرامی نے ایک مثنوی 'قضا و قدر' کے نام سے ۱۸۵۷ء میں لکھی تھی، لیکن وہ مقبول نہ ہوئی۔ معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ اختر نے اپنی کئی مثنویاں کلکتہ، مٹیا برج میں اپنے ذاتی مطبع (مطبع سلطانی) میں طبع کرائی تھیں، مگر ان میں سے کوئی بھی قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ ان میں سے صرف ایک مثنوی 'حزنِ اختر' کسی قدر بہتر تھی۔ ناسخ کے شاگرد مرزا حاتم علی مہر لکھنوی نے ایک مثنوی 'شارعِ مہر' کے نام سے لکھی تھی جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ حافظ رحیم الدین کاکوروی نے ایک طویل مثنوی 'گلزارِ رحیم' کے نام سے "گلزارِ نسیم" کے جواب اور اُسی بحر میں لکھی تھی۔ اُنھوں نے 'قصۂ چہار درویش' کو بھی منظوم کیا تھا، لیکن وہ دونوں شائع نہ ہوئے۔ سید عبد الرزاق کلامی رائے بریلوی نے واقدی کی 'فتوح الشام' کا اردو نظم میں ترجمہ کیا مگر وہ ناکام رہا۔ منشی طوطا رام شایاں نے 'مہابھارت' کا اردو نظم میں ترجمہ کیا لیکن وہ بھی مقبول نہ ہوا۔ امیر مینائی کی دونوں مثنویاں، 'نورِ تجلی' اور 'ابرِ کرم' بھی ناکام کوششیں تھیں۔ داغ کی مثنوی 'فریادِ داغ' بھی مقبول نہ ہوئی۔

محسن کاکوروی نے تین مثنویاں لکھیں، 'صبحِ تجلی'، 'چراغِ کعبہ' اور 'شفاعت و نجات'، جو نعت میں تھیں۔ ساقی نامہ کا نمونہ :-

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر   سرسوں پھول ہوئی انگاروں پر
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو   تم تو بے مے پیے متوالے ہو
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک؟   روشنی شمعِ سحر کی کب تک؟

سید اسمٰعیل حسین منیر لکھنوی نے دو مثنویاں لکھیں، 'حجابِ زناں' اور 'معراج المضامین' (۱۸۶۹ء) ثانی الذکر شیعہ ائمہ کی ثنا میں ہے۔ اس کا نمونہ :-

بڑھی شعلہ کو لے کر بادِ صرصر   قیامت ہٹ گئی دامن بچا کر
جوانی تک توانائی کی تھی دھاک   گئی اکسیر، باقی رہ گئی خاک

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے اپنی پہلی مثنوی 'نالۂ تسلیم' واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں لکھی تھی، لیکن وہ مقبول نہ ہوئی۔ اُن کی دوسری مثنوی 'شامِ غریباں' (۱۸۶۲ء) کا بھی وہی حشر ہوا۔ اُنھوں نے دو مثنویاں اور لکھی تھیں 'صبحِ خنداں' اور 'دل و جان'۔ سید فرخ حسین فرخ نے اپنی مثنوی 'طلسمِ جہاں'، ۱۸۸۰ء میں مکمل کی تھی۔ اسی زمانے میں حافظ کریم بخش احقر نے اپنی مثنوی 'ترجمانِ عصمت' لکھی تھی، جو ایک ناکام کوشش تھی۔ میر مہدی حسن احسن لکھنوی کی مثنوی، 'جذبِ عشق'، حیدرآباد گزٹ پریس میں ۱۸۹۳ء میں چھپی تھی، مگر وہ معدوم ہے۔ حکیم جعفر علی بیمار نے 'گلشنِ جانفزا' کی مشہور

کہانی کو اپنی مثنوی 'زارِ جعفری' میں بیان کیا تھا۔ منشی انوار احمد تسلیم سہسوانی کی مثنوی 'سعدین' اور مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی کی 'دخترِ سحر' بھی اُسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ منشی احمد علی شوق قدوائی کی مشہور مثنوی 'ترانۂ شوق' ۱۸۸۷ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ پُرانے طرز کی آخری اردو مثنوی ہے، جو 'گلزارِ نسیم' کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ یہ اُردو میں عہدِ جدید کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ شوق قدوائی نے ایک اور مثنوی ڈرامہ کے طرز پر 'قاسم و زہرہ' کے نام سے لکھی تھی۔ 'ترانۂ شوق' کا نمونۂ کلام :-

صدمہ تھا، ملال تھا، قلق تھا — آنکھیں نیچی تھیں، رنگ فق تھا
سسکی لب پر، شکن جبیں پر — آنچل منہ پر، نظر زمیں پر
تارے گِن گِن کے رات کاٹی — کوئی بولا تو بات کاٹی
آنکھیں جو کُھلیں، نصیب سویا — کانپا، سہما، غریب رویا

سید ولایت علی فردوس نے اپنا منظوم 'قصۂ فسانۂ عجائب' نامکمل چھوڑا تھا۔ اس کا نمونۂ کلام :-

ہنس ہنس کے مجھے رُلائیں گے اور — بگڑوں گی جو میں، بنائیں گے اور
جب سامنے اُن کے جاؤں گی میں — آئے گی حیا، لجاؤں گی میں

جدید اُردو مثنویوں میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کی مثنوی 'خوابِ امن' لائقِ ذکر ہے۔ اس کا نمونہ :-

نیند کا جھونکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا — مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا
صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں — نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنوی 'حُبِّ وطن' مشہور ہے :-

اے وطن، اے میرے بہشتِ بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں؛
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

علامہ شبلی کی مشہور مثنوی 'صبحِ اُمید' کا ذکر ہو چکا ہے۔ مرزا محمد ہادی رُسوا لکھنوی کی مثنوی 'اُمید و بیم' بھی معروف ہے۔ اس کا نمونہ :-

ایک پری وش پہ طبیعت آئی — دل یہ سمجھا کہ قیامت آئی
وہ تڑپنا شبِ تنہائی کا — وہ بگڑنا دلِ سودائی کا

منشی احمد علی شوق قدوائی کی 'مثنوی حسن'، اور بے نظیر شاہ کی مثنوی 'الکلام'، دونوں کامیاب تھیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی مثنوی 'پریم درپن'، کا نمونہ:۔

دیکھا وہاں ایک حور لقا کو — حسن کی دیوی ہوش رُبا کو
سر سے پا تک نور کی صورت — تھی وہ پری یا حور کی صورت

[۱۔ 'کنول'، آگرہ، جنوری سنہ ۱۹۳۷ء 'نقدِ نظم اردو'، از حامد حسن قادری۔ ۲۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری'، از مولانا حالی صفحہ ۲۱۴-۲۲۔ ۳۔ 'روحِ تنقید'، از پروفیسر زور سنہ ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۰-۱۲۵۔ ۴۔ 'نگار'، لکھنؤ، فروری سنہ ۱۹۲۸ء 'مثنوی زہرِ عشق'، از احسن لکھنوی۔ ۵۔ 'ندیم'، بھوپال۔ اگست ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء۔ ۶۔ 'لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری'، از مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی۔ ۷۔ 'شعر الہند'، جلد دوم باب اول 'مثنوی'، صفحہ ۸۳-۱۶۴۔ ۸۔ 'تاریخ شعرائے اردو'، صفحہ ۱۳۶-۷۹۔ ۹۔ 'گلشنِ بیخار' صفحہ ۹۴۔ ۱۰۔ 'کاشف الحقایق' صفحہ ۳۳۷۔ ۱۱۔ 'تذکرۂ میر حسن'۔ ۱۲۔ 'ذکر بتقلید'۔ ۱۳۔ 'دریائے لطافت'، صفحہ ۲۳۹۔ ۱۴۔ 'تذکرۂ گلشنِ ہند'، از مرزا علی لطف، 'تذکرۂ میر'۔]

(۱۶)

رباعی

قطعہ میں اشعار کی تعداد کی کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن رباعی میں محض چار مصرعوں کی قید ہے۔ قطعہ اور رباعی کے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ اول الذکر کے تمام دوسرے مصرعے (پہلے نہیں) ہم قافیہ ہوتے ہیں، جبکہ ثانی الذکر کے پہلے دوسرے اور چوتھے (تیسرے نہیں) مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ رباعی کی بحر کا کوئی تعلق دیگر تمام اصنافِ شعری (غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ) سے نہیں ہوتا۔ رباعی کی مقرر کردہ بحر لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلّا بِاللہ ہے۔

(۱) اُردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرح، رباعی بھی شروع ہی سے عالم وجود میں آئی۔ مثلاً ۱۷۰۰ء سے قبل میر عبدالقادر حیدرآبادی نے یہ رباعی کہی تھی۔

ہر چند ہمن سب سے اٹھایا ہے بات اِس پر بھی نہ آزاد کہائے ہیہات !!
عالم منے (میں) ہر ایک یہ کہتا ہوگا دکھن میں ہے قادر اجُمن (ابھی) در قیدِ حیات

(۲) پہلے دَور کے بعد، دوسرے دَور میں، دہلی اور لکھنؤ کے تمام شعراء نے اُردو شاعری کے دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ رُباعیاں بھی کہیں۔ ۱۸۵۷ء تک برِصغیر میں رُباعی چنداں اہم نہیں سمجھی جاتی تھی اور اُردو شاعری میں اس کی حیثیت محض ضمنی تھی۔

(۳) اُردو رباعی کے تیسرے دَور میں، مرثیہ گو شعراء، بالخصوص انیسؔ و دبیرؔ نے رباعی کو خاص اہمیت بخشی۔ ان کے مراثی کی طرح، انیسؔ کی رباعیاں اُردو شاعری کی شہ رگ ہیں۔ انیسؔ کے بعد، پیارے صاحب رشیدؔ نے تو رباعی کی اہمیت کو چار چاند لگا دیئے۔

(۴) انیسؔ و دبیرؔ کے اتباع میں اُردو شاعری کے مصلحین شعراء نے رباعی کو کثرت سے استعمال کر کے اس کو ایک مستقل و ممتاز اہمیت بخشی۔ اس گروپ میں مولانا حالیؔ اور اکبرؔ الہ آبادی پیش پیش ہیں۔

(۵) جدید زمانے میں اُردو شاعری کے اندر رُباعی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اُردو شاعری کی حیات کی گذشتہ دو صدیوں میں بھی اتنی بڑی تعداد میں رباعیات نہیں کہی گئیں جتنی کہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے لیکر آج تک کہی گئی ہیں۔ عہد جدید کے بعض معروف شعراء نے بکثرت رباعیات کہی ہیں، مثلاً امجدؔ حیدرآبادی

۱ جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، سیماب اکبرآبادی ساغر نظامی اور رئیس امروہوی وغیرہ۔
میر تقی میر کی رباعی کا نمونہ :۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے　　خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر　　مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

میر حسن دہلوی :۔

دُنیاداری میں اور نہ دینداری میں　　چاہت میں کسی کی ہیں نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح　　سو یا کرتے ہیں عین بیداری میں

جعفر علی حسرت :۔

دل دردِ بتاں سے آہ کیونکر نہ کرے　　پر آہ تو تب کرے جو ان سے نہ ڈرے
وہ شکل ہے جیسے دشمنوں میں گھائل　　دم لیوے تو سر کٹے نہ دم لے تو مرے

عرب صنفِ رُباعی سے نابلد تھے، کیونکہ یہ صرف ایرانیوں کی تخلیق ہے۔ اُستاد رودکی (ابتدائی چوتھی صدی ہجری) اور امیر یعقوب بن لیث صفار (تیسری صدی ہجری کا وسط) رُباعی کے خالق کہے جاتے ہیں۔ بحرِ ہزج اپنی ۲۴ ایرانی اشکال میں رباعی کا ماخذ بتائی جاتی ہے۔ فارسی اور اُردو عروض میں ۱۹ بحر رائج ہیں، جن میں رباعی کی بحر بھی شامل ہے۔ بحرِ ہزج کے علاوہ کسی اور بحر میں رباعی کے کہنے کا دستور نہیں ہے، مثلاً غالب کی رُباعی "مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل" یا حالی کی رباعی "بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی" وغیرہ۔ فارسی میں حکیم عمر خیام اور شیخ ابوسعید ابوالخیر نے رباعی کو بڑی ترقی دی اور سرمد شہید تو محض ایک رباعی گو شاعر تھے۔ نیز سحابی استرآبادی۔ اُردو شاعری میں محض رباعی گو شعرا کا وجود نہیں ہے۔ خال خال ایرانی شعرائے نے رباعی کی مُسلّمہ ورائج بحر ہزج کے اُصول کو توڑا ہے، مثلاً بابا طاہر عُریاں ہمدانی (آخری تیسری اور ابتدائی چوتھی صدی ہجری) جو ایران کے ایک دیہاتی شاعر تھے۔ [ماہنامہ 'کنول'، آگرہ، سالنامہ، جنوری ۱۹۳۷ء، 'نقد و نظمِ اُردو'، از پروفیسر حامد حسن قادری۔ ماہنامہ 'نیرنگِ خیال'، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۶ء، 'الرُّباعی'، از عبدالرحمٰن لاہوری]

۱۷

سہرا اور عیدی

سہرا اُردو شاعری میں بالکل نئی اختراع ہے اور ہنود کی رسموں کے اتباع میں اختیار کیا گیا ہے۔ ہنود میں، خاص کر ہندوستان کے علاقہ راجپوتانہ میں مدت سے بھاٹوں کو استعمال کرنے کی رسم جاری تھی جو شادی بیاہ کے مواقع پر بات پکّی کرنے کے لیے دونوں (دولہا اور دولہن والوں) کی طرف جاکر گاتے بجاتے اور طرفین کے محاسن بیان کیا کرتے تھے۔ منظوم سہرے لکھنے اور گانے کی یہ ہندوانہ رسم بتدریج برِصغیر کے مسلمانوں میں بھی پھیل گئی اور شادی بیاہ کی رسوم کا ایک لازمی جُزو بن گئی۔ یہ بات متحقق نہیں ہے کہ آیا لفظ 'سہرا' سنسکرت سے مشتق ہے یا عربی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ عربی میں لفظ 'سہر' کے معنی ہیں 'شب بیداری' اور 'سہرا' 'محفلِ شب' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ 'سہرے' کا ماخذ ہنوز دریافت نہیں ہو سکا، لیکن یہ صرف اُردو شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ 'خزینتہ العلوم فی متعلقات المنظوم' کی رائے میں سہرا، شادی کی دیگر رسوم کے ساتھ، مراٹھی سے مستعار لیا گیا ہے۔ چونکہ سہرا ایک وقتی و ہنگامی موقع ہی کے لیے مخصوص ہے تمام اُردو شعرائے نے اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے اس کی تاریخی حیثیت اُن سہروں کے باعث ہے جو شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر غالب اور ذوق نے کہے تھے، جن کے باعث ان کے مابین حریفانہ معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ مولانا نظم طباطبائی (شرح دیوانِ غالب، از نظم طباطبائی) اور سید امداد امام اثر (کاشف الحقائق) دونوں نے ان دونوں سہروں پر تفصیلی بحث کی ہے، اور ثانی الذکر نے ذوق کے سہرے کو غالب کے سہرے پر ترجیح دی ہے۔

سہرے کی طرح ''عیدی'' بھی محض اُردو شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی 'عیدی' سُنیئے :-

کیا ہی معانقہ کی مچی ہے اُلٹ پلٹ — ملتے ہیں دَوڑ دَوڑ کے باہم جھپٹ جھپٹ
پھرتے ہیں دلبروں کے بھی گلیوں میں غٹ کے غٹ — عاشق مزے اُڑاتے ہیں ہر دم لپٹ لپٹ
کاجل، حنا، غضب، مسی و پان کی دھڑی — پشواز میں سُرخ سوہنی لاہی کی پھلجھڑی

کرتی کبھی دکھا، کبھی انگیا کسی کرتی ۔ کہہ عید عید، لوٹتے ہیں دل کو گھڑی گھڑی

ماسٹر باسط بسوانی :-

لائیں کہاں سے ہائے یہ سامان عید کا ! دستِ طلب سے دور ہے دامان عید کا
ہم غمزدوں پہ کچھ نہیں احسان عید کا دل ہی نہیں ہے، کیا کریں ارمان عید کا

متفرق :-

تمہارے ملنے کی ہے تمنا تمہاری ہی ہمکو جستجو ہے ہنسیں گے بولیں گے عید کے دن، گلے لگانے کی آرزو ہے
ہم تو ہیں پردیس میں اعظم، منائیں کیا خوشی دید کے قابل مگر اہل وطن کی عید ہے !
عید میں ملنے کا وعدہ تو کیا ہے مجھ سے دیکھئے ملتے ہیں یا رہتی ہے حسرت دل میں

[شعر الہند، از مولانا عبد السلام ندوی، سہرا، جلد دوم، باب دوم، ص ۲۸۳-۸۴ - مجموعۂ استفسار و جواب، از نیاز فتحپوری، عیدی، جلد اول]

۱۸

حمد، نعت، منقبت

مذہبی و صوفیانہ شاعری

اُردو شاعری کا آغاز مذہبی جذبات کے اظہار کے لیے ہوا تھا جو عرصے تک جاری و ساری رہے قدیم ترین شعرائے اُردو کے سرخیل سلطان قلی قطب شاہ تھے، جن کا تخلص "ظل اللہ" تھا اور جو ولی دکنی سے بہت پہلے ہوئے تھے۔ ان کے جانشین محمد قطب شاہ تھے۔ دونوں مذہبی شعرا تھے۔ قطب شاہ نے ایک نعتیہ مثنوی بھی لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائبریری میں برطانیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد محمد عادل شاہ کے عہد میں، مولانا نصرتی نے ایک "معراج نامہ" تصنیف کیا، جس میں ۱۳۰ اشعار ہیں اور جس کا حوالہ "تذکرۂ قدرت" میں درج ہے۔ خواجہ محمود بحری (حضرت محمد باقر کے مرید) نے ۱۱۱۲ھ میں "من لگن" کے نام سے اسلامی تصوف پر ایک مثنوی لکھی تھی۔ بحری بھاگ نگر میں رہتے تھے۔ یہ مثنوی بعدازاں حیدرآباد (دکن) کے نواب امین جنگ کی ملکیت ہوئی۔ "من لگن" کا نمونہ:۔

ہندی تو زبان ہے ہماری — کہتے نہ لگے ہمن کو بھاری
ہر بول میں معرفت کی بانی — سیتا کی نہ رام کی کہانی
دستورِ عمل ہے عاملاں کوں — دارُو ہے دُکھی پڑی دلاں کوں

اس قدیم زمانے میں مرثیہ کا آغاز بھی مذہبی اظہارِ جذبات کے باعث ہی ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ بقول صفیر بلگرامی (مصنف "تذکرۂ جلوۂ خضر")، "ولی دکنی سے پیشتر، اُردو شعرا کا کلام عام طور پر، مذہبی جذبات و احساسات سے مُتاثر تھا۔ اُسی زمانے میں، خواجہ حسن حسنی نے قرآن و حدیث کی روشنی میں "وحدت الوجود" کے عسیر الفہم صوفیانہ مسئلہ کو اُردو میں منظوم کیا۔ ایک اور شاعر کلیم نے شیخ محی الدین ابن عربی کی "فصوص الحکم" کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا ("تذکرۂ مصحفی")۔ میر فضل علی شاہ دانا (میاں شرف الدین مضمون دہلوی کے شاگرد)، جن کا تعلق شاہ برہان الدین کے مشہور صوفی خاندان سے تھا، خود ایک معروف صوفی تھے اور صوفیانہ شاعری کیا کرتے تھے ("تاریخ شعرائے اُردو" از مولوی کریم الدین ص ۸۳)

شیخ فرحت اللہ فرحت اُس دَور کے ایک اور صوفی اُردو شاعر تھے (تذکرہ میر حسن)۔ نیز میر ولایت اللہ خاں ۔ ان کے بعد خواجہ میر درد دہلوی نے اُردو میں صوفیانہ شاعری کی۔ اُن کے کلام کا نمونہ :۔

پھوٹے گی اس زبان میں گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

سودا اور میر نے بھی اپنی اپنی شاعری میں کثرت سے صوفیانہ اور مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دونوں نے متعدد قصاید نعت و منقبت میں کہے ہیں۔ میر حسن دہلوی نے اپنی صوفیانہ مثنوی رموز العارفین، مثنوی مولانا روم کے طرز پر لکھی تھی۔ اس کا نمونہ :۔

تلخ و شیریں ہو تو بولوں ماجرا | حبیب پر آتا نہیں اس کا مزا
بات ہے باہر بیاں سے اس کو تُو | جی ہی جانے ہے، بیاں ہے گو مگو

اُسی زمانے میں راسخ عظیم آبادی نے اپنی صوفیانہ مثنوی 'نور الانظار'، جامی کی 'سبحۃ الابرار' کی بحر میں لکھی۔ اس کا نمونہ :۔

ناگاہ ایک طیر نے فوراً آکر | جا کی اُس صاحب سِر کے سر پر
بعد ازیں ہاتھ پہ وہ آ بیٹھا | واں سے آغوش میں ٹک جا بیٹھا

لیکن اس دَور کے بعد اُردو شاعری اہل اللہ اور صوفیہ کے حجروں اور خانقاہوں سے نکل کر اُمرا و سلاطین کے درباروں میں داخل ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کے مذہبی اور صوفیانہ میلانات ختم ہو گئے اور ان کی جگہ دُنیا داری نے لیلی۔ بہ ایں ہمہ مصحفی نے کسی قدر صوفیانہ شاعری کو جاری رکھا۔ انشا نے بھی منقبت میں بعض قصاید لکھے، مع اس کے جس میں نقاط نہ تھے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا تھا ؎

ہلاؤ مروہ ہلے آہِ سرد کو ہر گام
کہ دل کو آگ لگا کر ہوا ہُوا آرام

اسی زمانے میں شاہ محی الدین اُویسی نے اُردو نظم میں تفسیر قرآن لکھی (تذکرۂ قدرت)۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی بعض آیات قرآنی کو اپنے مخصوص انداز میں اُردو میں منظوم کیا۔ اس کا نمونہ ؎

وقتِ سحر کی رُو میں کیا کیا ہُوں ہُوں کرتی ہیں
ہُوں ہُوں کر کر ذکر دگن، اور دُعا کُن کرتی ہیں

نظیر اکبر آبادی نے بے شمار مختلف موضوعات و عنوانات پر طویل نظمیں لکھی ہیں۔ اُردو شاعری کے

لکھنؤ اسکول کے عروج کے دوسرے دور میں، مذہبی وصوفیانہ شاعری سے اغماض برتا گیا اور لکھنؤ اسکول کے شعرائنے اسے مکمل طور پر نظر انداز کیا، البتہ دہلوی شعرائنے اس کی جھلملاتی شمع کو تھامے رکھا، مثلاً منقبت میں غالب کا یہ قصیدہ :-

خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا ۔۔۔ چشم نقش قدم آئینۂ بخت بیدار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستئ ناز ۔۔۔ عرض خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج غبار

شیعی شعرائنے نعت کم اور شیعی ائمہ کی شان میں منقبت زیادہ لکھی۔ سُنّی شعرائے اُردو کے سامنے فکرِ شعری کے لیے زیادہ وسیع میدان تھا مثلاً مومن دہلوی نے حمد و نعت کے علاوہ حضرت عمر فاروق رض اور حضرت عثمان غنی رض کی شان میں طویل قصاید لکھے۔

غالب اور مومن کے زمانے تک نعت و منقبت صرف قصیدے کی صورت میں کہے جاتے تھے، لیکن ان کے بعد مولوی غلام امام شہید نے ان کا دائرہ وسیع کیا اور اپنی مذہبی وصوفیانہ نظمیں اُردو شاعری کی ہر صنف (غزل، مثنوی، قصیدہ اور ترجیع بند وغیرہ) میں کہیں۔ ان کی "مولودِ شہید" اس کا ثبوت ہے۔ شہید کے کلام کا نمونہ :-

قدِ رعنا کی ادا جامۂ زیبا کی پھبن ۔۔۔ سُرمۂ چشم غضب، ناز بھری وہ چتون

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی ۔۔۔ دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اُسی زمانے میں لطف علی خاں لُطف نے خود کو ثنائے رسولِ مقبول ؐ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ :-

خُدا کے دوست پہ اے دوستو درود پڑھو
جہنمی ہو، بہشتی بنو، درود پڑھو

معروف شیدائے رسولِ عربی ؐ، شہیدی بریلوی بھی اسی عہد میں ہوئے۔ ان کی رحلت مدینہ منورہ میں ۱۸۴۰ء میں ہوئی تھی (تذکرۂ معاصر جہان ناب) اُس وقت شہیدی اپنا حسب ذیل قصیدہ روضۂ رسولِ کریم ؐ کے سامنے پڑھ رہے تھے :-

ہوئی ہے ہمت عالی میری معراج کی طالب ۔۔۔ میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیرے مرقد کا

کبھی نزدیک جا کر آستانے پر ملوں آنکھیں ۔۔۔ کبھی گرد دور بیٹھوں میں، کروں نظارہ گنبد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے ۔۔۔ قفس جس وقت ٹوٹے طائر روحِ مقید کا

اس کے بعد کے زمانے میں بہت تھوڑے اُردو شعرائنے نعت و منقبت کی طرف توجہ کی۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں، جلال نے ان اصناف پر قصاید لکھے۔ جو ان کے آخری دیوان "مضمون ہائے دلکش" میں شامل ہیں۔ امیر مینائی نے بھی اپنی زندگی کے آخر میں اردو شاعری کے ان اصناف کی طرف زیادہ توجہ دی اور متعدد مذہبی مثنویوں اور نظموں کے علاوہ صرف نعت پر ایک مکمل دیوان تصنیف کیا۔ لیکن محسن کاکوروی نے خود کو محض نعتِ رسول ؐ کے لیے وقف کر دیا۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن
کلام نعتیہ رکھا میری زباں کے لیے

اسی لیے وہ نعتیہ شاعری کے لیے معروف ہیں، لیکن ان کی زبان و پیرایۂ بیان کسی قدر دشوار ہے۔ اُن کا بیان کردہ سراپائے رسول ؐ :۔

کیوں نہ سو جاں سے ہو گلزار بہارِ معنی — محو رنگینیٔ تصویر سراپائے نبی ؐ
یہ وہ صورت ہے کہ دیکھی نہ سُنی ایسی کبھی — تھی یہی شکل مقدس کہ ازل میں جو کھنچی
ناز سے خامۂ قدرت نے کہا 'واہ رے میں' — بول اُٹھا عارضِ پُر نور کہ 'اللہ رے میں'

جدید زمانے میں، شاہ محمد اکبر ابو العلائی اور شاہ عبد العلیم آسی اردو میں مذہبی و صوفیانہ شاعری کے لیے مشہور ہوئے۔ مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، مولوی اسمٰعیل، اور عہدِ جدید میں فانی بدایونی نے صوفیانہ شاعری کی۔ شاہ تُراب علی کاکوروی، شاہ نیاز بریلوی، حضرت مولانا احمد رضا خاں رضا بریلوی ؒ اور محمد حسن رضا خاں حسن بریلوی خاص طور پر صوفیانہ شاعری کے لیے معروف ہیں۔ لیکن افسوس کہ نعتیہ شاعری کے لیے جو اعلیٰ معیار "مسدس حالی" نے قائم کیا تھا وہ دیگر شعرا نے قائم نہیں رکھا۔ الیاس برنی نے "معارفِ ملت" کی تین جلدوں میں عہدِ جدید کے اردو شعرا کی مذہبی شاعری کی بہت سی مثالیں دی ہیں جن میں نعتیہ شاعری کا بھی کافی مواد موجود ہے۔ لیکن عہدِ جدید میں بھی ہمیں نعتیہ شاعری کے ایسے نمونے ملتے ہیں :۔

سینے میں آجا او کملی والے — درشن دکھا جا او کملی والے
تُو مورا بالا، میں تیری چیری — تُو مورا راجا او کملی والے

حسن بریلوی کے نعتیہ کلام کا نمونہ :۔

اس تماشے کا کوئی دیکھنے والا ہوتا — وہ ہیں بے پردہ تو بےہوشِ تماشائی ہے
حسن جب مقتل کی جانب تیغ بُرّاں لے چلا — عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا
الٰہی وہ بے مہر شاداں رہے — کیا جس نے غم کے حوالے ہمیں

کلیجہ ہے بس میں، نہ قابو میں دل ہے   قیامت ہوا یاد آنا کسی کا !

[’شعر الہند‘ ’مذہبی شاعری‘، جلد دوم باب اوّل ص ۱۹۰-۲۰۷ ۔ ’صوفیانہ شاعری‘، ص ۲۰۸-۳۸ ۔
’دیوان ثمر فصاحت‘، از حسن رضا خاں حسن بریلوی سنہ ۱۹۰۱ء]

(۱۹)

واسوخت

مُتاخرین شعرائے ایران کے عہد میں، وحشی یزدی نے، جو ایرانی غزل گو شعرا کا سرخیل تھا، واسوخت کی بنا ڈالی، اور اردو میں عہدِ قدیم کے شعرائے اس کی نقل کی۔ سودا نے اس طرز پر ایک طویل واسوخت کہا ؎

شیشۂ دل کو میرے سنگِ ستم سے پھوڑا
دل نے میرے بھی مُنہ اب تیری طرف سے موڑا

میر حسن نے اپنے تذکرے میں محتشم علی خاں حشمت کے مشہور واسوخت کے چند اشعار نقل کیے ہیں اور اس طرزِ شاعری کی تعریف کی ہے۔ یہ بات ہنوز متحقق نہیں ہے کہ اردو میں واسوخت کا بانی کون تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے "تذکرۂ آبحیات" میں واسوخت اردو کا خالق میر تقی میر کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس دعوے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، لیکن میر یقیناً واسوخت میں مسدس کے طرز کے بانی تھے، کیونکہ ان کا دیوان اس امر کا شاہد ہے۔ "تذکرۂ گلدستۂ نازنینان" میں جرأت اور آتش دونوں کے واسوخت موجود ہیں۔ بعد کو لکھنوی شعرائے اس کو اپنایا اور امانت لکھنوی تو واسوخت نگاری ہی کے باعث معروف ہوئے۔ خواجہ آتش نے واسوخت کے انداز پر ایک مسلسل غزل کہی۔ اس کا نمونہ :-

خواہاں تیرے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے — یوسف تھا اگر تُو تو خریدار ہمیں تھے
بے اپنے بہلتی تھی طبیعت نہ کسی سے — دلسوز ہمیں تھے تیرے غمخوار ہمیں تھے
جب چاہتے تھے لیتے تھے آغوش میں تم کو — مجبور سے رہ جاتے تھے، مختار ہمیں تھے

دہلوی شعرا میں، مومن نے کئی واسوخت رقم کیے، جن میں ایک واسوخت مسلسل غزل کے طرز پہ بھی شامل ہے اور جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے ؎

اب اور سے لَو لگائیں گے ہم
جُوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

امیر مینائی کا مجموعۂ واسوخت "مینائے سخن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ میر کے مسدس کے طرز پر جو واسوخت کہے ان کا نمونہ :-

آیا گر غیر کے ملنے کی قسم کھاتا ہے　　میر بھی حرف درشتانہ سے شرماتا ہے
ذوق رلیا ہی ہے اُس کا، تو اُسے بھاتا ہے　　دل کو واسوز سے مُنہ پر یہ سخن لاتا ہے

ورنہ مشتاق ہے سو جی سے جگر خستہ ہوا
کُشتہ و مُردہ تیرا رفتہ و دل بستہ ہوا!

"آبحیات" کے مطابق، میر ضمیر نے مرثیہ میں سراپا کو پہلی بار متعارف کیا، جس کے بعد امانت لکھنوی نے اسے واسوخت میں شامل کر دیا۔ ("تذکرۂ مہر جہاں تاب"، "شعر الہند" جلد دوم، "واسوخت" ص ۹۰-۸۶]

۲۰

ہجو، ریختی، ہزل

ہجو قصیدے کی ضد ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تنقیص واقعات پر مبنی ہو، نہ کہ محض انتقاماً یا بدنامی و بدخواہی کی خاطر۔ اردو میں ہجو نگاری بیشتر شاکر ناجی، میر ضاحک، مرزا سودا، بقاء اللہ بقا اور انشا نے کی ہے۔ لیکن وہ بدکلامی و دشنام طرازی سے مملو ہیں۔ اُن کی ہجو نویسی خود اُنہی کے وقار کو نقصان پہنچانے کا سبب بنی۔ ہجو نگاری کے صحیح نمونے بعض مرثیوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً دبیر کا کلام:۔

ارزق یہاں برابرِ قاسم پہنچ گیا　　وہ صرصرِ خزاں، بہ گُلِ باغِ مجتبیٰ

اُس نے سپر کو پھینک دیا ہو کے خشمگیں　　مطلع سے دیں کے مقطعِ ایماں ہوا قریں

وہ اردو اشعار بھی جو واعظ، زاہد اور محتسب کے خلاف کہے گئے ہیں، ہجو کے ضمن میں آتے ہیں لیکن وہ بھی بیشتر ناشایستہ ہیں۔ مثلاً سودا ؎

ریش کو شملے سے بن باندھے تیرے چھوڑوں ہوں میں
ہاتھ آیا ہے میرے مضمونِ عالی محتسب

ناسخ کے عہد میں اس رجحان کی مخالفت ہوئی اور بہت کم اردو شعرا نے ہجو کی جانب توجہ کی حتیٰ کہ عہدِ جدید میں مولانا حالی اور مولوی اسمٰعیل نے اس صنف کو نہایت معقولیت و شائستگی کے ساتھ استعمال کیا اور اسے اپنی اصلاحی تحریک میں بطور حربہ جگہ دی۔ ان کے تیکھے اور تند اعتراضات اور تنقید ہمیشہ تعمیری انداز کی ہوا کرتی تھیں اور اخلاقی اصلاح ان کا مقصد ہوتا تھا [شعر الہند جلد دوم 'ہجو' صفحہ ۳۶۹-۳۷۰]۔

اردو غزل کی ایک مبتذل شکل کا نام 'ریختی' تھا، جس کے بانی لکھنوی معاشرت کے عہدِ ابتذال کے ایک شاعر سعادت یار خاں رنگین تھے ؎

کچھ نہ دم مارا میری خاطر سے اُس نے زینہار
میں نے جس جس طور سے چاہا تہ و بالا کیا

لیکن مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرہ 'گلستانِ سخن' (صفحہ ۲۴۵-۲۵۲) میں رنگین کے اس دعوے

کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ صنفِ ریختی کے بانی تھے، بلکہ اس کے آغاز کا سہرا انشا کے سر پر باندھتے ہیں اور رنگین کو انشاء کا محض معاون بتاتے ہیں۔ اُنھوں نے میر یار علی جان صاحب کو بہترین ریختی گو شاعر قرار دیا ہے۔ جان صاحب فرخ آباد میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے مگر ان کی زندگی لکھنؤ میں گذری۔ وہ نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے اور ۱۸۷۹ء میں فوت ہوئے تھے۔ جان صاحب کے کلام کا نمونہ ہے

ایسا نکھٹو پلّے سے میرے بندھا ہوا　　اُلٹا پڑا ہے جھگڑا گلے روٹی دال کا

'تذکرۂ مہرِ جہاں تاب' نے بھی 'تذکرۂ گلستانِ سخن' کی اس بارے میں تصدیق کی ہے کہ انشا ہی ریختی کے بانی تھے، لیکن اس کے برعکس خود انشا نے اپنی تصنیف 'دریائے لطافت' میں (ص ۹۵) رنگین کے اس دعوے کی حمایت کی ہے جو رنگین نے اپنے 'دیوانِ ریختی' کے دیباچہ میں کیا تھا کہ وہ ریختی کی صنف کے خالق ہیں۔ رنگین کا بیان ہے کہ "گندہ بروزہ با خشکہ خوردن ہر چند گندہ مگر ایجادِ بندہ"۔ انشاء کے اندازِ بیانِ ریختی کا نمونہ ہے

خط پڑھنے کو ڈیوڑھی کے اوپر چاہیئے کوئی بوڑھا سا
انشا تو ہے ہٹا کٹا، ہے یہ دوگانہ بات گڈھب

مولانا سید عبدالحیؒ اپنے 'تذکرۂ گلِ رعنا' میں رنگین اور انشاء دونوں کے دعاوی کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ علی عادل شاہ والیِ ریاست بیجاپور (دکن) کے درباری شاعر مولانا ہاشمی بیجاپوری (متوفیٰ ۱۶۹۷ء) مصنف مثنوی یوسف و زلیخا، صنفِ ریختی کے اصل بانی تھے اور ہاشمی کے بعد صاحبِ 'تذکرۂ گلِ رعنا' کو ولی دکنی کے ایک ہمعصر سید محمد قادر خاکی کے کلام میں ریختی کا پتہ چلا، جن کا مکمل دیوان (۱۷۶۸ء) علی گڑھ (انڈیا) کے قریب حبیب گنج میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی لائبریری میں موجود ہے۔

'خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم' مندرجہ بالا تمام آراکی تردید کرتے ہوئے ریختی کے ممکنہ بانی کی حیثیت سے دوسروں کی اس رائے کو نقل کرتا ہے کہ رحمن اور ولی دکنی کے ہمعصر رحیم اس صنف کے بانی تھے، لیکن اُس کی اپنی رائے میں ریختی کے موجدِ اوّل حضرت امیر خسروؒ تھے اور اس دلیل کے ثبوت میں خود امیر خسرو کا حسبِ ذیل مصرعہ پیش کرتا ہے۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

پھر وہ یہ نام لیتا ہے، یعنی انشاء، پنڈت راجہ رام بہادر، رنگین، جان صاحب، نازنین،

عیاشؔ، نازؔ اور اوباشؔ، جنہوں نے اُردو شاعری کی اس رکیک و مبتذل صنف کو ترقی دی۔ مولانا عبدالسلام ندوی مصنف تذکرہ 'شعرالہند' کی رائے میں رنگینؔ ہی صنفِ ریختی کے بانی تھے، جن کے حامی انشاؔ تھے اور جانؔ صاحب نے اسے بہت ترقی دی۔ مرزا قادر بخش صابرؔ مصنف 'گلستانِ سخن' (ص ۴۴۵) کے خیال میں نازنینؔ سب سے بڑے ریختی گو شاعر تھے، اور مولوی عبدالغفور خاں نساخؔ نے اپنے تذکرے میں اس رائے کی حمایت کی ہے۔ مرزا علی بیگ نازنینؔ دہلوی لکھنوی اسکول کے سب سے بڑے ریختی گو شاعر میر یار علی جانؔ صاحب کے ہمعصر تھے۔ نازنینؔ ذوقؔ کے شاگرد تھے اور ۱۸۵۴ء میں زندہ تھے ان کی رحلت کے ساتھ ساتھ دہلی میں ریختی بھی رخصت ہوگئی تھی۔ نازنینؔ کا نمونۂ کلام ؎

سونا کبھی شوہر کو میسّر نہیں ہوتا!
عورت، انھی باتوں سے تیرا گھر نہیں ہوتا

تاریخ گلزارِ آصفیہ، (ص ۵-۵۵۴) اور مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری کا تذکرۂ شعرائے دکن، (ص ۲-۹۴۱) دونوں ایک اور ریختی گو شاعر محمد صدیق قیسؔ حیدرآبادی کا حوالہ دیتے ہیں، جن کا انتقال رنگینؔ سے قبل ہو چکا تھا یعنی ۱۸۱۴ء میں۔ اس طرح قیسؔ رنگینؔ کے ہمعصر تھے لیکن وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی بھی اپنی تصنیف 'دکن میں اُردو'، (ص ۱۲۹) قیسؔ کا ذکر کرتے ہیں، جس کی کلیات میں ریختی پر ۴۴ صفحات ہیں۔ قیسؔ کی ریختی کا نمونہ:-

شعلہ سا ایک آنکھ میں میرے چمک گیا — سر پر سے اُنکے وہ جو کہیں ڈھلکی اوڑھنی
رات مجھے جگا جگا، تُو نے کیا ہے رت جگا — اب بھی نہیں ہے جی بھرا سونے دے مت جگا مجھے

ددؔ اور دکنی اُردو شعرائے، اشتیاقؔ اور محمودؔ، بھی غالباً ریختی گو شاعر تھے مولانا تمکین اکاظمی حیدرآبادی کا 'تذکرۂ ریختی'، اس موضوع پر اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ سید سرفراز علی جانیؔ اکبرآبادی (جن کا انتقال موجودہ صدی کے آغاز میں ہوا) بھی ایک کامیاب ریختی گو شاعر تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ ؎

خدا کرے کہ یہ اندھے ہوں دیکھنے والے
جو آنکھیں پھاڑ کے بھڑوے ادھر کو دیکھتے ہیں

دہلی اسکول کے ریختی گو شعرائے حسب ذیل تھے:

قیسؔ حیدرآبادی، انشاؔ، رنگینؔ، رائے گلاب چند ہمدمؔ اور نازنینؔ وغیرہ۔

لکھنؤ اسکول کے ریختی گو شعرائے:- آغا حجو شرفؔ، گلشن الدولہ، عابد مرزا بیگم، جانؔ صاحب اور نثار حسین خاں شیداؔ الہ آبادی وغیرہ۔

ہزل گو اُردو شعراء کے نام یہ ہیں :۔ (۱) میر جعفر زٹلی دہلوی۔ (۲) میاں چرکین دہلوی، جو لکھنؤ میں مصحفی کے ہمعصر تھے، اور (۳) میر صاحبقراں مارہروی، جو لکھنؤ آصف الدولہ کے زمانے میں آئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ لکھنؤ کے معروف نابینا حکیم سید حسن عسکری ان کے نواسے تھے ["شعر الہند" جلد دوم "ریختی" صفحہ ۸۴-۸۱ ۔ ماہنامہ "نگار" لکھنؤ، اگست سنہ ۱۹۲۹ء "ریختی" از سید تمکین الکاظمی ۔ "تذکرہ چمنستانِ شعراء" از رائے لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی "تذکرہ جان صاحب"۔ ماہنامہ "شاعر" آگرہ مئی سنہ ۱۹۳۸ء "رجائی اکبرآبادی" صفحہ ۲۴-۲۲]

(۲۱)

اُردو شاعری کی تجدید

اُردو شاعری کے آغاز سے قدیم اصنافِ شعری غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ اور واسوخت وغیرہ رہے ہیں۔ تین صدیوں سے زاید مدت سے تمام معروف اُردو شعرائے نے مذکورہ بالا کلاسیکی ادب ہی میں خامہ فرسائی کی ہے اور اس قدیم لٹریچر کے اردو میں موضوعات عشق و محبت، تعریف و تنقیص، وہم و گمان، حسن و ہوس رانی، اخلاقیات و فلسفہ، مذہب و تصوف وغیرہ ہی رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر موضوعات کو بہت کم چھیڑا گیا۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

رام بابو سکسینہ کی 'تاریخ ادب اُردو' (انگریزی) اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جس میں جدید نقطۂ نظر سے اُردو ادب کا مطالعہ کیا گیا اور اس پر بحث و تمحیص کی گئی ہے۔ لیکن اس میں اردو شعرا کا صرف عہد اصلاحات تک ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انگریزی ہی میں، سر شیخ عبدالقادر نے بھی اِسی موضوع پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی۔ دریں اثنا ڈاکٹر موہن سنگھ نے 'جدید اُردو شاعری' پر اپنی کتاب لکھی۔ پھر اس کے بعد انگریزی ہی میں، ڈاکٹر سید عبداللطیف نے حیدر آباد (دکن) سے اپنی تصنیف بعنوان 'اُردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر' پیش کی۔

اُردو شاعری میں جدید اصلاحات اس میں خاص طور پر تغزل کے قدیم و فرسودہ موضوعات کی جگہ تازہ وصحت مندانہ عنوانات کو متعارف کر کے اس کے دامانِ خیال و بیان کو مزید وسعت دینے کے لیے کی گئیں۔ یہ مقصد بحسن و خوبی مولانا حالی نے پورا کیا۔ لاہور میں، جب کرنل ہولرائیڈ HOLROYD (اُس وقت کے غیر منقسم پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات) نے جب اُردو زبان و ادب کی اصلاح کی جانب توجہ کی، تو اُنھوں نے ایک مشاعرے کی بنیاد بھی ڈالی۔ جس میں غزلوں کے لیے ایک مصرعۂ طرح کی جگہ نظم گوئی کے لیے ایک خاص موضوع مقرر کیا جاتا تھا۔ اس طرح رومانی شاعری کی جگہ مناظرِ فطرت، محسوسات و تجرباتِ انسانی کے نئے مضامین نے لے لی۔ اس جدید مشاعرے کے حامی و ہمنوا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی تھے۔ جنھوں نے اس میں حب الوطنی و عکاسئ فطرت کے موضوعات پر متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں پڑھیں۔ اِس طرح، ایک صدی سے زاید عرصہ پیشتر، اُس ادبی انقلاب نے

جدید اُردو شاعری کی بُنیاد ڈالی جس نے شاعری کو بے پناہ وسعت دی۔ ہم نے جدید اُردو شاعری کی نئی شاخوں کو حسبِ ذیل پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے :۔

(۱) جذباتی یا تخیلی شاعری، یعنی تغزل و تصوّف، جس میں قدیم و فرسودہ اسالیب بیان کی جگہ حقیقت نگاری و معقولیت، نفاست و وقار اور نئے اصُول کے ماتحت ذاتی جذبات و تجربات کے اظہار کو متعارف کیا گیا ہے۔ عہدِ جدید ہی میں بہترین غزل گو شعرا حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی اور جگر مرادآبادی وغیرہ ہوئے ہیں۔ انھی کے ضمن میں ریاض خیرآبادی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں دہلوی اور حفیظ جالندھری نے بڑی حد تک جدید اُردو غزل کو قدیم روایتی بحروں کی زنجیروں سے آزاد کیا اور اس میں غنائی عنصر کا اضافہ کیا۔ اصلاحِ غزل کے جوش نے اس کے اسلوب ہی کو یکسر بدل ڈالا۔ مولانا حالی نے اس میں اتنے مختلف موضوعات، اخلاقی، معاشرتی و وطنی، متعارف کئے کہ غزل کچھ اور ہی شے بن گئی۔ حالی کے بعد، مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور ان کے دیگر ہم خیال شعرا نے اُردو غزل کو اپنی پیغام رسانی کا ذریعہ بنا لیا۔ اُردو غزل میں ان بدعات و اختراعات نے، ہر چند کہ وہ اس کے دائرہ افادیت کو وسیع تر کرنے کا ذریعہ بنیں، اس کے روحانی جذبات اور نازک محسوسات کو برباد کر دیا۔ بایں ہمہ، بعض مشاق اُردو شعرا نے غزل میں اس چیلنج کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ غزل کی اصلی روح، روحانیت، کو بھی نباہا۔ ایسے شعرا میں، مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ، فراق گورکھپوری، وفا رامپوری (امیر مینائی کے شاگرد)، رضا علی وحشت کلکتوی (وحشت کی وفات ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ میں ہوئی اور وہ وہیں دفن ہوئے (غالب کے معروف پیرو) اور مولانا محمد علی جوہر رامپوری (غالب کے ایک اور کامیاب متبع) ہیں۔ وفا رامپوری کا نمونۂ کلام :

بزمِ نظارہ ہے پھر آج سراپا گستاخ ‏ ‏ ‏ ‏ جلوہ بیباک، نگاہ شوخ، تماشا گستاخ
تم ہو آغوشِ تصوّر میں، کہاں کی تمکین ‏ ‏ ‏ ‏ شوق بدمست ہے اور دستِ تمنا گستاخ

مولوی رضا علی وحشت کلکتوی :۔

مبارک ہو مجھے موقع فریب تازہ کھانے کا ‏ ‏ ‏ ‏ کیا ہے پھر میرے پیمان شکن نے وعدہ آنے کا
اب عام ہے وہ لطف، کہ تھا خاص میرے ساتھ ‏ ‏ ‏ ‏ جو دلنواز تھا، وہ دل آزار ہو گیا

مولانا محمد علی جوہر رامپوری :۔

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں ‏ ‏ ‏ ‏ اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — ایک فاسق و فاجر میں اور اتنی کرامتیں!
مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی
ہوں لائقِ تعزیر پر الزام ہے جھوٹا — مجرم تو ہوں بیشک پہ خطا اور ہی کچھ ہے
ہم خواستگانِ اہلِ نظر اور یہ قتلِ عام؟ — جور و ستم بھی کر تو ستمگار دیکھ کر

(۲) تشریحی شاعری یا فطرت نگاری و منظر کشی :- اس قسم کی شاعری کے عنوان سے ہی اس کے مضامین کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی اُردو شاعری کے اولین اساتذۂ سخن نظیر اکبرآبادی، میر حسن دہلوی اور میر انیس وغیرہ تھے۔ بعد کو ان کی جگہ حالی، آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، سلیم پانی پتی، افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، سرور جہان آبادی، پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی، آنند نرائن مُلا، چکبست لکھنوی اور علی اختر حیدرآبادی وغیرہ نے لے لی۔ نظیر اکبرآبادی اس شعبہ میں ان سب کے سرخیل تھے۔ نظیر کی منظر کشی کا ایک نمونہ (خمسہ):-

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے — جگنو چمکتے پھرتے، جوں آسماں پہ تارے
لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے — گرتی ہے چھت کسی کی، کوئی کھڑا پکارے
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

نظیر کے بعد، سوائے اُن شعرائے کے جنہوں نے مثنویاں اور مرثیے لکھے، بہت کم اُردو شعرا نے اِس اسلوب شاعری کی طرف توجہ کی۔ آخرِ کار حالی نے اپنی مشہور نظم 'برکھارُت' کے ذریعہ سے جو اُنھوں نے پہلی مرتبہ انجمن پنجاب، لاہور کے تاریخی مشاعرے میں پڑھی تھی، اس اسلوب شعری کا احیا کیا۔ بعدازاں بے نظیر، اوج گیاوی، محسن کاکوروی، شوق قدوائی، سرور جہان آبادی اور ظفر علی خاں وغیرہ نے اس طرز میں طبع آزمائی کی۔ شوق قدوائی کا نمونۂ کلام:-

بہار آئی ہے نیچر اپنی نقاشی دکھاتا ہے — بہت رنگین نقشہ سامنے آنکھوں کے لاتا ہے
دُلھن کی شکل ہر گل نے لباسِ سُرخ پہنا ہے — شجر کے جسم پر کیا خوشنما پھولوں کا گہنا ہے

اس عنوان کے ماتحت اُردو مثنویاں اور مرثیے بھی آتے ہیں۔ اُردو شاعری میں 'دیہاتی شاعری' کی بھی بڑی کمی ہے، البتہ نظیر، میر حسن، انیس و دبیر اور اسمٰعیل میرٹھی اور عہدِ جدید میں حکیم جگر بسوانی اور ماہ عظیم آبادی وغیرہ کے کلام میں اس طرزِ شاعری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

(۳) بیانیہ یا واقعاتی و تاریخی شاعری :- جنگ نامے، مرثیے، مدح اور ڈرامے وغیرہ سب اس عنوان شاعری کے ماتحت آتے ہیں، جس میں مثنویاں اور دیگر طویل نظمیں بھی شامل ہیں۔ اُن

نظموں کے علاوہ جو اسلامی ثقافت سے متعلق ہیں اُردو کے ہندو شعرا نے بھی اپنے مخصوص مذہبی موضوعات پر نظمیں کہی ہیں، مثلاً سرور جہان آبادی اور چکبست لکھنوی دونوں کی منظوم اُردو رامایَن۔ عہدِ جدید میں حفیظ جالندھری نے اپنے طویل شاہنامۂ اسلام کے پہلے حصّے میں اسلام کی جو تاریخی و واقعاتی عکاسی کی ہے، وہ اس زمرے میں آتی ہے۔

اُردو شاعری اس شعبہ میں خاص طور پر ممتاز ہے کیونکہ اس کے ضمن میں تمام مثنویاں اور دیگر بیانیہ نظمیں آتی ہیں۔ عہدِ جدید میں، شوق قدوائی کی مثنویاں، نظم طباطبائی، محسن کاکوروی اور کیفی حیدرآبادی نیز عزیز لکھنوی کے قصاید، اور سرور وغیرہ کی نظمیں اس شعبہ میں داخل ہیں۔ اُردو ناٹک اور ڈرامے بھی شاعری کی اسی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرر، رُسوا اور کیفی حیدرآبادی کی ڈرامائی نظمیں بھی قابلِ لحاظ ہیں اور آغا حشر کاشمیری کا نام بھی اس ضمن میں لینا ضروری ہے۔

مدحیہ شاعری کے سلسلے میں، حالی نے روایتی غیر حقیقی قصیدہ گوئی سے انحراف کیا اور ایسے قصاید لکھے جو صداقت و حقیقت پر مبنی تھے۔ ان کے بعد محسن کاکوروی اور بالخصوص نظم طباطبائی نے اس میں نام پیدا کیا۔ مؤخر الذکر کی اُردو شاعری ان کے قصاید کے باعث ممیز ہے، جن میں قدیم فارسی شاعری کا زور اور حالی کی سادگیٔ بیان ملے جُلے ہیں۔

مراثی داخلی بھی لکھے جا سکتے ہیں اور خارجی بھی، دونوں طرح۔ حالی نے اُردو مرثیہ میں بھی قابلِ تعریف اصلاحات کیں۔ مرزا غالب اور حکیم محمود خاں پر ان کے مرثیے خلوصِ جذبات، سادگی، حقیقت نگاری اور اثر اندازی کے لحاظ سے ان کے عظیم شاعرانہ شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے نظم طباطبائی نے اُردو میں مغربی اسالیبِ بیان کو متعارف کیا۔ ان کی نظم 'گورِ غریباں'، جو تھومس گرے THOMAS GRAY کی شہرۂ آفاق نظم ایلیجی ELEGY کا اُردو ترجمہ ہے، اُردو شاعری کا شاہکار باور کی گئی ہے۔ مولانا علی حیدر طباطبائی نے اُردو میں انگریزی طرزِ شاعری کو مقبول بنانے کی کوشش کی، جس کا اعتراف کیا گیا۔

(۴) <u>قومی و سیاسی یا پیغامیہ شاعری</u>: اس طرز کے معروف اُردو شعرا نظیر، حالی، آزاد، شبلی، سلیم پانی پتی، اقبال، ظفر علی خاں، جوش اور احسان دانش وغیرہ تھے۔ مولانا حالی پہلے شاعر تھے جنھوں نے اُردو میں جدید قومی شاعری کی بنا ڈالی۔ ان کی مثنوی 'حُبِّ وطن'، جسے اُنھوں نے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب، لاہور کے مشاعرے میں پڑھا تھا، اس نوع کی اُردو شاعری کی شاہراہ کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا نمونہ :-

قوم سے جان تک عزیز نہو　　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہو
عزتِ قوم چاہتے ہو اگر　　　جاکے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر

اُسی مشاعرۂ لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد نے وہی گیت ان الفاظ میں گایا تھا:۔

آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو　　　ہاتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو
ہر حال میں رہے اُسے اہلِ وطن عزیز　　　اور ہوویں نیک و بدروشِ جان و تن عزیز

چکبست لکھنوی نے ہندوستان کی قدیم عظمت پر ۱۹۰۵ء میں ایک نظم لکھی تھی۔ نیز "ہوم رول" پر ۱۹۱۷ء میں۔ علامہ اقبال نے حبّ الوطنی کے موضوع پر جو مخمس لکھا تھا اس کا نمونہ یہ:۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سُنایا　　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　　جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

سُرور جہان آبادی نے بھی بڑے مؤثر انداز میں حبّ الوطنی کا گیت گایا ہے۔ مولانا حالیؔ نے سیاسی نظمیں بھی لکھی تھیں۔ مندرجہ ذیل نظم میں اُنھوں نے اپنے زمانے کے غدّار سیاست دانوں کی سخت مذمت کی ہے:

اے بزمِ صغیرانِ دُوَل کے سخن آرا　　　ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
دل کی تیرے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات　　　گونگا نہیں، گویا نہیں، کیا جانیے کیا ہے

علامہ شبلیؔ کی سیاسی شاعری کا نمونہ:۔

تم کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو　　　وہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں　　　کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہم رنگِ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے　　　کر دئے دم میں قوائے عملی سب بیدار

اُسی زمانے میں اکبر حسین اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اُردو میں اتنی سیاسی نظمیں لکھیں کہ اگر وہ سب جمع کی جاتیں تو اُن سے اُس عہد کی سیاسی تاریخ مُرتب ہو سکتی تھی۔

حالیؔ اُردو میں قومی شاعری کے بھی بانی تھے، جس کا آغاز، سرسید کی ترغیب سے، اُنھوں نے اپنے مشہور و مقبول 'مُسدس'، سے کیا تھا۔ ان کے بعد، مولانا شبلیؔ، مولوی نذیر احمد اور مولوی اسمٰعیل نے بھی قومی نظمیں کہیں۔ شبلیؔ نے اپنی جو متعلقہ نظم ۱۸۹۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی تھی، وہ اس طرح شروع ہوئی تھی ۔

ابھی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی
شرر گو بجھ چکا پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر

ہر چند کہ مولانا نذیر احمد کوئی باقاعدہ شاعر نہ تھے، بر ایں ہمہ انھوں نے اُردو میں بعض نہایت عمدہ قومی نظمیں کہی ہیں۔ ان کا نمونہ کلام:-

حسنِ صورت محض بے رونق ہے سیرت کے بدوں ۔۔۔ جن گلوں میں بو نہیں، وہ خوشنما کینے کو ہیں
عالمانِ دین کہ از رُوئے حدیث معتبر ۔۔۔ پیشوا و مُقتدا ورہ نما کینے کو ہیں

مولانا اسمٰعیل نے "قلعۂ اکبر آباد" پر ایک طویل نظم لکھی تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے ملّت اسلامیہ کے قومی زوال کا سبب جدید مغربی تعلیم بتایا، جس نے مسلمانوں کو اپنے دین سے انحراف کرنے پر اُکسایا اس نظریہ نے اُردو میں قومی شاعری کی کایا پلٹ دی۔ ان کی مشہور نظم "شکوہ" اسی نظریہ سے متعلق ہے:-

اُمتیں اور بھی ہیں، اُن میں گنہگار بھی ہیں ۔۔۔ عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں ۔۔۔ سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر ۔۔۔ برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

(۵) اخلاقی و فلسفیانہ شاعری:- اُردو کی اخلاقی و فلسفیانہ شاعری کے درمیان حدِ فاصل محض دُھندلی سی ہے۔ مذہبی و صوفیانہ شاعری ان کے ماتحت ضمنی ہے۔ دُنیا کی کوئی زبان اخلاقی شاعری کے میدان میں فارسی شاعری کا مقابلہ نہیں کرسکتی، جس کے سرخیل سعدی شیرازی تھے۔ میر درد دہلوی نے اُردو شاعری میں کم و بیش وہی کردار ادا کیا، جن کا کلام نہ صرف اسلامی تصوف و اخلاق سے بلکہ کسی حد تک ہندو ویدانت سے بھی متأثر ہے، جیسا کہ اُردو کے ہندو شعرائے مہر، شیدا اور شیو برت لال وغیرہ کی نظموں سے ظاہر ہے۔

جدید اُردو شاعری میں، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولوی اسمٰعیل نے اخلاقی شاعری کے مختلف موضوعات پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ مولانا شبلی نے بھی اس میدان میں قابلِ قدر کام کیا۔ اکبر الہ آبادی کی بھی اخلاقی نظمیں معروف ہیں۔

اگرچہ اُردو شاعری نے فلسفیانہ شاعری کے آغاز میں مخصوص فلسفی شاعر پیدا نہیں کئے لیکن بعض اساتذہ، مثلاً درد، میر اور غالب نے ایسے اشعار کہے ہیں جو اس خاص شعبۂ شاعری سے متعلق ہیں۔ علامہ اقبال اُردو کی فلسفیانہ شاعری کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔

سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس طرح جدید اردو شاعری کے معمار و رہنما یہ اساتذہ ہوئے: مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، حافظ نذیر احمد، مولوی عبدالحلیم شرر، علامہ شبلی، سید رضی الدین حسن کیفی حیدرآبادی (۱۸۶۰ء ۔ ۱۹۲۰ء)، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، محسن کاکوروی، سید محمد بے نظیر شاہ، علامہ اقبال، سلیم پانی پتی، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، عظمت اللہ خاں دہلوی، جوش ملیح آبادی، امجد حیدرآبادی، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، راز چاند پوری، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، اختر شیرانی، مجنوں گورکھپوری، روش صدیقی، احسان دانش، اکبر حیدری، علی اختر، فراق گورکھپوری، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر رامپوری، تلوک چند محروم اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی وغیرہ۔

سید محمد بے نظیر شاہ ۱۸۶۶ء میں کڑہ مانک پور (ضلع الہ آباد، یو پی، انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے عمر کی عمر حیدرآباد (دکن، بھارت) میں گذری۔ ان کے پدر بزرگوار مولانا شاہ احسان علی مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی کے خلیفہ تھے۔ بے نظیر شاہ خاص کر اپنی مشہور صوفیانہ مثنوی "اکلام" (۱۹۰۸ء) کے باعث معروف و مقبول ہیں۔ جس نے جدید اردو شاعری میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا اور جس کو محققین میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کے بعد دوسرا درجہ دیتے ہیں۔ مثنوی "الکلام" میں صبح کا منظر:۔

صبا صبح کی پھیلی اطراف میں شب ہجر جا کر چھپی قاف میں
شفق پھول کر رنگ لانے لگی نئی آگ دل میں لگانے لگی

اُڑا ہر طرف رنگِ صبحِ بہار فلک پر کھلا یک بیک سبزہ زار
ہوا صبح صادق کا جس دم یقیں تو بستر سے اُٹھنے لگے نازنیں

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی (۱۸۷۳ء ۔ ۱۹۱۰ء) ولد حکیم پیارے لال، قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت، روہیلکھنڈ، یو پی، انڈیا کے ساکن اور ہندو جاتی کے سکسینہ کالستھ تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ حکیم اور شاعر سید کرامت حسین بہار، بیان اور یزداں میرٹھی کے شاگرد تھے۔ مالی اعتبار سے ان کی زندگی شدید عسرت میں گذری حتیٰ کہ وہ زندہ رہنے کے لیے اپنا کلام فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ جوان العمر فوت ہوئے، جبکہ وہ صرف ۳۷ سال کے تھے۔ وہ جدید اردو شاعری کے بہترین شعراء میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے مختلف مقامی اور وطنی موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھیں۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے شاعرانہ کلام کا مجموعہ انڈین پریس، الہ آباد نے جام سرور

کے نام سے شائع کیا۔ سرور کا نمونۂ کلام:-

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا | کہ گذر گئی شب آدھی، دلِ بیقرار سو جا!
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے تیز جھونکے | تجھے دے رہے ہیں لوری، دلِ بیقرار سو جا
تجھے پہلا سابقہ ہے، شبِ غم بری بلا ہے | کہیں مر مٹے نہ ظالم، دلِ بیقرار سو جا!

سید احمد حسین امجد حیدر آبادی (پیدائش ۱۸۸۶ء) اردو میں واحد رباعی گو شاعر ہوئے ہیں، جنہیں اردو شاعری کا سرمد کہا گیا ہے۔ امجد ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کے والد صوفی سید رحیم علی ساکن حیدر آباد (دکن) تھے۔ وہ اپنی عمدہ رباعیات کے باعث مشہور ہیں۔ ۱۹۰۸ء کے ایک حیا نکاہ حادثے میں ان کا پورا گھرانا موسیٰ ندی میں ڈوب گیا تھا اور وہ تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ ان کی نظم "قیامتِ صغریٰ" اسی دلخراش حادثے پر لکھی گئی تھی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "ریاضِ امجد" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

حفیظ، جوش اور اختر شیرانی کی طرح ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ بھی شباب و رومان کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں تغزل کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہندی ادب کے ادیب ہیں اور انھوں نے اپنی نظموں میں ہندی اور اردو دونوں کے عناصر شعری کو باہم گر سمونے کی کوشش کی ہے جو بیشتر جذباتی ہیں۔ انھوں نے بعض وطنی و قومی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کا نمونۂ کلام:-

اے غنچہ کس صبا کا ہے انتظار تجھ کو؟ | کس لب کی تشنگی ہے پیل و نہار تجھ کو؟
کس رازداں سے تجھ کو ملنے کی آرزو ہے؛ | کس ترجماں کی تجھ کو ہر لحظہ جستجو ہے؟

عظمت اللہ خاں دہلوی ۱۸۸۷ء میں پیدا اور ۱۹۲۷ء میں فوت ہوئے تھے۔ وہ پیدا تو دہلی میں ہوئے تھے لیکن جوانی ہی میں حیدر آباد (دکن، ہند) میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے والد کا نام نعمت اللہ خاں تھا۔ عظمت اللہ خاں کا شمار اردو شعرا کے ترقی پسند، آزاد خیال اور آزاد رو گروہ میں ہوتا ہے۔ وہ اردو شاعری میں ایک نئے مکتبۂ فکر کے بانی تھے۔ ان کی شاعری کی خصوصیت اردو شاعری میں ہندی بحروں اور موضوعات کو سمونا اور نسوانی جذبات و محسوسات کی مؤثر ترجمانی تھی۔ گو تعداد کے لحاظ سے ان کا کلام کم ہے لیکن انھوں نے جو کچھ کہا ہے، بہت خوب کہا ہے۔ ان کا شاہکار ان کی آخری نظم "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" تھی۔ اس کا نمونہ:-

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا | میرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کسی پل نہ ملا | میرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

مولانا ظفر علی خاں موضع کوٹ مہرتھ (ضلع سیالکوٹ، پنجاب) میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا نام سراج الدین احمد خاں تھا۔ ظفر علی خاں ایک شعلہ بیان مقرر، ادیب، بدیہہ گو شاعر، طنز نگار، مشاق صحافی، سیاست داں، اسلام کے مجاہد اور مسلمانوں کی آزادی کے زبردست علم بردار تھے۔ وہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے برسوں تک قید و بند میں رہے لیکن انھوں نے برطانی حکام کے سامنے کبھی سر نہ جھکایا۔ ان کی بےخوف تحریروں کے باعث ان کا روزنامہ 'زمیندار'، لاہور ناقابلِ بیان مصائب سے دوچار رہا۔ ان کا نمونۂ کلام :-

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں　　اک روز جھلکنے والی تھی کل دنیا کے درباروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا　　وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

['جدید اردو شاعری' از پروفیسر عبدالقادر سروری، حیدرآباد (دکن)، ۱۹۳۲ء 'شعر الہند' از عبدالسلام ندوی، جلد اوّل و دوم۔ ماہنامہ 'جامعہ'، دہلی 'جدید اردو شاعری کے بعض میلانات'، از آلِ احمد سرور، جون۔ جولائی ۱۹۳۰ء۔ ماہنامہ 'کنول'، آگرہ، فروری۔ 'اردو انٹرمیڈیٹ کورس'، از عبدالشکور بریلوی اور آسی ۱۹۳۶ء]

۲۲

اُردو کے ان پڑھ شعراء

(۱) غلامی، ایک چپراسی، جو دہلی کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں ان کے متعلق اچھی رائے نہیں دی ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ:

سُرخ لاتی ہیں نشے بیچ جو ڈورے انکھیاں
دلِ زخمی پہ لگاتی ہیں ٹکورے انکھیاں

(۲) میر عبداللہ غمگین، میر حسین تسکین دہلوی کے بیٹے اور شاگرد، جو جوانی ہی میں فوت ہو گئے تھے

کمی کریں جگر و دل تو کیا کروں یا رب
کچھ اور دے مجھے مژگانِ خونفشاں کیلئے

(۳) بنّو فصاد دہلوی، ایک حجام اور شاہ نصیر کے شاگرد

بادہ کے ہیں پینے سے کیا کام ہے ساقی
مے خونِ جگر آبلہ ہے جام ہمارا

(۴) فضل مولا خاں فضل لکھنوی ثم دہلوی دہلی اور مرشد آباد دونوں میں شاعرِ دربار رہے اور کلکتہ میں جوان فوت ہوئے

جس جگہ جا بیٹھنا ناصح کو کچھ کہنا ضرور
کیا کرے عادت سے وہ بیچارہ خود مجبور ہے

(۵) محمد علی خاں آزاد (متوفی ۱۸۵۹ء) ولد قادر خاں بدایونی

شہرہ تیرے وحشی کا ہے گھر گھر کئی دن سے
کوٹھوں پہ چُنے جاتے ہیں پتھر کئی دن سے

(۶) غالب علی غالب، بدایوں کے ایک برف فروش

بادل گرج رہا ہے یہ طوفانِ آب ہے
غالبؔ ہمارے برف کی مٹی خراب ہے

(۷) واحد علی داغؔ غالب علی غالبؔ بدایونی کے فرزند ؎

رات غصے میں آ کے ساقی نے
توڑ ڈالے سبُو تڑاق پڑاق

(۸) واحد علی واحدؔ ساکن بریلی (روہیلکھنڈ، یو۔پی۔ انڈیا) گرمیوں میں برف اور سردیوں میں چائے بیچا کرتے تھے ؎

درد اُٹھانے کے لیے ضعف بٹھانے کیلئے
تیرے بیمار کی یہ دو ہی خبر رکھتے ہیں

(۹) مرزا چپاتی دہلی میں ایامِ زوال کے ایک مفلوک الحال مُغل شہزادے، جو روزی کمانے کے لیے پتنگیں بنایا اور بیچا کرتے تھے۔ وہ ۱۹۰۳ء کے دہلی میں جشن تاجپوشی کے دربار میں شریک ہوئے تھے ؎

شاہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

(۱۰) سید احمد حسین نقو صاحب شفیقؔ (پیدائش ۱۸۶۸ء) لکھنوی، پیارے صاحب رشیدؔ کے شاگرد اور دیوان عطیۂ الٰہی کے مالک (۱۹۱۶ء) ؎

کچھ آپ نہ گھبرائیں، یہ شیوۂ عاشق ہے
ہر بات پہ جی جانا، ہر بات پہ مر جانا

(۱۱) الٰہی بخش صابرؔ ولد مولا بخش بہاری کلکتہ اور بمبئی میں پھیری لگا کر جرابیں اور بنیائن وغیرہ بیچا کرتے تھے ؎

فراغت سے بیٹھے نہ دم بھر کہیں ہم
مٹی ہائے کیا نوجوانی ہماری

(۱۲) شیخ مُراد بخش ضاحکؔ دہلوی صُوفی حجام تھے ؎

مجھ کو مارا ہے کئی سنگ دلوں نے ضاحکؔ
سنگِ مرمر سے ہو تعمیر میرے مدفن کی

(۱۳) اسلام علی ریاضت عبداللہ لکھنوی کے بیٹے اور سید آغا حسن امانت لکھنوی کے گھر بلو خادم تھے

ے حسرت سے پسکے ہوگیا دل میرا پایمال

اُس شوخ نے دکھائے جو مہندی لگا کے ہاتھ

(۱۴) شیخ بلاقی زار (پیدائش ۱۸۱۴ء) ولد شیخ سعد اللہ لاہوری، حاتم علی مہر کے شاگرد تھے اور آگرے میں ایک جوہری کے ہاں کاریگر کے طور پر ملازم تھے ے

دل میں، جگر میں، سینہ میں یکساں ہے درد آج

اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت!

(۱۵) خلیفہ محمد علی گھیسا سکندر پنجابی لکھنؤ میں رہتے اور ناجی دہلوی کے شاگرد تھے ے

غیر کیا چیز ہے محفل سے اُٹھا دوں پل میں

کیا کہوں، کہہ نہیں سکتا میں تمہارا مارا

(۱۶) سلیم اللہ سلیم ڈھاکہ کے باشندے اور کلکتہ میں دلالی کا کام کرتے تھے ے

جی بچیں گے جو اُن کے آزار سے

نام لیں گے نہ پھر محبت کا

(۱۷) دولت رام شفق ایک باغبان تھے اور دہلی میں اُن کی پھولوں کی دُکان تھی ے

دل مرحوم کا مدفن زیارت گاہ بن جائے!

شفق چھوٹی سی اک تربت بنا دو کوئے دلبر میں

(۱۸) مہر علی ثبات بُدھانہ (ضلع مظفر نگر متصل دہلی) کے باشندے تھے لیکن دہلی میں مقیم ہو گئے تھے ے

اگلی لگاوٹیں بھی ذرا یاد کیجیے

دل لیکے میرا آنکھ چُرانا نہ چاہیے

(۱۹) غلام ناصر جرّاح کاشمیری دہلی میں حجّام تھے۔ "گلشنِ بیخار" کے مصنف نے ان کی تعریف کی ہے ے

ایک دم نہیں ہے اُس بُتِ خورشید رُو کو چین

پھرنے میں جیسے کوکب سیّار گرم ہے

(۲۰) رحیم اللہ رحمو جوشش دہلی میں ۱۸۹۳ء میں زندہ تھے ے

دریا میری آنکھوں سے نت جاری لہو کا ہے
بیدرد تو کیا جانے، کیا حال کسو کا ہے

(۲۱) گُل محمد چمن کاشمیری دہلی میں رفوگری کا کام کرتے تھے ؎

ہر شب جس ماہ نے زلیخا کے اُڑائے خواب میں
ہم بھی اے ہمدم اُسی کے دیکھنے والوں میں ہیں

(۲۲) عنایت اللہ کلّو حجّام سہارنپوری صوفی مشرب اور دہلی میں حجّام تھے۔ وہ سوداؔ کے شاگرد اور اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں زندہ تھے ؎

کل میاں حجّام سب کا مُونڈتے پھرتے تھے سر
آج اُسی کوچے میں اُن کی بھی حجامت ہو گئی

(۲۳) مرزا حسام الدین حیدر حسامی ولد مرزا خانی دہلوی، خدا بخش خاں تنویر کے شاگرد اور ایک پیشہ ور قصہ گو تھے۔ وہ دہلی میں ۱۸۸۲ء میں زندہ تھے ؎

یہ زمانہ ہے وہ بُرا فلک، چلو بچکے سب سے الگ تھلگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

(۲۴) سید صادق علی چھنگا صاحب حسین لکھنوی (پیدائش ۱۸۷۳ء) ولد میر حسن لکھنوی ؎

لگ جائے کہیں آنکھ قفس میں تو غضب ہو
ہم آہ بھی کرتے نہیں صیاد کے ڈر سے

(۲۵) حافظ فتح محمد حقیر بریلوی پیدائشی نابینا تھے اور لکھنؤ میں کُتب فروشی کرکے گذارہ کرتے تھے (متوفی ۱۹۰۷ء)۔ وہ ایک نعتیہ دیوان کے مصنف تھے ؎

ہیں ارض و سما سب، تہِ فرمانِ محمدؐ
ہے خلقِ خدا سایۂ دامانِ محمدؐ

(۲۶) خبیر لکھنؤ میں خراد کا کام کرتے تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے بیشتر پیدا ہوئے اور کانپور میں فوت ہوئے تھے ؎

گلوں کا رنگ پڑ جاتا ہے پھیکا شرم کے مارے
اگر گلگشت کو سوئے چمن وہ حیا نکلتا ہے

(۲۷) اچھّے خلیفہ دہلی میں حجّام تھے اور سوداؔ کی طرح ایک ہجو گو شاعر تھے ؎

خلیفہ مرمٹا آخر ادائے خوبرویاں پر
جوانا مرگ مرنے کا بڑا ارمان رکھتا تھا

(۲۸) دلاور علی دلاور ولد بہادر علی آنولہ کے معروف پہلوان تھے سے

گلہ شکوہ نہیں ہے، یہ تو باتیں ہیں محبت کی
ہوئے جاتے ہو کیوں برہم میرے دل کی صفائی پر

(۲۹) سید عشرت حسین ذاکر بلگرامی سے

بیچین ہو دل اُن کا بیتابیٔ دل سُنکر
اِس رنگ سے اے ذاکر قصہ نہ میرا کہنا

(۳۰) نواب مرزا حسن رضا خاں رضا ولد مرزا علی رضا شاہانِ اودھ کے وزیر تھے اور ۱۸۰۱ء میں لکھنؤ میں فوت ہوئے تھے۔ وہ میر حسن دہلوی کے مربی تھے لیکن بڑے غالی شیعہ تھے سے

ٹپک رہی ہے ہواؤں سے کچھ عجب مستی
چمن میں آج مقرر کوئی سنہرا ہے

(۳۱) بیک ابو محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری مغل شہنشاہِ دہلی کے خادمِ خاص تھے سے

بیک اُس کو میں نہ لیجا آرزو
دن دہاڑے قافلہ لُٹ جائے گا

(۳۲) میر حیدر تاب ولد میر محبوب علی پانی پتی دہلی کے ایک قوال تھے اور ۱۸۵۷ء سے قبل فوت ہو گئے تھے سے

میں تو عاقل تھا زمانے کا یہ اُلفت کے طفیل
کوئی سودائی کہے ہے، کوئی دیوانہ مجھے

(۳۳) غلام مصطفےٰ تحیر ولد مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی حکیم ثناء اللہ خاں فراق کے شاگرد تھے مگر یہ عجیب وغریب واقعہ ہے کہ وہ ان پڑھ تھے سے

فکر اطفال کو ہے سنگ اُٹھا لانے کی
آمد آمد ہوئی شاید تیرے دیوانے کی

(۳۴) شیخ تصدق حسین تصدق لکھنوی نولکشور پریس میں قصہ گوئی پر مامور تھے اور لکھنؤ میں

۱۹۰۵ء میں بقیدِ حیات تھے ؎

پوچھے اگر تو کہہ دیں خدا کے بھی سامنے　　مارے ہوئے ہم ایک بُتِ پیماں شکن کے ہیں

(۳۵) شیخ حسن جان تصویرؔ لکھنؤ میں ایک موچی اور خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ کے شاگرد تھے ؎

ہر ایک قدم پہ قیامت نثار ہوتی ہے
عجیب شان ہے دامن اُٹھا کے آنے کی

(۳۶) غلام احمد تصویرؔ المعروف بہ میاں بتن دہلوی میاں تنویرؔ کے اور بعد کو ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ الور میں رہنے لگے تھے ؎

کیا بُری چیز ہے محبت بھی
بات کرنے میں آنکھ بھر آئی

(۳۷) اکا تنہاؔ سوداؔ کے زمانے میں دہلی میں قصاب تھے ؎

دیدے سے کے وصلِ یار کا مژدہ بتاؤ تو
بہلاؤں کب تلک دلِ خانہ خراب کو!

(۳۸) احمد علی احمدؔ کلکتہ میں پھیری لگا کر سودا بیچتے تھے ؎

کون غمخوار ہے میرا شبِ فُرقت احمدؔ!
ہمنشیں ایک فقط گوشۂ تنہائی ہے

(۳۹) شیخ بُلاقی بدترؔ (متوفی ۱۹۲۲ء) لکھنؤ کے ایک سبزی فروش تھے ؎

جب سے اُس شوخ کا شباب آیا
دلِ بیتاب کی قضا آئی!

(۴۰) ہیرا علی ہیراؔ دہلی کے ایک بہشتی اور مجرمؔ کے شاگرد تھے ؎

بھلا ہیراؔ کا دل بہلے گا کیونکر حُور و غلماں سے!
اُسے جنت میں بھی دہلی کی گلیاں یاد آئیں گی

[ماخوذ "کے ان پڑھ شاعر" از مرزا فدا علی خنجرؔ لکھنوی۔ سہ ماہی رسالہ "اُردو"، اورنگ آباد دکن۔ انڈیا) جنوری ۱۹۲۹ء، جولائی ۱۹۳۰ء، جولائی ۱۹۳۱ء اکتوبر ۱۹۳۱ء اور اپریل ۱۹۳۲ء]

(۲۳)

شاعرات

(۱) نواب بیگم المعروف بہ چھوٹی بیگم حجابؔ لکھنوی داروغہ اعظم علی خاں کی بیٹی اور نواب معتمد الدولہ وزیر غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی پوتی تھیں۔ بعض مصنفین نے (مع مولوی عبد الباری آسیؔ) غلطی سے اُنھیں واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی بیوی لکھا ہے۔ وہ لکھنؤ میں ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئی تھیں اور اُن کا دیوان بعنوان "تحریر عاشق" ۱۸۷۳ء میں حسینی اثنا عشری پریس، لکھنؤ میں طبع و شائع ہوا تھا۔ لیکن وہ اب نایاب ہے۔ حجابؔ کا نمونۂ کلام :-

خفا ابھی سے نہ ہو، مدعا سنو تو سہی   قبول کرنا نہ کرنا، بھلا سنو تو سہی

جو اُس نے کہا گو وہی کرتے گئے ہم تو   اُس پر بھی نگاہوں سے اُترتے گئے ہم تو

کچھ خوفِ خدا کیجیے، اس طرح نہ چلیے   سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

(۲) دولھن پاشا اعجازؔ نواب جہانگیر جنگ کی بیٹی، جن کی شادی ۱۹۰۶ء میں نواب میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد (دکن) سے ہوئی تھی۔ ان کا نمونۂ کلام :-

حالِ عاشق کبھی سنا تو کرو   کیا حسینوں میں یہ رواج نہیں؟

درد دینے لگا مزہ دل کو   اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

(۳) اشکؔ مغلیہ خاندان کی ایک شہزادی تھیں اور قلعۂ معلّیٰ (لال قلعہ) میں رہتی تھیں۔ وہ ۱۸۷۵ء میں زندہ تھیں۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

نہ بوسہ دینا آتا ہے، نہ دل بہلانا آتا ہے!
تجھے تو اے بتِ کافر فقط ترسانا آتا ہے

(۴) بدرؔ عالم بیگم اودھ کے عیاش بادشاہ واجد علی شاہ کی بے شمار ممتوعہ بیویوں میں سے ایک تھیں۔ ان کے کلام کا نمونہ ؎

ستاتا ہے بہت دردِ جدائی
دہائی ہے خداوندا دہائی

(۵) بھو بیگم نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ ریاست رامپور کی بیگم تھیں جو ۱۸۸۱ء میں زندہ تھیں۔ ان کے کلام کا نمونہ ہے

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا
آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اُس رشکِ قمر سے

(۶) پارسا نواب میر تقی خاں ہوسؔ نیشاپوری کی بڑی بیٹی تھیں، جو اپنی چھوٹی بہن حیا کی طرح، غیر شادی شدہ فوت ہوئیں۔ پارساؔ کا نمونۂ کلام ہے

تن صورتِ حباب بنا اور بگڑ گیا
یہ قصرِ لاجواب بنا اور بگڑ گیا

(۷) شہزادی قرطیس بانو اختر جہاں آرا کج کلاہ پرویںؔ، مرزا عاشق حسین بزم قزلباش اور میری وکٹوریہ مارکس نیپولیون کی بیٹی اور سید علی رضا نقوی زمیندار سرسی کی بیوی تھیں۔ وہ رامپور میں ۱۹۱۱ء میں زندہ تھیں۔ پرویںؔ کا نمونۂ کلام ہے

کسی گلبدن پر جو آئی ہوئی ہے
طبیعت عجب رنگ لائی ہوئی ہے

(۸) شاہجہاں بیگم تاجورؔ نواب جہانگیر محمد خاں، والیٔ ریاست بھوپال اور سکندر بیگم کی بیٹی (پیدائش ۱۸۳۸ء) اور نواب اُمرائے الدولہ باقی محمد خاں کی بیگم تھیں۔ ان کی دختر سلطان جہاں بیگم ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئی تھیں، جو بعد کو نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کی والدہ ہوئیں۔ تاجورؔ کا دوسرا نکاح نواب صدیق الحسن خاں سے ہوا تھا۔ ان کی وفات ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور انہوں نے دو دیوان چھوڑے۔ تاجورؔ کا نمونۂ کلام ہے

تڑپا رہی ہے دونوں کو اک بیوفا کی یاد
بے بس میرا کلیجہ ہے، بے اختیار دل

(۹) بیگم جان بہو بیگم جاؔنی نواب قمر الدین خان کی دختر اور اودھ کے والیٔ نواب آصف الدولہ کی بیگم تھیں۔ وہ ۱۷۹۵ء میں زندہ تھیں۔ جانیؔ کا نمونۂ کلام ہے

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمنِ جانی
کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہیں ہے

(۱۰) جینا بیگم جیناؔ مرزا بابر شہنشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے فرزند کی دختر اور جہاندار شاہ کی ملکہ

تھیں۔ جیسا مرزا سودا کی شاگرد اور ۱۸۴۵ء میں زندہ تھیں۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

نہ دل کو صبر، نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

(۱۱) حیات النسا بیگم المعروف بہ بھوری بیگم حیاؔ شہنشاہ شاہ عالم ثانی کی دختر اور شاہ نصیر دہلوی کی شاگرد تھیں۔ وہ غیر شادی شدہ فوت ہوئیں۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص
حیاؔ ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

(۱۲) دولھن بیگم المعروف بہ نواب بہو دولھنؔ نواب انتظام الدولہ کی دختر اور نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ کی دوسری منکوحہ بیوی تھیں، جو ۱۸۸۵ء میں زندہ تھیں۔ دولھنؔ کا نمونۂ کلام ؎

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری میں کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

(۱۳) گنا بیگم شوخؔ نواب عماد الملک غازی الدین خاں نظامؔ کی بیگم اور میر قمر الدین منتؔ کی شاگرد تھیں۔ شوخؔ کا نمونۂ کلام ؎

ابر چھایا ہے، مینہ برستا ہے
جلد آجا کہ جی ترستا ہے

(۱۴) نواب بادشاہ بیگم عالمؔ نواب علی نقی خاں کی دختر اور نواب واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی منکوحہ بیگم تھیں، جن کے ساتھ ان کا نکاح ۱۸۳۷ء میں ہوا تھا۔ عالمؔ کا نمونۂ کلام ؎

اے باغباں چمن میں یہ کہدے پکار کے
بلبلو چلو کہ دن آئے بہار کے

(۱۵) عصمتؔ ۱۹۳۰ء سے بیگم ریاست رامپور زوجہ نواب رضا علی خاں۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

کیا کیا صلے ملے ہیں قاتل کو پیار کر کے
دن کاٹتے ہیں رو کے، شب انتظار کر کے

(۱۶) حیدر بیگم المعروف بہ ماہ طلعت بیگم قمرؔ مرزا ہمایوں بخت کی دختر جو واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی منکوحہ بیویوں میں سے ایک تھیں، اور جنہوں نے شاہ اودھ کی رحلت کے بعد عبد الغفور نساخ سے نکاح ثانی کر لیا تھا۔ اُن کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا۔ قمرؔ کا نمونۂ

کلام سے

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا
بھول کر بیٹھے ہیں پھر نہ کبھی یاد کیا

(۱۷) کنیز فاطمہ بیگم کنیز نواب نصرت الدولہ کی دختر عین عالم شباب میں فوت ہوگئی تھیں۔
اُن کا نمونۂ کلام سے

وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں یوں ناز سے
جب تلک تم بند کھولو گے، سحر ہو جائے گی

(۱۸) نواب سلطان جہاں بیگم مخفی صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر (مصنف تذکرۂ گلستانِ سخن)
کی بیگم جو ۱۸۵۵ء میں زندہ تھیں سے

کوئی اُن کی شوخی تو دیکھنا لیے زلفِ خم شدہ ہاتھ میں
میرے پاس آکے دبے دبے مجھے سانپ کہکے ڈرا دیا

(۱۹) چھوٹی بیگم بیگم میر تقی میر کی دختر لکھنؤ میں مقیم تھیں سے

کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا

(۲۰) جمیعت خانم جمیعت دہلوی نے عیسائی مذہب قبول کرکے میجر آرگسٹن ARGUSTON
سے شادی کر لی تھی۔ ڈاکٹر اسپرنگر (پرنسپل دہلی کالج۔ ۱۸۴۰ء) اُن سے واقف
تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام سے

مقسوم کی خوبی ہے یہ قسمت کا ہے احسان
رہتا ہے خفا ہم سے جو دلبر کئی دن سے

(۲۱) بادشاہ بیگم مخفی دہلوی بھی عیسائی ہوگئی تھیں اور اُنھوں نے ایک گورے سے شادی کر لی تھی سے

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد ۔۔۔ شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم

[ماہنامہ نگار، لکھنؤ اکتوبر ۱۹۲۹ء نواب بیگم حجاب از نیاز فتحپوری ''ادبی دنیا''، لاہور سالنامہ ۱۹۳۰ء شہزادیوں
کی شاعری، از تسکین عابدی، حیدرآباد (دکن)۔ ''لیلیٰ'' لاہور جنوری ۱۹۳۵ء ''داستانِ اردو، از نواب
نصیر حسین خیال ''تذکرہ خواتین شعرا''، از تمکین کاظمی، حیدرآباد (دکن)]

☆☆

۲۴

کلام الملوک

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سب سے بڑے فرزند و ولی عہد، شہزادہ معظم (جو بعد کو شہنشاہ بہادر شاہ اوّل ہوئے)، ایک عالم وفاضل شخص اور علوم وفنون کے بڑے قدردان تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی اعظم شاہ خصوصیت کے ساتھ ہندی کی سرپرستی کرتے تھے بہادر شاہ اوّل کے بعد جب فرخ سیر مُغل شہنشاہِ ہند بنے تو اُردو ادب نے بڑی ترقی کی۔ اُس وقت کے ایک بڑے اُردو شاعر عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام تھے، جو بعد کو شہنشاہ محمد شاہ کے دورِ سلطنت میں وزیر بن گئے تھے۔ محمد شاہ خود ایک ہندی شاعر اور 'بارہ ماسہ'، اور 'دُبگنٹ کہانی'، دونوں کے مصنف تھے۔ اُس عہد کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اُردو نثر کی سب سے پہلی کتاب 'کربل کتھا' محمد شاہ ہی کے عہدِ سلطنت میں نواب فضل علی خاں فضلی نے ۱۷۳۲ء میں لکھی تھی۔ شہنشاہ محمد شاہ کی اُردو شاعری کا نمونہ:

پیری میں نہ کس طرح کروں سیرِ جہاں کی ۔۔۔ دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا
کھولکر بندِ قبا دل کے تئیں غارت کیا ۔۔۔ کیا حصارِ قلب دلبر نے کھُلے بندوں کیا
خوف سے مار کے یاراں اُسے لرزاں نہ کرو ۔۔۔ زلف کا نام نہ لو اور پریشاں نہ کرو

(تکرار بیان کے خوف سے دکن و ہند کے مسلمان بادشاہوں اور اُن کے اُردو کلام کا یہاں اعادہ نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ان کا حوالہ سابقہ صفحات میں دیا جا چکا ہے)۔ نواب امیر خاں انجام کا نمونۂ کلام ہے:

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم ۔۔۔ مُدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
کیوں بُلایا بھیڑ میں، مجھ سے یہ نادانی ہوئی! ۔۔۔ دُخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

شہنشاہ محمد شاہ کی وفات کے بعد ہندوستان کی سلطنتِ مُغلیہ بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مُغل شہزادے بھی دہلی چھوڑ کر دوسرے مقامات پر پناہ لینے پر مجبور ہوئے شہزادہ علی گوہر جو اپنے باپ شہنشاہ عالمگیر ثانی کے دوران سلطنت میں بنگال چلے گئے تھے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد دہلی واپس آکر تختِ سلطنت پر شہنشاہ شاہ عالم ثانی کے لقب سے

متمکن ہوئے۔ اُس وقت دہلی ایک ویران شہر تھا اور شاہی دربار محض نام کا تھا۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی بھی اُردو شاعر تھے جن کے چند اشعار حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کی عمارت پر ثبت ہیں۔ مرزا جہاندار شاہ جہاندار (شاہ عالم ثانی کے ولی عہد) اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا سلیمان شکوہ دونوں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے، جہاں والیٔ اودھ نواب آصف الدولہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی تھی۔ جب ہم لکھنؤ کے نوابوں اور بادشاہوں کی اُردو ادب کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں لکھنؤ میں مقیم اُن مغل شہزادوں کو نہیں بھولنا چاہیئے جنہوں نے دہلی سے ترکِ وطن کرکے اپنے دربار لکھنؤ میں، قائم کر لیے تھے اور جو اُردو شعرا اور ادیبوں کے زبردست مُربّی تھے۔ اپنی زندگی کے آخر ایام میں مرزا جہاندار شاہ لکھنؤ چھوڑ کر بنارس چلے گئے تھے، جہاں ان کا ۱۷۸۶ء میں انتقال ہوا تھا۔ اُن کے قیام کے باعث بنارس بھی اُردو ادب و شاعری کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ مرزا قادر بخش صابر بنارس ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ عالم ثانی سے لے کر بہادر شاہ ظفر (آخری مغل تاجدارِ ہند) تک بیسیوں شاعر شہزادے گذرے ہیں، مثلاً شاہ عالم، مرزا جہاندار شاہ جہاندار، سلیمان شکوہ سلیمان، مرزا معزالدین ثابت، اکبر شاہ ثانی اور ان کے فرزند و ولی عہد بہادر شاہ ظفر اور مرزا قادر بخش صابر وغیرہ۔

مرزا معزالدین گورگانی ثابت شہنشاہ شاہ عالم ثانی کے فرزند تھے۔ ان کے غیر مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ پنڈت ہرجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری کو ہدایتاً دیا ہے ثابت اردو کے اچھے شاعر تھے اور بہادر شاہ ظفر کے عہدِ سلطنت کے آغاز میں زندہ تھے۔ ان کا نمونۂ کلام :-

دستِ جنوں کو یوں ہے گریباں سے اختلاط دامن کو جیسے خارِ بیاباں سے اختلاط
جگر میں درد ہے، آنکھوں سے اشک آتے ہیں تڑپ کے پھوٹ گیا شاید آبلہ دل کا

مرزا سلیمان شکوہ سلیمان شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے، جو دہلی سے لکھنؤ کو مستقلاً ترکِ سکونت کر گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی بیٹی کی شادی مرزا نصیر الدین حیدر سے کر دی تھی جو بعد کو شاہِ اودھ ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخر میں سلیمان لکھنؤ سے آگرہ چلے گئے تھے، جہاں وہ ۱۸۳۸ء میں فوت اور سکندرہ میں دفن ہوئے۔ لکھنؤ میں ان کا دربار شعرائے اُردو کا ملجا و مامن تھا۔ وہ خود بھی اچھے اُردو شاعر تھے۔ اُن کے غیر مطبوعہ اُردو دیوان کا ایک نسخہ دہلی میں لالہ سری رام مصنّف "تذکرۂ خمخانۂ جاوید" کی نجی لائبریری میں محفوظ تھا۔ سلیمان کی اُردو شاعری کا نمونہ :-

اے سلیمان میں کروں کیونکر زبانِ خلق کی بند مُفت بدنام کیا مجھ کو، وہ آئے نہ گئے

جیسی ہے تیری نام خدا نور کی گردن
ویسی نہ پری کی ہے نہ ہے حور کی گردن

شہنشاہ بہادر شاہ ظفر دہلی میں ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے، ۱۸۳۷ء میں وہ تختِ سلطنت پر بیٹھے جبکہ ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ دہلی میں وہ آخری مغلیہ تاجدارِ ہند تھے۔ وہ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کے ہاتھوں معزول ہوکر رنگون (برما) کو جلاوطن کیے گئے جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں ۸۷ سال کی عمر میں فوت و دفن ہوئے۔ اردو شاعری میں وہ شاہ نصیر، ذوق اور غالب کے شاگرد تھے۔ ان کا نمونہ کلام:۔

نہیں ہے طاقتِ پرواز آہ اے صیاد
خدا کرے کہ تو آب وادرِ قفس نہ کرے

تم نظر آجاؤ شاید اس ہوس میں آئے ہم
صبح سے تا شام سوئے رہ گذر دیکھا کیے

میکدے میں عشق کے جو لوگ ہیں کافر تو ہیں
لیکن ان کے کفر میں اندازِ دینداری ہے اور

کوچے میں تیرے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا
دو چار گھڑی اپنا دل کھول کے رو جانا

مرزا محمد دارا بخت دارا عرف مرزا شبو بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۴۹ء میں ہوا تھا اور وہ حضرت شاہ چراغ دہلوی کے مزار کے قریب دفن ہوئے تھے۔ ان کا نمونہ کلام:۔

ہم سن چکے ہیں شورشِ رفتار کسی کی
اب شورِ قیامت کا بھی دھڑکا نہیں ہم کو

کسی کی چشمِ میگوں کا تصور ہم کو ہے دارا
قدم اٹھتا نہیں ہے لغزشِ مستانہ رکھتے ہیں

مرزا فخر الدین عرف مرزا فخرو رمز شہنشاہ ظفر کے دوسرے بیٹے اور ذوق کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۵۲ء میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کا دیوان ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا تھا۔ ان کے فرزند مرزا خورشید عالم کا انتقال رامپور میں ستر سال کی عمر میں ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا۔ رمز کا نمونہ کلام:۔

بیٹھوں جنوں میں سر کو کہ روکوں سرشک کو
تھاموں قلق میں دل کو کہ رکھوں جگر پہ ہاتھ

ہم نے تو غم یار میں یوں عمر بسر کی
مر مر کے جو کی شام تو رو رو کے سحر کی

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم آصف نظامِ دکن (ہند) ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے ۱۸۶۹ء میں تخت نشین ہوئے (جبکہ وہ محض تین سال کے بچے تھے) اور ۱۹۱۱ء میں فوت ہوئے وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا نمونہ کلام:۔

نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے
زمانے میں کون کسی کا ہوا ہے!

کہاں جائے انسان ان سے نکل کر؟
زمیں فتنہ گر ہے، فلک فتنہ زا ہے

ریاست رامپور (روہیلکھنڈ، یوپی، انڈیا) کے بانی نواب علی محمد خاں تھے جن کو مغل شہنشاہ

دہلی نے غاصب ساداتِ بارہہ کو جنگ میں شکست دینے کے عوض بطور انعام ایک جاگیر عطا کی تھی۔ یہ جاگیر بدایوں کے قریب تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملۂ ہند کے وقت ہنگاموں کے دوران، نواب علی محمد خاں نے روہیلکھنڈ کے بیشتر علاقے پر قبضہ کرلیا۔ ان کے انتقال کے بعد، ان کے بیٹوں اور ان کے بھائی نواب حافظ رحمت خاں والیٔ بریلی کے درمیان اختلاف ہوئے۔ آخر کار نواب علی محمد خاں کے چھوٹے بیٹے نواب فیض اللہ خاں کو رامپور کھیڑ کی جاگیر ملی۔ جب نواب حافظ رحمت خاں اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے لڑتے ہوئے جنگ میں شہید ہوگئے تو نواب فیض اللہ خاں ۱۷۸۳ء میں ریاست رامپور کے مستقل فرماں روا بن گئے۔ آخرالذکر کے دو بیٹے تھے، بڑے محمد علی خاں اور چھوٹے غلام محمد خاں۔ چھوٹے بھائی نے اپنے بڑے بھائی کو قتل کردیا اور ریاست رامپور پر قبضہ کرلیا۔ لیکن شاہِ اودھ نے غاصب کو شکست دے کر رامپور کے تخت پر محمد علی خاں کے نابالغ بیٹے احمد علی خاں رند کو بٹھا دیا۔ ۱۸۰۱ء میں اودھ کے نواب سعادت علی خاں نے حماقت سے روہیلکھنڈ کا وسیع علاقہ انگریز غاصبوں کے حوالے کردیا۔ اس طرح ریاست رامپور برطانوی حکومتِ ہند کے ماتحت آگئی۔ جب نواب احمد علی خاں لاولد فوت ہوئے تو ان کے عم زاد برادر نواب محمد سعید خاں کو، جو اُس وقت دہلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے، نواب رامپور بنا دیا گیا۔ ان کی وفات پر نواب یوسف علی خاں ناظم ۱۸۵۴ء میں والیٔ رامپور ہوئے، جو ۱۸۶۶ء میں جوان فوت ہوگئے اور ان کی جگہ ان کے فرزند نواب کلب علی خاں نواب فرماں روائے رامپور ہوئے۔ مؤخرالذکر کا انتقال ۱۸۸۷ء میں ہوا اور ان کے دوسرے بیٹے نواب مشتاق علی خاں ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے بیٹے اور جانشین نواب حامد علی خاں رشک تھے، جن کے فرزند نواب رضا علی خاں رضاؔ آخری والیٔ رامپور ہوئے کیونکہ اُن کے زمانے میں برطانوی حکومتِ ہند کے خاتمے اور بھارت کی ہندو حکومت کے آغاز کے ساتھ ریاست کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

نواب رامپور احمد علی خاں رندؔ (متوفی ۱۸۴۰ء) کا نمونۂ کلام ؎

سیر کو جب چمن کی جاتا ہے
باغ پھولا نہیں سماتا ہے

نواب محمد یوسف علی خاں ناظمؔ ولد نواب محمد سعید خاں والیٔ رامپور ۱۸۵۴ء میں تخت نشین اور ۱۸۶۶ء میں فوت ہوئے جبکہ وہ جوان تھے۔ وہ مومنؔ اور غالبؔ دونوں کے شاگرد تھے ان کا دیوان شائع ہوچکا ہے۔ ان کا نمونۂ کلام:

ہائے وہ چینِ جبیں شوخی و انداز کے ساتھ ہائے وہ ناز سے تیور کا بدلنا ہر دم

ہائے وہ شعلۂ رخسار کی غصہ میں بھڑک ہائے وہ گیسوئے پُر پیچ کا ہونا پُر خم

نواب کلب علی خاں نواب ولد نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۳۵ء میں پیدا اور ۱۸۸۷ء میں فوت ہوئے تھے۔ انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنا دیوان چھوڑا ہے۔ ان کا نمونۂ کلام :-

بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کنج مرقد میں رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوش نازنیں برسوں
ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید رہی ہم سے تو اُس بے رحم کا فرکی نہیں برسوں

نواب حامد علی خاں رشک ولد نواب مشتاق علی خاں والیٔ رامپور ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی وفات کے بعد صرف ۱۴ سال کی عمر میں تخت نشیں ہوئے (۱۸۸۹ء میں)۔ وہ امیر مینائی کے بیٹے منشی محمد احمد تمر اور سر رئیر کے شاگرد تھے۔ ان کا نمونۂ کلام :-

کیا چیز ہے اُلفت بھی، دل جس سے سُلگتا ہے اس آگ کو کیا کہئے جل جانے کو کیا کہئے
حسینوں میں تھے انتخاب اوّل اوّل غضب تھا تمہارا شباب اوّل اوّل

نواب ظفر یاب خاں راسخ بریلوی ولد مُلّا میاں نواب حافظ رحمت خاں والیٔ بریلی کی اولاد میں تھے۔ وہ لکھنؤ میں مقیم رہے اور نواب منصور خاں مہر کے شاگرد تھے۔ وہ صاحب دیوان تھے اور ۱۸۵۷ء میں فوت ہوئے تھے۔ وہ ناسخ لکھنوی کے طرز کلام کے متبع تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا
انگڑائی اُس نے نشہ میں لی جو اُٹھا کے ہاتھ

نواب احمد علی خاں رونق ٹونکی ریاست ٹونک کے بانی کے ساتویں بیٹے اور ظہیر دہلوی اور سید امراؤ مرزا انور کے شاگرد تھے۔ ۱۸۳۴ء میں بانیٔ ریاست ٹونک (راجپوتانہ بھارت) نواب امیر خاں کا انتقال ہو گیا اور نواب وزیر الدولہ ان کے جانشین ہوئے۔ رونق ٹونکی کا نمونۂ کلام ؎

ہے یہی فکر یوں نہو، یوں نہو
ان ہوس ہائے خام نے مارا

نواب حافظ محمد ابراہیم علی خاں خلیل والیٔ ریاست ٹونک ولد نواب محمد علی خاں (پیدائش ۱۸۴۸ء) بسمل اور مضطر خیر آبادی دونوں کے شاگرد تھے۔ ان کا نمونۂ کلام :-

تجھ پر فدا ہزار کلی، ہر کلی کے رنگ تجھ پر نثار لاکھ چمن، ہر چمن کے پھول

یہاں تو نور کا تڑکا ہے یادِ روئے روشن میں   وہ کوئی اور ہونگے شامِ فرقت دیکھنے والے

نواب محمد یار خاں امیر والیٔ ریاست ٹانڈہ ؎

اِس مُنہ پہ کھلے زلف تو راز بہرِ قدم بوس
شام آوے اِدھر سے تو اُدھر سے سحر آوے

نواب احمد یار خاں افسرؔ ولد نواب محمد یار خاں امیر والیٔ ٹانڈہ ؎

آ گئے تیری پلکوں کے وہ کیا سینہ سپر ہو
ہوگی آئینہ جس پاس نہ لوہے کا جگر ہو

نیشاپور (ایران) کے ایک سوداگر سید سعادت علی ایک غیر معمولی خوش نصیب انسان تھے جنھیں مُغل شہنشاہِ ہند دہلی نے نواب بُرہان الملک وزیر الممالک کے بلند بانگ خطابات سے نوازا اور صوبۂ اودھ (بھارت) کی حکومت بخشی۔ ان کے جانشین صفدر جنگ تھے۔ مؤخر الذکر کا بیٹا اور جانشین اور اودھ میں مُغل سلطنتِ دہلی کا وزیر شجاع الدولہ وہ بے غیرت شخص تھا جس نے اپنے وطن سے غدّاری کی اور غاصب انگریزوں کی حمایت کی تھی۔ اِس کا جانشین آصف الدولہ ہوا اور مؤخر الذکر کی جگہ نواب سعادت علی خاں والیٔ اودھ ہوئے۔ ان کے فرزند غازی الدین حیدر کو برطانوی حکمرانوں نے مُغلیہ سلطنت کے رقیب و حریف کے طور پر اودھ کا بادشاہ بنا دیا۔ ان کے جانشین شاہ نصیر الدین حیدر ایک ناکارہ حکمراں تھے جنھوں نے اودھ کو برباد کر کے رکھ دیا۔ مؤخر الذکر کے بیٹے محمد علی شاہ اور پوتے امجد علی شاہ تھے۔ جانِ عالم واجد علی شاہ اخترؔ فرماں روائے اودھ، لکھنؤ امجد علی شاہ کے بیٹے تھے۔

واجد علی شاہ لکھنؤ میں ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ امجد علی شاہ کے ۱۸۴۷ء میں انتقال کے بعد شاہِ اودھ ہوئے تھے۔ وہ شاعر تھے اور اپنا تخلّص اخترؔ کرتے تھے۔ وہ شراب اور عورتوں کے بڑے شائق تھے۔ اُن کی درجنوں منکوحہ اور بیسیوں متوعہ بیویاں تھیں (کیونکہ وہ شیعہ تھے)۔ آرٹ کی سرپرستی کے بہانے سے وہ خلافِ اسلام اشغال میں علی الاعلان حصّہ لیتے تھے اس سلسلے میں ان کی 'کرشنا لیلا' کا کھیل مشہور ہے۔ ان کی انتہائی بدعنوانیوں اور بدنظمی کے باعث اور بحیثیت ایک حکمراں کے اس کی نالائقی کے سبب ملک و رعایا کی حالت ابتر ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے برطانوی حکومتِ ہند کو حرکت میں آنے کا ایک معقول بہانہ مل گیا۔ نتیجتاً انگریزوں نے اودھ پر ۱۸۵۶ء میں غاصبانہ قبضہ کر کے واجد علی شاہ اخترؔ کو ایک پنشن خوار جلاوطن کی حیثیت سے

مٹیا برج، کلکتہ، بھیج دیا، جہاں وہ ۳۱ سال تک مقیم رہے اور ۱۸۸۷ء میں وہیں فوت ہوئے اور وہیں اپنے ذاتی امام باڑہ سبطین آباد میں دفن ہوئے۔ واجد علی شاہ نے اپنے بعد بے شمار بیویوں اور باندیوں کا ایک جمِ غفیر چھوڑا، جن سے ۴۶ قانونی بیٹے اور ۳۴ قانونی بیٹیاں ہوئیں۔ علاوہ بیسیوں غیر قانونی اولاد کے۔ بعد کو یہ سب کے سب شہزادے، اور شہزادیاں، ہندوستان کے طول و عرض میں مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ اختر کی اردو شاعری کا نمونہ:-

ایک حسرت طور پر بھی بہرِ موسیٰؑ رہ گئی — ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی
آنکھ کو مدِ نظر دیدار ہے اُس یار کا — اور زباں نے ذائقہ اُلفت کا چکھا رہ گئی
بنا دے نور کا پُتلا خدایا میری مٹی کو — بُتوں کے واسطے پتھر کا کر دے قلب کوجی کو
نصیبوں پر ہمارے سنگدل آنسو بہاتے ہیں — کرے گا شمع رُو کیا موم اپنی تیرہ بختی کو

["احسان"، لاہور، سالنامہ ۱۹۳۶ء "مغل شہزادے اور اُن کی ادب نوازیاں"، از پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، گورنمنٹ کالج، لاہور۔ "نگار"، لکھنؤ، ظفر نمبر، جنوری ۱۹۳۰ء۔ "خمخانۂ جاوید"، از لالہ سری رام، دہلی، جلد سوم۔ "جدید اُردو شاعری"، صفحہ ۹۹-۱۹۷۔ "اُردوئے معلّٰی"، کانپور، جولائی ۱۹۲۵ء۔ "مخزن"، لاہور، جون، جولائی اور اگست ۱۹۰۵ء اور جون، جولائی اور اگست ۱۹۰۶ء۔ "ندیم"، بھوپال، جنوری اور فروری ۱۹۳۸ء۔ "سلطان عالم واجد علی شاہ اختر اور لکھنؤ کا دورِ آخر"، از مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی]

(۲۵)

اُردو شاعری کے مراکز ــــ مُربیانِ سخن

۱۔ عظیم آباد (بہار۔ بھارت)۔ راجہ رام نراین موزوں (شیخ علی حزیں کے شاگرد) نواب سراج الدولہ، نائب سلطنت برائے صوبجات بہار و بنگال کی طرف سے صوبۂ بہار کے گورنر کے زمانے سے۔

۲۔ مرشد آباد (بہار۔ بھارت)۔ مہاراجہ شتاب رائے صوبۂ بہار کے ناظم کے زمانے سے جبکہ نواب محمد رضا خاں بنگال کے گورنر تھے۔ راجہ بہادر راجہ مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے تھے۔

۳۔ فرخ آباد (یوپی۔ انڈیا)۔ نواب تجمل حسین خاں اور نواب احمد خاں کے زمانے سے۔ نواب مہربان خاں رِند متوخر الذکر کے دیوان (وزیر) تھے۔

۴۔ ٹانڈہ (متصل آنولہ۔ یوپی۔ انڈیا)۔ نواب محمد یار خاں امیر کے زمانے سے جو نواب رامپور علی محمد خاں کے چوتھے بیٹے اور رامپور کے حکمراں نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے۔

۵۔ رامپور (روہیلکھنڈ۔ یوپی۔ انڈیا)۔ نواب فیض اللہ خاں۔ نواب احمد علی خاں رِند، نواب یوسف علی خاں ناظم، نواب کلب علی خاں نواب اور نواب حامد علی خاں رشک۔

۶۔ بریلی (روہیلکھنڈ۔ یوپی۔ انڈیا)۔ نواب حافظ رحمت خاں شہید کے زمانے سے (جو اودھ کے حکمراں نواب شجاع الدولہ کی غداری اور فریب کاری کی بھینٹ چڑھ گئے کیونکہ اُس نے انگریزوں کی حمایت اور بریلی کے روہیلوں کی مخالفت کی تھی۔ اس معرکہ میں انگریزوں اور افواجِ اودھ سے لڑتے ہوئے حافظ رحمت خاں شہید ہو گئے تھے)۔ ان کے فرزند نواب محبت خاں محبتؔ لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے، جن کے پوتے نواب چندا میاں قمرؔ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔

۷۔ نجیب آباد (روہیلکھنڈ۔ یوپی۔ انڈیا)۔ نواب نجیب الدولہ کے زمانے سے۔ ان کے بیٹے نواب ضابطہ خاں، جن کا بد نام بیٹا غلام قادر خاں تھا۔

۸- فیض آباد (یوپی - انڈیا)- نواب شجاع الدولہ کے زمانے سے ۔
۹- لکھنؤ (یوپی - انڈیا)- نواب آصف الدولہ آصف کے زمانے سے لے کر واجد علی شاہ اختر تک تمام فرمانروایان اودھ۔ شاہ عالم کے مُغل شہزادے، یعنی مرزا جواں بخت جہاندار شاہ اور مرزا سلیمان شکوہ وغیرہ۔ جنہوں نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرزا جواں بخت بعد کو لکھنؤ سے بنارس چلے گئے تھے۔ نواب سالار جنگ اور ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں - اور مہاراجہ تکیت رائے وغیرہ۔
۱۰- باندہ (یوپی - انڈیا)- نواب علی بہادر، مُنیر شکوہ آبادی کے شاگرد۔
۱۱- الہ آباد (یوپی - انڈیا)- نواب محمد قلی خاں اور نواب مُنیر الدولہ ۔
۱۲- حیدر آباد (دکن - بھارت)۔ نظام اور ان کے دیوان - راجہ چندو لال شاداں اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد وغیرہ۔
۱۳- لاہور (پنجاب)- نواب حسین الملک میر مَنّو خاں۔
۱۴- ٹونک (راجپوتانہ - بھارت)۔ نواب ابراہیم علی خاں خلیل ولد نواب احمد علی خاں رونق۔
۱۵- بھوپال (مالوہ - انڈیا)- نواب سلطان جہاں بیگم دختر نواب شاہجہاں بیگم۔
۱۶- مانگرول (کاٹھیاواڑ- انڈیا)- شیخ حسین میاں۔
دیگر مُربیانِ سخن کے چھوٹے چھوٹے مراکز حسب ذیل تھے۔
الور، بھرت پور اور پٹیالہ (جو ہندو ریاستیں تھیں)۔ اُردو کا ایک دور دراز مرکز صوبۂ مدراس (جنوبی ہند) میں ارکاٹ بھی تھا۔

جب وَلی دکنی دہلی آئے تھے تو شہنشاہِ ہند سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے ان کی قدر افزائی کی تھی (گلدستۂ نازنینان)۔ ہر چند کہ شہنشاہ فرخ سیر کے عہد تک دہلی میں اُردو شاعری کو عام فروغ نہیں ملا تھا، لیکن جب ۱۷۱۸ء میں محمد شاہ تختِ سلطنت پر بیٹھے تو دہلی اُردو شاعری و ثقافت کا مرکز بن گیا تھا (تذکرۂ جلوۂ خضر، جلد دوم ص۲۳)۔ اُس وقت آبرو، یک رنگ اور حاتم وغیرہ دہلی میں اُردو کے شعرا تھے۔ اس کے بعد شاہ عالم کے دورِ سلطنت میں دہلی میں اُردو کے عظیم اساتذہ میر، سودا، خان آرزو، خواجہ میر درد اور میر حسن وغیرہ موجود تھے۔

۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ فیض آباد میں تختِ سلطنت اودھ پر متمکن ہوئے۔ اس کے سات سال کے بعد اُنھوں نے اپنا دار الحکومت فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل کر دیا۔ آصف الدولہ

خود ایک اُردو شاعر اور میر سوز دہلوی کے شاگرد تھے۔ اُن کے دورانِ حکومت میں لکھنؤ نے اُردو ثقافت کے مرکز کی حیثیت سے دہلی کی جگہ لے لی تھی۔ (تذکرۂ گلشن ہند، ص۱۴۰)۔ اس کے بعد ان کے بھائی نواب سعادت علی خاں کے دورِ حکومت میں معروف شعرا، قتیل، مصحفی، انشا، جرأت اور رنگین وغیرہ ہوئے۔ نوابانِ اودھ کے علاوہ لکھنؤ میں پناہ گزیں مغل شہزادوں کے دربار بھی اُردو شاعری کی سرپرستی کے مراکز تھے۔ مثلاً مصحفی، انشا، محب، میر سوز اور جرأت وغیرہ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ مرزا جہاندار شاہ کے دربار سے مرزا اسمٰعیل تپش اور مرزا جعفر علی حسرت منسلک تھے۔ سودا اور میر سوز کی سرپرستی مہربان خاں رند (فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش کے دیوان) کا دربار کرتا تھا (تذکرۂ قدرت، اور تذکرۂ میر حسن)۔ نواب محمد یار خاں امیر فدوی لاہوری، میر نعیم، پروانہ علی شاہ مراد آبادی، مصحفی اور غالباً شاہ حاتم کے بھی مربی تھے۔ وہ خود قائم چاند پوری کے شاگرد تھے (تذکرۂ مصحفی)۔

نواب محبت خاں محبت ولد نواب حافظ رحمت خاں شہید والیٔ بریلی (روہیلکھنڈ۔ یوپی۔ انڈیا) لکھنؤ میں آباد ہوگئے تھے اور مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ حسرت کے علاوہ جرأت بھی اُن کے دربار سے وابستہ تھے۔ لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ جانسن کی ترغیب سے محبت نے اپنی مثنوی "اسرارِ محبت" نظم کی تھی، جس کی بنیاد سسی پنوں کے مشہور افسانے پر رکھی گئی ہے۔ اس طرح، اُس زمانے میں، ہر امیر کا دربار اُردو شاعری کا مربی تھا، جس سے اُس عہد کے تمام معروف اُردو شعرا منسلک تھے۔

دکن (جنوبی ہند) میں راجہ چندولال کا دربار شاہ نصیر دہلوی کا سرپرست تھا (تذکرۂ گلِ رعنا)۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کے امرا بھی شعرائے اُردو کی سرپرستی کے معاملے میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔ مثلاً خواجہ محمد خاں نے شاہ رکن الدین عشق کی اور مہاراجہ شتاب رائے نے اشرف علی فغاں کی سرپرستی کی (تذکرۂ گلشنِ ہند، از مرزا علی لطف)۔ شاہ قدرت اللہ قدرت دہلی چھوڑ کر مرشد آباد میں جا بسے تھے۔ فقیر صاحب دردمند عظیم آباد میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کی زیرِ سرپرستی رہتے تھے۔ میر باقر حزیں دہلی چھوڑ کر نواب سعید احمد خاں کے پاس عظیم آباد میں مقیم ہوگئے تھے۔ ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی نواب شوکت جنگ کے پاس تھے (تذکرۂ گلشن ہند)۔ عالم (خواجہ میر درد کے فرزند) اور میر خلیق دہلوی دونوں مرشد آباد میں راجہ دولت رام کی سرپرستی میں رہتے تھے۔

لکھنؤ میں البتہ نواب غازی الدین حیدر کا دور اس بارے میں محروم تھا۔ اسی وجہ سے ناسخ اور آتش دونوں درباری کی مبتذل ذمہ داریوں سے آزاد معلوم ہوتے ہیں۔ دہلی میں ذوق اور غالب دونوں کا بہادر شاہ ظفر کی زیر سرپرستی ہونا عام طور پر معلوم ہے۔ لکھنؤ میں اردو شعرا کا ایک جم غفیر واجد علی شاہ اختر کے دربار سے وابستہ تھا جن میں سے سات شعرا سبعہ سیارہ کے خطاب یافتہ تھے۔

جب دہلی میں بہادر شاہ ظفر کا اور لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کا زوال ہوا اور یہ دونوں مراکز ادب وشعر اردو برباد و ویران ہو گئے تو ریاست رامپور نے جو متذکرہ بالا ہر دو مراکز اردو ادب کے وسط میں واقع تھی، دہلوی اور لکھنوی دونوں مکاتب فکر کے شعرا کی سرپرستی کی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم خود شاعر تھے اور پہلے مومن کے اور بعد ازاں غالب کے شاگرد ہوتے تھے۔ بعد کو وہ اسیر اور امیر مینائی کے شاگرد ہوئے [ماخیار الصنادید از نجم الغنی خاں، جلد دوم ص ۱۲۵]

نواب کلب علی خاں نواب کے عہدِ حکومت میں تو رامپور وسیع پیمانے پر تمام دہلوی اور لکھنوی شعرا کا مامن و ملجا بن گیا تھا، مثلاً اسیر، امیر مینائی، داغ، جلال، منیر، بحر، تلق، حسین علی خاں شاداں، خواجہ بشیر تسلیم، مرزا رحیم الدین حیا، مرزا معین الدین حیدر غمگین، آغا علی نقی غنی، آغا محمد شیرازی نثار، مرزا احمد علی رسا، ذکی بلگرامی، گوبند لال صبا، لالہ کنج بہاری لال حیرت اور میر یار علی جان صاحب وغیرہ سب دربارِ رامپور سے وابستہ تھے۔ لیکن نواب کلب علی خاں نواب کے بعد نواب مشتاق علی خاں کے عہدِ حکومت میں رامپور میں اردو شعرا کی یہ چہل پہل قایم نہ رہی۔ مگر ان کے جانشین نواب حامد علی خاں رشک نے منشی محمد احمد سریر مینائی کے شاگرد ہونے کے بعد اپنے دادا کی روایت کی تجدید کی اور رامپور ایک مرتبہ پھر اردو شاعری و شعرا کا مربی بن گیا۔

دکن (جنوبی ہند) میں، نواب میر محبوب علی خاں، نظام حیدر آباد نے نہایت فیاضانہ طور سے مرزا داغ دہلوی کو نوازا۔ اُن کے جانشین میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد (دکن) نے بھی اردو شعرا کی سرپرستی کی روایت کو نباہا اور حافظ جلیل حسن جلیل اور دیگر شعرا ان کی قدردانی سے مستفیض ہوئے [شعر الہند، جلد دوم ص ۵۵-۴۴۲]

۲۶

اُردو کے ہندو شعراء

اُردو شاعری کے مختلف تذکروں میں ایسے متعدد ہندو شعرائے اُردو کے نام ملتے ہیں جو مسلمان اساتذہ کے شاگرد تھے۔ اسی طرح بعض مسلمان شعرا بھی ہندو اساتذہ کے شاگرد تھے، مثلاً میاں حسرت اور میر حیدر علی حیران دونوں رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ میر حسن نے اپنے زمانے کے ہندو شعرا کی تعریف کی ہے اور ریسناتھ سنگھ اور بندرابن راقم وغیرہ کا اپنے تذکرے میں حوالہ دیا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد متعدد ہندو امرا نے، جو شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے، بہت سے معروف مسلمان شعرا کی سرپرستی کی۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں دہلی میں ان ہندو امرا کا حوالہ دیا ہے مثلاً …جی لال حیا، پروانہ المعروف بہ کاکاجی اور تسلی ولد گوپال رائے بخشی وغیرہ۔ اُردو شعرا کے سب سے بڑے مربی حیدرآباد دکن کے راجہ چندو لال تھے، جو شاہ نصیر دہلوی کے سرپرست تھے۔ شاہ نصیر اپنے زمانے کے ہندو شعرا کو اپنا شاگرد بنانے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ تذکرۂ گلستانِ سخن میں ایسے ہندو شعرا کے نام درج ہیں یعنی اجودھیا پرشاد صبر، موتی لال طرب، دھومی لال طرب، گھنا رام …تی، مہاراج سنگھ عزیز، مہتاب سنگھ غم اور منشی مولچند وغیرہ۔ شاہ نصیر کے دیوان کو بھی ان کے ہندو شاگرد مہاراج سنگھ عزیز نے مرتب کیا تھا۔ ہندو مصنفین نے متعدد تذکرے بھی مدون کیے ہیں (تذکرۂ گلستانِ سخن، ص ۲۵)۔

مسلمانوں نے بھی، گو جزوی طور پر ہی، ہندو ادیبوں اور شاعروں کا یہ ادبی قرض چکا دیا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں فیضی نے سنسکرت کے شاہکار "مہابھارت" کا ترجمہ کیا تھا۔ فارسی … نے ہندو اخلاق کی ایک مذہبی کتاب "جوگ بشسٹ" نامی کا ترجمہ کیا تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ کی کتاب "سرِ اعظم" بھی سنسکرت کا ترجمہ ہے۔ ملک محمد جائسی کی "پدماوت" خالص بھاشا میں ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے زمانے میں متعدد اُن کتابوں کا اُردو ترجمہ کیا گیا جو ہندو ادب و طرزِ حیات سے متعلق تھیں۔ اُردو کے معروف نثر نگار ہندو ادیبوں کے علاوہ بہت سے ہندو شعرائے اُردو بھی ہوئے ہیں، مثلاً:-

(۱) راجہ رام کشن راجہ کلکتوی ولد مہاراجہ بینا کشن، لارڈ کلایو کے دیوان۔ راجہ مرزا جان طپش دہلوی کے شاگرد اور بقول نساخ، اُردو میں ایک دیوان کے مالک تھے۔ ان کا طرز کلام ؎

گر شب کو نہ تم پاس میرے آؤ گے صاحب
تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

(۲) مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ ولد مہاراجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس، جو انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ اس لڑائی کی وجہ وارن ہیسٹنگز WARREN HASTINGS برطانی وائسرائے ہند کی نامعقولیت و زیادتی تھی، لیکن اسی جنگ میں اُنھیں ۱۷۸۱ء میں شکست ہوئی اور اُنھوں نے گوالیار میں پناہ لی تھی۔ اپنے بہادر باپ کی وفات کے بعد راجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرے میں رہے، جہاں وہ پہلے نظیرؔ کے اور پھر مرزا حاتم علی مہرؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے تھے۔ راجہ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا دیوان "گلِ ریاض" ۱۸۵۳ء میں مکمل ہوا تھا۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

کیا تم پہ تصدق کریں، کیا نذر دیں تم کو؟
دل ہم نہیں رکھتے ہیں، جگر ہم نہیں رکھتے

(۳) مہاراجہ دِگ بجے سنگھ راجہ والیٔ بلرام پور اور تلسی پور (اودھ۔ یوپی انڈیا) صاحبِ دیوان اور منشی جواہر سنگھ جوہرؔ (خواجہ وزیرؔ کے شاگرد) کے شاگرد تھے۔ راجہ کا انتقال ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

پامال آج وہ ہیں جو کل تک نہال تھے
کھلتا نیا ہے روز تری انجمن میں گُل!

(۴) راجہ سرپ سنگھ دیوانہؔ راجہ مہا نارائن، اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے دیوان، کے بھتیجے تھے اور دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر شاہ عالم کے زمانۂ سلطنت کے آغاز میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ لکھنؤ میں دیوانہؔ مرزا فاخر مکینؔ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ بعد کو وہ خود ایک معروف اُردو شاعر اور اُستاد ہوئے۔ اُن کا انتقال ۱۷۸۹ء میں ہوا اور اُنھوں نے اپنے بعد فارسی کے چار اور اُردو کا ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ اُن کے شاگردوں میں ایسے معروف شعرا تھے جیسے میر حیدر علی حیرانؔ اور جعفر علی حسرتؔ (جرأتؔ کے اُستاد) وغیرہ۔ ان کا نمونۂ کلام :-

جان پر آبنی ہمدم میری خاموشی سے ‏ ‏ بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
وے یار کہاں کہ یار باشی کیجئے ‏ ‏ وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجئے

(۵) لالہ بندرابن راقم دہلوی میر تقی میرؔ اور مرزا سوداؔ دہلوی دونوں کے شاگرد تھے (نکات الشعراء از میر تقی میرؔ اور 'تذکرہ قدرت')۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں راقم کی تعریف کی ہے۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے ‏ ‏ اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

(۶) منشی خوب چند ذکا دہلوی شاہ نصیرؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے شعرائے اُردو کا ایک ضخیم تذکرہ 'عیار الشعراء' کے نام سے مرتب کیا تھا، نیز اپنے کلام کا ایک دیوان، لیکن وہ دونوں ان کی ۱۸۴۲ء میں وفات کے بعد ان کے خاندان کی بے پروائی کے سبب ضائع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر SPRINGER کے پاس، جو اُس وقت مشہور دہلی کالج کے پرنسپل تھے، ان کی نقلیں تھیں، جو اب شاید کسی جگہ جرمنی میں موجود ہوں۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

دل نہیں چاہے ہے کرنے کو کسی سے اخلاص
ہر کوئی اپنی غرض کا ہمیں بندہ نظر آیا

(۷) حکیم سکھانند رقم دہلوی ایک اچھے ایورویدک طبیب تھے۔ وہ اُردو شاعری میں شاہ نصیرؔ کے اور نجوم میں حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے اور عربی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ اُن کا دیوان ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ ۱۸۶۸ء میں فوت ہوئے ؎

وفورِ شوق میں رُخ کے لیے دہن کے لیے
نہیں تمیز کہ بوسے کہاں کہاں کے لیے

(۸) پنڈت دیا شنکر نسیمؔ لکھنوی ولد پنڈت گنگا پرشاد کول کاشمیری آتشؔ لکھنوی کے شاگرد، لکھنؤ میں ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنی مشہور و معروف اُردو مثنوی 'گلزارِ نسیم' ۱۸۳۸ء میں مرتب کی تھی، جو ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُسی سال نسیمؔ کا عین عالم شباب میں لکھنؤ میں انتقال ہو گیا تھا:-

پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ 'قسمت'، ‏ ‏ پوچھا کہ طلب؟ کہا 'قناعت'،

پوچھا کہ کدھر سے آئے، کیا نام! بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام!

(۹) لالہ بھگونت رائے راحتؔ کاکوروی ولد منشی دین دیال آغا حسن امانتؔ لکھنوی کے شاگرد اور زہرہ و بہرام، نل دمن، اور سوزِ عاشقانہ، نام کی مثنویوں کے خالق تھے، جن میں سے اب صرف مؤخر الذکر مثنوی باقی ہے۔ راحتؔ واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں زندہ تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد فوت ہوئے ؎

جب تک اپنے تن میں جان رہے
رات دن بس تیرا ہی دھیان رہے

(۱۰) منشی چھوٹو لال سکسینہ لکھنوی اپنی جوانی میں غزلیں کہتے اور طربؔ تخلص کرتے تھے اور مرزا خانی نوازشؔ کے شاگرد تھے، لیکن جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو غزل گوئی ترک کر کے مرثیے کہنے لگے، دلگیرؔ تخلص اختیار کر لیا اور ناسخؔ کی شاگردی قبول کر لی۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ دلگیرؔ میر خلیقؔ اور فصیحؔ کے ہمعصر تھے۔ وہ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے دورانِ حکومت میں لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا میں پیش پیش تھے۔ میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی کے عروج کے زمانے میں دلگیرؔ بوڑھے تھے۔ دلگیرؔ کا نمونۂ کلام ؎

آئے نزاب تیرا جو وہ خوش چشم باغ میں
نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم

(۱۱) دیوان دیا کرشن ریحانؔ لکھنوی، منشی گنگا بشن عزیزؔ کے فرزند اور منشی موجی رام موجیؔ (تلمیذِ مصحفیؔ) اور منشی جواہر سنگھ جوہرؔ دونوں کے شاگرد تھے۔ وہ 'باغ ریحاں' نامی دیوان کے مصنف تھے، جو شائع ہو گیا تھا۔ ان کی رحلت ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔

دل کے آئینہ کی جلا مشکل جب غبار آگیا، صفا معلوم
دل رنجیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن جب آنکھیں چار ہوتی ہیں، مروت آ ہی جاتی ہے

(۱۲) مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ (پیدائش ۱۸۶۲ء) نظام حیدرآباد دکن آصفؔ کے شاگرد اور وزیر اعظم اور مہاراجہ چندو لال شاداںؔ کے پوتے تھے۔ شادؔ شعرائے اردو کے بڑے مربی تھے جن میں داغؔ، امیرؔ، سرشارؔ، جلیلؔ، اخترؔ، محویؔ، ثاقبؔ اور ہوشؔ وغیرہ شامل ہیں۔ وہ خود فارسی اور اردو دونوں کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا نمونۂ کلام:۔

ہے جلوۂ یار میکدے میں ہے رقص بہار میکدے میں

اِس بادہ کا کیف ہم سے پوچھو ۔۔۔ کیفیتِ جام، جم سے پوچھو

(۱۳) منشی دُرگا سہائے سُرورؔ جہان آبادی (۱۸۷۳ء - ۱۹۱۰ء) جدید اُردو شاعری کی عمارت کے ایک ستون تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ہے

تجھے جن کا ہے تصوّر ارے مستِ جامِ اُلفت

ابھی انکھڑیوں کے صدقے میرے بادہ خوار سوجا

(۱۴) منشی پیارے لال رونقؔ دہلوی ولد منشی جے نرائن، تلمیذِ راسخؔ دہلوی دو دیوانوں کے مالک تھے جن میں سے ایک "رونقِ سخن" چھپ گیا تھا ۔

کس کو دل بیخودی میں دے بیٹھے؟

ہائے یہ بھی نہیں خیال ہمیں

(۱۵) منشی جگت موہن لال رواںؔ (پیدائش ۱۸۸۹ء) قصبۂ مُوراواں ضلع اُناؤ (یو پی، انڈیا) کے رہنے والے اور امیرؔ کے بیٹے افضلؔ اور عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے غزلیں تو کم کہیں، لیکن وہ نیچرل شاعری میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے ۔

حصولِ آرزو کی کیا توقع ایسے غافل سے

جو دل میں رہ کے بھی واقف نہیں بیتابیٔ دل سے

(۱۶) پنڈت چاند نرائن رینا سر تیج بہادر سپرو کے داماد اور علامہ اقبالؔ کے شاگرد تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام ہے

شمعِ اقبالؔ تیرا میں بھی ایک پروانہ ہوں!

تُو سراپا سوز ہے، میں سوز کا دیوانہ ہوں

(۱۷) شیام موہن لال جگرؔ بریلوی ہے

خونِ دل کچھ اس طرح اُن کے اشاروں پر ہوا

بڑھ گئی افسوس جینے کی تمنّا اور بھی

(۱۹) ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ بھی جدید اُردو شاعری میں ایک بڑا نام ہے :-

فطرت کی بہاروں کو آئینہ دکھا دے تُو ۔۔۔ رُخسارِ حقیقت سے پردے کو اُٹھا دے تُو

پیغامِ ترقی دے، پیغامِ محبت دے ۔۔۔ دُنیائے اسیری کو آزادیٔ جنت دے

دے بُت وہ محبت نے جو آپ بنائے ہوں ۔۔۔ دے نقش وہ فطرت نے جو آپ بنائے ہوں

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ پنڈت آنند نرائن مُلّا لکھنوی۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری وغیرہ۔

[خُم خانۂ جاوید، جلد سوم۔ شعرالہند جلد دوم ص ۴۲۸-۴۲۱۔ جدید اُردو شاعری، ص ۲۲۲-۲۲۰۔ سہ ماہی رسالہ اُردو، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۳۸ء]

(۲۷)

اُردو کے یوروپی شعراء

سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں سواحل ہند پر نیز بنگال اور جنوبی ہند میں، اور اُن تمام مقامات میں جہاں یوروپی تجار کے کارخانے اور تجارتی مراکز قائم تھے، افہام و تفہیم کے لیے پرتگالی زبان بطور رابطہ رائج تھی۔ مثلاً کلایو CLIVE پرتگالی زبان بخوبی جانتا تھا۔ اس طرح غیر معلوم طور پر بہت سے پرتگالی الفاظ انگریزی زبان میں سرایت کر گئے اور بے شمار ہندی، عربی اور مشرقی زبانوں کے اسماء انگریزی لغت میں پرتگالیوں کے ذریعہ سے داخل ہو گئے، جنہوں نے اُردو زبان کو بھی متاثر کیا، نتیجتاً حسب ذیل اور دیگر پرتگالی اسمار آج اُردو زبان کا ایک جزوِ لاینفک ہیں:۔

پُرتگالی		اُردو	انگریزی	
اُرماریو	ARMARIO	الماری	اَیل مرا	ALMIRAH
بَلدے	BALDE	بالٹی	بکیٹ	BUCKET
پادر	PADRE	پادری	پریسٹ	PRIEST
توباکو	TOBAGO	تمباکو	ٹوبے کو	TOBACCO
تُوآلیہ	TOALHA	تَولیہ	ٹوویل	TOWEL
سَباؤ	SABAO	صابن	سوپ	SOAP

اُردو زبان پر سب سے زیادہ اثر انگریزی زبان کا ہوا، لیکن ڈچ اور فرانسیسی زبانوں کا برائے نام۔ اہلِ یوروپ کا اُردو زبان و ادب کی ترقی میں بڑا حصہ ہے۔ مثلاً:۔

(۱) جان جوشوا کیٹلے لیئر JOHN JOSHUA KETELAER، ہندوستانی زبان کی گرامر پر کتاب لکھنے والے پہلے یوروپی مصنف ہیں۔ وہ پروشیا (جرمنی) کے ایک شہر کے باشندے اور عقیدتاً لوتھرن عیسائی تھے۔ اُنھیں ڈچ (ہالینڈ کے باشندے) لوگوں نے اپنا ایجنٹ بنا کر مغل شہنشاہان شاہ عالم اور جہاندار شاہ کے درباروں میں بھیجا تھا ۱۷۱۱ء

میں وہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سورت میں تجارتی ڈائریکٹر تھے، جہاں سے وہ دہلی، آگرہ اور لاہور آتے جاتے رہتے تھے۔ اُس زمانے میں آگرے میں اُس تجارتی ڈچ کمپنی نے بغرض تجارت اپنی اندرونی فیکٹری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ہندوستان میں اپنے اِس منصب پر ۱۷۱۶ء تک قائم رہے، جہاں سے وہ سفیر مقرر ہوکر ایران بھیج دیئے گئے تھے کیٹلے بیئر تیس سال تک اس علاقے میں ڈچ کی ملازمت میں رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی 'ہندوستانی گرامر اور ڈکشنری، ۱۷۱۵ء میں مرتب کی تھی، جس کو ڈیوڈ مل DAVID MILL نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا تھا۔

(۲) دوسرے یوروپی شخص ماتُورِین وِلیسیئر لاکروز MATURIN VEYSSIERE LA CROZE تھے جو نینٹس NANTES میں ۱۶۶۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۶۷۷ء میں برلن (جرمنی) کے ایلیکٹر ELECTOR کے مہتمم کُتب خانہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۷۳۹ء میں ہوا تھا۔ وہ مختلف ممالک کے دانشوروں سے خط و کتابت کیا کرتے تھے، جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوگئی تھی۔ ان کے خطوط میں اہم تر وہ خطوط تھے جو بیئر BAYER (سینٹ پیٹرز برگ کی امپیریل روسی اکادمی کے بانیوں میں سے ایک) نے اُنھیں لکھے تھے۔ اپنے ایک خط میں بیئر نے، جو اُنھوں نے یکم جون ۱۷۲۶ء کو لکھا تھا، اُردو زبان کے پہلے چار اعدادِ شمار کے نام لکھے تھے، جو غالباً سب سے پہلے یوروپ کو معلوم ہوئے تھے۔

(۳) ۱۷۴۴ء میں مشہور عیسائی مشنری (مُبَلِّغ) شُلٹز SCHULTZE کی اُردو گرامر لاطینی زبان میں شائع ہوئی تھی، جس میں اُردو الفاظ عربی رسم الخط میں ان کے تلفظ کے ساتھ ساتھ دیئے گئے تھے۔

(۴) ۱۷۴۸ء میں جان فریڈرِش فرِٹز JOHN FRIEDRICH FRITZ کی ایک عجیب وغریب کتاب لیپ سِش LEIPZIG (جرمنی) سے شائع ہوئی تھی، جس کا دیباچہ شُلٹز نے لکھا تھا اور جس میں دُنیا کی سَو سے اوپر مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی درج تھے۔ اس کتاب کے ۲-۳ صفحات اُردو زبان کے حروفِ تہجی کے لیے مع ان کے عربی رسم الخط کے مخصوص تھے۔

(۵) سُورت کے ایک عیسائی مشنری فرانسِسکس ایم ٹُوری نائسِس FRANCISCUS M. TURINYSIS نے ۱۷۰۴ء میں ایک اُردو ڈکشنری مُرتّب کی تھی، جس کا مسودہ اُس وقت روم کی پروپیگنڈا لائبریری میں محفوظ تھا۔

مذکورہ بالا اَوّلین وقدیم ترین عہد تھا جس میں یوروپی مُصنّفین نے 'ہندوستانی، (اُردو) زبان

کی لسانیات اور گرامر پر سرسری طور پر کتابیں لکھیں، جو ابتدائی اور اغلاط سے پُر تھیں، مگر اس کے بعد کے زمانے میں زیادہ سنجیدہ اور صحیح تر کتابیں کامیابی کے ساتھ رقم ہوئیں۔ اس طرح ہیڈلے HADLEY کی اُردو گرامر ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔ فرگسن FERGUSSIN کی 'ہندوستانی لغت' ۱۷۷۳ء میں شائع ہوئی۔ ایک پُرتگالی 'ہندوستانی گرامر' لسبن سے ۱۷۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اواری ساہیل IWARI SAHEL نے کوپن ہاگین سے ۱۷۸۳ء میں ایک کتابچہ شائع کیا، جس میں برِصغیر جنوبی ایشیا کی گیارہ زبانوں کے ۵۲ مترادف الفاظ ایک دوسرے کے مقابل درج تھے۔ ۱۷۹۱ء میں 'ہندوستانی' ناگری، تلنگی اور مالا باری السنۂ ہند کے حروفِ تہجی کا ایک مجموعہ ٹائپ میں روم (اطالیہ) سے شائع ہوا تھا، جس کا دیباچہ پالی نس اے ایس بارتھومولیئر PAULINUS A.S. BARTHOMOLAES نے لکھا تھا۔ ایک روسی لیبے ڈیف LBEDEFF نے اپنی 'ہندوستانی گرامر' لندن میں ۱۸۰۱ء میں لکھی تھی۔ وہ ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ مدراس میں بینڈ ماسٹر تھا، جہاں سے وہ کلکتہ گیا۔ وہاں اُس نے سنسکرت، ہندوستانی اور بنگالی زبانیں سیکھی تھیں۔ ایک معروف جرمن ماہرِ لسانیات جان کرسٹوف اڈے لنگ JOHANN CHRISTOPH ADELUNG نے اپنی 'متھرا داتیس' MITHRADATES ۱۸۰۶ء میں مُرتب کی تھی۔ کپتان تھوماس روبک ROEBUCK نے، جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی زبان کے پروفیسر اور ڈاکٹر گلکرائسٹ GILCHRIST کے ہمکار تھے، ایک انگریزی۔ ہندوستانی ڈکشنری ۱۸۱۱ء میں اور 'ہندوستانی انٹرپریٹر' (ترجمان) ۱۸۲۴ء میں لندن میں مُرتب کی تھی۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ کے ایک اور ساتھی کپتان ڈاکٹر جوزف ٹیلر TAYLOR نے اپنی 'ہندوستانی۔ انگریزی ڈکشنری' کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شائع کی تھی۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی بیش قیمت تصنیفات کا آغاز ۱۷۸۷ء سے ہوا تھا۔

لارڈ ویلزلے WELLESLEY ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، کی بُنیاد ۴ رمئی ۱۸۰۰ء کو رکھی تھی۔ ویلزلی ایک خود مختار اور آزاد رَو طبیعت کا مالک تھا۔ اُس نے یہ کالج برطانی ایسٹ انڈیا کمپنی، لندن، کے بورڈ آف ڈائرکٹرز سے اس کے قیام کی اجازت لیے بغیر قائم کر دیا تھا، اور پھر اس کے قیام کی اجازت بعد کو مانگی تھی۔ انگلستان کے بورڈ کو اُس کی یہ آزاد روی نہ بھائی۔ علاوہ ازیں اُنھیں تو دلچسپی ہندوستان کو لوٹ کر دولت جمع کرنے میں تھی نہ کہ ہندوستان میں کسی کارِخیر کو شروع کرنے سے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس کالج کے قیام کی اجازت نہ دی، جو بڑے وسیع پیمانے پر قائم ہونا تجویز ہوا تھا۔ مجبوراً اصلی اسکیم سے قطع نظر کر کے ۴ رجون ۱۸۰۲ء کو

وسیع پیمانے پر قائم شدہ کالج کے بجائے محض معمولی "کلکتہ مدرسہ"، پر اکتفا کیا گیا، جو لارڈ ڈلہوزی DALHOUSIE کے زمانے تک یا شاید ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ تک قائم رہا۔ اس کالج کے قیام کی تجویز ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے کی تھی اور وہی اس کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ اُردو زبان ان کی بیحد احسان مند ہے۔ اُنھی کی مساعیِ جمیلہ سے برِ صغیر میں ۱۸۴۶ء میں فارسی کی جگہ اُردو زبان نے لی تھی۔ جو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کی گئی۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ادبی کارنامے حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ انگریزی۔ہندوستانی لغت۔ کلکتہ ۱۷۸۷ء

۲۔ ہندوستانی علمِ زبان۔ ایڈنبرا ۱۸۱۰ء

۳۔ ہندوستانی صرف و نحو۔ کلکتہ ۱۷۹۶ء

۴۔ مشرقی زباندان۔ کلکتہ ۱۷۹۸ء

۵۔ رہنمائے زبانِ اُردو۔ کلکتہ ۱۸۰۴ء

۶۔ اتالیقِ ہندی۔ کلکتہ ۱۸۰۳ء

۷۔ ہندی۔عربی آئینہ۔ کلکتہ ۱۸۰۴ء

۸۔ انگریزی۔ہندوستانی مکالمہ۔ لندن ۱۸۲۰ء اور

۹۔ قصصِ مشرقی۔ کلکتہ ۱۸۰۳ء وغیرہ۔

یوروپی مُصنّفین نے کئی لُغات (ڈکشنریاں) بھی مُرتّب کی تھیں، مثلاً گلیڈون GLADWIN نے ایک فارسی۔ہندوستانی ڈکشنری لکھی تھی جو کلکتہ سے ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئی تھی، جان شیکسپیئر کی اُردو ڈکشنری ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ ڈنکن فاربز DUNCAN FORBES کی ہندوستانی ڈکشنری لندن سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

ایک فرانسیسی برٹرانڈ BERTRAND نے ایک اُردو ڈکشنری مُرتّب کی تھی جو پیرس سے ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ پرائیس PRICE کی اُردو ڈکشنری لندن میں ۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فیلن FELON کی ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری مشہور ہے۔ ان اُردو قواعد (گرامر) اور لُغات (ڈکشنریاں) کے علاوہ، جان ولیم پیل J.W.PEEL نے، جو آگرہ کالج میں طبیعیات و کیمیا کے پروفیسر تھے، طبیعیات پر اُردو میں ۱۸۵۰ء میں ایک کتاب لکھی تھی، جو مُصوّر پریس، آگرہ، میں ۱۸۵۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ جان پارکیس لیڈلے PARKES LEADLEY JOHN نے آگرے میں ایک اُردو پریس لگایا تھا جہاں اُنھوں نے اپنی ایک اُردو کتاب معاشیات پر "دستور المعاش" کے نام سے ۱۸۵۳ء میں طبع کی تھی۔

لیکن اُردو کا سب سے بڑا یورپی عاشق ایک فرانسیسی ادیب گارساں دتاسی DE TASSI GARCIN نامی تھا۔ گو وہ متعدد ہندوستانی زبانیں جانتا تھا، مگر اُسے خاص طور پر 'ہندوستانی' (اُردو) سے عشق تھا جس میں وہ بے تکان گفتگو اور خط و کتابت کرتا تھا۔ اُس کی اُردو کی مراسلت پیرس کی قومی لائبریری میں محفوظ ہے۔ برِصغیر جنوبی ایشیا سے اپنی فرانس کو مراجعت کے بعد، دتاسی اُردو زبان و ادب پر پیرس میں سالانہ لیکچر دیا کرتے تھے، جن کا اُردو ترجمہ نواب مسعود جنگ نے کیا تھا اور جو انجمن ترقیٔ اُردو، اورنگ آباد (دکن۔ انڈیا) کے ادبی آرگن سہ ماہی رسالہ 'اُردو' میں شائع ہوئے تھے۔ اسی ادارے سے وہ کتابی شکل میں بھی پیش کیے گئے تھے۔ گارساں دتاسی نے متعدد اُردو کتابوں کے فرانسیسی تراجم کر کے اپنے ہموطنوں کو اُردو زبان و ادب سے متعارف کیا تھا۔ دتاسی کی تصانیف کی فہرست بہت لمبی ہے، ذیل میں اُن کی بعض نہایت اہم تصانیف کا حوالہ دیا جاتا ہے:۔

۱۔ انتخاب از 'گلِ بکاولی'، پیرس، سنہ ۱۸۳۵ء۔
۲۔ 'سبق آموز قصے، نظمیں اور گیت'، پیرس، سنہ ۱۸۷۶ء۔
۳۔ ایک ہندوستانی ڈرامہ کا انتخاب، پیرس، سنہ ۱۸۵۰ء۔
۴۔ 'زبان کا ابتدائی رسالہ'، پیرس، سنہ ۱۸۳۳ء۔
۵۔ ہندوستان کے مقبولِ عام گیت، پیرس، سنہ ۱۸۵۴ء۔
۶۔ 'منورخ آیاتِ قرآنی'، پیرس، سنہ ۱۸۴۲ء
۷۔ اُردو۔ ہندی سے انتخابات، پیرس، سنہ ۱۸۵۴ء۔
۸۔ سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۷۷ء کے درمیان اُردو ادب کی ترقی پر ایک نظر، پیرس، سنہ ۱۸۷۴-۷۷ء۔
۹۔ 'منطق الطیر' مصنفہ حضرت فریدالدین عطار پر مبنی 'مسلمانوں کی دینی و فلسفیانہ شاعری'، پیرس، سنہ ۱۸۵۷ء۔
۱۰۔ 'حدائق البلاغت' پر مبنی 'مسلمانوں کا علم بلاغت'، پیرس، سنہ ۱۸۴۴ء۔
۱۱۔ 'بوستانِ سعدی کا انتخاب'، پیرس، سنہ ۱۸۵۲ء۔
۱۲۔ اُردو مصنفین اور ان کی تصانیف، پیرس، سنہ ۱۸۶۸ء۔
۱۳۔ 'اسماء و القابِ اہلِ اسلام'، پیرس، سنہ ۱۸۵۴ء۔
۱۴۔ اُردو اور ہندی ادب (نثر و نظم) کے تذکروں کا تذکرہ، پیرس، سنہ ۱۸۳۸ء۔
۱۵۔ 'انوارِ سہیلی' پر ایک نظر، پیرس، سنہ ۱۸۳۷ء۔

١٦۔ 'ذکرِ کتبہ جات عربی، فارسی اور اردو، پیرس، ۱۸۳۸ء۔

١٧۔ 'مسلمانانِ مشرق کا علمِ عروض (عربی، فارسی اور اردو)، پیرس، ۱۸۳۴ء۔

١٨۔ 'سعدی دکنی، ۱۸۴۳ء۔

١٩۔ 'مذہب اسلام. قرآن، عقاید و اعمال، پر ایک مذاکرہ، پیرس، ۱۸۷۴ء۔

٢٠۔ 'آثار الصنادید، کا ترجمہ، پیرس، ۱۸۵۲ء۔

٢١۔ 'اخوان الصفا، کا ترجمہ و تلخیص، پیرس، ۱۸۶۴ء۔

٢٢۔ 'مذہب اسلام کے عقائد، ماخوذ از قرآن، پیرس، ۱۸۳۶ء۔

٢٣۔ میر تقی میر کی شاعری کا انتخاب و ترجمہ، پیرس، ۱۸۲۶ء

٢٤۔ ولی کی شاعری کا انتخاب و ترجمہ، پیرس، ۱۸۳۶ء۔

٢٥۔ 'تشریح قوانینِ اہل اسلام، پیرس، ۱۸۳۲ء۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن دتاسی کا شاہکار ان کا 'تذکرۂ شعرائے اردو' (فرانسیسی) ہے، جو پیرس سے ۱۸۴۷ء میں دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ مصنف نے اس کا ترمیم شدہ و ضخیم تر ایڈیشن تین جلدوں میں پیرس سے ۱۸۷۰ء میں شائع کیا تھا، جس کے مفصل دیباچہ میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تواریخ بیان کی گئی تھیں اور ان کے ادبی فرق کو ظاہر کیا گیا تھا۔ اس میں تین ہزار اردو اور ہندی شعراء اور مصنفین کا تذکرہ تھا۔

برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ نے، بڑھاپے میں آگرے کے مولوی برکت اللہ سے اردو زبان سیکھی تھی اور اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ انھوں نے اپنی ڈائری اردو میں لکھی تھی۔ مشہور انگریز مستشرق سر ولیم جونس SIR W. JONES (متوفی ۱۷۹۴ء) بھی اردو بخوبی جانتے تھے۔

یوروپی شعرائے اردو

(۱) بی ڈی مانٹروز B.D.MONTROSE ایک آیرش آرٹسٹ اور پینٹر (نقاش) داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور مضطر تخلص کرتے تھے۔ وہ دہلی میں تقریباً دس سال مقیم رہے تھے اور ۱۸۸۳ء میں مرزا پور کے مقام پر وہ نوروزجی کے تھیٹر میں بطور آرٹسٹ (فنکار) شامل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ذاتی اسٹوڈیو الہ آباد میں کھول لیا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنے استاد مرحوم کا مرثیہ بعنوان 'نوحۂ داغ' ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا۔ ان کا نمونۂ کلام ہے

بچے تو کیا بچے کوئی نگاہِ چشم پُر فن سے
کہ در پردہ چلاتی ہے ہزاروں تیر چلمن سے

(۲) اسحاق عبری عبری کلکتہ کے ایک یہودی تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ہے
اشک مے شیشہ جگر، چشم میخانہ سینے ISAAC ABREE
دیکھیے اب ہمہ تن غیرتِ میخانہ ہوا

(۳) مُصطفیٰ ندیم، جدید ترک کے ایک معروف شاعر، کا ذکر کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا، جو انقرہ میں ۱۹۳۱ء میں فوت ہوئے۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے انھوں نے اپنے بعد ترکی اور فارسی میں اپنے دیوان چھوڑے اور اُردو میں بھی اپنے کلام کا مجموعہ چھوڑا جسے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے ڈاکٹر سر عبد اللہ المامون سہروردی نے 'سبد گل' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ندیم استنبول سے ۱۹۰۳ء میں ہندوستان آئے تھے اور بمبئی، حیدر آباد (دکن) اور کلکتہ میں مقیم رہے تھے۔ وہ واپس ترکی ۱۹۱۳ء میں گئے تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام اُردو ہے
راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی
جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

(۴) اے بی فلپس A.B. PHILIPS صابر، نجم اور سیماب اکبرآبادی دونوں کے شاگرد تھے۔ وہ آگرے میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور پیشہ کے لحاظ سے معلم (ٹیچر) تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ہے
حسرتیں جمع ہوں میری تو بنے اُن کی شبیہ
اُن کے جلوے جو ہوں یکجا تو میرا دل ہو جائے

کپتان الیگزنڈر ہیڈرسے ALEXANDER HEDERLEY آزاد، جیمس ہیڈرسے اور دہلی کی ایک مسلمان ماں کے بیٹے تھے۔ وہ نواب زین العابدین خاں عارف دہلوی (ولد نواب غلام مصطفیٰ خاں سرور و تلمیذ شاہ نصیر و مرزا غالب، جو صاحبِ دیوان تھے اور ۱۹۵۲ء میں فوت ہو گئے تھے) کے شاگرد تھے آزاد دہلی میں ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۶۱ء میں فوت ہو گئے تھے۔ آگرے کے مطبع احمدی نے ان کا دیوان ۱۸۶۳ء میں طبع کیا تھا۔ آزاد نے چند مرتبہ اپنی غزلوں پر بذریعہ مُراسلت غالب سے بھی اصلاح لی تھی۔ وہ دہلی میں طبابت کرتے تھے۔ لیکن بعد کو وہ ریاست الور میں توپ خانے کے کپتان مقرر ہو گئے تھے۔ وہ عالمِ جوانی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام ہے

وہ مُکدر ہوا ہے دل اُس کا
کوئی صورت نہیں صفائی کی !

(۶) جارج اسٹیفین GEORGE STEPHEN اصفاںؔ دہلوی ایک یوروپی باپ اور ایک ہندوستانی مسلمان ماں کے بیٹے تھے اور ۱۸۰۲ء میں بقید حیات تھے۔ منشی خوب چند ذکاؔ دہلوی نے اپنے تذکرے میں انھیں اپنا قریبی دوست کہا ہے [ذکاؔ نے اپنے اُستاد اور مربّی میر نصیر الدین نصیر المعروف بہ میر کلّو کی ترغیب سے اُردو شعراء کا ایک ضخیم تذکرہ مرتب کیا تھا' جس کا نام 'عیار الشعراء' تھا اور جو ۱۷۹۲ء اور ۱۸۳۱ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔ اس میں بے شمار شعرائے حالات درج تھے اور وہ ایک ہزار صفحات پر محیط تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مسودے کی ایک نقل ڈاکٹر اسپرنگر کے پاس تھی۔ ذکاؔ ۱۸۴۶ء میں فوت ہوئے تھے] اصفاںؔ کا نمونۂ کلام ؎

خط کا یہ جواب آیا، لکھا جو کبھی پھر خط
کر ڈالوں گا ایک دم میں تیرے آنکے پُرزے

(۷) جان بال تھزار JOHN BALTHAZAR اسیرؔ دہلوی نواب ظفر یاب خاں صاحب دہلوی (سردھنہ کی بیگم سمرو کے متبنّیٰ تھے)، کے ایک ذاتی دوست اور شاہ نصیرؔ دہلوی [شاہ نصیر الدین نصیرؔ دہلوی المعروف بہ میاں کلّو صاحبِ دیوان اور میر مہدی مائلؔ کے شاگرد تھے۔ وہ حیدر آباد' دکن' میں دیوان چندو لال کی زیرِ سرپرستی مقیم رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ مرنے کے بعد وہ حضرت موسیٰ شاہ قادری کے مقبرے کے اندر یعنی احاطہ قاضی مخدوم موسیٰ متصل پُل قدیم میں دفن کئے گئے تھے] کے شاگرد تھے۔ اسیرؔ دہلوی کا نمونۂ کلام ؎

ہم اُس آئینہ رُو کے ہجر میں یوں زیست کرتے ہیں
کہ سکتہ کی سی حالت ہے، نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

(۸) آئرین جیکب IRENE JACOB ایرنؔ گورکھپوری ریاضؔ خیر آبادی کے شاگرد تھے (سید ریاض احمد ریاضؔ خیر آبادی منشی امیر احمد امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے)، ؎

یہ کیا چُپکے چُپکے شکایت ہے اے دل؟
خبردار کس کا گلہ ہو رہا ہے

(۹) دانیال سُقراط ناتھی نیل گارڈر D.S.N.GARDER شکرؔ باشندۂ ایٹہ (یوپی۔ انڈیا)

پہلے جوزف بینسلی J. BENSELEY فنا کے اور پھر مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی کے شاگرد ہوئے تھے (ہوش آفتاب الدولہ ارشد علی خاں قلق لکھنوی کے شاگرد تھے) ؎

دعائیں ہوئیں کارگر رفتہ رفتہ
ہوا مدتوں میں اثر رفتہ رفتہ

(۱۰) جارج برنس شور G. B. SHORE شور علی گڑھ میں رہتے تھے۔ منشی کریم الدین اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ شور اپنی غزلیں اُن مشاعروں میں پڑھے جانے کے لیے بھیجا کرتے تھے جو ۱۸۴۲ء میں اُن کے (منشی کریم الدین کے) گھر پر منعقد ہوا کرتے تھے (منشی کریم الدین پانی پت کے رہنے والے تھے اور ۱۸۵۲ء میں ۵۹ سال کے تھے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے ایک اُن کا مشہور تذکرہ "شعرائے اُردو" ہے)۔ شور کے دو دیوان طبع ہو گئے تھے مگر وہ نایاب ہیں۔ وہ (ممتاز المطابع، میرٹھ میں ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئے تھے۔ شور کا نمونۂ کلام ؎

دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا
سر جس طرف جھکا یا وہی سجدہ گاہ تھی

(۱۱) ایلوی سس رائن ہارٹ ALOYSUS REINHARDT صاحب الملقب بہ نواب ظفریاب خاں، مظفر الدولہ، فرانسیسی النسل اور مشہور بیگم سردھنہ، زینت النساء بیگم شمرو کے متبنّٰی تھے۔ (بیگم شمرو ایک عرب مسلم کی بیٹی تھیں جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر کے ایک فرانسیسی جنرل سومبر SOMBRE سے شادی کر لی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد وہ ریاست سردھنہ کی حکمراں بن گئی تھیں اور ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو فوت ہوئی تھیں) صاحب کا لباس اور رہنا سہنا بالکل مسلمانوں کا سا تھا۔ اُن کی شاعری اور مشاعرے دہلی میں نہایت مقبول تھے۔ اُن کے مشاعروں میں، جو دہلی میں ان کے مکان پر منعقد ہوا کرتے تھے، ممتاز شعرا اپنی غزلیں پڑھا کرتے تھے مع نواب سرور کے۔ (اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور محمد جان بیگ سامی کے شاگرد، صاحبِ دیوان اور اُردو شعرائے کے ایک تذکرہ 'عمدہ منتخبہ' کے مصنف تھے سرور کا انتقال ۱۸۳۴ء میں ہوا تھا)۔ صاحب خیراتی خاں افغانی دلسوز دہلوی کے شاگرد تھے۔ (دلسوز نصیر کے شاگرد اور نواب ظفریاب خاں کے، جن کا انتقال جے پور میں ہوا تھا، مصاحب تھے)۔ صاحب موسیقی اور نقاشی دونوں میں ماہر تھے۔ ان کا انتقال جوانی میں ۱۸۲۶ء

ہیں ہوا تھا۔ ان کا نمونۂ کلام ؎

نظر آیا مجھے شب بام پہ پیارا اپنا
بارے اب کچھ ہے بلندی پہ ستارا اپنا

(۱۲) جونس JOHANS صاحب میر وزیر علی صبا لکھنوی کے شاگرد تھے۔ (صبا میر بندہ علی لکھنوی کے بیٹے اور خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے تھے۔ ان کا دیوان "غنچۂ آرزو" کے نام سے طبع ہو چکا ہے)۔ صاحب کا نمونۂ کلام ؎

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا
مجھ کو پہنانے ہو زنجیر پہ زنجیر عبث

(۱۳) جارج فون ٹوم G. FONTAUM صاحب کپتان برنارڈ فونٹوم کے بیٹے، فرانسیسی نژاد اور میر نجف علی شفقت کے شاگرد تھے۔ صاحب نے عربی و فارسی زبانیں بھی سیکھی تھیں اور کچھ عرصے تک ان کا تخلص جرجیس رہا تھا۔ ان کا تعلق ریاست رامپور سے تھا اور وہ ۱۸۷۳ء تک زندہ تھے، جبکہ ان کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔ صاحب فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے (شفقت ولد یار محمد شاہ درگاہی کے خلیفہ اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ وہ رامپور میں رہتے تھے، جہاں اُن کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا تھا۔ اُس وقت ان کی عمر ۶۶ سال تھی)۔ صاحب کا نمونۂ کلام ؎

یہ آرزو ہے تیرے آنے کی مجھے اے شوخ
کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

(۱۴) جان تھومس J. THOMAS طوماس المعروف بہ "خان صاحب"، ولد جارج تھومس (آئرلینڈ کے باشندے) شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۰۲ء میں ہانسی سے ترکِ سکونت کر کے دہلی آگئے تھے، جہاں وہ مستقلاً سکونت پذیر رہے ؎

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اسقدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

(۱۵) فرانکوے کوئنس FRANCOIS QUINES فراسُو ولد آگسٹن (ایک فرانسیسی) خیراتی خاں دلسوز کے شاگرد اور بیگم سردھنہ کے شاعر دربار تھے۔ ان کا دیوان دہلی میں لالہ سری رام کی لائبریری میں تھا۔ فراسُو کا نمونۂ کلام ؎

کہوں میں دل کے تڑپنے کی کیا حقیقت، آہ
خدا کسی کو دکھائے نہ اضطراب کے دن

(۱۶) بنجامن جانسٹن B. JOHNSTON فلاطون المعروف بہ ڈاکٹر بنی صاحب ایک معروف طبیب اور فارسی و اُردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ وہ امیر اللہ احمد امیر مدراسی کے فارسی میں اور مرزا مہدی حسین حنا کے اُردو میں شاگرد تھے۔ وہ حیدر آباد (دکن) میں ملازم تھے اور ۱۸۸۶ء میں قریباً پچاس سال کے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ ؎

کیوں خزاں میں سر پٹک کر مر نہ جائے عندلیب
ہے بقائے گل سے وابستہ بقائے عندلیب

(۱۷) آگسٹن دو سلویرا A. DE SILVERA مفتوں آگرے کے ایک پرتگالی باشندے اور مرزا عنایت علی بیگ ماہ لکھنوی (تلمیذ آتش) کے شاگرد تھے ؎

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اُس کے پیکاں کا
کہ مدت میں گزر دل میں ہوا ہے آج مہماں کا

(۱۸) واکر WALKER واکر کلکتہ کے ایک انگریز شاعر ؎

تاثیر دم سرد کی ظاہر ہوئی جب سے
تن ہو گیا یخ، بن گئی کافور کی بڈی ہے

(۱۹) این ANNE ملکہ۔ کلکتہ کے ایک انگریز پولس سپرنٹنڈنٹ بلیکر BLAKER نامی کی بیٹی، جو ۱۸۷۰ء میں زندہ تھیں۔ وہ بڑھاپے میں کلکتہ ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں اور مولوی عبدالغفور نساخ کی شاگرد تھیں، جو کلکتہ میں رہتے تھے (نساخ صاحب دیوان اور "تذکرہ سخن شعرا" کے مصنف تھے، جن کی کلیات شائع ہو چکی ہے)۔ ملکہ کا نمونۂ کلام ؎

ہجر میں دل کو بیقراری ہے
جوشِ فریاد آہ وزاری ہے

(۲۰) مسز آرکیسٹن ARCHESTON جمعیت آگرے کے میجر آرکیسٹن کی بیوی ؎

رُوٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے
اس واسطے رہتی ہوں میں مُضطر کئی دن سے

حسب ذیل تذکروں میں یورپی شعرائے اردو کے متعلق مواد مہیا کیا گیا ہے :-

(۱) تذکرۂ شعرائے اردو (فرانسیسی زبان میں) از گارساں دوتاسی GARCIN DE TASSI پہلے دو جلدوں میں پیرس میں ۱۸۴۷ء میں اور پھر ۱۸۷۰ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں تین ہزار شعراء کا ذکر ہے، جن میں ۲۵۰ ہندی کے اور باقی ۲،۷۵۰ اردو شعراء ہیں۔ ان میں سے ۲،۲۰۰ مسلمان ہیں۔

(۲) طبقات الشعراء از منشی کریم الدین۔ ایف فیلن F FELON نے گارساں دوتاسی کے مذکورہ بالا فرانسیسی تذکرے کو مختصر کر کے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، جس کو منشی کریم الدین نے اردو میں ترجمہ کیا اور جو دہلی میں ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔

(۳) گلشن بیخار، از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، جو فارسی میں ۱۸۳۲ء میں لکھا گیا تھا اور جس میں قریباً چھ سو اردو شعراء کا ذکر ہے۔ اس میں ۲۷۲ صفحات ہیں۔

(۴) سخن شعراء از عبدالغفور خاں نساخ، ۱۸۶۴ء میں مرتب ہوا تھا اور اس میں ۵۸۲ صفحات ہیں۔

(۵) خمخانۂ جاوید، یا تذکرۂ ہزار داستان، از لالہ سری رام دہلوی (رائے بہادر مدن گوپال دہلوی کے بیٹے) جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔

(۶) انتخاب یادگار، از منشی امیر احمد امیرؔ مینائی لکھنوی، ۱۸۷۳ء میں نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رامپور کے ایماء سے مرتب ہوا تھا۔ اس میں صرف ان اردو شعراء کا ذکر ہے جو یا تو باشندگانِ رامپور تھے یا دربارِ رامپور سے وابستہ تھے۔

(۷) یادگارِ ضیغم، از محمد عبداللہ خاں ضیغم، ۱۸۸۵ء میں مرتب ہوا تھا، جس میں صرف ان شعرائے اردو کا ذکر ہے جو ۱۸۸۴ء میں زندہ تھے۔ اس میں ۵۰۴ صفحات ہیں۔

(۸) تذکرۂ فرح بخش، از نواب یار محمد خاں (نواب فوجدار محمد خاں کے فرزند)، والیٔ بھوپال ۱۸۷۰ء میں مرتب ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا تذکرہ ہے جس میں صرف ۸ صفحات ہیں اور جس میں محض ان اردو شعراء کا ذکر ہے جو بھوپال میں رہتے تھے۔

(۹) عمدۂ منتخبہ، از نواب میر محمد خاں سرور، ۱۸۲۶ء میں مرتب ہوا تھا۔ یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں قریباً ۱۲۰۰ اردو شعرا کا ذکر ہے۔

(۱۰) گلستانِ بیخزاں، یا نغمۂ عندلیب، از حکیم قطب الدین خاں باطن لکھنوی۔

(۱۱) "فہرست کتب خانۂ شاہانِ اودھ، مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر DR. SPRINGER -

- (سہ ماہی رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۳۰ء "اردو زبان کا ایک آئرش شاعر" از مقبول حسین احمد پوری "ماہنامہ "کلیم" دہلی، اگست ۱۹۳۷ء "وہ انگریز جنہوں نے اردو کی خدمت کی" از سید رضا قاسم مختار۔ ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور، اپریل ۱۹۳۳ء "مصطفٰے ندیم" از چراغ حسن حسرت ایڈیٹر "تہذیب" لاہور۔ ماہنامہ "شاعر" آگرہ "آگرہ اسکول نمبر" ۱۹۳۷ء "اہلِ یوروپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی؟" از مولوی عبدالحق، ایڈیٹر سہ ماہی رسالہ "اردو" اورنگ آباد (دکن)، جنوری ۱۹۲۴ء "ہندوستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف" گارساں دتاسی کے لکچر، سہ ماہی رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۲۸ء "یوروپین شعرائے اردو" از مولوی محمد سردار علی "نظامِ دکن پریس" حیدرآباد (دکن) ۱۹۲۵ء)

حصّہ دوم

اُردو نثر

نثر نگار

سرسید احمد خان

سید علی بلگرامی

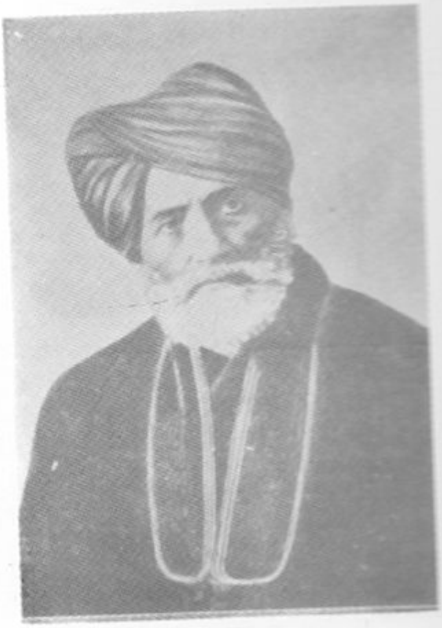

مولوی محمد حسین آزاد

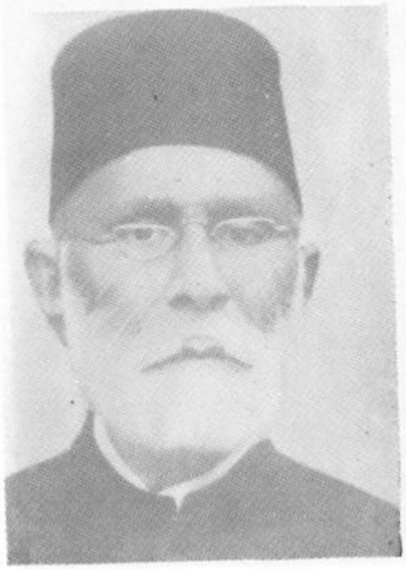

خواجہ الطاف حسین حالی

سجاد حسین

نذیر احمد

رتن ناتھ سرشار

مولانا شبلی نعمانی

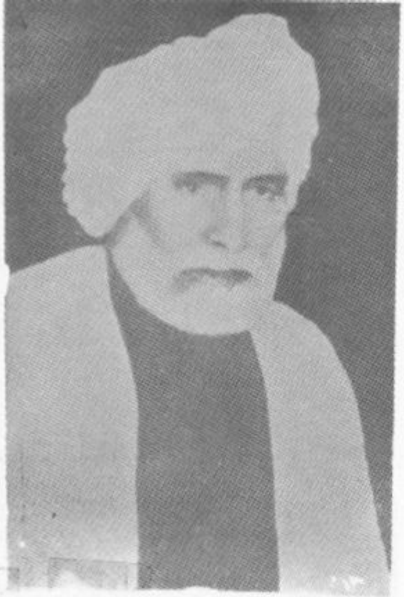
مرزا محمد ہادی رسوا

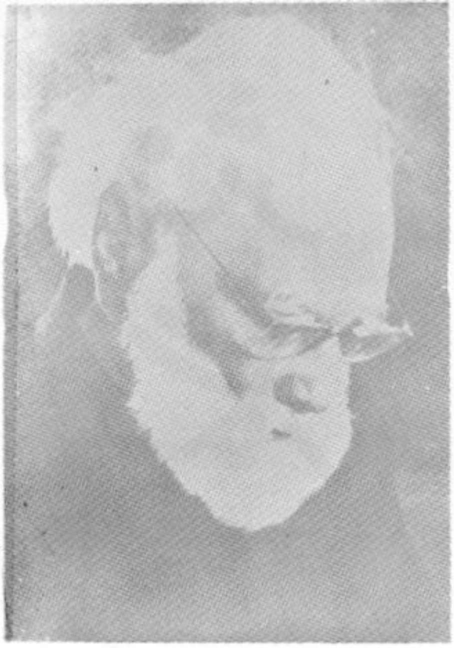
ڈاکٹر مولوی عبدالحق

آغا حشر

عبدالحلیم شرر

خواجہ حسن نظامی

سید سجاد حیدر یلدرم

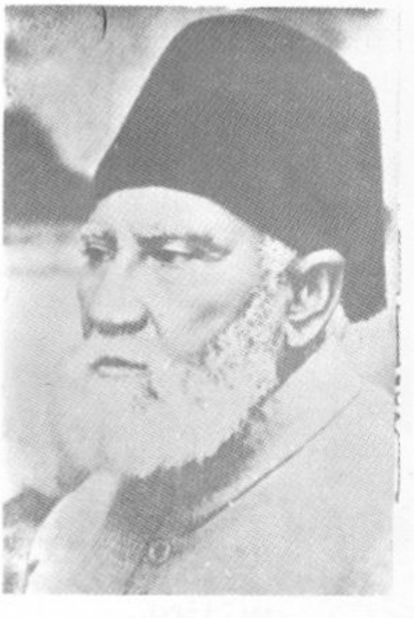
علامہ راشد الخیری

شیخ عبدالقادر

فرحت اللہ بیگ

سید سلیمان ندوی

حافظ محمود شیرانی

مہاشے سدرشن

منشی پریم چند

ابوالکلام آزاد

قاضی عبدالغفار

نیاز فتح پوری

عظیم بیگ چغتائی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

علی عباس حسینی

شوکت تھانوی

کرشن چندر

پطرس بخاری

ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

امتیاز علی تاج

آل احمد سرور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

حصّہ دوم

اُردو نثر

(۲۸)

اُردو ادب کی تاریخ

اُردو زبان کے آغاز و ابتدا کے بارے میں انشاء اللہ خاں نے اپنی فارسی تصنیف 'دریائے لطافت' میں اور میر امّن نے اپنی کتاب 'باغ و بہار' (۱۸۰۱ء) میں لکھا ہے کہ اس زبان کی بُنیاد (بقول میر امّن) شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں یا (بقول انشاء) شہنشاہ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں، جو یا تو اکبر آباد (آگرہ) میں، یا شاہجہان آباد (دہلی) میں پڑی تھی۔ سر سید احمد خاں اپنی تصنیف 'آثار الصنادید' (۱۸۵۴ء) میں اس طرح رقم طراز ہیں :—

"شہنشاہ جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اپنی بات چیت میں مسلمان فارسی اور ہندو بھاشا بولتے تھے۔ مگر امیر خسرو نے خلجی شاہانِ دہلی کے زمانے سے، یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں، بھاشا کے الفاظ فارسی میں سمونے شروع کیے، اور اُس زبان میں پہیلیاں، کہہ مُکرنیاں اور نسبتیں، کہیں۔ اس طرح بھاشا اور فارسی کا غیر معلوم طور پر اختلاط و فروغ پذیر ہوا جو بتدریج تھا، لیکن ہنوز کوئی نئی زبان عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ آخر کار جب شہنشاہ شاہجہاں نے شاہجہان آباد کو ۱۶۴۸ء میں بسایا، جہاں مختلف ممالک کے لوگ آکر جمع ہوئے تو ضرورتاً فارسی اور بھاشا زبانیں زیادہ قریب آگئیں۔ مختصر یہ کہ شاہی افواج نیز 'اُردوئے مُعلّٰی' بازار میں ان دونوں زبانوں کا مخلوط خمیر تیار ہو کر ایک نئی زبان کی پیدائش کا

سبب بنا، جسے 'اردو' کا نام دیا گیا، حتیٰ کہ ۱۱۰۰ھ ہجری مطابق ۱۶۸۸ء میں، یعنی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اس نئی زبان میں شعر و شاعری بھی ہونے لگی۔"

جب عربوں نے ہندوستان پر حملہ کیا، اُس وقت ملک کی عام زبان 'برج بھاشا' تھی، جو صوبجات یوپی، بہار، پنجاب، سندھ، راجپوتانہ اور مالوہ وغیرہ میں رائج تھی۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ اور پنجاب میں آکر آباد ہوئے جہاں عربی فارسی اور بھاشا کا باہمی لسانی اختلاط سب سے پہلے عمل میں آیا۔ بعض مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ امیر خسرو [۱۲۵۵ء ۔ ۱۳۲۵ء] اردو زبان کے پہلے شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ اردو کے پہلے نثر نگار بھی تھے، جیسا کہ اُن کی 'خالق باری' سے ثابت ہے۔ شاد عظیم آبادی اپنی تصنیف 'فکر بلیغ' میں امیر خسرو کی اردو میں ادبی تخلیق کی صداقت کو مشکوک سمجھتے ہیں، نیز اس کو جو اُن سے پیشتر عالم وجود میں آنے کی دعویدار ہے۔ کیونکہ اُس کی زبان کا معیار کافی ترقی یافتہ ہے۔ امیر خسرو کی اردو تخلیقات کے علاوہ بعض دوسری ایسی اردو تحریریں دریافت ہوئی ہیں، جن کا تعلق شاہجہان آباد (دہلی) کے بسنے سے پیشتر سے ہے۔ ان میں سے ایک محمد افضل جھنجھانوی کی تصنیف 'بارہ ماسہ' ہے، جن کی رحلت ۱۶۲۵ء میں ہوئی تھی۔ اُس کا نمونہ ؎

اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے؟
کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

پروفیسر محمود خاں شیرانی نے اپنی تصنیف 'پنجاب میں اردو' میں 'تذکرۂ میر حسن' کے حوالہ سے، اس 'بارہ ماسہ' کے کچھ اور اشعار بھی لکھے ہیں، جن میں سے ایک حسب ذیل ہے ؎

مسافر سے جنھوں نے دل لگایا!
اُنھوں نے سب جنم روتے گنوایا

مندرجہ بالا اشعار 'بارہ ماسہ' علی ابراہیم خاں خلیل کے 'تذکرۂ گلزار ابراہیم' میں بھی ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان اردو اشعار کی موجودگی کے علم کے باوجود میر حسن اور ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے دہلی میں 'ریختہ' کا آغاز وہاں ولی دکنی کی آمد سے کیوں متعین کیا ہے۔ مزید برآں شہنشاہ بابر کی 'تزک بابری' میں حسب ذیل شعر ملتا ہے ؎

مجھکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا حلیفہ لیس بولتو سید وُر پانی و روٹی

('تزک بابری' کا مسودہ ریاست رامپور کی سرکاری لائبریری میں محفوظ تھا)

صفیر بلگرامی نے اپنے 'تذکرہ جلوہ خضر' میں ایک اُردو رباعی کو شہنشاہ اکبر سے منسوب کیا ہے لیکن اس کی تردید سرسید احمد خاں نے 'تزک جہانگیری' میں کردی ہے۔ صفیر بلگرامی کے مذکورہ بالا بیان کے باعث نواب نصیر حسین خیال وغیرہ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ مذکورہ رباعی شہنشاہ اکبر نے کہی تھی حقیقت یہ ہے کہ اردو میں 'تزکِ جہانگیری' کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے شہنشاہ اکبر کی وہ فارسی رباعی بھی اُردو نظم میں ترجمہ کردی ہے، جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ البتہ 'تزکِ بابری' میں بعض اُردو الفاظ ملتے ہیں، مثلاً ہاتھی، پان، پنکھا، کیلا اور دوپہر وغیرہ۔ 'تذکرہ جلوہ خضر' میں دو اُردو اشعار ملکہ نورجہاں سے منسوب کئے گئے ہیں، لیکن میر حسن نے اپنے 'تذکرہ شعرائے اُردو' میں وہی اشعار معین الدین معین بدایونی کے بتائے ہیں۔ نساخ نے اپنے 'تذکرہ سخن شعرا' میں انھی معین بدایونی کے دو مزید اشعار نقل کئے ہیں۔ نواب نصیر حسین خیال نے اپنی تصنیف 'مغل اور اردو' میں بعض اُردو اشعار کو شہزادی زیب النسار (دختر شہنشاہ اورنگ عالمگیر) سے منسوب کیا ہے بحوالہ 'جلوہ خضر' جن میں سے ایک حسبِ ذیل ہے ؎

کہتے ہو تم نہ گھر میرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

مگر اُن کے بدرجہا ترقی یافتہ معیارِ شعری کے باعث اُردو کے یہ اشعار یقیناً شہزادی زیب النسار کے نہیں ہوسکتے اور نہ وہ اُردو رباعی، جو شہنشاہ اکبر سے منسوب ہے، نہ وہ اُردو اشعار جو ملکہ نورجہاں کی تخلیق بیان کئے جاتے ہیں، کس طرح اصلی اور اُن کے ہوسکتے ہیں۔ البتہ مذکورہ بالا بابر کا اُردو شعر کسی شک و شبہ سے بالا ہے، کیونکہ اوّل تو اس کا معیار محض ابتدائی ہے، دوسرے یہ کہ وہ 'تزکِ بابری' میں موجود ہے، جس کو شہنشاہ بابر نے خود تصنیف کیا تھا۔ ابوالفضل نے بھی اپنی تصنیف 'آئینِ اکبری' میں فارسی کے ساتھ بعض ہندی الفاظ بھی لکھے ہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دورانِ سلطنت میں شمالی ہند میں اُردو ادب مستحکم و ترقی پذیر ہوتا گیا۔ اُس وقت کے نمایاں اُردو ادیب میر جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) اور مرزا عبدالقادر بیدل (متوفی ۱۷۲۰ء) ہیں۔ حضرت امیر خسرو کی 'خالق باری' کی طرح، خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۱۴۰۵ء) کی تصنیف 'رسالۂ تصوف و اخلاق' (۱۳۰۸ء) بھی اُردو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں سے ہے۔ ان کے بعد محمد افضل جھنجھانوی کے 'بارہ ماسہ' کا نمبر آتا ہے۔

قدیم ترین اُردو نثری تصانیف کے سلسلے میں دکن اہم حیثیت کا حامل ہے۔ دکن کی سب سے

پہلی نثری تصانیف میں شیخ عین الدین گنج العلم (پیدائش ۱۳۰۶ء) کے رسائل شامل ہیں۔ سلطان علاالدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے ۱۳۱۲ء میں دکن فتح کیا تھا۔ اُس شمالی عسکری لشکر نے دکن کو لسانی طور پر بھی ضرور متاثر کیا ہوگا۔ پھر شیخ عین الدین گنج العلم دکن میں دولت آباد اور بیجا پور پہنچے، جہاں وہ دہلی سے گجرات ہوکر گئے تھے۔ اُنھوں نے ۱۳۹۳ء میں بیجاپور میں انتقال کیا۔ اُن کے دکنی اُردو میں مذکورہ بالا رسائل فقراب بمشکل دستیاب ہیں۔ شیخ عین الدین کے بعد، اوّل ترین اُردو نثر نگاروں میں خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ (متوفی ۱۴۲۱ء) کا نام لیا جاتا ہے، جو دہلی سے گلبرگہ (دکن) پہنچے تھے اور وہیں اُنھوں نے رحلت فرمائی۔ اُن کی اُردو میں نثری کتاب 'معراج العاشقین' اُن قدیم ترین اُردو نثری کارناموں میں شمار ہوتی ہے جو شائع ہوئے تھے۔ اس کا نمونہ:۔

"پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کر دوا دینا۔ پیر منع کئے سو پرہیز کرنا۔
طبیب فرمائے نیوں پرہیز کرے، تو اُن نے بھی طبیب ہووے گا۔"

اس کے بعد سید عبداللہ حسینی نے حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب 'نشاط العشق' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کے بعد وجدی ہوئے جن کو بعض مورخین نے دکنی اُردو زبان کا قدیم ترین شاعر کہا ہے۔ اُنھوں نے اپنی معروف نثری کتاب 'تحفۂ عاشقاں' ۱۶۰۶ء میں لکھی تھی۔ 'پنچھی بچھا' (۱۷۴۲ء) بھی وجدی کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ لیکن نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف 'دکن میں اُردو' میں لکھا ہے کہ وہ کارنامہ ایک دوسرے وجدی کا تھا، جو ولی اور سراج کے ہمعصر تھے۔

مذکورہ بالا قدیم اُردو کی نثری کتب کے علاوہ 'سفرنامہ ابن بطوطہ'، 'شرف نامہ'، اور 'موید الفضلا' نامی کتابوں میں بھی اُردو زبان کے سینکڑوں الفاظ ملتے ہیں، جن سے اس نئی زبان 'اُردو' کی سولھویں اور سترھویں صدیوں میں ہر دلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے۔

جب سلطان محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، اُس وقت دہلی کا حکمراں پرتھوی راج چوہان تھا، جس کے شاعر دربار چندر کوی نے 'پرتھوی راج راسا' [۵۸۵ ہجری مطابق ۱۱۸۹ء] میں لکھی تھی، جس میں حسب ذیل اُردو الفاظ استعمال ہوئے تھے، مثلاً سلطان، سلام، پروردگار، پیغام، کریم، اللہ، مسلمان، فرمان وغیرہ جو غالباً اُس زمانے میں مستعمل تھے۔ اُردو ادب کے اکثر مورخین اس کو ایسا قدیم ترین کارنامہ سمجھتے ہیں جس میں اُردو زبان کے الفاظ موجود ہیں۔ لیکن بعد کے محققین نے ایک قدیم تر ہندی شاعری کی کتاب دریافت کی ہے، جس کا نام 'وسال دیو راسو' (۱۱۵۵ء) ہے، جو ایک ان پڑھ ہندو کوی (شاعر) نرپت لال کی تصنیف ہے، اور جو ۱۹۲۵ء میں ناگری

پرچارنی سبھا، نے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں حسب ذیل الفاظ عربی اور فارسی زبانوں سے موجود ہیں جو اُردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں:۔ کُلا (کلاہ یعنی ٹوپی)، کبائی (یعنی قبا)، جرہ (یعنی زرہ)، کِسماگ (یعنی قسمت)، تاجی (یعنی تازی۔ تازہ)، باج باج (یعنی بعض بعض)، چابکو (یعنی چابک) وغیرہ [" اُردو سروے رپورٹ، ہندوستانی اکادی، الہ آباد ۱۹۲۷ء]

حسب ذیل فارسی تواریخ شاہد ہیں کہ ہندوستان میں تغلق خاندان کی حکمرانی کے عہد میں اُردو کا وجود تھا۔ ان تواریخ میں اُردو کے الفاظ ملتے ہیں اور یہ عہدِ تغلق ہی سے تعلق رکھتی ہیں: (۱) تاریخِ فیروز شاہی، از ضیاء الدین برنی۔ اور (۲) تاریخِ فیروز شاہی، از عفیف سراج۔ ان دونوں تواریخ میں ہندی الفاظ آزادی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد سنت کبیر (متوفی ۱۵۱۸ء) کا زمانہ آتا ہے نیز گرونانک (متوفی ۱۵۳۸ء) کا۔ کم و بیش وہی زمانہ سُورداس اور تُلسی داس کا ہے، جن کے بھاشا زبان میں کارنامے عربی اور فارسی الفاظ کے حامل ہیں، جو اُردو میں مستعمل ہیں۔ کبیر کی ادبی تخلیق اُس زبان وادب کی ترجمان ہے جو دہلی میں سلطان سکندر لودھی کے عہد میں رائج تھے۔ گرونانک کبیر کے ہمعصر اور سکھ مت کے بانی تھے۔ بعض اُردو غزلیں بھی کبیر سے منسوب کی گئی ہیں۔ لیکن ان کی صداقت مشکوک ہے۔ کبیر کے دوہے کا نمونہ ؎

کنکر پتھر جوڑ کے مسجد لیے بنائے
تا چڑھ مُلا بانگ دے کیا بہرا ہوا خدائے؟ (آبِ حیات صـ۱۶)

گرونانک کے دوہے کا نمونہ:۔

سانس ماس سب جیو تمھارا تُو ہے کرا پیارا
نانک شاعر یو کہت ہے سچے پرور دگارا

تاریخِ فرشتہ، کے مطابق راجہ کالنجر، آنند، نے اپنا ہندی قصیدہ (۱۰۲۲ء میں) سلطان محمود غزنوی کی شان میں لکھ کر پیش کیا تھا اور سلطان موصوف کی بہت خوشنودی حاصل کی تھی سلطان محمود کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مسعود غزنوی (۱۰۴۰-۱۰۳۰ء) کو سلجوقی ترکوں نے بہت پریشان کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے بیٹے مودود غزنوی (۱۰۴۸-۱۰۴۰ء) کے پاس حکومت کرنے کے لیے صرف افغانستان اور ہندوستان رہ گئے۔ اس طرح سلطان محمود غزنوی کی اولاد کو وسطی ایشیاء سے ہاتھ دھوتے پڑے اور پنجاب (موجودہ پاکستان) میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ پنجاب میں غزنوی بادشاہوں کے دربار نے عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے باہمی اختلاط و ارتباط کے

مراکز بن گئے تھے۔ مسعود سعد سلمان، ابو عبداللہ (سلطان ابراہیم کے عہد میں ۱۰۵۹-۹۹ء) اور حکیم سنائی غزنوی (سلطانِ بہرام شاہ غزنوی کے ہم عصر، از ۱۱۱۸ء تا ۱۱۵۰ء) بڑے مشہور فارسی گو شعرا تھے، جو ہندی میں بھی شعر گوئی کرتے تھے (اُردوئے قدیم، از مولوی شمس اللہ قادری، اور پنجاب میں اردو، از پروفیسر محمود شیرانی)۔

دکن میں اُردو نثر کی قدیم ترین تصانیف، حضرت شاہ عین الدین گنج العلم اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (رسالہ معراج العاشقین، اور ہدایت نامہ وغیرہ) کے دینی و صوفیانہ رسائل کے بعد، حسبِ ذیل تسلیم کی گئی ہیں:

۱۔ 'کلمۃ الحقیقت'، از شاہ برہان الدین (متوفی ۱۵۸۲ء)۔
۲۔ 'احکام الصلوٰۃ'، از عبداللہ (۱۶۶۲ء)۔
۳۔ 'معرفت السلوک'، از ولی اللہ قادری (۱۶۸۸ء) وغیرہ۔

اٹھارھویں صدی میں:-

(۱) فضلی نے 'روضۃ الشہدا' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا، جس کا نام اُنھوں نے 'دہ مجلس' رکھا، مگر وہ اب نایاب ہے۔
(۲) محمد حسین کلیم نے اُردو زبان کی پیدائش پر ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔
(۳) مرزا سودا دہلوی نے میر تقی میر کی مثنوی 'شعلۂ عشق' کو اُردو نثر میں منتقل کیا تھا اور اپنے دیوان کا دیباچہ اُردو نثر میں لکھا تھا۔
(۴) میر عطا حسین تحسین اٹاوی نے 'چہار درویش' کا اُردو ترجمہ کیا اور اس کا نام 'نو طرزِ مرصع' (۱۷۷۵ء) رکھا، اور
(۵-۶) شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآنِ حکیم کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

مولانا آزاد نے اپنی تصنیف 'آبِ حیات' میں میر فضلی کی 'دہ مجلس' کو اُردو نثر کی پہلی کتاب لکھا ہے لیکن میر فضلی کی 'دہ مجلس' سے پیشتر دکن میں اُردو نثر کے قیام کو کم و بیش چار صدیاں گذر چکی تھیں۔
بعض مصنفین نے 'عصر جدید' سے قبل، اُردو نثر کی ترقی کے پانچ ادوار مقرر کئے ہیں:
(۱) قدیم ترین دکنی اُردو کی تصانیف سے لیکر 'فورٹ ولیم کالج' کلکتہ کی ادبی تخلیقات تک۔
دکن میں بعض کتابیں اُردو نثر کی ۵۰۰ھ ہجری (ابتدائی بارھویں صدی عیسوی) کی دریافت ہوئی ہیں۔ اس طرح اُردو نثر کی تاریخ قریباً نو صدیاں پرانی ثابت ہوتی ہے۔ شیخ گنج العلم کے اسلامی فقہ پر

رسائل (چودھویں صدی عیسوی)، 'معراج العاشقین'، اور 'ہدایت نامہ' مصنفہ خواجہ بندہ نواز، سید محمد عبداللہ کا اُردو ترجمہ 'نشاط العشق'، اور میرانجی شمس العشاق کی کتاب 'جل ترنگ'، وغیرہ اِس دَورِ اوّل کی اُردو نثر کی کتابیں ہیں۔ اِس اوّلین دَور کی اُردو، ہندی، تامل اور تلگو زبانوں کے اسلامی زبانوں عربی، فارسی اور ترکی، کے ساتھ اختلاط کا ایک بہت ہی ابتدائی نمونہ ہے۔

(۲) یہ دَور فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی تصانیف و تراجم سے شروع ہو کر دہلی میں مرزا غالب کی اُردو نثر سے پہلے ختم ہوتا ہے۔ اُردو نثر کے اِس دَور کی بُنیاد اٹھارھویں صدی میں ڈاکٹر گلکرائسٹ نے ڈالی تھی جن کو لارڈ ویلزلی (وائسرائے ہند) نے ۱۸۰۰ء میں 'فورٹ ولیم کالج کلکتہ' کا پرنسپل مقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے کالج مذکور میں ایک 'دارالتصنیف والترجمہ' قائم کیا تھا، جس کے لیے نہ صرف اُنھوں نے خود اُردو اور ہندی میں بیش بہا ادبی تصانیف مُرتّب کیں، بلکہ اس میں قابل مسلمان اور ہندو اہالیانِ قلم کو کام کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ مفید ادبی کارنامے انجام دے سکیں۔ لیکن ڈاکٹر گلکرائسٹ نے جو نہایت زبردست و دیرپا نقصان پہنچایا وہ ان کی ادبی مساعی کے پردے میں نہایت شاطرانہ و خطرناک سیاسی تحریک تھی، جسے ہمارے مورخین نے نظر انداز کیا ہے، اور جس کے ماتحت کالج مذکور میں اُردو اور ہندی کے دو بالکل جداگانہ مدارسِ فکر قائم کر کے گویا ہمیشہ ہمیش کے لیے برِّصغیر کو لسانی طور پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف تو اُنھوں نے میر شیر علی افسوس کو 'گلستاں' کے اور میر بہادر علی حسینی کو قرآنِ کریم کے اُردو ترجموں پر مامور کیا تھا تو دوسری طرف اُنھوں نے للّو لال کوی اور بینی نارائن کو اُردو کے مقابلے میں ہندی کتابیں لکھنے پر لگایا تھا۔ اِس طرح گویا برطانوی حکمرانوں کے مستعمرانہ مقاصد کو تقویت دینے کے لیے اُنھوں نے ملک میں کبھی نہ حل ہونے والے ہندی۔ اُردو لسانی قضیے کی تخم ریزی کر دی تھی۔ بہ ایں ہمہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی مساعی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اُردو کا ایک نیا سادہ و آسان طرزِ تحریر عالمِ وجود میں آیا جو آج بھی قابلِ تقلید ہے۔ لیکن بدنصیبی سے اُردو مصنفین، مثلاً مرزا رجب علی سرور لکھنوی (جنھوں نے اپنی تصنیف 'فسانۂ عجائب' میں سادہ و مؤثر 'اُردوئے معلّٰی' کو انتہائی دشوار و عسیر الفہم 'اُردوئے مطلّٰی' میں تبدیل کر دیا) نے اِس سادہ و آسان اسلوبِ زبان سے مکمل اغماض کیا۔ (تعجب تو یہ ہے کہ یہ گنجلک طرزِ بیان ملک میں ایسا مقبول ہوا کہ مرزا غالب (سوائے اُن کی مُراسلت کے) اور ان کے معاصرین، مولانا غلام امام شہید اور مولانا بیخبر، بھی اس کے اثر سے خود کو نہ بچا سکے، جس کا ہوا اپنے معاصرین کی کتب پر غالب کے تبصرے، مولانا شہید کا مضمون 'تاج گنج'، اور مولانا بیخبر کی 'مناظرِ صبح و شام'، وغیرہ ہیں۔

(۳) اُردو نثر کا یہ دَور مرزا غالب کی خطوط نویسی اور اُن مصنفین کی ادبی تخلیقات سے شروع ہوا جن کا تعلق 'اُردو کے سرسید اسکول' سے تھا۔ اِس دَور کی بُنیاد مرزا غالب کے خطوط سے پڑی، جو 'اُردوئے معلّٰی' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور جن کی کامیاب نقل آج تک کسی اور سے نہ ہو سکی۔ غالب کی تحریروں کے اسی اسلوب کی بنیاد پر 'اُردو کے سرسید اسکول' کی بلند و بالا عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ غالب سے بیشتر بلکہ اُن کی زندگی میں بھی اُردو کا پُر تصنع اسلوب جسے مرزا رجب علی سرور لکھنوی نے متعارف کیا تھا، ملک میں مقبول تھا، اور خود غالب نے، اُن کی مراسلت سے قطع نظر، اُس سطحی و مصنوعی طرزِ تحریر کو اختیار کیا تھا۔ مگر سرسید احمد خاں کی دُور اندیش نگاہوں نے اُسے رد کرکے اس کے بجائے مرزا غالب کے خطوط کے دو ٹوک، براہِ راست، آسان اور سادہ اندازِ تحریر کو اختیار کیا۔ خوش قسمتی سے سرسید کو اُردو نثر کے اسلوب کی اس عہد ساز اصلاح کے لیے اُس وقت کے بہترین اہلِ قلم مددگار مل گئے تھے۔

(۴) یہ دَور اُردو کے معروف ادبی ماہنامہ 'مخزن'، لاہور کی اشاعت اور 'اُردو کے نئے سر عبدالقادر اسکول' کی ادبی تحریروں سے شائع ہوا۔ اُردو نثری ادب کے اس اسکول کا باقاعدہ آغاز ۱۹۰۱ء میں رسالہ 'مخزن' لاہور کی اشاعت سے ہوا جس کے ایڈیٹر سر شیخ عبدالقادر تھے۔ اُردو کی اس تحریک کو نثر میں سید سجاد حیدر یلدرم جیسے مشّاق اہلِ قلم اور نظم میں علّامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کی ادبی اعانت سے تقویت ملی۔ 'مخزن' کے بعد 'زمانہ' کانپور، 'ادیب'، الہ آباد اور 'اُردوئے معلّٰی' علی گڑھ وغیرہ ادبی ماہناموں نے اُردو نثر کو ترقی دینے میں مدد دی۔

(۵) اُردو نثر کے اس جدید دَور کی کامیابی کے لیے ملک کے عظیم علمی، تدریسی و ادبی اداروں نے کچھ کم کام نہیں کیا، جن میں حسبِ ذیل ادارے سرِفہرست ہیں:۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن؛ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انجمن ترقی اُردو، (جواب کراچی میں ہے)، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ جامعہ ملیہ، دہلی۔ ندوہ، لکھنؤ۔ اور بعض دیگر ادارے لاہور میں، وغیرہ وغیرہ۔

اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں حسبِ ذیل اہم آرا کی پیشکش دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ (۱) سید انشا نے اُردو کا آغاز شہنشاہ شاہجہاں کے عہد سے شمار کیا ہے۔ (۲) میر امن دہلوی نے اس کو شہنشاہ اکبر کے زمانے سے قائم کیا ہے۔ میر امن کے بیان کو سند مان کر بین BEAN نے بھی اُردو زبان کی ابتدا دَورِ اکبری ہی سے تسلیم کی ہے (ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کی متقابل گرامر، از بین BEAN ص ۱۵)۔ نیز سر چارلس لایل SIR CHARLES LYALL نے اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں میر امن

کے ہی نظریے کو ۱۸۸۰ء میں یورپ کے سامنے پیش کیا اور سر گریرسن GRIERSON نے سر چارلس لایل کے بیان کو سند مان کر میر امن کے نظریے کو اپنی مشہور تصنیف 'ہندوستان کی لسانی سروے' (جلد اوّل، ص ۱۶۴) میں دوہرایا ہے۔ (۳) سر سید احمد خاں اس بارے میں ہماری رہ بری دہلی کے خلجی بادشاہوں کے عہد تک کرتے ہیں۔ (۴) مغربی مصنفین میں ڈاکٹر گلکرائسٹ GILCHRIST اردو زبان کا آغاز اس برِ صغیر پر تیمور کے حملوں (۱۳۶۹ء تا ۱۴۰۴ء) سے منفر کرتے ہیں ('ہندوستانی لسانیات') اور وہی اپنی ایک اور تصنیف ('ایشیائی تحقیقات'، جلد ۳) میں اس کا قیام پندرھویں صدی سے مانتے ہیں۔ ڈاکٹر ونٹرنز WINTERNITZ اردو زبان کا آغاز بارھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان باور کرتے ہیں (ان کی جرمن زبان میں تصنیف GESCHICHTE DER INDISCHEN LITTERATUR) ص ۱۳۹)۔ (۵) عبدالغفور خاں نساخ اس بحث کو ہندوستان کے غزنوی سلاطین تک پہنچاتے ہیں ('رسالہ در تحقیق زبان ریختہ') (۶) مولانا محمد حسین آزاد دہلوی اپنی تصنیف 'آبِ حیات' میں اور شمس اللہ قادری اپنی 'اردوئے قدیم' میں اس مقصد کے لیے ہندوستان میں غزنوی عہد سلاطین کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ مسلمان سلطان محمود غزنوی کے حملۂ ہندوستان سے بہت پیشتر برِ صغیر جنوبی ایشیا کے سواحل پر وارد ہونے لگے تھے۔ اس واقعہ کی روشنی میں نواب محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ('مقالاتِ اردو'، انجمن اردوئے معلّٰی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور علامہ سید سلیمان ندوی ('عرب و ہند کے تعلقات'، اردو اکیڈمی، الٰہ آباد) دونوں نے اردو زبان کی پیدائش کو مسلمانوں کی اس برِ صغیر میں پہلی مرتبہ آمد یعنی عربوں کے ہاتھ سے سندھ کی فتح سے منسلک کیا ہے۔ لیکن عرب اور ایرانی تاجر سواحل ہند پر اسلام کی پیدائش سے قبل سے آتے رہے تھے، لہٰذا جہاں تک اس حصۂ دنیا میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ اور اظہار خیالات کے اختلاط کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا یہاں مسلمانوں کی آمد سے نہیں بلکہ عرب اور ایرانی تجار کی آمد سے سمجھنا چاہیے۔

عرب مسلمان ہندوستانی سواحل پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے (از ۶۳۴ء تا ۶۴۳ء) ہی سے وارد ہونے لگے تھے۔ ۶۳۶ء میں عثمان بن عاص الثقفی، گورنر عمان و بحرین نے موجودہ بمبئی کے قریب مغربی ساحل ہند پر حملہ کیا۔ اس کے چند ماہ کے بعد، مغیرہ نے دیبل (پاکستان میں موجودہ ٹھٹھہ کے قریب) پر حملہ کیا اور حکم بروچ (ہند) پر حملہ آور ہوا لیکن ناکام رہا۔ ۶۴۲ء میں عربوں نے ایران کو فتح کیا اور وہ عراق سے لے کر خراسان تک تمام خطۂ ارض پر قابض ہو گئے۔ ایران کے مشرق اور جنوب و مشرق میں تمام علاقے سیستان، کرمان اور مکران وغیرہ، عرب مسلمانوں

نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے (٦٤٣ء - ٦٥٥ء) میں فتح کر لیے۔ ٦٦٢ء میں امیر مُحلّب بن ابی صُفرہ نے ہندوستان پر کابل کے راستہ سے حملہ کیا اور لاہور تک پہنچ گئے۔ اس مہم کے نتیجہ میں کابل سے لے کر ملتان تک تمام علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اس کے بعد بیس سال تک مسلمان سندھ پر حملے کرتے رہے، جس کے دوران میں متعدد ساحلی مقامات ان کے قبضے میں آ گئے۔ عبدالملک بن مروان کی اُموی خلافت کے زمانے (٦٩٤ء - ٧٠٥ء) میں، جب حجّاج بن یوسف ثقفی عراق کے گورنر مقرر ہوئے تو اُنھوں نے سندھ کی طرف متعدد مہمات روانہ کیں۔ ان میں سے ایک جو اُنھوں نے ٧١١ء میں روانہ کی، اور جس کے میرِ لشکر محمد بن قاسم تھے، اس نے ٧١٤ء تک تمام سندھ، ملتان اور جنوبی پنجاب کو فتح کر لیا۔ پھر عباسی خلیفہ الواثق باللہ کے زمانے (٨٤١ء - ٨٤٧ء) تک سندھ کے گورنر عباسی خلافت بغداد سے مقرر ہو کر آتے رہے۔ سندھ کے مسلمان گورنروں کا دارالحکومت اُس وقت منصورہ تھا۔ جب خلافتِ عباسیہ کا زوال ہوا تو سندھ کے مسلمان عرب سردار خودمختار ہو بیٹھے، جنھوں نے اپنی اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لیں، جو کشمیر کی حدود سے لے کر خلیج فارس اور ایرانی سرحد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سندھ اب بھی مسلمانوں کے زیرِ تسلط تھا۔ ان واقعات کی تصدیق مشہور عرب سیاحوں اصطخری (جو ٩٥١ء میں سندھ اور ملتان آیا تھا) ابنِ حوقل (جس نے ان مقامات کا ٩٦٨ء میں دَورہ کیا تھا) اور البشاری مقدسی (جس نے ٩٨٥ء میں ملتان دیکھا تھا) وغیرہ نے کی ہے۔ اِس طرح ظاہر ہے کہ سندھ سب سے پہلے مسلمانوں اور اسلام سے واقف ہوا اور عربی و فارسی زبانوں کے سندھی، ملتانی اور پنجابی زبانوں کے ساتھ اختلاط کے بعد جب ہندی بھاشا بھی اِن میں مل گئی تو بالآخر ایک عام فہم زبان، اُردو، عالمِ وجود میں آئی۔ دکن میں گو یہ لسانی عمل آزادانہ طور پر وقوع پذیر ہوا، لیکن نتیجہ یکساں طور پر اُردو زبان کے حق میں ہی نکلا [سہیل، علی گڑھ سالنامہ ١٩٣٦ء 'اُردو اور اس کے بعض تاریخی مآخذ' از محمد ابوالعلیث صدیقی بدایونی۔ عالمگیر، لاہور، سالنامہ ١٩٣٧ء 'اُردو نثر پر ایک نظر' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی۔ تحفۂ نو، کراچی ١٩٤٩ء 'اُردو زبان و ادب' از اُویس احمد ادیب ص ٦-٢٤]۔

(۲۹)

اُردو زبان و ادب کی ترقی میں مُسلمان صُوفیائے کرام و مُبلّغین کا حصّہ

ملک محمد جالیسی کی "اخرو ٹی" کے مطابق، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ہندی زبان میں اظہارِ خیال پر نادر تھے، لیکن بدنصیبی سے آج تک اُن بزرگ کا کوئی ہندی دوہا وغیرہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔

(۲) لیکن شیخ فریدالدین گنج شکر ملتانیؒ کے متعدد اقوال ملے ہیں، جو ابتدائی اُردو زبان کے نہایت عمدہ نمونے ہیں۔ "سیر الاولیا" (شایع شدہ از چرنجی لال و مطبوعہ از محبّ ہند پریس، دہلی ص ۱۸۲) مصنفہ مولانا سید مبارک المعروف بہ میر خورد (سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلوی کے مُرید اور [illegible] مصاحب) میں حضرت گنج شکرؒ کی یہ ابتدائی اُردو کی کہاوت موجود ہے، یعنی "پُونوں کا چاند بھی بالا ہے"۔ سیر الاولیا، فارسی زبان میں ہے۔ "رجاعت شاہیہ" میں، جو حضرت شاہ عالمؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، حضرت گنج شکرؒ کا حسب ذیل منظوم مقولہ درج ہے ؎

اساکیری یہی سوریت
جاؤں نائے کہ جاؤں مُیت

اُردو کی کچھ ابتدائی نظمیں بھی حضرت گنج شکرؒ سے منسوب کی جاتی ہیں، مثلاً

تن دھوتے سے دل جو ہوتا پوک | پیشرو اصفیا کے ہوتے غوک
خاک لانے (یعنی لگانے) سے اگر خدا پائیں | گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
عشق کا رموز نیارا ہے | جُز مدد پیر کے نہ چارہ ہے

محمد شمیم ڈیسنوی بہاری کے بیان کے مطابق، ڈیسنہ (بہار۔ ہند) کی "الاصلاح" لائبریری میں ایک مسودہ موجود ہے، جس میں حضرت شیخ فریدؒ کی یہ ریختہ غزل درج ہے:۔

وقتِ سحر، وقتِ مناجات ہے | خیز در آں وقت کہ برکات ہے
بر تن تنہا چہ روی زیرِ زمیں ؟ | نیک عمل کُوں کر وہی سات ہے

پندِ شکر گنج کہ بادل جاں شنو ضایع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت فریدؒ کو گنج شکرؒ اور شکر گنجؒ دونوں طرح سے مخاطب کیا گیا ہے۔ حسبِ ذیل اردو نظم، بعنوان "جھولنا شیخ فرید شکر گنجؒ"، جو ایک چار صفحی رسالہ ہے، ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق حضرت فریدؒ ہی کی تخلیق کہا جاتا ہے: "سکّن ذکر جلی:-

جلی یاد کی کرنا ہر گھڑی، یک ٹال حضور سوں ٹلنا نہیں

اُٹھ بیٹھ میں یاد سوں شاد رہنا، گواہ دار کو چھوڑ کے چلنا نہیں

پاک رکھ توں دل کو غیر ستی آج سائیں فرید کا وُتا ہے

قدیم قدمی کے آونے سیں لازوالی دولت کون پاوتا ہے

حضرت شکر گنجؒ ۱۱۷۳ء میں پیدا اور ۱۲۶۵ء میں فوت ہوئے۔ وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مُرید اور خلیفہ تھے اور پاک پٹن (پاکستان) میں رہتے تھے۔

(۳) شیخ حمید الدین ناگوریؒ (پیدایش ۱۱۹۳ء۔ وفات ۱۲۷۴ء) بھی اُس زمانے کی ابتدائی اردو بول سکتے تھے (سرورالصدر، ص ۳۲۰)۔

(۴) حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتیؒ (متوفی ۱۳۲۳ء) کے متعلق مشہور ہے کہ اُنھوں نے امیر خسروؒ سے حسبِ ذیل اردو فقرہ کہا تھا:- "تُر کا کچھ سمجھدا رہے"۔ "فرہنگ آصفیہ" کے مصنف کے بقول، ہندوستان میں سلطان محمد تغلق اور سلطان علاء الدین خلجی کے دورانِ حکومت (یعنی تیرھویں صدی عیسوی) میں جو عوامی زبان جنم لے رہی تھی اُس کا نہایت عمدہ نمونہ شیخ شرف الدینؒ کا حسبِ ذیل ہندی دوہا ہے، جو اُنھوں نے مُبارز خاں کے سفر پر روانگی کے وقت کہا تھا:-

سجن سکارے جائیں گے، اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر، بھور کدھی نہ ہوئے

(۵) امیر خسروؒ۔ سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین دہلویؒ (پیدائش ۱۲۳۶ء۔ وفات ۱۳۲۶ء) سلسلۂ چشتیہ کے ایک مشہور و معروف صوفی بزرگ تھے، جن کو سماع سے دلچسپی تھی اور جو ہندی شاعری کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے بہت سے مسلمان صوفیائے کرام بھی ہندی موسیقی کی سرپرستی کرتے تھے۔ مثلاً شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ اور شیخ بہاءالدین برناویؒ وغیرہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ امیر خسرو بھی اپنے پیر سلطان الاولیاءؒ کی دلچسپی سے متاثر تھے۔ وہ خاص طور پر ہندی موسیقی میں اپنی غیر معمولی مہارت کے

باعث مشہور ہیں۔ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ فارسی اور ہندوستانی موسیقی دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا تھا۔ شاید اسی مقصد کی خاطر انھوں نے اپنی ہندی نظمیں اور دوہے وغیرہ کہے تھے۔ لیکن بدنصیبی سے ہنوز ان کی ہندی تخلیقات فراہم نہیں ہو سکی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض تذکرات اُردو شاعری میں امیر خسرو کی ان بیش بہا ادبی تخلیقات کے خال خال نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً میر تقی میر نے اپنے تذکرہ 'نکات الشعرا' میں امیر خسرو کا حسب ذیل قطعہ درج کیا ہے :۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا | کچھ گھڑیے سنوائے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست | پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

یہ طرز خاص 'ریختہ' کہلایا کیونکہ اس میں فارسی اور ہندی دونوں مخلوط تھے، اور جو اُردو زبان کے آغاز کا ترجمان تھا۔ اُردو تذکروں میں ریختہ میں ایک مشہور غزل امیر خسرو سے منسوب کی جاتی ہے، جس کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم ایجاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اس کے علاوہ امیر خسرو کے نام سے بیسیوں ہندی پہیلیاں، انملیاں اور کہہ مکرنیاں مشہور ہیں لیکن ان کی صداقت کی توثیق کی کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو کی ایک پہیلی :۔

دس ناری، ایک ہی نر | بستی باہر وا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم | منہ میٹھا، تاثیر گرم (یعنی تربوز)

(۶) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے مُرید اور خلیفہ شیخ سراج الدین عثمانؒ المعروف بہ 'اخی سراج'، (متوفی ۱۳۵۶ء) کو بنگال بھیجتے وقت حسب ذیل اُردو فقرہ کہا تھا: "تم اوپر، وہ تل" (یعنی تم اُن سے اوپر ہو)۔ خواجہ چراغؒ نے یہ فقرہ 'اخی سراج' کے اس تامّل کے جواب میں کہا تھا جو اُنھیں بنگال جانے پر اس وجہ سے تھا کہ بنگال میں تو شیخ علاءُ الدین تالؒ پہلے ہی سے تھے۔

(۷) شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (پیدائش ۱۲۶۳ء ـ وفات ۱۳۸۰ء) پوربی بھاشا اور ہندی دونوں میں شاعری کرتے تھے اور اپنے ہندی منتروں کے باعث، جو وہ سانپ وغیرہ کے کاٹے پر پڑھ کر دم کیا کرتے تھے، خاص طور پر مشہور ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی نے بھی اپنی تصنیف 'پنجاب میں اُردو' میں ان کا حوالہ دیا ہے۔ ان کے دوہروں کا نمونہ :۔

کہنا نہ ملا بسے سمندر تیر | پنکھ پسارے بگہ ہارے نرمل کرے سریر

شرف حرف مایل کہیں درد کچھ نہ بسائے   گرد چھوئیں دربار کی، درد رہے نہ بہیر

(۸) حضرت شاہ بُرہان الدین غریبؒ (متوفی ۱۳۳۰ء) دہلی کے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ تھے، جن کو حضرت سلطان الاولیاؒ نے دکن میں مامور کیا تھا۔ شاہ غریبؒ دہلی سے دولت آباد (دکن) سلطان محمد تغلق کے ساتھ پہنچے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ غیر ارادی طور پر شاہ غریبؒ کی نظر حضرت بیبیؒ عائشہؒ کی جوان بیٹی کی طرف اٹھ گئی تو اُنھوں نے حسب ذیل ملتانی زبان کا جُملہ کہا تھا: "اے بُرہان الدین، ساڑھی دِھی کِہہ کیہا ہنسدا ہے؟" بیبی عائشہؒ بابا فریدؒ کی بیٹی تھیں۔

(۹) حضرت گیسو دراز بندہ نوازؒ دہلی کے معروف ولی حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مخصوص خلفا میں سے ایک شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ تھے جن کو اُن کے پیر اُن کے علم و فضل کے باعث 'گنج معانی' کہا کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلیؒ کے مُرید اور خلیفہ سید محمد بن یوسف الحسنی دہلویؒ (متوفی ۱۴۲۱ء) تھے، جو اپنے خطابات 'بندہ نواز گیسو دراز' سے زیادہ معروف ہیں۔ حضرت چراغ دہلیؒ کی وفات (۱۳۹۸ء) کے بعد حضرت بندہ نوازؒ ۱۴۱۲ء میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دورِ حکومت میں دہلی سے گجرات ہو کر حسن آباد گلبرگہ (دکن) پہنچے تھے۔ اس بہمنی سلطان کے بھائی اور جانشین، احمد خاں خانخاناں، حضرت بندہ نواز کے نہایت معتقد مُرید ہو گئے تھے۔ حضرت بندہ نوازؒ نے اپنی بقیہ زندگی گلبرگہ میں گذاری اور وہیں فوت ہوئے۔ بزرگ موصوفؒ لوگوں سے دکنی اُردو زبان میں مخاطب ہوا کرتے تھے۔ حضرت بندہ نوازؒ کا حسب ذیل مُثلث ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو ایک پُرانی بیاض (۱۶۵۰ء) میں ملا تھا جو بیجاپور (دکن) کے ایک معروف صوفی خاندان کی ملکیت تھی اور جس میں اُس خاندان کے صُوفی بزرگوں کے اقوال قدیم دکنی اُردو زبان میں درج تھے۔ وہ مثلث یہ ہے:-

او معشوق بے مثال نورِ نبیؐ نہ پایا
اور نورِ نبی رسولؐ کا میرے جیو میں بھایا
اَپیس اَپیں دیکھاوِنے کیسی آرسی لایا!

عربی و فارسی تصانیف کے علاوہ حضرت گیسو درازؒ عوام کے لیے مقامی دیسی یعنی دکنی اُردو زبان میں بھی لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے حضرتؒ کے اُردو رسالہ 'معراج العاشقین' (۱۵۰۰ء) کو شائع کر دیا ہے، جس کا اسلوبِ بیان حسبِ ذیل ہے:-

"اے عزیز! اللہ بندہ پانا یہاں پہچان کو جسم نیئں تو شرع جانا ہے۔ اوّل اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا۔ انسان کے بُوجنے کو پانچ تن۔ ہر ایک تن

کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس اس کا اماره یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سُننا سو۔ حسد ناک سوں بدبوئی نہ لیا سو۔ بُغض کی زبان سوں بدگوئی نہ کرنا سو۔"

ڈاکٹر عبدالحق کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس حضرت گیسو درازؒ کے نام سے متعدد دیگر رسائل تھے جن کی زبان بھی قدیم دکنی اردو تھی، مثلاً تلاوت الوجود، دُرّالاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ، اور ہشت مسائل وغیرہ۔ ہر چند کہ ان کی زبان بھی وہی قدیم دکنی اردو ہے لیکن اس امر کی توثیق از بس دشوار ہے کہ آیا وہ واقعی حضرت بندہ نوازؒ کی اپنی تصانیف ہیں، یا محض ان کے نام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ بیجاپور والی ۱۶۵۷ء کی بیاض کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق کو دو اور بیاضوں میں ایک غزل اُسی قدیم دکنی ریختہ میں کہی ہوئی ملی لیکن اس کی صداقت کی تصدیق نہ ہو سکی اس قدیم دکنی ریختہ کی غزل کا مقطع یہ ہے ؎

شہباز حسینی کھوئے کر، ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ آپے یک ہوئے کر، تب پاوے گا دیدار کوں

(۱۰) حضرت قطب عالمؒ۔ سید برہان الدین ابو محمد عبداللہؒ المعروف بہ قطب عالمؒ (پیدائش ۱۳۸۸ء۔ وفات ۱۴۴۶ء) ابن سید ناصرالدین ابن سید الاقطاب مخدوم جہانیان بخاریؒ، پٹن سے ترکِ سکونت کر کے نئے شہر احمد آباد کو نقل مکانی کر گئے تھے جبکہ یہ شہر ان کے مُرید سلطان احمد شاہ گجرات نے بسایا تھا۔ لیکن حضرت قطب عالمؒ کا انتقال باٹوہ (کاٹھیاواڑ) میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک رات حضرت ممدوحؒ کو ایک مرتبہ مسجد میں ٹھوکر لگی تو بیساختہ حضرتؒ کے مُنہ سے حسب ذیل اُردو جُملہ ادا ہوا تھا: "لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے!" حضرتؒ کا ایک اور اُردو فقرہ 'تحفتہ الکرام' صـ ۱۸ میں درج ہے۔ حضرتؒ ہی کے نام سے حسب ذیل اُردو جُملہ 'جماعتِ شاہیہ' میں مرقوم ہے:

"محمدؐ پر میں نمر یا سائیں پریم چکھائے۔"

(۱۱) حضرت سراج الدین ابوالبرکات سید محمدؒ المعروف بہ شاہ عالمؒ، شاہ قطب عالمؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ ان کے ایک مُرید نے اُن کے اور اُن کے والد بزرگوار کے اقوال، جو قدیم اُردو میں ہیں، ایک کتاب میں جمع کئے ہیں، جس کا نام 'جماعتِ شاہیہ' ہے۔ ان میں سے حضرت شاہ عالمؒ کا ایک

قول ذیل میں درج ہے :

"کاندھی کا راجہ تم سر کوئی نہ بوُجھے ۔ سکین کا راجہ تم سر کوئی نہ بوُجھے"،

(۱۲) حضرت سید محمد جونپوری (پیدائش جونپور ۱۴۴۳ء ۔ وفات و مدفن فرح بلوچستان ۱۵۰۴ء) نہایت معروف صوفی بزرگ گذرے ہیں، جو اسلام میں مہدوی، فرقہ کے بانی تھے، کیونکہ ان کے مرید اور پیرو اُن کو مہدی باور کرتے تھے ۔ چونکہ ان کے مذہبی نظریات کی بنا پر ان کے خلاف زبردست ہیجان پیدا ہوگیا تھا چنانچہ وہ کسی جگہ مستقلاً قیام نہیں کرسکتے تھے بلکہ ہمیشہ سفر میں رہتے تھے ۔ مہدویہ فرقہ کی کتابوں، مثلاً 'تاریخ سلیمانی اور شواہدالولایت'، وغیرہ میں حضرت جونپوری کے قدیم اُردو میں اقوال اور دوہرے درج ہیں ۔

(۱۳) شیخ بہاءُالدین باجنؒ (پیدائش ۱۳۸۸ء ۔ وفات ۱۵۰۶ء) کا تعلق بُرہان پور کے مشہور مسلم صوفیہ سے تھا ۔ وہ 'خزانۂ رحمت' نامی کتاب کے مصنف ہیں جس میں اُنھوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات وارشادات جمع کیے ہیں ۔ پروفیسر شیرانی (مصنف 'پنجاب میں اُردو') کے مطابق حسب ذیل اُردو شعر حضرت باجنؒ کا ہے ؎

روزے دھر دھر نماز گذاری، دینی فرض زکواۃ
بن فضل تیرے چھُٹک نہیں اگین مکھ میں بات

(۱۴) شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (پیدائش ۱۴۵۵ء ۔ وفات ۱۵۳۸ء) 'الکھ داس' کے تخلص کے ساتھ ہندی شاعری کیا کرتے تھے ۔ پروفیسر شیرانی کی تصنیف 'پنجاب میں اُردو' کے مطابق حسب ذیل قدیم اُردو شعر حضرت گنگوہیؒ نے ہی کہا تھا ؎

جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں اور نہ کوئے
دیکھا بوجھ بچار مُنہ سبھی آپین سوئے

(۱۵) حضرت شاہ محمد غوثؒ گوالیاری ۔ (مقصود المُراد، سید ہاشم علویؒ کے ملفوظات) میں شاہ محمد غوثؒ کا حسب ذیل اُردو قول درج ہے ۔ "بھیکی بچہ خدا کو نہ ملے" (یعنی بھکاری ولی نہیں ہو سکتا)۔ حضرت غوثؒ ہندی شاعر بھی تھے ۔ اُن کا انتقال آگرے میں ہوا تھا مگر وہ دفن گوالیار میں ہوئے تھے ۔ ان کی تاریخ وفات ۱۵۶۲ء ہے ۔ مشہور مؤرخ بدایونی کے بموجب، حضرت غوثؒ کی عمر انتقال کے وقت قریباً اسی سال تھی ۔

(۱۶) شیخ وجیہہ الدین احمد علویؒ (پیدائش محمدآباد چانپانیر ۱۵۰۴ء ۔ وفات ۱۵۸۹ء مدفن احمدآباد)

شاہ قدن اور شاہ محمد غوثؒ دونوں کے مُرید تھے ۔ حضرت علویؒ کے مُریدوں نے ان کے ملفوظات ایک کتاب 'بحرالحقایق' نامی میں جمع کئے ہیں جس کا ایک نمونہ ذیل میں درج ہے :-

"جس چیز میں ذوق وشوق پاوے ، اُوسے ترک نہ دیوے ۔ جیسی تجلی پکڑے ، تیسا ارادہ دیوے ۔ اگر عبد کی تجلی پکڑے ، عبدیت ارادہ دیوے ۔

(۱۷) شیخ بہاءالدین برناوی خاتم التارکینؒ شہنشاہ اکبر اور جہانگیر دونوں کے ہمعصر اور نہایت عمدہ مُغنی تھے ۔ پروفیسر شیرانی کے مطابق حسب ذیل ہندی شعر موصوف ہی کا ہے ؎

اِن نینن کا یہی بسیکھ
ہُوں تجھ دیکھوں، توُں مُنجھ دیکھ

['اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام' از مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۳ء 'پنجاب میں اُردو' از پروفیسر محمود خاں شیرانی]

(۳۰)

بنگال میں اُردو

بنگال میں اُردو زبان کے آغاز کا قدیم ترین زمانہ بارھویں صدی عیسوی کے ختم سے متعین کیا جاتا ہے جبکہ مشہور مسلمان جنرل بختیار خلجی نے بنگال کو فتح کیا تھا اور وہ آسام تک پہنچ گئے تھے۔ دو صدیوں کی بنگال میں آزادی کے باوجود اُردو کا اثر وہاں سے زائل نہ ہو سکا، حتیٰ کہ ہندو بنگالی سیاست داں بھی عوام تک پہنچنے کے لیے اسی عام ہندوستانی زبان کو استعمال کرتے تھے۔ اس حقیقت کی تصدیق مشہور انگریز مصنف سر گریرسن GRIERSON نے ۱۸۶۲ء میں اپنی تقریر میں حسب ذیل الفاظ میں کی تھی:۔
"لفٹنٹ گورنر سر سی پی گرانٹ GRANT کے جلسۂ الوداع میں صدر جلسہ راجہ رادھا کانت بہادر نیز راجہ کالی کرشنا دیو بہادر، راجہ اپورُبا کرشنا دیو بہادر، اور دیگر مقررین سب نے جلسہ کو اُردو زبان میں مخاطب کیا"۔ یہ ایک حیرت ناک حقیقت ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے مکمل طور پر بنگال میں اُردو زبان کی اشاعت سے بے پروائی برتی، اس کے بجائے وہ بنگالی زبان کی سرپرستی کرتے رہے، جس میں اُنھوں نے فارسی الفاظ، گرامر اور طرزِ بیان کو متعارف کیا، مگر خود بنگالیوں کو اُردو زبان اسقدر بھائی کہ وہ اسے اراکان (برما) تک لے گئے۔ الاول نے، جو خالصتاً ایک بنگالی شاعر تھے اور سنسکرت آمیز بنگالی زبان استعمال کرتے تھے، 'پرماوتی' اور 'سیف الملوک و بدیع الجمال' کا بنگالی زبان اور اُردو رسم الخط میں ترجمہ کیا تھا۔ اُنھوں نے اُردو رسم الخط ہی میں اپنا بنگالی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ اسی طرح نظامی کی مثنوی 'ہفت پیکر' اور بعض دیگر تراجم بھی بنگالی زبان میں اُردو رسم الخط میں کیے گئے تھے۔

بنگالی مسلم مبلغین نے بھی مشرقی بنگال (اب بنگلہ دیش) میں، جن میں حاجی شریعت اللہ اور دھودھو میاں کے نام سرفہرست ہیں، اپنی تقاریر اور وعظوں کے ذریعہ سے اُردو زبان کو بڑی ترقی دی تھی۔ مسلمان شعرائے کے علاوہ بنگال کے تمام معروف ہندو شعرائے نے بھی اپنے شاعرانہ کلام میں آزادانہ طور پر اُردو الفاظ کو استعمال کیا۔ مثلاً مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) کے مشہور ہندو شاعر 'ودیا پتی' نے حسب ذیل اسلوب اختیار کیا تھا:۔

رام بولیں رحیمان

ہندو اور مسلمان
جرگا تے قرآن و پُران
ایک آتما ناہی دُوئی
پیدا کریں شائی (وہی)
حکم جبین و آسمان

رائے گنا کر بھارت چندر را (اٹھارھویں صدی) بردوان (مغربی بنگال۔ ہند) کے راجہ کرشنا چندر را کے شاعر دربار اپنی بنگالی شاعری میں عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے، مثلاً جہاں پناہ، فتح، سلامت، قُدرت، کرامت، حُکم، شاہنشاہ، نمک حرام، غلام وغیرہ۔ اُن کی حسب ذیل نظم، ہوا، ہمارے بیان کی نہایت دلچسپ شاہد ہے:۔

دُھوم، بڑا دُھوم کیا،
کھانے، سونے نہیں دیا،
چوہرا گھیر لیا، فوج کی سی قوی
بالاخانہ کوٹ کیا،
قنات سی گھیر لیا،
ھوان دغا دیا آگ کی سی نوا،
دیکھنے میں ہوا چور
چھڑے سینے میری پور
تمہاری بلائی دُور، او میرے نوا

مُتعصب انگریز لارڈ میکالے MACAULAY نے سیاسی مصالح کے زیر اثر بنگال میں اُردو کی اشاعت کی حوصلہ شکنی کی اور اُردو کے بنگال میں اثر کو زائل کرنے کے لیے بنگالی زبان کی پشت پناہی کی۔ میکالے کی پالیسی کی سیرامپور کے غیر ملکی عیسائی مشنریوں (مُبلغین) نے بڑے زور شور سے حمایت کی، کیونکہ وہ خائف تھے کہ مبادا اُردو کے زیر اثر بنگال میں اسلامی تبلیغ کی مہم زور پکڑ جائے اور وہ نصرانیت کے بنگال میں پھیلنے میں ایک رُکاوٹ بن جائے۔ اس لیے اُنھوں نے بنگالی زبان و ادب میں اصلاحات کی ایک مہم چلائی اور اس کا ٹائپ ڈھالا۔ اُس سے اُنھوں نے اپنا پروپیگنڈہ لٹریچر بڑے وسیع پیمانے پر چھاپا اور اسے بہت فیاضانہ طور پر تقسیم کیا۔ غیر ملکی نصرانی مشنریوں کے ساتھ بنگال کے متعصب

اسلام دشمن ہندو فرقہ پرستوں نے دل کھول کر تعاون کیا، جن میں ودیا ساگر، بنکم چٹرجی، بھودیپ مکرجی اور اکھے کمار وغیرہ پیش پیش تھے، جنھوں نے نہایت کامیاب سازش اور ریشہ دوانیوں سے کام لے کر کلکتہ یونیورسٹی کی حدود سے اُردو زبان کو خارج کروا دیا۔

اس اُردو کش ذہنیت کے باوجود، بنگال اور آسام دونوں ہندوستانی صوبوں کے بہت سے خاندانوں میں اُردو رسم الخط آج تک رائج ہے۔ بنگال کے علاقہ چٹاگام سے ۱۹۴۰ء کے بعد کے برسوں میں اُردو رسم الخط میں ایک ہفتہ وار بنگالی جریدہ 'القرآن' کے نام سے شائع ہوا تھا، لیکن ہندو کانگریسیوں اور مہاسبھائیوں کی دشمنی کے باعث وہ جاری نہ رہ سکا تھا۔ اصل بنگالی زبان 'پوتھی' کہلاتی تھی، جو بڑی حد تک اُردو کی مانند تھی، جس کے گیت بنگال کے دیہی علاقوں میں نہایت مقبول تھے۔ 'پوتھی' کا ایک نمونہ :۔

اِستے (اتنا) گوسنیا مردو غصہ تے جلیا۔

جنگی گھوڑا پر چلے سوار ہویا۔

دُشمنے دا بایا مردو چلے لوکی (چلا گیا) رنے (رن میں)۔

شنا ون کنیا کیسا پُرچھے جانے جاتے۔

کوئی کہے حُور پری، رہے پرستان۔

دُنیا تے شناون پر پر سمان (پری کی مانند)۔

ہندو اس امر کے قائل ہیں کہ وشناوی سادھوؤں کے (اُردو میں) پرچار کے باعث ہی مغربی بنگال ایک ہندو علاقہ قائم رہ سکا ورنہ پورا بنگال مسلمان ہو جاتا۔ مسلمانوں کے زوال اور بنگال میں برطانوی تسلط کے بعد بنگال سے اُردو زبان کا اثر بھی زائل ہوتا گیا، لیکن وہ مکمل طور پر مٹایا نہ جا سکا۔ اُس وقت بنگال میں اُردو کلچر کا مرکز مُرشد آباد تھا۔ اس کے بعد وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں عدالتیں قائم کیں جن کی سربراہی مسلمان قاضی اور مُفتی کرتے اور جو اپنے فیصلے فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں 'مدرسۂ عالیہ' قائم کیا تاکہ وہاں ماہر فارسی داں تیار کئے جائیں۔ اُردو زبان کا چونکہ فارسی زبان سے بھائی چارہ ہے، لہٰذا اُردو پر بھی خاص توجہ کی گئی۔

اس کے بعد لارڈ ویلزلی نے کلکتہ ہی میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، جہاں جدید اُردو کی داغ بیل پڑی، جہاں قدیم ترین اُردو پریس کا افتتاح ہوا (جس میں قرآنِ کریم اور انجیل دونوں طبع ہوئے) اور جہاں جدید سادہ اسلوب میں پہلی اُردو ناول 'باغ و بہار' لکھی گئی۔ اس طرح اُردو زبان نے بنگال

میں نہایت اہم مقام پالیا۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو پروفیسروں میں چار بنگالی تھے۔ یعنی (۱) مُرشدآباد کے اِنتظار (۲) کرشنا نگر کے آشنا (۳) چٹگام کے حیدر اور (۴) کلکتہ کے خیرالدین۔ موخرالذکر مولوی خیرالدین نے فورٹ ولیم سے ایک ہفتہ وار پرچہ 'اُردو گائیڈ' کے نام سے جاری کیا تھا، جس کو وہ خود مُرتب کرتے تھے اور جو ۱۸۶۰ء تک شائع ہوتا رہا تھا۔

مذکورہ صدر حالات کے باعث کلکتہ نہ صرف بنگال میں ایک اہم اُردو مرکز بن گیا تھا بلکہ اس اس کی بہ حیثیت ہندوستان گیر تھی۔ اُردو بنگالیوں کی زندگی اور سوسائٹی میں بہت گہری نفوذ کر گئی تھی اور بنگال میں وہ ذہانت، ثقافت اور کلچر کی علامت بن گئی تھی۔ مزید دو تاریخی واقعات کے سبب سے کلکتہ اُردو کا ثقافتی مرکز بن گیا تھا، یعنی (۱) جنوبی ہند میں شاہِ میسور ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت کے بعد انگریزوں نے اُس مردِ مجاہد کے بیٹوں کو کلکتہ میں محصور کر دیا تھا، اور (۲) سلطنت اودھ کے برطانوی ہند میں الحاق کے بعد اس کے بادشاہ واجد علی شاہ اختر کو انگریزوں نے معزول کر دیا تھا اور ان کو مع ان کے بڑے خاندان اور ملازمین کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا ہر دو حوادث کلکتہ میں اپنے ساتھ اسلامی ثقافت اور اُردو زبان بھی لائے تھے۔ گو میسور کے شاہی مسلم خاندان سے کلکتہ نسبتاً کم متأثر ہوا، لیکن اودھ کے جلاوطنوں نے کلکتہ کی کایا ہی پلٹ دی، حتیٰ کہ شہر کا ایک حصّہ ان کے قیام کے باعث 'مٹیا برج' کہلایا، جو لکھنؤ ثانی بن گیا اور کلکتہ کا لکھنؤ مشہور ہو گیا تھا۔ کلکتہ میں بہت سے اُردو شعرا ہوئے۔ مسلمانوں کے علاوہ کلکتہ میں ہندو شعرا کی بھی کمی نہ تھی، جن میں سے بعض حسب ذیل تھے:۔

(۱) اُردو شاعری میں کلکتہ کے سودا بازار کا راج خاندان مشہور ترین ہے جس میں ہر نسل میں ایک اُردو شاعر ضرور ہوا ہے۔ اِس خاندان کے آخری ممتاز راجہ جادو کرشنا دیب مُشفق تھے۔ اُن کا نمونہ کلام ؎

خفتگان خاک ہیں قربان اِس رفتار پر
ہے قیامت کا گماں سب کو قدِ دلدار پر

(۲) راجہ جنم جائے متر ارمانؔ کا تعلق کلکتہ کے ایک اور راج خاندان سے تھا، جو فنونِ لطیفہ کا بڑا شائق تھا۔ وہ ایک عمدہ اُردو شاعر تھے، جنہوں نے گرے GRAY کے مرثیہ (ELEGY) کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اُن کی ایک اور اُردو تصنیف کا نام 'تذکرے' تھا۔

(۳) کلکتہ کے ایک اور معروف ہندو شاعر بابو جگن ناتھ پرشاد ملک تھے۔ الغرض کلکتہ

اُردو ثقافت کا ایک ممتاز مرکز رہا ہے، یہاں سے راجہ رام موہن رائے کا 'مرآۃ الاخبار'۔ آقا سید جلال الدین کی 'حبل المتین'۔ مولانا محمد علی جوہر کا روزنامہ 'ہمدرد' اور مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' شائع ہوئے تھے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں برطانوی ہند کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔ جس کے باعث کلکتہ کی حیثیت کو بطور اُردو کے ثقافتی مرکز کے سخت نقصان پہنچا۔ ساتھ ہی ساتھ بہار ہائی کورٹ بھی پٹنہ چلی گئی اور ممتاز اُردو ادیبوں، مثلاً سر علی امام، سر سلطان احمد اور حسین امام وغیرہ۔ سب نے کلکتہ چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کلکتہ سے اُردو کالعدم ہو گئی۔ کلکتہ کے علاوہ بنگال (ہند) اور سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں متعدد دیگر مقامات، مثلاً ہگلی اور بردوان (بنگال۔ ہند) اور ڈھاکہ اور چٹگام وغیرہ ایسے ہیں جہاں اُردو کے شایق آج بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بنگالی طلبہ جو بغرض حصولِ علم مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن)۔ 'فرنگی محل' اور 'ندوہ'، لکھنؤ اور 'دارالعلوم'، دیوبند وغیرہ گئے عمر بھر کے لیے شیدائے اُردو ہو کر پلٹے۔ لاکھوں مولوی بنگال (ہند) اور بنگلہ دیش میں اُردو زبان میں وعظ کہتے ہیں۔ اُردو کے خلاف کلکتہ یونیورسٹی کی دشمنی کے باوجود آج بھی ہر دو بنگالی علاقوں میں تبادلہ خیال کا عام اور مقبول ذریعہ اُردو زبان ہی ہے۔ متعصب بنگالی ہندوؤں کی اُردو زبان کو بنگال سے مکمل طور پر خارج کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہی ہیں، جنہوں نے سادہ بنگالی زبان کو سنسکرت الفاظ کی بھرمار سے قطعی ناقابلِ فہم بنا دیا تھا۔

نذرالاسلام اور ان کے معاصرین و متبعین کی بنگالی شاعری نے بھی بنگالیوں کے دل و دماغ کو اُردو زبان کی ہمہ گیری سے بہت متاثر کیا ہے۔ نذرالاسلام کی مشہور نظم 'محرّم'، سے ایک شعر بطور نمونہ ذیل میں درج ہے ؎

نیل سیاہ آسمان لاے لال دُنیا
آسمان، لال تو لہو (نیرا)، لال کیا خُونیا

['ہماری زبان'، دہلی، ۱۶ راگست سنہ ۱۹۴۵ء 'بنگال میں اُردو'، از ضیاء عاکف]

(۳۱)

اُردو تراجم و مُترجمین

اُردو میں تراجم کے تین ادوار متعین کئے گئے ہیں :۔

(۱) اُردو تراجم کا پہلا دور اُس وقت سے شروع ہوا جبکہ زبان کی تہی دستی اور اس میں مفید لٹریچر کے فقدان کے باعث دوسری زبانوں سے اُردو میں تراجم کی ضرورت محسوس کی گئی ۔ وہ اُردو زبان کے آغاز کا اوّلین زمانہ تھا۔ اُس وقت فارسی زبان کا دَور دورہ تھا۔ اُس اوّلین دَور میں اُردو زبان کا آغاز یا تو مسلمان صُوفیہ و مبلغینِ اسلام کے وعظ و پند سے ہوا جو اپنا روحانی پیغام اُن ہندوستانی عوام کو دینا چاہتے تھے جو فارسی زبان سے نابلد تھے، یا پھر ملک میں بعض اُن فارسی گو شعراء سے ہوا جو محض تفننِ طبع کے طور پر اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ۔ اُس ابتدائی زمانے میں اُردو کی تقویت کے لیے ہر چیز فارسی ہی سے مستعار لی جاتی تھی ۔ اس طرح اوّل اوّل اُردو تراجم کمتر عربی مگر زیادہ تر فارسی زبان سے کئے گئے اور اُن کتابوں سے کئے گئے جو یا تو مذہب و تصوّف سے متعلق تھیں، یا قصہ کہانیوں سے ۔ مزید براں اُس پہلے دَور کے اُردو تراجم دکن اور دکنی اُردو سے مخصوص ہیں ۔ اس کے بعد کے زمانے میں شمالی ہند میں بھی بعض اُردو تراجم ہوئے، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے ۔ اس اوّلین دَور میں زیادہ تراجم دکنی اُردو ہی میں ہوئے ۔ اُس پہلے زمانے میں معدودے چند تراجم سنسکرت سے بھی اُردو میں کئے گئے ۔ اُردو تراجم کا یہ اوّلین دَور اُس وقت تک قائم رہا جب تک کہ ہندوستان میں فارسی زبان کا غلبہ رہا ۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ اُن کی زبان فارسی پر بھی زوال آیا ۔ سازشی و غاصب انگریزوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے برِصغیر میں فارسی زبان کی جگہ انگریزی زبان کو متعارف کرنے کا آغاز کیا اور ہندوؤں نے موقع شناسی سے کام لے کر فارسی کو خارج اور انگریزی کو رائج کرنے میں غیر ملکیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔

گو اوّلین اُردو تراجم دکن اور دکنی زبان ہی میں ہوئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس وقت شمالی ہند میں اُردو رائج و مقبول نہ تھی ۔ برِصغیر میں قدرتی طور پر اوّل اوّل اُن علاقوں میں اُردو زبان کا آغاز ہوا جہاں مسلمان نو واردوں کا ملک کی دیسی آبادی سے سب سے پہلے سابقہ پڑا اور پھر یہ رابطہ

بڑھتا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عرب تاجر و سیاح بہت پہلے سے دکن (جنوبی ہند) میں آنے جانے لگے تھے، گو وہ ابتدائی رابطہ کسی نئی زبان کے آغاز کے لیے کافی نہ تھا۔ زبان سازی کا یہ کام دراصل سب سے پہلے سندھ، پنجاب اور برج (مضافاتِ دہلی) کے علاقوں میں ہوا۔ دَورِ اوّل میں اُردو زبان کے رواج اور مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دکن کے مسلمان فرماں رواؤں نے دکنی اردو کی سرپرستی کی، جو خود بھی اس نئی زبان کے شاعر و مصنّف تھے۔ اس کے برعکس شمالی ہند میں اُردو کی ترقی اس لیے رُکی رہی کہ وہاں حکمراں طبقہ فارسی کا دلدادہ تھا اور اُردو سے اغماض کرتا تھا۔ شمالی ہند میں اُردو کی ترقی فارسی کے زوال سے وابستہ تھی۔

(۲) اُردو تراجم کا دو... اُس وقت سے شروع ہوا جبکہ ملک میں ایسے ادارے قائم ہوئے جیسے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ۔ سرکاری بُک ڈپو، لاہور۔ دہلی سوسائٹی اور دہلی کالج، اور سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ۔

(۳) اُردو تراجم کے تیسرے دَور کا تعلق عہدِ جدید سے ہے جبکہ برِصغیر میں انجمن ترقیٔ اُردو (موجودہ قیام کراچی)، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن)، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ندوہ، لکھنؤ۔ ہندوستانی اکاڈمی، الٰہ آباد اور اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ، دہلی وغیرہ کا قیام ہوا۔

انگریزی حکام نے برطانوی ہند سے فارسی زبان کو مکمل طور پر بدر کرنے کے لیے اُردو زبان کو استعمال کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو پہلا قدم اُٹھایا گیا وہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، کا قیام تھا اور اس کے سربراہ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھے۔ اس تحریک کا اصل مقصد نئے برطانوی حکام کو ہندوستانی زبانوں اور برِصغیر کے باشندوں کے طرزِ زندگی اور کلچر کی تربیت دینا تھی۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ خود بڑے مصنّف تھے اور اُنھوں نے لائق مسلمان اور ہندو مُنشیوں کی (کوئی ہندوستانی پروفیسر نہیں ہو سکتا تھا) ایک جماعت تیار کر لی تھی تاکہ وہ کالج مذکور کے پروگرام کو کامیاب بنا سکے۔ اِسی جماعت کے اُردو تراجم و ادبی تخلیقات نے برِصغیر میں جدید اُردو ادب کے نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مشہور منشی حسب ذیل تھے:-

(۱) مرزا علی لُطف نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کے ایما سے شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ بنام 'گلشنِ ہند' مرتّب کیا تھا۔

(۲) میر حیدر بخش حیدری دہلوی (متوفی ۱۸۲۳ء) نے حسب ذیل تراجم کئے :- 'ہفت پیکر'، 'آرائشِ محفل'، 'گلزارِ دانش'، 'تاریخِ نادری'، 'گلِ مغفرت'، (دہ مجلس) کا ترجمہ ۱۸۱۴ء) اور 'طوطا کہانی'،

(۱) اس کی اصل کہانی سنسکرت میں تھی، جس سے ضیاء الدین نخشبی بدایونی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کا اردو ترجمہ حیدری نے ۱۸۰۲ء میں کیا)۔ مندرجہ بالا تمام اردو تراجم فارسی سے کئے گئے تھے۔ 'ہفت پیکر' کا ۱۸۰۱ء میں ترجمہ ہوا تھا۔

(۳) میر امن دہلوی کے اردو تراجم کے نام 'گنج خوبی' اور 'باغ و بہار' تھے ('چہار درویش' کا ترجمہ) جو اُنھوں نے فارسی سے ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کئے تھے۔ بعض مؤرخین نے میر امن کو اردو نثر کا میر تقی میر کہا ہے۔

(۴) میر بہادر علی حسینی کے تراجم کے نام حسب ذیل تھے، جو اُنھوں نے ۱۸۰۲ء میں کئے تھے: میر حسن کی 'مثنوی سحر البیان' کا اردو نثر میں ترجمہ، جس کو اُنھوں نے 'نثر بے نظیر' کا نام دیا تھا، اور 'ہتوپدیش' کے فارسی ترجمہ سے اردو نثر میں ترجمہ جو اُنھوں نے اُسی سال کیا اور جس کا نام اُنھوں نے 'اخلاقِ ہندی' رکھا۔ مزید براں، اُنھوں نے قرآنِ حکیم کا اردو ترجمہ کیا، ایسپ AESOP کی بعض کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا اور فارسی سے 'تاریخِ آسام' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اُنھوں نے اردو گرامر پر بھی ایک چھوٹا سا رسالہ مرتب کیا تھا۔

(۵) میر شیر علی افسوس دہلوی کا مشہور ترین کارنامہ اُن کا اردو ترجمہ بعنوان 'آرائشِ محفل' ہے۔ اسکے علاوہ اُنھوں نے نہال چند کے 'مذہبِ عشق'، بہادر علی حسینی کی 'نثر بے نظیر'، اور محمد اسمٰعیل کی 'بہارِ دانش' کو بھی ریویو کیا تھا۔ ان کے علاوہ افسوس نے سعدی کی 'گلستاں' کا بھی فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور اسے 'باغِ اردو' نام دیا تھا۔

(۶) مولوی حفیظ الدین احمد دہلوی نے ۱۸۰۳ء میں 'عیارِ دانش' کو اردو میں ترجمہ کر کے 'خرد افروز' نام دیا تھا۔

(۷) نہال چند لاہوری نے 'گل بکاولی' کی کہانی کا فارسی سے اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ اور اس کو 'مذہبِ عشق' کا نام دیا تھا۔

(۸) مرزا کاظم علی جوان نے للو لال کی مدد سے ۱۸۰۳ء میں 'شکنتلا' اور 'سنگھاسن بتیسی'، دونوں کا اردو ترجمہ کیا تھا اور ۱۸۰۸ء میں اُنھوں نے 'تاریخِ فرشتہ' کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

(۹) مظہر علی ولا نے حسب ذیل اردو تراجم کئے تھے

'مادھونل'، 'تاریخ شیر شاہی' (۱۸۰۵ء)، 'پند نامہ سعدی'، 'ہفت گلشن'، اور 'جہانگیر شاہی'۔

(۱۰) مولوی اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں عربی سے اردو میں 'رسائل اخوان الصفا' ترجمہ کئے تھے۔

(۱۱) مولوی امانت اللہ نے حسب ذیل اُردو تراجم کئے تھے :-
'بوستانِ سعدی'، 'قرآن کریم' (۱۸۰۳ء)، 'اخلاقِ جلالی' اور 'ہدایت الاسلام' (۱۸۰۴ء)۔
(۱۲) کپتان بینی نارائن نے 'بہارِ گلشن' (۱۸۱۱ء) اور 'تنبیہ الغافلین' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اُنھوں نے 'قصہ حیات' کے نام سے اُردو میں کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں۔
(۱۳) مولوی معین الدین نے ۱۸۰۴ء میں 'پند نامۂ عطار' کا 'پند نامہ' کے نام سے اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۱۴) مرزا فطرت نے ۱۸۰۵ء میں انجیل کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔
(۱۵) مرزا جان طپش نے ۱۸۱۱ء میں 'بہارِ دانش' کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔ نیز اُردو میں فارسی محاورات پر ایک کتاب لکھی تھی۔

حسب ذیل اُردو تراجم بھی اُسی زمانے میں ہوئے تھے گو ان کا کوئی تعلق فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے نہیں تھا :-

(۱) قادر بخش نے بخشی کا 'طوطی نامہ' اُردو میں اُسی نام سے ۱۸۲۹ء میں ترجمہ کیا تھا۔
(۲) فضلی اورنگ آبادی نے 'روضۃ الشہدا' کو ۱۷۳۲ء میں اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔
(۳) مولوی رفیع الدین نے ۱۷۸۸ء میں قرآنِ حکیم کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۴) مولوی عبد القادر نے ۱۷۹۰ء میں قرآن کریم کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۵) سید شاہ حقانی نے ۱۷۹۱ء میں 'تفسیر حقانی' کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۶) پی برٹن P.B URTON نے اُردو میں ۱۸۱۷ء میں علم الابدان (فزیولوجی) پر ایک کتاب کا مجموعہ 'علم التشریح' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔
(۷) سید صالح محمد دہلوی نے ۱۸۳۵ء میں اُردو میں 'اتالیق الصبیان' کا ترجمہ کیا تھا۔
(۸) منیم چند کھتری نے ۱۸۳۷ء میں 'قصہ گل یا صنوبر' کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۹) سعد اللہ رامپوری نے ۱۸۴۰ء میں 'فقہ اکبر' کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۱۰) سید باقر حسین نے ۱۸۴۰ء میں 'عجایب القصص' کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔
(۱۱) خلیل اللہ خاں اشک فیض آبادی نے متعدد کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں۔ مثلاً 'قصہ امیر حمزہؓ' (۱۸۰۱ء)، 'گلزارِ چین' (۱۸۰۴ء)، 'واقعات اکبری' (۱۸۰۹ء) میں اشک نے 'اکبر نامہ' و 'آئینِ اکبری' مصنفہ ابوالفضل دونوں کا ترجمہ و تلخیص اُردو میں کی، اور 'رسالہ کائنات' کے نام سے طبیعیات پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا۔

(١٢) فقیر اللہ گویا نے ١٨٢٥ء میں 'بوستانِ حکمت' کے نام سے 'انوارِ سہیلی' کا اردو ترجمہ کیا۔

(١٣) رجب علی بیگ سرور نے اپنے شاہکار 'فسانۂ عجائب' کے علاوہ فارسی سے اردو میں دو مزید تراجم 'شرورِ سلطانی' اور 'گلزارِ سرور' کے نام سے کئے۔

(١٤) عبدالکریم نے ١٨٤٥ء میں 'الف لیلہ' کی کہانیوں کا اردو ترجمہ کیا۔

(١٥) رامچندر نے ١٨٤٩ء میں اردو میں دو کتابیں 'عجائب روزگار' اور 'تذکرۃ الکاملین' لکھیں۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے بعد، اس سلسلے میں ایک اور اہم ادارہ قدیم 'دہلی کالج' کا تھا، جو قائم تو ١٧٩٢ء میں ہوا تھا لیکن وہ کالج ١٨٢٥ء میں بنا تھا۔ 'دہلی کالج سوسائٹی' نے جدید سائنس اور علوم پر اردو تراجم و تصانیف کے ذریعہ سے نہایت اہم و قابلِ قدر علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ اس نے اردو زبان میں ایک 'اسکول بک لائبریری' بھی قائم کی تھی۔ دہلی کالج کے پرنسپل پروفیسر بطروس تھے۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے بعد یہ ایک دوسری منظم اور باقاعدہ تحریک تھی جس کے ذریعہ سے برِّ صغیر میں اردو زبان کو بحیثیت ایک قومی زبان کے پروان چڑھانا مقصود تھا۔ بقول مولوی عبدالحق، 'اردو کو ایک سائنٹفک زبان بنانے کی یہ ایک باقاعدہ و منظم کوشش تھی' دہلی کالج کے بعض نہایت اہم اردو تراجم کے نام ذیل میں درج ہیں۔

اردو ترجمہ کا نام	از	تاریخ	کیفیت
١۔ تزکِ تیموری			فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی
٢۔ تاریخ ابوالفدا			عربی 〃 〃 〃 〃 〃
٣۔ تذکرۂ شعرائے عرب			〃 〃 〃 〃 〃 〃
٤۔ تذکرۂ گارساں دتاسی از متین			فرانسیسی 〃 〃 〃
٥۔ ترجمۂ گلستاں، (اردو اخبار پریس، دہلی)			فارسی 〃 〃 〃
٦۔ رسالہ مقناطیس۔ سید کمال الدین۔ ١٨٥٠ء			انگریزی سے 〃 〃 〃
٧۔ اصول علم طبیعی۔ شیو پرشاد۔ ١٨٤٨ء			انگریزی سے
٨۔ جبر المقابلہ۔ کریم الدین			انگریزی 〃 〃 〃
٩۔ اقلیدس۔ کریم الدین			انگریزی 〃 〃 〃
١٠۔ جغرافیہ۔ اجودھیا پرشاد۔ ١٨٦١ء			انگریزی 〃 〃 〃
١١۔ اصولِ علم ہیئت۔ ماسٹر رامچندر۔ ١٨٤٨ء			انگریزی 〃 〃

اُردو ترجمہ کا نام	از	تاریخ	کیفیت
۱۲- ترجمہ معاشیات مِل MILL	وزیر علی	۱۸۴۴ء	انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی-
۱۳- انوارِ سہیلی	کریم الدین		فارسی ″ ″ ″ ″ ″
۱۴- تاریخِ طبری	جعفر شاہ		
۱۵- مسلم ہندسہ	ماسٹر رامچندر		وغیرہ وغیرہ-

یہ تھی بنیاد، جو فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، اور دہلی کالج اور سوسائٹی دہلی نے ڈالی تھی، جس پر بعد ازاں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے وہ عظیم الشان عمارت تعمیر کی، جس نے اُردو کو دُنیا کی اہم ترین اور وسیع الاستعمال زبانوں میں شامل کر دیا۔ اُردو زبان کی اس عظیم عمارت کو بعد کو سرکاری بک ڈپو، لاہور، رسائنٹفک سوسائٹی، علی گڈھ، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ، دہلی، ندوہ، لکھنؤ، دارالمصنفین، اعظم گڈھ وغیرہ کے علمی و ادبی کارناموں اور پروگراموں نے مزید تقویت پہنچائی، حتّٰی کہ اُردو زبان آج دُنیا کی مقبول ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ چونکہ سرسید احمد خاں کی جدید اُردو ادب میں اصلاحات کا آغاز ۱۸۵۰ء سے ہوا تھا لہٰذا یہ تاریخ اُردو ادب کے قدیم و جدید ادوار کے مابین حدِ فاصل بن گئی ہے۔ ["جامعہ" دہلی، اکتوبر ۱۹۴۰ء اُردو تراجم، از محمد ابو اللیث صدیقی البدایونی "عالمگیر" لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۷ء اُردو نثر پر ایک نظر، از پروفیسر مولانا محمد طاہر فاروقی]

(۳۲)

اُردو نثر کا ابتدائی اَدب

(کہانیاں)

جس طرح ہنود میں قدیم زمانے میں 'کتھا' کا رواج تھا، اسی طرح اُردو میں داستان گوئی کا آغاز ہوا اُردو کہانیاں فارسی ہی سے پیدا ہوئیں، مثلاً داستانِ امیر حمزہؓ اور میر محمد تقی خیالؔ کی بوستانِ خیال، (متعدد جلدوں میں)۔ ان دونوں کا اُردو ترجمہ ہو چکا ہے، ثانی الذکر کا اُردو ترجمہ خواجہ بدرالدین المعروف بہ خواجہ امان، دہلوی نے کیا تھا۔

لکھنؤ اُردو داستان گویان کا مرکز تھا، جہاں مرزا طُور نے سب سے پہلے اس فن میں شہرت پائی۔ اُن کی جگہ میر فدا علی نے لی، جو بڑے منشی، کہلاتے تھے اور پھر چھوٹے منشی کا دور دورہ ہوا۔ نواب ہادی علیخاں نیشاپوری بھی لکھنؤ کے ایک معروف داستان گو تھے۔ وہ اپنی داستانیں لکھنؤ میں ایک خاص انداز سے مترنم طور پر سنایا کرتے تھے۔ ان کے بعد لکھنؤ میں ایک اور معروف داستان گو امیر خان کا ظہور ہوا، جو سارے سال وزیر باغ کی کوٹھی میں ایک خیالی شہزادے ایرج نامی کی فرضی داستانیں سُنایا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں داستان گوئی کا ایک اور مرکز 'حیدر امام باڑہ' تھا۔ ایک نام کے نواب صاحب (نواب صاحب' اُس زمانے میں لکھنؤ میں اودھ کی بادشاہت کے زوال کے بعد ہرا یرہ غیرہ نتھو خیرہ کو کہا جانے لگا تھا) اپنی کہانیاں نواب آغا حیدر افسوس المخاطب بہ آغا میر، کی ڈیوڑھی پر سُنایا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے ایک اور مقبول عام داستان گو اُمبکا پرشاد کایستھ تھے، جو ریاست رامپور کے نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں دونوں کے ملازم تھے۔ رسالدار نواب محمد حسین خاں وثیقہ دار نیشاپوری اپنی کہانیاں لکھنؤ میں نواب شیش محل کے دربار میں سُنایا کرتے تھے۔ نواب بہرام الدولہ نے اُنھیں حیدر آباد (دکن) میں بُلا لیا تھا، لیکن وہ وہاں زیادہ عرصے تک نہیں ٹھیرے تھے۔ وہ رامپور بھی طلب کئے گئے تھے۔ اُن کے بعد ان کے شاگرد وزیر گنج کے مولوی احمد حسن لکھنؤ کے ایک مشہور داستان گو ہوئے۔

اودھ کی بادشاہت کے زوال کے بعد، جبکہ اُردو داستان گوئی کا فن بھی لکھنؤ میں 'متاثر ہوا'

تو منشی نولکشور نے ان اُردو داستانوں کو جمع کر کے لکھنؤ میں اپنے پریس میں طبع کرنے کا اہتمام کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے 'بڑے منشی' میر فدا علی کے ایک شاگرد منشی محمد حسین جاہ کو اپنے ہاں ملازم رکھا۔ منشی جاہ نے اپنے 'طلسم ہوش رُبا' کی پہلی چار جلدیں نولکشور پریس میں مکمل کیں، لیکن جب وہ اس کی پانچویں جلد کا پہلا حصہ مرتب کر رہے تھے تو ان کے اور پریس مذکور کے درمیان کسی بات پر تنازعہ ہو گیا اور منشی جاہ نولکشور پریس کو خیرباد کہہ کر منشی گلاب سنگھ کے پریس میں چلے آئے جو لاہور سے لکھنؤ کو منتقل ہوا تھا۔ ثانی الذکر پریس نے 'طلسم ہوشربا' کی پانچویں جلد کا دوسرا حصہ مصنفہ منشی احمد حسین قمر لکھنوی شائع کیا۔ 'طلسم ہوش رُبا' کے سلسلے کی بقیہ جلدیں مصنفہ منشی قمر جلدی جلدی چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گئیں اور بہت مقبول ہوئیں۔ منشی جاہ کو 'بزم نگاری' میں اور منشی قمر کو 'رزم نگاری' میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کہانیوں میں 'عمر عیار' کا کردار انتہائی دلچسپی کا باعث رہا۔ اس کردار کو لکھنؤ کے ایک معروف داستان گو امیر خاں نے اختراع کیا تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے بھی ایک داستان 'شگوفۂ اُلفت' کے نام سے نواب صاحب رامپور کی فرمائش پر لکھی تھی، جس کو لکھنؤ کے مطبع نامی نے چھاپا تھا۔ منشی اسمٰعیل مُنیر نے بھی اُردو میں ایک داستان لکھی تھی مگر وہ طبع نہیں ہوئی تھی۔ حکیم میر ضامن علی جلال کے والد حکیم سید اصغر علی نوابانِ رامپور (یوسف علی خاں اور کلب علی خاں) کے پیشہ ور درباری داستان گو تھے۔ 'طلسم ہوشربا' کی تکمیل کے بعد منشی قمر نے یہ داستانیں لکھیں:- 'طلسم صندلی نامہ'، 'نورج نامہ' (دو جلدیں) اور 'لعل نامہ' (دو جلدیں)۔ منشی قمر نہایت پُرگو داستان گو تھے۔ اُنھوں نے اپنے انتقال سے پہلے حسب ذیل تین مزید داستانیں رقم کی تھیں: 'طلسمِ خیالِ سکندری'، 'ہفت پیکر' اور 'فتنۂ نُور افشاں'۔

منشی احمد حسین قمر کے انتقال کے بعد، لکھنؤ میں اُردو داستان گوئی کے میدان پر ایک اَن پڑھ داستان گو شیخ تصدق حسین نے قبضہ کر لیا تھا جو اپنی داستانیں دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھیں نواب ریاست بہاولپور (موجودہ پاکستان) نے بُلایا تھا۔ شیخ تصدق حسین کا ناشر نولکشور پریس، لکھنؤ، تھا۔ اُن کی اُردو داستانوں کے نام یہ ہیں:- 'طلسم آفتابِ شجاعت'، 'گلستانِ باختر'، 'طلسم نوخیز جمشید' (تین جلدیں)، 'طلسمِ خیالِ سکندری' (تین جلدیں) اور 'طلسم زعفران زارِ سلیمانی'۔ ابتدائی اُردو داستانوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ کارکردگی مذکورہ بالا دو عظیم اُردو داستان گویان کی تھی، یعنی منشی قمر اور شیخ تصدق حسین کی۔ موجودہ صدی کے آخری عظیم اُردو داستان گو لکھنؤ کے مرزا ٹلن تھے۔ ان میں سے اکثر داستان گو افیون کھانے کے عادی تھے۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، کے اہلِ قلم میں خلیل علی خاں بھی تھے، جو کالج مذکور کے باقاعدہ ملازم تو نہیں تھے لیکن ڈاکٹر گلکرائیسٹ کے ایما سے لکھا کرتے تھے۔ اُن کی ایک تصنیف 'قصۂ امیر حمزہؓ'، برِ صغیر میں بیحد مقبول ہوئی، لیکن اس کے مصنف کی حیثیت سے خود اُن کا نام حال ہی میں دریافت ہوا ہے کیونکہ کسی اُردو تذکرے میں اُن کا نام مذکور نہیں ہے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اُن کی اپنی کتابوں میں اُن کے ذاتی حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ پہلی مرتبہ مختصر طور پر مولوی عبدالحق، ایڈیٹر سہ ماہی رسالہ 'اردو' نے خلیل علی خاں کا نام اپنے مضمون 'اہلِ یورپ نے اُردو زبان کی کیا خدمت کی؟' میں لیا، جو اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، کی اُردو خدمات کے سلسلے میں رقم کیا تھا (اُردو، نمبر ۱۵ صفحہ ۴۸۵) اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ خلیل علی خاں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر TAYLOR کی فرمایش پر ابوالفضل کا 'اکبرنامہ' اُردو میں 'واقعاتِ اکبری' کے نام سے ترجمہ کیا تھا (جو شائع نہیں ہوا تھا)۔ پھر مولوی محمد یحییٰ تنہا نے خلیل علی خاں کے نام کا اپنی تصنیف 'سیر المصنفین' کے صفحہ ۱۲۶ پر حوالہ دیا، جس میں اُنھوں نے محض مولوی عبدالحق کے بیان کو دوہرا دیا ہے۔ لیکن ان دونوں نے ان کا نام خلیل اللہ خاں لکھا ہے۔ مگر 'قصۂ امیر حمزہؓ' میں (مطبوعہ پرکاش پریس، دہلی صفحہ ۲) صاف طور پر ان کا نام خلیل علی خاں اشک مذکور ہے اور لکھا ہے کہ وہ کتاب ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گلکرائیسٹ کے ایما پر مرتب ہوئی تھی۔ لیکن افسوس کہ خلیل علی خاں کے مزید ذاتی و خاندانی حالات کا اس میں کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ نہ ہمیں ان کی تاریخِ وفات اور مدفن کا کوئی علم ہے۔ بس ہمیں صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، کے ابتدائی اہلِ قلم میں سے تھے۔ وہ غالباً شروع شروع میں کالج مذکور کے باقاعدہ تنخواہ یافتہ منشیوں میں بھی نہیں تھے اور ممکن ہے کہ اُنھوں نے اس کتاب کا اُردو ترجمہ اپنے طور پر شاید ڈاکٹر گلکرائیسٹ کے اشارے پر کیا ہو۔ اشک بعد کو کالج مذکور کے باقاعدہ تنخواہ پانے والے منشی مقرر ہو گئے ہوں گے۔

'قصۂ امیر حمزہؓ' کی طویل و ضخیم داستان کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر گلکرائیسٹ کے اشارے پر ۱۸۰۱ء میں کیا گیا تھا۔ لیکن اس داستان کے اصل مصنف کا صحیح طور پر پتا نہ چل سکا۔ خلیل علی خاں کے اُردو ترجمہ سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کے اصل مصنف چند فارسی داستان گو تھے جنھوں نے سلطان محمود غزنوی کے تفننِ طبع کے لیے یہ داستان گھڑی تھی (۹۸۸ھ۔ ۱۰۳۰ء) اور جو چودہ جلدوں میں درج تھی۔ ایک اور راستے یہ ہے کہ یہ قصہ مُلا جلال بلخی کی دماغی اُپج کا نتیجہ ہے۔ برطانوی میوزیم، لندن، میں اس کے ایک فارسی مسودے پر شاہ ناصرالدین محمود کا نام لکھا ہے اور دوسرے پر ابوالمعالی کا۔ مزید براں

یہ بھی تحقیق نہ ہو سکا کہ آیا اس کا اصل نسخہ عربی زبان میں تھا یا فارسی میں۔

خلیل علی خاں اشک اور دیگر مترجمین کے 'داستان امیر حمزہؓ' کے اُردو ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں یہ داستان اتنی طویل نہ تھی جتنی کہ اسے اُردو مترجمین نے بنا دیا۔ اشک سے پہلے اس داستان کو کسی اور نے اُردو میں ترجمہ نہ کیا تھا۔ اس داستان کو طباعت کے لیے سب سے پہلے لکھنؤ کے منشی نولکشور کی طرف سے حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے مرتب کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس ایڈیشن کا اُردو ترجمہ بھی فارسی سے اُنھوں ہی نے کیا تھا۔ نولکشور پریس، لکھنؤ کا مطبوعہ یہ ایڈیشن ملک میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے چوتھے ایڈیشن پر عربی و فارسی کے ایک بڑے عالم سید تصدق حسین نے نظرثانی کی تھی جو نولکشور پریس، لکھنؤ، میں ہی طبع ہوا تھا۔ سید تصدق حسین فارسی میں 'لغاتِ کشوری' کے مشہور جامع تھے۔ لیکن اُنھوں نے اشک کے ساتھ بڑی بے انصافی سے کام لیا کیونکہ اُنھوں نے سادہ 'داستانِ امیر حمزہ' کو عربی و فارسی کے دشوار الفاظ و محاورات سے گرانبار کر کے ایک دوسرا 'فسانۂ عجائب' بنا دیا۔

'داستانِ امیر حمزہؓ' پہلے پہل چار جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد منشی محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر دونوں نے اپنے اپنے تصرفات سے اس میں تحریف کر کے اس کے مضامین کو اپنے 'طلسم ہوشربا' کی مختلف جلدوں کے لیے استعمال کیا۔ پھر دوسرے مصنفین نے بھی اس کے مضامین کو اپنی طویل داستانوں کے لیے اپنایا، مثلاً 'طلسم ہفت پیکر'، 'طلسم نوخیز جمشیدی'، 'ایرج نامہ'، اور 'اختر نامہ'، وغیرہ۔ مختصر یہ کہ 'داستان امیر حمزہ' فرضی داستانوں کو مواد مہیا کرنے کے لیے اُردو کی انسائیکلوپیڈیا بن کے رہ گئی۔ اشک کا ایک اور ادبی کارنامہ اُن کی کتاب 'واقعاتِ اکبری' ہے، جو فارسی میں ابوالفضل کے 'اکبر نامہ' کا اُردو ترجمہ ہے، جو اشک نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم ٹیلر کے ایما سے کیا تھا، لیکن وہ شائع نہ ہوا اور نایاب ہے۔ اُن کے تخلص اشک سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیل علی خاں شاعر بھی تھے۔ لیکن کسی تذکرۂ شعرائے اُردو میں ان کا نام نہیں ملتا، اور نہ اُنھوں نے اپنے کلام کا کوئی دیوان چھوڑا ہے۔ 'داستان امیر حمزہ' میں اُنھوں نے اپنے جو اُردو اشعار لکھے ہیں، اُن سے ان کی شعر گوئی کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے۔

میر امن کا 'قصۂ چہار درویش' یا 'باغ و بہار' اُردو نثر کی اُن کتابوں میں سے ہے جس کی ہر دلعزیزی کبھی کم نہ ہوگی۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کی سادہ زبان اور آسان اسلوب بیان میں ہے۔ جیسا کہ میر امن نے خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے 'چہار درویش' کی یہ داستان اصلاً حضرت امیر خسرو دہلوی نے اپنے مُرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی علالت کے زمانے میں اُن کا دل بہلانے کے لیے لکھی تھی۔ عام طور سے

مشہور ہے کہ اس کی اصل کہانی امیر خسروؔ نے فارسی میں لکھی تھی۔ لیکن نہ تو اس کا نام امیر خسروؔ کی تصانیف کی فہرست میں درج ہے اور نہ اس کی فارسی کہانی میں اس مفروضہ کا کہیں پتا چلتا ہے۔ اس کے برعکس، اس کے فارسی ایڈیشن میں شروع ہی میں ایک منظوم حمد درج ہے، جس کے مقطع میں شاعر کا تخلص صفیؔ درج ہے یہ امر منطقی خلافِ قیاس ہے کہ امیر خسروؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر نے اپنی تخلیق میں کسی اور شاعر کی حمد شامل کی ہوگی۔ لہٰذا حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ قصہ حضرت امیر خسروؔ کی تخلیق نہیں ہے بلکہ ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ میر امنؔ کے قصہ 'باغ و بہار' کو اسی فارسی کہانی کا اردو ترجمہ باور کیا جاتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو میں یہ داستان اصل فارسی کا ترجمہ نہیں ہے۔ ہر چند کہ کہانی وہی ہے لیکن اسے فارسی والے ایڈیشن سے اخذ نہیں کیا گیا، بلکہ ایک اردو کتاب 'نوطرزِ مرصع' سے، جس کے مصنف میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ اٹاوی تھے، جو ایک معروف خوشنویس تھے اور 'مرصع رقم' کہلاتے تھے۔ تحسینؔ نے اپنی 'نوطرزِ مرصع' ۱۷۷۵ء میں مکمل کی تھی اور اس کو والیِ اودھ نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی تدوین میر امنؔ کی 'باغ و بہار' سے قریباً تیس سال پیشتر ہوئی تھی۔

'چہار درویش' کے فارسی ایڈیشن اور 'نوطرزِ مرصع' کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'باغ و بہار' اوّل الذکر کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ ثانی الذکر سے ماخوذ ہے۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میر امنؔ نے 'چہار درویش' کے فارسی قصہ کا حوالہ دیا ہے لیکن 'نوطرزِ مرصع' کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ نہ 'نوطرزِ مرصع' اور 'باغ و بہار' دونوں میں سے کوئی 'چہار درویش' کی فارسی کہانی کا اردو ترجمہ نہیں ہے بلکہ تحسینؔ اور میر امنؔ دونوں نے فارسی کہانی کو اپنے اپنے طور پر آزادانہ بیان کیا ہے۔

ہر چند کہ 'باغ و بہار' 'نوطرزِ مرصع' سے ماخوذ ہے لیکن دونوں میں زبان، اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا کے لحاظ سے بڑا اختلاف ہے۔ ثانی الذکر کی زبان دشوار اور طرزِ اظہار مبہم ہے۔ 'نوطرزِ مرصع' کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

> "بعد ایک لمحہ کے وہ ماہِ شبِ چہاردہم رونق افزا حدیقۂ فردوس نما کے ہو کر اوپر مسندِ زربفت نقروی کے جلوہ آرا ہوئی" وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برعکس 'باغ و بہار' کی زبان سادہ، آسان اور بےحد رواں ہے۔ طرزِ بیان کی سادگی و روانی کے لحاظ سے قدیم اردو کی کتابوں میں سے کوئی دوسرا نثری کارنامہ 'باغ و بہار' کی سادگیِ بیان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی تحریر کے وقت (۱۸۰۱ء) سے آج تک کہ ۱۸۱ سال ہوتے ہیں اردو زبان میں بڑے تغیرات عمل میں آئے ہیں لیکن باغ و بہار کی تازگی آج بھی جوں کی توں موجود ہے اور وہ اب بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی

جاتی ہے۔

محمد عوض زرّیں نے بھی ۱۸۰۲ء میں چہار درویش کے کرداروں پر مبنی اپنی کتاب 'نوطرز مُرصّع' بی کے نام سے لکھی تھی، جیسا کہ وہ ذیل میں خود لکھتے ہیں :۔

"اس خاکپائے درویشان حق ہیں، محمد عوض زرّیں نے قصہ چار درویش زبان فارسی میں ترتیب دیا اور عبارت شگفتہ سے گلدستۂ مجالس کیا" وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب میں بھی کہانیوں کے حالات و کوائف وہی ہیں جو 'قصۂ چہار درویش' کی دیگر کتابوں میں ہیں، سوائے اس امر کے کہ زرّیں نے اُنھیں کافی مختصر کر دیا ہے۔ اس کی زبان بھی تحسین کی کتاب سے آسان تر ہے۔ لیکن جہاں تک معیار کا تعلق ہے، یہ میرامن کی 'باغ و بہار' سے کمتر درجہ کی کتاب ہے۔ کتاب مذکور کے مدوّن نے کتاب کے اندر اس کا نام کسی جگہ نہیں لیا، جس سے گمان ہوتا ہے کہ اس کا نام 'نوطرز مُرصّع' اُس پریس کے کارکنان نے رکھ دیا ہوگا جس میں وہ طبع ہوئی تھی۔

'باغ و بہار' کے دیباچہ میں اس کتاب اور اپنے ذاتی حالات کے متعلق بیان کے ساتھ ساتھ میرامن نے اُردو زبان کی پیدائش و ترقی کے موضوع پر بھی بحث کی ہے۔ اس طرح وہ غالباً پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کے اس بیان کے چند جملے بطور نمونہ ذیل میں درج ہیں :۔

"ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے اس آمدورفت کے باعث کچھ زبان نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر تیمور نے ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار 'اُردو' کہلایا۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے" وغیرہ وغیرہ۔

گریرسن GRIERSON نے اپنی مشہور کتاب 'دی لنگوسٹک سروے آف انڈیا' (THE LINGUISTIC SURVEY OF INDIA) 'ہندوستان کی لسانی پیمائش' میں اُردو زبان کو اُس کا صحیح اور جائز مقام نہیں دیا ہے اور اس کو 'مغربی ہندی' کی محض ایک شاخ بتایا ہے جو غلط بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ دوسرے یوروپی اور مغربی ماہرین لسانیات نے بھی آنکھ بند کر کے گریرسن کے غلط فارمولا کی محض نقل کر دی ہے۔ اُردو پر عربی اور فارسی زبانوں کے اہم اثرات کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ 'باغ و بہار' کے اسلوبِ بیان کا ایک نمونہ ذیل میں پیش ہے :۔

"کسی گاؤں کے کنارے ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ ٹھلیا اور بدھنا پانی سے بھرا

ہوا دھرا تھا اور وہ پیرزن چرخہ کاتتی تھی۔ کُتّا کوزے کے نزدیک گیا۔ چاہا کہ لوٹے کو اُٹھاوے۔ عورت نے ڈانٹا۔ لوٹا مُنہ سے چھوٹا۔ گھڑے پر گرا۔ مٹکا پھوٹا۔ باقی باسن لڑھک گئے۔ پانی بہ چلا۔ بڑھیا لکڑی لاکر مارنے کو اُٹھی۔ یہ سگ اُس کے دامن میں لپٹ گیا۔ اُس کے پاؤں پر مُنہ ملنے لگا اور دُم ہلانے لگا" وغیرہ وغیرہ۔

سید حیدر بخش حیدری دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام ابوالحسن تھا۔ نامساعد حالات کے باعث یہ گھرانا دہلی سے بنارس کو ہجرت کر گیا تھا، جہاں حیدری کو نواب علی ابراہیم خاں خلیل (مصنف تذکرۂ گلزارِ ابراہیم ۱۱۹۸ھ ہجری مطابق ۱۷۸۳ء جو مصحفی اور شیفتہ دونوں کے تذکروں سے پہلے مرتب ہوا تھا) کی زیرِ تربیت دے دیا گیا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں حیدری نے 'قصۂ مہر و ماہ' مرتب کیا اور اسے ڈاکٹر گلکرائسٹ کے پاس فورٹ ولیم کالج، کلکتہ لے گئے۔ یہ کہانی حیدری کی فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں بطور منشی کے ملازمت کا ذریعہ بن گئی، جہاں اُنھوں نے قریباً بائیس سال تک کام کیا اور اپنی تصانیف وتراجم کے ذریعہ سے اُردو زبان وادب کی بیش قیمت خدمت کی۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے مطابق حیدری کا قریباً ۱۸۲۳ء میں انتقال ہوا۔ حیدری نے ایک درجن کے قریب کتابیں مرتب کی تھیں۔ اُن کی اکثر کتابیں فارسی کے تراجم ہیں۔ ذیل میں اُن کی معروف کتابوں کی تفصیل پیش ہے:۔

(۱) 'قصۂ مہر و ماہ'۔ ۱۷۹۹ء

(۲) قصۂ لیلیٰ مجنوں، امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' کا اُردو نثر میں ترجمہ ہے ۱۷۹۹ء

(۳) 'طوطا کہانی'۔ اصل میں 'شکاسپ تاتی' (یعنی طوطے کی ستر کہانیاں) کے نام سے یہ کتاب سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی، جس کی منتخب باون کہانیوں کا ضیاء الدین بخشی نے فارسی میں ۱۳۲۹ھ ہجری میں ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام 'طوطی نامہ' رکھا تھا۔ ۱۷۹۳ء میں ملا سید محمد قادری نے بخشی کی کتاب کو دوبارہ لکھا، اختصار کے ساتھ اور بخشی کی ۵۲ کہانیوں میں سے صرف ۳۵ کہانیوں کو منتخب کیا۔ ۱۸۰۰ء میں حیدری نے قادری کی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا، جس کی فرمائش ڈاکٹر گلکرائسٹ نے کی تھی۔ یہ کہانیاں برِ صغیر کے طول و عرض میں نہایت مقبول ہوئیں، جن کے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں تراجم کئے گئے۔ جی اسمال SMALL نے لندن سے اس کو انگریزی میں شائع کیا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے ایک 'بیاضِ ہندی' مرتب کی تھی جس میں اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے منشیوں کے اسالیبِ تحریر کے شاہکاروں کے انتخابات بھی درج کئے تھے۔ اسی میں پہلی مرتبہ حیدری کی 'طوطا کہانی' کا ایک انتخاب بھی شائع کیا گیا تھا۔ مدت تک یہ کہانی ہندوستانی مدارس کے نصاب میں داخل رہی۔ اس کا پہلا ایڈیشن

کلکتہ سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد طوطا کہانی کے کئی اور ایڈیشن ہندوستان کے مختلف مطابع نیز لندن سے شائع ہوئے۔ طوطا کہانی اردو نثر کی اولین کتابوں میں سے ہے۔ حیدری کے اردو نثر میں اس ترجمہ سے بہت پہلے بخشی کے طوطی نامہ کے غواصی نے ۱۶۳۹ء میں اور ابنِ نشاطی نے ۱۶۶۵ء میں (جو گولکنڈہ کے ہمعصر شعرا تھے) دکنی اردو میں منظوم تراجم کئے تھے۔

(۴) آرائشِ محفل، فارسی کے 'قصۂ حاتم طائی' کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۱ء میں کیا گیا تھا۔ یہ پہلے پہل کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا تھا، جس کے بعد اس کو کئی بار دہلی، لکھنؤ، کانپور، بمبئی اور مدراس وغیرہ کے مطابع نے شائع کیا اس کے تراجم بنگال، ہندی اور گجراتی زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

(۵) ہفت پیکر، اس مثنوی کا نام ہے جو حیدری نے اردو میں حضرت نظامی گنجوی کی اسی نام کی فارسی مثنوی سے ترجمہ کرکے ۱۸۰۵ء میں لکھی تھی۔

(۶) تاریخِ نادری، مرزا محمد مہدی کی فارسی تاریخ کا (جو نادر شاہ کے کارناموں پر مبنی تھی) اردو ترجمہ ہے (۱۸۰۹ء)

(۷) گلِ مغفرت۔ ملا حسین الواعظ کاشفی (انوارِ سہیلی اور اخلاقِ محسنی کے مشہور مصنف) نے شہدائے اسلام پر ایک کتاب 'روضۃ الشہدا' کے نام سے لکھی تھی۔ حیدری نے اس کا ترجمہ اردو نثر و نظم دونوں میں 'گلشن شہدا' کے نام سے کیا تھا۔ 'گلِ مغفرت' اسی کتاب کے مختصر ایڈیشن کا نام ہے جس کا دوسرا نام 'دہ مجلس' بھی ہے۔ وہ کلکتہ میں ۱۸۱۲ء میں ترجمہ ہوئی اور اسی سال شائع بھی ہوئی۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ ایم برٹرانڈ BERTRND نے کیا تھا۔

(۸) گلزارِ دانش، شیخ عنایت اللہ کی فارسی کتاب 'بہارِ دانش' کا اردو ترجمہ ہے۔

(۹) گلدستۂ حیدری، یعنی کلیاتِ حیدری (۱۸۰۲ء) ان کے دیوان اور شعرائے اردو کے تذکرے وغیرہ پر مشتمل ہے۔

(۱۰) گلشنِ ہند۔ ایک اور اردو تذکرہ بھی اسی نام کا رائج ہے۔ اتفاق سے یہ دونوں تذکرے ایک ہی وقت میں مرتب ہوئے تھے۔ ان میں سے حیدری کا مصنفہ تذکرہ تو نایاب ہے[۱]، لیکن مرزا علی لطف کے تذکرہ 'گلشنِ ہند' کو مولوی عبداللہ، مہتمم کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد (دکن) نے ۱۹۰۶ء میں شائع کیا تھا، جس پر علامہ شبلی کی اصلاحات و تفصیلات درج ہیں اور جس کا مقدمہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ ناموں کی یکسانیت کے باعث یہ دونوں تذکرے غلطی سے ایک ہی کتاب سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن حیدری کا تذکرہ ۱۷۹۹ء میں مرتب ہوا تھا لیکن لطف کا ۱۸۰۰ء میں۔ لطف کا تذکرہ 'گلزارِ ابراہیم'

---

[۱] اب اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۶۰ء میں مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔

یہ مختصر انتخابی ترجمہ ہے، جس میں صرف ستّر شعراء کا تذکرہ ہے ۔ حیدری کے تذکرے میں دیگر تذکروں کی مانند شعرائے کے حالات مختصر و نامکمل ہیں اور نمونہ ہائے کلام نے ساری جگہ لے لی ہے ۔ حیدری کے تذکرے کی ایک نقل آکسفورڈ کی انڈین انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ ڈاکٹر ڈنکن فوربز DUNCAN FORBES نے (جن کی اُردو ڈکشنری مشہور ہے) بھی اپنی مشرقی کتابوں کی فہرست کتب BIBLIOGRAPHY OF ORIENTAL WORKS میں اس کا حوالہ دیا ہے ۔ برٹش میوزیم، لندن، کی لائبریری میں بھی "گلدستۂ حیدری" کے چھٹے حصے کے طور پر، حیدری کے "گلشنِ ہند" کا یہ نامکمل مسوّدہ موجود ہے ۔

یہ بیان نامکمل رہے گا اگر اُردو ادب کی ایک اور ابتدائی اور نہایت اہم تصنیف کا ذکر نہ ہوگا ۔ اُردو زبان کی یہ عجیب و غریب لسانیاتی کتاب سید انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی کی "دریائے لطافت" ہے ۔ ایک مسلمان ماہر لسانیات کی لکھی ہوئی یہ پہلی اُردو گرامر ہے ۔ یہ ایک نہایت بسیط و مکمل تصنیف ہے ۔ اُردو قواعد، محاورات و ضرب الامثال وغیرہ پر ایسی جامع کتاب نہ اس سے پیشتر کبھی لکھی گئی تھی اور نہ اب تک لکھی گئی ہے ۔ اُردو زبان کے محققین کے لیے یہ ایک لازم و ملزوم کارنامہ ہے ۔ اُردو زبان ایسی بے مثال اور معتبر محققانہ کتاب لکھنے کے لیے ہمیشہ سید انشاء کی مرہونِ منت رہے گی ۔ جب تک اُردو زندہ رہے گی اس کی زبردست افادیت قائم رہے گی ۔ اس زبردست علمی کارنامہ کی تحریر میں سید انشاء کو مرزا محمد حسن قتیل نے بھی مدد دی تھی ۔ یہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھی اور اسے مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی نے ۱۸۴۹ء میں اپنے مطبع آفتاب عالم تاب مرشدآباد سے شائع کیا تھا ۔ اس پر اصلاحات مومن تمدّن گوپاموی نے کی تھیں ۔ "دریائے لطافت" کا جو ایڈیشن "انجمن ترقی اُردو" نے شائع کیا ہے وہ ترمیم شدہ ۱۸۴۹ء والے ایڈیشن سے مرتب کیا گیا ہے ۔ (نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۳۵ء، لکھنؤ کی داستان گوئی، تذکرہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، نگار، مارچ ۱۹۲۸ء، خلیل علی خاں اشک اور ان کی تالیف "قصہ امیر حمزہ" کا تنقیدی مطالعہ از سید محمد قادری، مقدمات عبدالحق جلد دوم، مقدمہ باغ و بہار، از مولوی عبدالحق، ہندوستانی، الہ آباد ۱۹۳۲ء، میر امن اور باغ و بہار، از پروفیسر اعجاز، الہ آباد یونیورسٹی، نگار، اگست ۱۹۳۰ء، سید حیدر بخش حیدری، از سید محمد قادری حیدرآبادی، مقدمات عبدالحق، جلد دوم، سنہ ... مقدمہ دریائے لطافت، از مولوی عبدالحق) ۔

۲۲

جدید اُردو ادب

(ناول اور مختصر افسانے)

بعض مصنفین کا دعویٰ ہے کہ اُردو ناول کی ہیئت رو مُلا وجہی کی شاہکار نثر اُردو کی کتاب 'سب رس' ہے، جو فتاحی نیشاپوری کی منظوم کتاب 'دستورِ عشاق' سے ماخوذ ہے۔ اُردو کی پہلی ناول کا ڈھانچہ 'سب رس' ہی سے تیار ہوا تھا۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد اُردو میں طلسماتی داستانوں کا دور آیا۔ 'فسانۂ عجائب'، 'داستانِ امیر حمزہ'، 'الف لیلہ'، 'طلسم ہوشربا'، 'بوستانِ خیال'، 'باغ و بہار'، 'لیلیٰ مجنوں' اور 'حاتم طائی'، وغیرہ۔ جب 'بوستانِ خیال' اور 'طلسم ہوش رُبا' کی بظاہر دلچسپ داستانوں سے لوگوں کا دل بھر گیا اور ان کے ذوقِ مطالعہ میں تبدیلی واقع ہوئی، تو ناول نگاروں کو اس تبدیلی کی وجوہات پر غور کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی ان داستانوں میں اصلیت و حقیقت کے فقدان کے باعث ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو خالص خیال آرائی میں دلچسپی نہ رہی کیونکہ خیال آرائی کی عمارت بھی حقیقت و واقعہ نگاری کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیئے۔ لیکن 'الف لیلہ' نسبتاً ان سے مختلف تھی کیونکہ اگرچہ اس میں محیر العقول اور مافوق الفطرت کہانیاں موجود ہیں، تاہم اس کی اکثر کہانیوں میں انسانی فطرت کے مطالعہ کا مواد ملتا ہے جو ہر ناول نگار کا مطمحِ نظر ہونا چاہیئے۔

سر سید احمد خاں کے ساتھ اُردو ادب کا وہ دور شروع ہوا اس کی تاریخ ۱۸۵۰ء سے متعین کی جاتی ہے اور جو دورِ جدید تک جاری رہا حتّٰی کہ وہ انقلابی ترقی پسند ادب سے متصادم ہوا۔ بد قسمتی سے علامہ حافظ نذیر احمد کو وہ مقامِ تحسین حاصل نہ ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ جدید اُردو ناول کے پہلے کامیاب مصنف تھے۔ جہاں تک کہ کردار نگاری اور نفسیاتی ترجمانی کا تعلق ہے، اُن کا مقام پریم چند سے بھی اوپر ہے۔ اس لحاظ سے نذیر احمد کی نہایت کامیاب ناول 'فسانۂ مبتلا' ہے۔ اس کے بعد مرزا رجب علی بیگ سرور نے جو پودا لگایا تھا اس میں برگ و بار پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ناولوں سے آئے۔ عبد الحلیم شرر نے سر والٹر اسکاٹ SCOTT. W سے متأثر ہو کر اُردو ادب میں تاریخی ناولوں کو متعارف کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے لوگوں کے ادبی ذوق میں تبدیلی رُونما ہوئی۔ اس طرح جدید اُردو ناول تدریجی ارتقا کا نہیں

...نشدد آمیز تاریخی انقلاب کا نتیجہ ہے، جس نے برِّصغیر میں برطانوی راج قائم کیا اور لوگوں کو مغربی لٹریچر سے متعارف کیا۔ مولوی حافظ نذیر احمد جدید اُردو کے پہلے ناول نگار تھے جنھوں نے اپنے نہایت مقبول ناولوں (مراۃ العروس، بنات النعش، اور توبۃ النصوح، وغیرہ) کے ذریعہ سے اُردو ادب میں وہ راہ ہموار کی جس پر چل کر سرشار و شرر نے شہرت و ہر دلعزیزی حاصل کی۔ بلاشبہ نذیر احمد، سرشار اور شرر کے ناولوں میں سائنٹفک اغلاط اور کمزوریاں ہیں، بلکہ بعض نقاد جدید نقطۂ نظر سے سرشار کو ناول نگار تسلیم کرنے میں بھی تامّل کرتے ہیں، یہ ایں ہمہ یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ہی اپنے پیروؤں کے لیے ...بت شاندار آغاز کیا تھا۔ شرر خاص طور پر اپنے تاریخی ناولوں کے باعث معروف ہیں، لیکن وہ ملک میں ...یم زمانے کی معاشرتی و ثقافتی زندگی کی صحیح و کامیاب عکاسی کرنے میں ناکام رہے۔ مزید برآں ان کے ...نفرادیت سے محروم ہیں۔ شرر کے معاصرین، اور ان کے بعد کے ناول نگاروں میں معدودے چند ...میابی و مقبولیت حاصل کر سکے۔ ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں:- مولوی بشیر الدین احمد، مولانا راشد الخیری ...م محمد علی خاں، سُدرشن، مرزا عظیم بیگ چغتائی، منشی پریم چند اور مرزا محمد ہادی رُسوا۔

مولوی بشیر الدین احمد اور مولانا راشد الخیری نے مولانا حافظ نذیر احمد کے اتباع میں معاشرتی ناول ...ری کی۔ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے بعد ناول نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی، لیکن ناکام رہے ...ریخی ناول نویسی میں کامیاب رہے، مثلاً ان کی "فردوسِ بریں"، "منصور موہنا"، "ملک العزیز ورجنا"، ...نور انا ورنڈا"، وغیرہ۔ شرر سوشل ناول نگاری میں ناکام رہے۔ اس میدان میں حکیم محمد علی خاں کو قدرے ...میابی ہوئی۔ لیکن سائنٹفک خطوط پر جدید اُردو ناول کے اصلی خالق مرزا محمد ہادی رسوا تھے، جن کے ...در مولانا نذیر احمد اور سرشار دونوں کی خصوصیاتِ نگارش جمع ہو گئی تھیں۔ خارجی موضوعات پر خامہ فرسائی ...رنے کے بجائے، رُسوا نے بھی مشہور انگریز ناول نویس ٹھیکرے THACKERAY کی طرح، اپنے ...ن صحیح اُصولوں اور مسلّمہ اسالیبِ ادب پر تحریر کیے۔ مرزا رُسوا کا شاہکار "امراؤ جان ادا" اس لحاظ سے ...ترین اُردو ناول تسلیم کیا گیا ہے۔

منشی سجاد حسین کا نام بھی اُردو کے اُن ناول نگاروں کی فہرست میں شامل کرنا ضروری ہے جنھوں نے نذیر احمد اور سرشار ...ہ پر چل کر جدید اُردو ادب کو مالا مال کیا۔ مذکورہ صدر تمام اردو ناول نگاروں کی جدید اردو ادب کی ترقی کیلئے مساعی کے باوجود اردو ...میں جدید تکنیکی خطوط پر مبنی عمدہ سوشل ناولوں اور مختصر افسانوں کا فقدان بُری طرح محسوس ہوتا تھا۔ جدید اُردو ...ریچر میں اس خلا کو بنارس کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے ایک غیر معروف ہندو اہلِ قلم ...دھنپت رائے نے پُر کیا جو دُنیائے اُردو ادب میں منشی پریم چند کے نام سے مشہور ہوئے۔

اگر عام مقبولیت کو کسوٹی قرار دیا جائے تو شرر و سرشار اپنے زمانے کے دو نہایت ہر دلعزیز اردو ناول نگار ہوئے ہیں۔ حکیم محمد علی کے ناول البتہ ایک محدود حلقہ میں پسند کئے جاتے تھے، جو صناعی و خارجی فنکاری کا قدردان تھا۔ مگر شرر اور سرشار اردو ناول کے مدارس فکر بن گئے، خصوصاً سرشار کا 'فسانۂ آزاد'، تو اکثر مبتدی ناول نویسوں کا ماخذ بن گیا۔ حکیم برہم اور برج نرائن چکبست دونوں نے 'فسانۂ آزاد' کی تنقیص کر کے نہایت بے انصافی سے کام لیا ہے، خصوصاً چکبست جنھوں نے ماہنامہ 'زمانہ' کانپور میں اپنے ایک مضمون میں اس حد تک لکھ دیا کہ "سرشار ہندو کی زندگی اور سوسائٹی کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے"، حالانکہ سرشار خود ہندو تھے۔

انسانی فطرت کا ادراک ہی ادب میں لافانی شہرت کا حامل ہوتا ہے اور سرشار کی عظمت اسی سبب سے ہے کہ وہ اس صفت سے بہرہ ور تھے۔ شرر بھی اس صفت سے یکسر محروم نہ تھے۔ لیکن ذہنی اعتبار سے سرشار یقیناً شرر پر فائق تھے۔ جبکہ سرشار کردار نگاری میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور اس ضمن میں ان کی تنوع نگاری مشہور ہے، شرر کے تمام ہیرو ایک ہی سانچے سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شرر کے اسلوب بیان میں ناپسندیدہ یکسانیت ہے اور ان کا طائرِ فکر بلند پرواز نہیں ہے۔ مزید یہ کہ شرر اپنی قوتِ مشاہدہ کو بہت کم بروئے کار لاتے ہیں اور اپنے ذاتی تعصبات سے پلاٹ میں مداخلت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس سرشار مکمل طور پر اپنے کرداروں کے عقب میں روپوش ہو جاتے ہیں اور اپنی ذات کو ان کے اندر ضم کر دیتے ہیں۔ شرر کے اکثر ناول تاریخی نوعیت کے ہیں۔ اپنے غیر تاریخی ناولوں میں، سوائے 'دلچسپ'، کے وہ ناکام رہے ہیں۔ 'دلکش'، 'بدر النساء کی مصیبت' اور 'میوۂ تلخ' کو شرر کے نام سے منسوب کرنا ان کی توہین کرنا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی ناولوں میں جو بات نہایت خطرناک ہے وہ یہ کہ صحیح تاریخ کا فسانہ پر گمان ہوتا ہے اور افسانہ کو بعض اوقات لوگ تاریخ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

یہ تصویر کا محض ایک رُخ تھا۔ دوسرے رُخ میں شرر کو سرشار پر اس بارے میں برتری حاصل ہے کہ شرر پلاٹ کی ترتیب کے معاملے میں سرشار پر فائق تھے۔ دیگر اُمور میں سرشار شرر سے بازی لے گئے ہیں۔ اپنی غیر معمولی قوتِ تخلیق اور بے مثال انفرادیت کے باعث سرشار کے اسلوب کی نقل کرنا سخت دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرشار کے یہ اوصاف ہمہ گیر نہ ہو سکے۔ بعض مصنفین نے سرشار کے اندازِ بیان کو اپنانے کی کوشش کی لیکن اُنھوں نے بُری طرح ٹھوکر کھائی۔ اس کے برعکس شرر کا اسلوب آسان اور سادہ ہے اور نقل کیا جا سکتا ہے۔ سرشار کی کہانیاں مزاح اور تفریح کی کانیں ہیں۔ اس نہج پر بھی

شرر سرشار سے پیچھے ہیں۔ مختصر یہ کہ شرر اور سرشار دونوں جدید اردو ناول کے دو مستحکم ستون ہیں۔

پریم چند ایک عظیم اردو ناول نگار تھے۔ اُن کے مداح کہتے ہیں کہ اردو ناول کے ارتقاء کے میدان میں اُن کے ناول ان کے معاصرین کے ناولوں کے مقابلے میں ایک صدی آگے ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقہ کی ترجمانی و کردار نگاری کی ہے۔ یہ ہمہ گیری و تنوع، سرشار کے بعد کسی اور ناول نویس کے ہاں پائے نہیں جاتے۔ پریم چند سے پہلے اردو ادب میں ہندوؤں کے درمیانی طبقہ کی گھریلو زندگی کی عکاسی کا مکمل فقدان تھا۔ سرشار کے ہیرو عام طور پر مسلمان ہیں اور ان کا نقطۂ نظر اسلامی ہے۔ اس کے برعکس پریم چند ہندوؤں اور ان کی معاشرت کی ترجمانی کرتے ہیں، کیونکہ وہ اردو زبان و ادب کو محض مسلمانوں کی جاگیر نہیں سمجھتے تھے۔

عہدِ جدید میں اردو ناول میں ایک اور رجحان قابلِ لحاظ ہے، یعنی ایک بازاری عورت کی زندگی کی عکاسی۔ ایسے ناولوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کا تعلق اُن طوائف کی زندگیوں اور حالات سے ہے جو 'ڈیرے دار' کہلاتی تھیں، گاتی اور ناچتی تھیں، اور ان کے نجی تعلقات ماہانہ معاوضہ پر قائم تھے جن میں نسبتاً باقاعدگی و استقامت تھی۔ اس دور کا بہترین ناول 'نشتر' ہی ہے، جس کا مصنف غالباً میر تقی میر کا ہمعصر تھا اور جس نے اپنی محبت کی یہ کہانی فارسی زبان میں نہایت دلفریب انداز میں تحریر کی تھی۔ سجاد حسین کسمنڈوی نے اس کو اردو زبان میں ترجمہ کیا، جو اردو کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کی مخصوص طرز بہترین مغربی ناولوں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہے۔ اس کا اصل فارسی ناول کا آج تک پتہ نہ چل سکا۔ اس کی ٹریجڈی، 'وردر' WERTHER کے المیہ سے کسی طرح کم المناک و اثرانگیز نہیں ہے۔

انہی ڈیرے دار طوائف کی زندگیوں پر مشتمل دوسرے دور کے ناولوں میں بہترین ناول مرزا رسوا کی 'امراؤ جان ادا' ہے۔ ان دونوں ادوار میں فرق یہ ہے کہ پہلے دور کی طوائف خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتی تھیں اور ہمیشہ سفر اور گردش میں رہتی تھیں، جبکہ دوسرے دور میں وہ شہروں کے پُرامن ماحول میں گھروں کے اندر آباد ہو گئی تھیں۔ علاوہ ازیں ان دونوں ادوار کے ناولوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جبکہ پہلے دور کی کسبی کسی چاہنے والے کی پابند ہوتی تھی، تو دوسرے دور کی طوائف پیشہ ور ہو گئیں۔ 'امراؤ جان ادا' کے بعد اس دوسرے دور کا بہترین اردو ناول پریم چند کا 'بازارِ حسن' ہے۔

تیسرے دور کی طوائف کا بہترین ترجمان اردو ناول قاضی عبدالغفار کا 'لیلیٰ کے خطوط' ہے۔ 'امراؤ جان ادا' کی نسبت اس دور کی عورت اپنے مرد کو بہتر طور پر سمجھنے لگی ہے۔ مگر امراؤ جان ادا کے برعکس،

اس دَور کی قحبہ نے خود کو محض تقدیر کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ اُس کے معاشرے نے اُس کے ساتھ جو بے انصافی برتی ہے اس کا وہ احساس رکھتی ہے۔ جبکہ 'اُمراؤ جان ادا' اس احساس سے معرّا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی عبدالغفار کے اس ناول نے اُردو ادب میں 'ترقی پسندی' کے نقطۂ نظر کو متعارف کیا اور اُردو ناول کے اصلاحی دَور کو پسِ پشت ڈال دیا۔ افسوس کہ 'لیلیٰ کے خطوط' کی عظیم کامیابی و شہرت کے بعد قاضی عبدالغفار کی بعد کی ادبی کاوشیں 'مجنوں کی ڈائری' وغیرہ قطعی ناکام رہیں۔

طوائف کی زندگی کے بیان کے حامل ناولوں کے برعکس وہ اُردو ناول جو باقاعدہ خانگی زندگی کی برکات کی ترجمانی کے لیے لکھے گئے، کامیاب نہ ہوئے کیونکہ بعد کے اہلِ قلم نذیر احمد کے مقرر کردہ معیار تک نہ پہنچ سکے۔ اس دَور کا بہترین ناول غالباً 'خوابِ کلکتہ' ہے۔ مولانا راشد الخیری نے عورت کے مصائب کی حمایت میں جس مبالغہ آمیز ہمدردی کا اپنے ناولوں 'شامِ زندگی' وغیرہ میں اعادہ کیا ہے وہ غیر فطری، بے حقیقت اور بے اثر ہے۔ سہ ماہی رسالہ 'اُردو' میں اس طرزِ تحریر کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے۔ بہ ایں ہمہ دورِ جدید میں دہلی کا ادبی وقار مولانا راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی نے قائم رکھا۔ اس لحاظ سے لکھنؤ میں اس میدان کے مرد ظفر الملک، مرزا عسکری اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب تھے۔

دَورِ جدید میں ناول کے مقابلے میں مختصر افسانوں پر زیادہ کام ہوا ہے۔ اُردو کے بہترین مختصر افسانہ نگاروں کے نام یہ ہیں:۔ پریم چند، نیاز فتحپوری، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، قاری سرفراز حسین، اعظم کریوی، آغا حیدر حسن دہلوی، امتیاز علی تاج، ذوقی، رفیعی اجمیری، سُدرشن، سلطان حیدر جوش، عبدالعزیز فلک پیما، لطیف الدین احمد، مجنوں گورکھپوری، ایم اسلم، احمد شاہ بخاری پطرس، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، علی عباس حسینی، اُپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، محمد حسن عسکری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، کرشن چندر اور غلام عباس وغیرہ۔

['مخزن'، لاہور، دسمبر ۱۹۰۶ء 'نثر و سرشار' از مرزا محمد سعید، 'عالمگیر' لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۷ء 'اُردو نثر پر ایک نظر' از پروفیسر مولانا محمد طاہر فاروقی۔ 'ترقی پسند ادب'، از عزیز احمد، رزاقی پریس، حیدرآباد دکن، مارچ ۱۹۴۵ء ص ۴۸-۲۲۱]

(۳۴)

اُردو کے مشہور اہلِ قلم

(۱)

نہال چند لاہوری

نہال چند پیدا تو دہلی میں ہوئے تھے لیکن لاہور میں جا بسے تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، سے منسلک ہو گئے تھے، جہاں اُنھوں نے ایک فارسی کہانی کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور مذہبِ عشق، اس کا نام رکھا تھا، جو گُل بکاولی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔ یہ ترجمہ اُنھوں نے ۱۸۰۲ء میں کیا تھا۔ فارسی میں اس کہانی کو شیخ عزت اللہ بنگالی نے تحریر کیا تھا (متوفی ۱۸۱۲ء)۔ اس کہانی نے تین چولے بدلے ہیں۔ پہلے پہل اس کو فارسی میں لکھا گیا، پھر نہال چند لاہوری نے اس کا اُردو نثر میں ترجمہ کیا، اور آخر میں پنڈت دیا شنکر نسیم نے اس کو اُردو نظم میں منتقل کیا اور اس کا نام ؛مثنوی گلزارِ نسیم، رکھا۔ ہر چند کہ نہال چند لاہوری کی اُردو نثر میں اس کہانی کو اب ۱۸۰ سال گذر چکے ہیں مگر یہ ہنوز مقبولِ عام ہے۔

(۲)

میر امّن دہلوی

میر امّن کے تخلص امّن اور لطف تھے۔ جب احمد شاہ درانی نے دہلی کو فتح کیا تو میر امّن دہلی سے عظیم آباد چلے گئے، جہاں سے وہ کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں منشی میر بہادر علی نے ان کا تعارف ڈاکٹر جان گلکرائسٹ سے کرایا، جنھوں نے میر امّن کو فورٹ ولیم کالج میں بطور منشی مقرر کر دیا۔ میر امّن آسان اُردو نثر میں ؛قصّہ چہار درویش، کے مترجم ہیں جو ؛باغ و بہار، کے نام سے مشہور ہے اور جو اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میر امّن پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو نثر کے روایتی مغلق، دشوار اور استعارات سے پُر طرزِ بیان کو ترک کر کے اس کہانی کو صاف، سادہ، آسان اور دہلی کی رائج الوقت بامحاورہ زبان میں تحریر کیا۔ ؛باغ و بہار، ۱۸۰۲ء میں ترجمہ کی گئی تھی۔

(۳)

مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی

سرور (متوفی ۱۸۶۳ء) شاعر بھی تھے اور صاحب دیوان بھی۔ وہ آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے ان نثری کارناموں کے باعث مشہور ہیں: "شگوفۂ محبت"، "گلزار سرور"، "انشائے سرور"، "سرور سلطانی"، اور "فسانۂ عجائب"۔ لیکن سرور کی شہرت مؤخرالذکر کتاب کے باعث ہوئی سرور کے "فسانۂ عجائب" کی عسیرالفہم، دشوار اور اُلجھی ہوئی زبان نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی ادبی سوسائٹی خصوصاً میرامن دہلوی کی مروجہ سادہ اور آسان اردو نثر کو اُس وقت تک پنپنے نہ دیا جب تک کہ مرزا غالب کی اُردو مراسلت کی تحریریں منظرِ عام پر نہ آگئیں۔ سرور کا یہ طرزِ بیان لکھنؤ میں "اُردوئے معلّٰی" کہلاتا تھا، جو دہلی کی "اُردوئے معلّٰی" کی ضد تھا۔ اوّل الذکر لکھنوی اسلوبِ نثر نے عرصے تک دہلی کے ادیبوں کی آنکھیں بھی خیرہ کئے رکھیں۔

(۴)

مرزا غالب

۱۷۹۶ء — ۱۸۶۹ء

غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں پہلے تو اودھ کے نواب آصف الدولہ اور نواب نظام علی خاں کے درباروں سے منسلک رہے۔ اس کے بعد وہ راجہ بختاور سنگھ کی فوجی ملازمت سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ ایک جنگی معرکہ میں کام آئے۔ غالب خود اپنی فارسی کی قابلیت کے مقابلے میں اپنی اُردو شاعری اور ادبی اہلیت کو کمتر درجہ کی سمجھتے تھے، جس کا اظہار اُنھوں نے ایک مرتبہ اس طرح کیا تھا "بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است"۔ لیکن اُس وقت وہ اس امر سے ناواقف تھے کہ جس شے کو وہ "بے رنگ" باور کرتے تھے وہی ان کی عظمت کا سبب بن جائے گی۔ غالب سے پیشتر، مراسلت کی عام زبان یا تو فارسی تھی یا "فسانۂ عجائب" کی ناقابل فہم اور پُرپیچ اُردو زبان، جس کا غالب نے، اپنی خط و کتابت سے قطع نظر، خود بھی اتباع کیا تھا۔ لیکن غالب نے اپنی مراسلت کے لیے جو طرزِ نگارش اختراع کیا وہ دوٹوک، سادہ، آسان، سہل اور مکالمہ کے انداز پر تھا۔ غالب کی نثر کے اس اسلوب کو آج تک کوئی بھی کامیابی کے ساتھ نقل نہ کر سکا۔ البتہ آزاد کا طرزِ نگارش بہت کچھ اُنھی خطوط پر ہے۔ غالب کا پورا نام مرزا اسداللہ خاں

تھا۔ وہ پہلے اسد تخلص کرتے تھے پھر غالب کرنے لگے۔ وہ آگرے میں پیدا ہوئے اور شادی ہونے تک وہیں رہے، پھر دہلی آ گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ اُن کی وفات دہلی میں ہوئی اور وہیں مدفن ہے۔ غالب فارسی زبان کے ماہر کامل تھے اور بے مثال شاعر۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔

(۵)

علامہ شررؔ لکھنوی

۱۸۶۰ء — ۱۹۲۶ء

علامہ عبدالحلیم شررؔ لکھنوی ضلع بارہ بنکی (یوپی، انڈیا) میں ایک مقام کرسی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین عباسی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے تھے۔ شاعری میں شررؔ نظم طباطبائی کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے اپنا معروف ماہنامہ 'دلگداز' لکھنؤ سے جنوری ۱۸۹۱ء میں جاری کیا تھا۔ حیدرآباد دکن کی ملازمت کے دوران میں ان کے ہمکار وہاں مولوی عزیز مرزا اور مولانا ظفر علی خاں تھے۔ شررؔ اردو کے مشہور تاریخی ناول نگار ہوئے ہیں، جن میں سے معروف ترین ناول حسب ذیل ہیں:۔
'ملک العزیز ورجینا'، 'ایامِ عرب'، 'فردوسِ بریں'، 'فلورا فلورنڈا'، 'ماہِ ملک'، 'تاریخ سندھ'، 'عصرِ قدیم'، 'سیرتِ نبیؐ کریم'، وغیرہ۔ گیلانی پریس، لاہور، نے شررؔ کے تمام مضامین کا مجموعہ تیرہ جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ ان کے ناول 'حسن کے ڈاکو' اور 'دلچسپ' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ شررؔ کے متفرق مضامین 'مضمونِ پارۂ دل' اور 'مضامینِ شررؔ' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

(۶)

حکیم محمد علی خاں لکھنوی

حکیم محمد علی خاں ہردوئی (یوپی۔ انڈیا) کے طبیب تھے، جہاں سے وہ شررؔ کے ماہنامہ 'دلگداز' کے مقابلے میں ایک ادبی ماہنامہ اردو میں 'مُرقعِ عالم' کے نام سے شائع کیا کرتے تھے۔ وہ تاریخی ناولوں کے میدان میں شررؔ کے حریف تھے اور ان کا طرزِ تحریر شررؔ کے اسلوب کے

مقابلے میں زیادہ خوشگوار تھا۔ان کے معروف ناول 'جعفروعباسہ' 'نیل کا سانپ' اور 'عبرت' (تین جلدوں میں) وغیرہ تھے۔

(۷)

مولوی عزیز مرزا

مولوی عزیز مرزا دہلوی ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے انگریزی ادب اور تاریخ میں آنرز کا درجہ حاصل کرنے کا اعزاز پایا۔وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔وہ متعدد کتابوں کے مترجم اور مؤلف ہیں۔ان میں نواب محسن الملک کے انگریزی سفرنامہ کا اردو ترجمہ گلگت کے فرنگ اور کالیداس کے مشہور سنسکرت ڈرامہ وکرم اُرسی کا اردو ترجمہ ان سے ہمیشہ یادگار رہیں گے خیالات عزیز (مضامین ومقالات کا مجموعہ) سیرۃ المحمود بھی ان کی تالیفات میں سے ہے۔۱۹۰۸ میں اردو کا تمغہ قیصرِہند عطا ہوا۔

(۸)

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

۱۸۴۶ء ــــ ۱۹۰۲ء

سرشار ایک کاشمیری برہمن تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔شروع میں وہ 'اودھ اخبار' کے ایڈیٹر تھے۔بعد کو اُنھوں نے اپنا ذاتی اُردو میگزین 'خمکدۂ سرشار' کے نام سے جاری کیا تھا۔اپنی زندگی کے آخر میں وہ حیدرآباد (دکن) چلے گئے تھے جہاں وہ شراب نوشی کی زیادتی کے باعث فوت ہوگئے۔وہ اُردو کی افسانہ نویسی میں ایک طرزِ جدید کے بانی اور اُردو نثر کے جدید لکھنوی مدرسۂ فکر کے خالق تھے، جو 'فسانۂ عجائب' کی مشکل زبان کے مقابلے میں آسان وسادہ طرزِ تحریر کا علم بردار تھا۔سرشار کی بعض تصانیف 'سیر کہسار' 'جامِ سرشار' اور 'فسانۂ آزاد'۔مؤخرالذکر ان کی بہترین تصنیف ہے جس نے بڑی مقبولیت پائی۔لیکن 'فسانۂ آزاد' بھی مخالف تنقید سے نہ بچ سکی، جس پر یہ الزام ہے کہ وہ ناول کے فنی خصائص سے محروم ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ عظیم اُردو کارنامہ اُس

وقت کی لکھنوی سوسائٹی کا ایک نہایت معتبر اور چلتا پھرتا مُرقع ہے۔ سرشار کے بعض دیگر ادبی کارنامے ’خدائی فوجدار‘، ’کرم دھم‘، ’پی کہاں‘ اور ’بچھڑی دولھن‘ وغیرہ۔

(۹)

سرسید احمد خاں

(دہلی ۱۸۱۷ء — علی گڈھ ۱۸۹۸ء)

اُن کا نام سید احمد تھا۔ ’خاں‘ کا خطاب مُغل شہنشاہیت اور ’سر‘ کا اعزاز برطانوی حکومت سے ملے تھے۔ اُنھوں نے زندگی کا آغاز ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے کیا تھا مگر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں ترقی کرکے سب جج بن گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اُنھوں نے خود اپنی جان پر کھیل کر متعدد انگریز دل اور ان کے بیوی بچوں کی جانیں بچائی تھیں۔ سرسید اپنے بڑے بیٹے سید محمود کے ساتھ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تھے۔ ہندوستان کو واپسی کے بعد اُنھوں نے علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں ’محمڈن اینگلو اورینٹل کالج‘ قائم کیا تھا۔ اس کے ایک سال کے بعد وہ سرکاری ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوگئے اور پھر اُنھوں نے اپنی باقی زندگی ہندی مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ وہ دہلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا اور ۱۸۹۸ء میں علی گڈھ میں فوت ہوئے تھے۔ سرسید احمد خاں عظیم الشان ذہانت کے مالک تھے۔ وہ مصلح بھی تھے، منتظم بھی، اور غیر معمولی اہلیت کے اہلِ قلم بھی۔ بطور اُردو اہلِ قلم کے، ۱۸۵۷ء کے بعد، اُنھوں نے اُردو نثر نگاری میں ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی جو سادگی پر مبنی تھا اور اس طرح وہ جدید اُردو ادب کے زبردست محسنین میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی بے شمار تقاریر اور متعدد رسائل و تصانیف نے اُردو ادب کی وسعت و مقبولیت کو بڑی ترقی دی۔ ان کے شاہکار یہ ہیں:- ’آثار الصنادید‘، ’اسبابِ بغاوتِ ہند‘، اور ان کے مضامین کا مجموعہ بعنوان ’تہذیب الاخلاق‘

اُردو نثر کا جدید انقلابی دور سرسید احمد خاں ہی سے شروع ہوا۔ ’آثار الصنادید‘ کو ابتدا میں مولانا امام بخش صہبائی نے مشکل زبان میں تحریر کیا تھا لیکن سرسید نے اسے دوبارہ آسان زبان میں ۱۸۴۷ء میں لکھا۔ ۱۸۴۸ء میں سرسید نے ’تاریخ بجنور‘ لکھی۔ اس وقت تک اردو ہندوستان میں عدالتی زبان بن چکی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں سرسید نے اپنی مشہور ’سائنٹفک سوسائٹی‘ کی بنیاد ڈالی، اور ۱۸۷۰ء میں ’تہذیب الاخلاق‘ نامی میگزین کی۔ ’علی گڈھ تحریک‘ میں سرسید کے شرکائے خاص کے اسمائے گرامی: خواجہ حالی،

مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ۔ سرسید کی دیگر تصانیف "خطبات احمدیہ" اور "مسلمانوں کی پولٹیکل پالیسی" تھیں۔

(۱۰)

مولوی محمد حسین آزاد دہلوی

(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۰ء)

آزاد مشہور دہلی کالج کے ایک طالب علم رہے تھے۔ چونکہ اُن کی والدہ ایک ایرانی خاتون تھیں لہذا فارسی ان کی مادری زبان تھی اور وہ عربی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ کرنل ہولرائڈ HOLROYDE کی زیر پرستی اور حالی کی اعانت سے آزاد نے ہی جدید اُردو شاعری کی بُنیاد ڈالی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں آزاد کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا تھا۔ ہر چند کہ آزاد کو سرسید کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا پھر بھی وہ سرسید کی پارٹی کے اہلِ قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ آزاد کی مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:۔ "جدید اردو پرائمر"، "قصصِ ہند"، "رسومِ ہند"، "نیرنگِ خیال"، "سخندانِ فارس"، "نگارستانِ فارس"، "دربارِ اکبری"، اور "آبِ حیات"۔ آزاد کا اسلوبِ تحریر سادہ، آسان اور اثر آفریں اُردو نثر کی بہترین مثال ہے، جس کے وہ بانی بھی تھے اور خاتم بھی کیونکہ اُن کے بعد آج تک اس طرزِ تحریر کو کوئی بھی کامیابی کے ساتھ نقل نہ کر سکا۔ آزاد کے والد محمد باقر نے دہلی سے ۱۸۵۶ء میں پہلا اردو اخبار نکالا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد آزاد دہلی سے حیدر آباد دکن چلے گئے تھے۔ دکن سے واپسی پر وہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے عربی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بدنصیبی سے آزاد دماغی امراض میں مُبتلا ہو گئے تھے اور اسی عالمِ دیوانگی میں ان کا ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔ آزاد شاعر بھی تھے، نقاد بھی، سوانح نگار بھی اور ایک موجدِ طرزِ نثر نگار بھی۔ لیکن ان کی تاریخ نویسی اور غیر متعصبانہ تنقید نگاری محلِ نظر ہے۔ اسی وجہ سے ان کے مورخانہ کارنامے "آبِ حیات"، اور "دربارِ اکبری" تاریخی اعتبار سے معتبر نہیں بلکہ محض ادبی تحریریں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کی کتاب "سخندانِ فارس" فارسی علم الالسنہ پر پہلی اور بے مثال اُردو کتاب ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب واحد اہلِ قلم ہیں جو کسی قدر آزاد کے طرزِ تحریر کو اپناتے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "آبِ حیات" کی طرزِ تحریر کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو:

"سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے

ہیں۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم وغصہ یا کسی قسم کے ذوق وشوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے اور وہ قوتِ بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے۔"

(۱۱)

پروفیسر ذکاء اللہ دہلوی

۱۸۳۲ء ـــ ۱۹۱۰ء

مولوی ذکاء اللہ نے بھی دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اُنھوں نے محکمۂ تعلیم میں ۳۷ سال تک ملازمت کی اور ۱۸۸۷ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ اُنھوں نے طبیعیات، جغرافیہ، ادب، تاریخ، اخلاقیات، اقلیدس اور مساحت وغیرہ پر ۱۴۲ کتابیں مُرتّب کی تھیں۔ جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے اُس وقت وہ میور سنٹرل کالج، الٰہ آباد میں پروفیسر تھے۔ اُن کی مصنفہ "تاریخ ہند" کی نو جلدیں بڑی تقطیع پر تقریباً سات ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ حکومت نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں اُنھیں "خان بہادر" اور "شمس العلماء" کے خطابات سے نوازا تھا۔ گو کہ مولوی ذکاء اللہ کی کتابوں کا ادبی معیار اتنا بلند نہیں ہے جتنا کہ اُردو کے سرسید اسکول کے کلاسیکی مصنفین (حالی، آزاد اور شبلی وغیرہ) کا تھا، لیکن تعداد اور افادیت کے لحاظ سے کوئی اور اُردو کا مصنف پروفیسر ذکاء اللہ کے معیار تک نہیں پہنچا۔ اُن کی کتابوں کو اُن کی ادبی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے جانچنا چاہیئے۔

(۱۲)

ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی

(۱۸۳۶ء ـــ ۱۹۱۲ء)

مولانا حافظ نذیر احمد ضلع بجنور (یو۔پی۔بھارت) میں پیدا ہوئے تھے لیکن وہ فوت دہلی میں ہوئے۔ وہ عربی و فارسی کے عالم و فاضل تھے اور انگریزی اور سنسکرت زبانیں بھی جانتے تھے۔ اُن کے والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ نذیر احمد نے بھی قدیم دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ انگریزی سے اُردو میں "مجموعہ قانون تعزیرات ہند" اور دیگر قانونی کتابیں ترجمہ کرنے کے صلے میں مولوی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے تھے اور حکومت نے اُنھیں شمس العلماء کا خطاب بھی دیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں سر سالار جنگ نے

اُنھیں بڑی تنخواہ پر حیدرآباد (دکن) بلالیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخر میں وہ حیدرآباد (دکن) کی ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوکر دہلی میں مستقلاً رہنے لگے تھے۔ اُنھیں اڈنبرا یونیورسٹی (انگلستان) نے ایل ایل ڈی کی اور پنجاب یونیورسٹی نے "ڈی او ایل" کی اعزازی ڈگریاں دی تھیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا مرتبہ اُردو کے مصنفین میں بہت بلند ہے۔ اُن کے خاص خاص ادبی شاہکاروں کے نام یہ ہیں: 'مرأۃ العروس'، 'بنات النعش'، 'ابن الوقت'، 'محصنات'، 'رویائے صادقہ'، 'ترجمان القرآن'، 'موعظۂ حسنہ' اور 'توبۃ النصوح'، آخر الذکر کتاب بہت مقبول ہوئی، جس پر حکومت نے ایک بھاری انعام عطا کیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے مذکورہ بالا اُردو ناولوں اور کتابوں کا اصل مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح تھی، بالخصوص مسلمان خواتین کی۔ ان کا شعری مجموعہ بھی طبع ہوگیا ہے، لیکن وہ شاعر کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں۔ اُن کی دینی تصانیف میں اُن کا اُردو ترجمۂ قرآن حکیم بعنوان 'جامع المصاحف' شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن سے بھی بہتر ہے۔ اُن کی دوسری دینی کتاب 'الحقوق والفرائض' (تین جلدوں میں) ہے، جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی تیسری مذہبی کتاب 'اجتہاد' ہے اور چوتھی 'اُمہات الاُمت'۔ مؤخر الذکر کتاب کی اشاعت پر اس کتاب اور اس کے مصنف کے خلاف علماء نے سخت احتجاج کیا اور یہ کتاب پبلک میں جلائی گئی۔

(۱۴)

مولوی چراغ علی

۱۸۴۴ء — ۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی میرٹھ (یوپی۔ انڈیا) میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ اسکول کی تعلیم تو مولوی چراغ علی کو کم میسر آئی تھی مگر اپنے نجی مطالعہ سے وہ زبردست عالم و فاضل بن گئے تھے۔ وہ ان زبانوں میں بخوبی گفتگو کرسکتے تھے: عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی، یونانی، عبرانی، کالدی اور اُردو۔ اِس طرح وہ ایک عظیم دانشور، متبحر عالم اور زبردست مفکر و ادیب تھے۔ شروع ہی سے وہ مذہب اور مذہبی مطالعہ میں دلچسپی لیتے تھے۔ خاص طور پر وہ اسلام کے خلاف عیسائی مشنریوں کے حملوں سے اپنے دین کی مدافعت میں دلچسپی لیتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں وہ علی گڑھ گئے، جہاں وہ سرسید احمد خاں کے پاس ٹھیرے۔ اس کے ایک سال کے بعد وہ ملازم ہوکر حیدرآباد (دکن) پہنچے جہاں ترقی کرکے وہ سیکریٹری خزانہ اور صوبائی گورنر بن گئے اور اُنھیں نواب اعظم یار جنگ کا خطاب

ملا۔ سرسید احمد خاں اور سید امیر علی کے بعد انہی انگریزی اور اُردو تصانیف کے ذریعہ سے مولوی چراغ علی نے اسلام کی زبردست مدافعت کی۔ ان کا بمبئی میں ۱۸۹۵ء میں مرض ذیابیطس میں انتقال ہو گیا۔ ان کی نہایت معروف تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ 'منشورِ محمدی' (اُردو)

۲۔ 'مخبرِ صادق' (اُردو)

۳۔ 'تعلیقات' (اُردو، لکھنؤ ۱۸۷۲ء۔ عیسائی مشنری امام الدین کی خلافِ اسلام کتاب "تاریخِ محمدیؐ" کا جواب)

۴۔ اسلامی 'جہاد' کی مدافعت میں انگریزی کتاب۔ جو اس موضوع پر لکھی ہوئی اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے بہترین کتاب ہے۔

۵۔ 'اسلام کی دُنیاوی برکتیں' (اُردو)

۶۔ 'قدیم قوموں کی مختصر تاریخ' (اُردو۔ اب نایاب ہے)

۷۔ 'العلوم الجدیدہ والاسلام' (اُردو۔ نامکمل) اور

۸۔ 'اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام' (انگریزی کینٹمپوریری ریویو Contemporary Review برائے اگست ۱۸۸۱ء میں شائع شدہ انگریزی مشنری میلکوم MALCOLM کے خلافِ اسلام انگریزی مضمون بعنوان "کیا اسلامی حکومت کے ماتحت ترقی ممکن ہے؟" Is Progress Possible under Islamic Govt? کا جواب)

(۱۴)

سیّد علی بلگرامی

۱۸۵۱ء ـ ۱۹۱۱ء

سید علی سید زین الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، جو بعد کو شمس العلماء، ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی کے بلند آہنگ نام سے مشہور ہوئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے عالم، فاضل شخص تھے۔ وہ لندن یونیورسٹی سے پاس شدہ علم طبقات الارض (Geology) میں انجینیر اور کلکتہ یونیورسٹی کے قانون میں گریجویٹ تھے۔ وہ حسب ذیل زبانیں جانتے تھے :۔ عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی،

ہندی، مراہٹی، تلوگو، گجراتی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور لاطینی۔ وہ حیدرآباد (دکن) میں ریلوے اور معدنیات کے محکموں کے سیکریٹری تھے۔ ۱۸۹۳ء میں اُنھیں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۲ء میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرار مقرر ہوئے۔ جس کے بعد وہ انڈیا آفس لائبریری، لندن، کے شعبۂ مسوداتِ دہلی کے محافظ catalogust بنادیئے گئے۔ اپنی زندگی کے آخر میں وہ ہردوئی (یوپی۔ انڈیا) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، جہاں اُن کی ۱۹۱۱ء میں رحلت ہوئی۔ اُنھوں نے ہی مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا دستور مُرتب کیا تھا۔ بدقسمتی سے اُن کی علمی تخلیقات اتنی نہیں ہیں جتنی کہ ان کی علمی قابلیت تھی۔ ان کی بہترین تصانیف کے یہ نام ہیں: ۔ 'تمدنِ عرب' 'تمدنِ ہند' (دونوں فرانسیسی مصنف موسیو لوبون MONS. LE BON کی فرانسیسی کتابوں کے اُردو تراجم ہیں) 'کلیلہ و دمنہ' پر ایک رسالہ۔ فارسی اور سنسکرت کا تقابلی مطالعہ ان کی تعلیمی اقدار کی روشنی میں 'طبی قانون' Medical juris prudence (ایک اُردو ترجمہ) اور 'ایلورا کے غاروں' (از بمبئی۔ بھارت) پر ایک رہنما کتاب۔ وغیرہ۔ ['حیاتِ جاوید' از مولانا الطاف حسین حالی۔ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ ۱۹۲۲ء 'سرسید اور ادب اُردو' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی، ماہنامہ 'کنول' آگرہ فروری ۱۹۳۷ء۔ ماہنامہ 'ہمایوں' لاہور، جون ۱۹۳۵ء 'نذیر احمد کی کہانی' از محمد خاں 'مقدمات عبدالحق' حصہ اوّل، مقدمہ 'حیاتِ نذیر' از مولوی سید افتخار عالم مارہروی 'مقدمات عبدالحق' حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۱ء]

(۱۵)

مرزا محمد ہادی رُسوا
(لکھنؤ ۱۸۵۸ء ۔ حیدرآباد دکن ۱۹۳۱ء)

مرزا رُسوا لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام آغا محمد تقی تھا۔ رُسوا عربی، فارسی، اُردو، ہندی، سنسکرت، انگریزی، عبرانی اور یونانی زبانیں جانتے تھے اور علم الکیمیا، ریاضی، ہیئت، منطق، فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے۔ اپنے تبحرِ علمی کے باعث مرزا رُسوا اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ وہ ایک عظیم ناول نویس تھے نیز شاعر۔ ناول کے علاوہ اُنھوں نے دیگر مضامین میں بھی خامہ فرسائی کی تھی۔ اُردو ادب پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن) کے دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے تھے۔ رُسوا بالخصوص اپنے اُردو ناولوں کے باعث مشہور ہیں، جن میں سے معروف ترین

ناول   یہ ہیں: "امراؤ جان ادا" (ان کا شاہکار)، "ذات شریف"، "طلسمات"، "افسانے راز"، "بہرام کی رہائی"، "خونی بھید"، "خونی جورو"، "شریف زادہ"، "خونی عاشق"، "خونی شہزادہ" اور "اختری بیگم"۔ شاعری میں اُنھوں نے دونوں تخلص مرزا اور رسوا استعمال کیے تھے۔ اُن کی مذہبی و فلسفیانہ تصانیف حسب ذیل ہیں:۔ "مصطلحات کیمیا"، "کتاب اخلاق ارسطو"، "افلاطون کی حکومت جمہوریہ"، "رسالہ در اُصول مناظرہ" اور "رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود" وغیرہ۔ ان کی شاعرانہ تخلیقات   "مرقع لیلیٰ و مجنوں"، "مثنوی لذت فنا"، "مثنوی بہار ہند"، "مثنوی نو بہار"، "مثنوی صبح اُمید"، "مثنوی اُمید و بیم" اور "کلیات اُردو" وغیرہ۔ شاعری میں رُسوا، اوج کے شاگرد تھے۔ [سرگزشت امراؤ جان ادا اور مرزا محمد ہادی رُسوا از سید محمود مورخ، ماہنامہ کنول آگرہ فروری ۱۹۳۶ء]

(۱۶)

مولوی اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

مولانا اکبر شاہ خاں (پیدائش ۱۸۷۶ء) نجیب آباد ضلع بجنور (روہیلکھنڈ، یوپی۔ انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی نادر شاہ خاں تھا۔ وہ عربی، فارسی اور اُردو کے بڑے عالم اور اسلام کے عظیم مورخ تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور اکبر تخلص کرتے تھے مگر اُن کی شہرت ایک مورخ اسلام ہی کی حیثیت سے ہوئی۔ اُنھوں نے طب کی تعلیم بھی پائی تھی لیکن اُنھوں نے اس کو بطور پیشہ کے اختیار نہیں کیا۔ دینی علوم پر اُن کا گہرا مطالعہ تھا اور وہ غیر پیشہ ور مبلغ اسلام تھے۔ اُنھوں نے بالخصوص ہندوؤں کی آریہ تحریک (شدھی) کے خلاف عملی حصہ لیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اُنھوں نے اپنا مشہور اُردو میگزین "عبرت" نامی نجیب آباد سے جاری کیا۔ اس کے دو سال کے بعد وہ لاہور آئے اور کیمبرج کالج میں فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے لاہور کے معروف ہفتہ وار اُردو اخبار "زمیندار" کی ادارت کی۔ ۱۹۲۳ء میں اُنھوں نے اضلاع علی گڑھ، بلند شہر اور متھرا وغیرہ کے مواضعات میں آریہ سماجی ہندو پرچارکوں کے خلاف اسلام کی مدافعت کی تھی (اس موقع پر یہ اضافہ غالباً بے محل نہ ہو کہ راقم الحروف بھی مولانا اکبر شاہ خاں کی اس تبلیغی جماعت میں ایک سب سے کم عمر رکن کی حیثیت سے شامل تھا)۔ اُنھوں نے نجیب آباد میں "مکتبۂ عبرت" کے نام سے ایک اسلامی تبلیغی مرکز بھی قائم کیا تھا۔ مولانا موصوف تاریخ اور دیگر اسلامی مضامین پر تیس سے زیادہ تصانیف کے مالک تھے۔ جن میں زیادہ معروف کے نام یہ ہیں:

تحریک اسلام ، تاریخ اسلام (متعدد جلدوں میں) ، آئینہ حقیقت نما ، قول حق ، مقدمہ تاریخ ہند اور نظام سلطنت وغیرہ ۔

(۱۷)

نواب سید نصیر حسین خیال عظیم آبادی

(۱۸۸۰ء - ۱۹۳۴ء)

نواب خیال پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے والد کا نام نواب سید نوروز حسین خاں تھا ۔ خیال نے اپنی ادبی زندگی شاعری سے شروع کی، جس میں وہ اپنے ماموں شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے ۔ وہ ماہنامہ ادیب، پٹنہ کے ایڈیٹر تھے ۔ اس کے بعد وہ کلکتہ کے مشہور فارسی جرنل حبل المتین کے نامور ایڈیٹر علامہ سید جلال الدین مؤید اسلام کے زیر اثر آگئے جو علامہ سید جمال الدین افغانی کے شریک کار رہے تھے ۔ ۱۹۰۶ء میں خیال نے کلکتہ میں شادی کی اور وہیں مستقلاً رہ گئے ۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے کلکتہ میں مسلم لیگ کی ایک شاخ کھولی ۔ ۱۹۰۹ء میں وہ ایم اے او کالج (جو بعد کو مسلم یونیورسٹی بن گیا) علی گڑھ کے ٹرسٹی مقرر ہوئے ۔ ۱۹۱۶ء میں سر سید علی امام وزیر اعظم حیدر آباد (دکن) نے انھیں اپنی کابینہ میں اعانت کے لیے اپنے پاس بلا لیا ۔ اسی سال ۲۴ دسمبر کو انھوں نے آل انڈیا اردو کانفرنس کے پہلے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جو لکھنؤ میں منعقد ہوا اور جس میں خیال نے اپنا وہ یادگار خطبۂ صدارت پڑھا جو شائع ہو گیا ہے ۔ اس کانفرنس میں علاوہ دیگر اکابر ملک کے گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی شرکت کی تھی ۔ ۱۹۲۰ء میں نظام حیدر آباد (دکن) نے نواب خیال کو انگلستان بھیجا ۔ ان کا مشہور مضمون "کیمبرج میں دو راتیں" اسی سال کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور ریوین کے اردو میگزین میں شائع ہوا تھا ۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے تمام یوروپ کا دورہ کیا اور وہ چھ ہفتے تک قاہرہ (مصر) میں ٹھہرے جہاں وہ سعد زغلول پاشا سے ملے تھے ۔ اس کے بعد وہ انقرہ (ترکی) گئے اور کمال اتاترک سے ملے ۔ واپسی کے بعد وہ کلکتہ میں ۱۹۲۴ء تک مقیم رہے ۔ اس کے دوسرے سال میر نواز علی خاں والیٔ ریاست خیر پور نے انھیں اپنے پاس بلا لیا ۔ سندھ سے کلکتہ کو واپسی کے بعد چراغ حسن حسرت، ایڈیٹر ماہنامہ آفتاب کلکتہ نے خیال کو دعوت دی کہ وہ دوبارہ اردو ادب کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیں ۔ ۱۹۲۹ء میں اپنی خرابیٔ صحت کے باعث انھیں کلکتہ چھوڑنا پڑا ۔ اس کے دوسرے سال وہ تہران (ایران) گئے

اور رضا شاہ پہلوی سے ملے۔ ایران سے واپسی کے بعد نواب خیال کشمیر گئے اور مہاراجہ سے ملے۔ ۱۹۳۱ء میں علی گڑھ میں اُنھوں نے اپنا مشہور مضمون 'ہماری شاعری' رقم کیا۔ خیال عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ ان کے مضامین 'ہمارے پانچ ملک الشعرا' (انگریزی) اور 'خالاؤں کا مارا آغا' (مزاحیہ) بہت مقبول ہوئے۔ اُنھوں نے 'داستانِ اُردو' کے نام سے اُردو ادب کی سیر حاصل تاریخ لکھی، جس کے باعث اُنھیں 'بہار کا آزاد' کا خطاب دیا گیا۔ ان کی مشہور مطبوعہ کتاب 'مغل اور اُردو' اُسی عظیم شاہکار کا ایک باب ہے۔ اُنھوں نے میر انیس کے مراثی پر مبنی بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ ان کا تیسرا شاہکار 'داستانِ عجم' ہے جسے 'شاد بُک ڈپو، پٹنہ' نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں 'شاہنامۂ فردوسی' ایران کا تاریخی کارنامہ شائع ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں اُنھوں نے 'ہندوستانی' کے نام سے اُردو اور ہندی زبانوں کو ملا کر برِ صغیر کے لیے ایک مشترک زبان بنانے کی مہم کا آغاز کیا۔ اُسی سال کے ماہ دسمبر میں وہ علی گڑھ سے اپنے دوست نواب کپتان حافظ سر احمد سعید خاں سے ملنے کے لیے چھتاری گئے جہاں وہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ [ماہنامۂ عالمگیر لاہور، ستمبر ۱۹۳۸ء۔ ماہنامہ کنول، آگرہ، ستمبر ۱۹۳۵ء۔ ماہنامہ نیرنگِ خیال، لاہور، مارچ ۱۹۳۵ء اور جنوری ۱۹۳۹ء]

(۱۸)

میر ناصر علی دہلوی

۱۸۴۷ء — ۱۹۳۳ء

خاں بہادر مولانا میر ناصر علی دہلوی کو بعض مصنفین نے 'اُردو نثر کا دوسرا آزاد' کہا ہے اور بعض دیگر اہل الرائے نے اُنھیں 'اُردو ادب کے آسکر وائلڈ' Oscar Wilde کا خطاب دیا ہے۔ یہ القابات اُنھیں صنفِ نسواں پر ان کے اقوال کے باعث ملے تھے، جن کا نمونہ ذیل میں پیش ہے:۔

"عورت بغیر چاہنے والے کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ جہاں یہ خود جان دینے کو تیار رہے، یہ چاہتی ہے کہ کوئی اُس پر بھی مرتا ہو۔ عورت میں محبت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں۔ محبت کے بغیر عورت جی نہیں سکتی، مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے۔"

افسوس کہ میر ناصر علی نے اپنی کوئی مستقل ادبی تصنیف نہیں چھوڑی۔ اُردو نثر میں ان کی جملہ تخلیقات

ان اُردو ماہناموں میں بکھری پڑی ہیں[1]: ۱۔ تیرھویں صدی ۲۔ زمانہ ۳۔ افسانۂ ایام ۴۔ ناصری، اور صلائے عام، وغیرہ۔ میر ناصر علی اپنے ان مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرنا چاہتے تھے مگر وہ ایسا کرنے سے قبل ہی فوت ہو گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ اُن کے لائق پوتے، انصر ناصری اپنے دادا کے اس ادبی ذخیرے کو مرتب و محفوظ کر رہے ہیں۔

سر سید احمد خاں کا مشہور اُردو میگزین تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اُس کا معاصر جریدہ میر ناصر علی کا رسالہ تیرھویں صدی تھا جو آگرے سے نکلتا تھا اور جس میں سرسید پر بیباک لیکن معقول تنقید ہوا کرتی تھی۔ خود سرسید بھی اس تنقید کو فراخ دلی سے سراہتے تھے۔ رسالہ تیرھویں صدی ساڑھے چار سال تک جاری رہا۔ ناصر علی کا دوسرا پرچہ زمانہ (آگرہ) تھا۔ غالباً اتنی ہی مزید مدت تک جاری رہا۔ ان کا تیسرا ادبی ترجمان ماہنامہ افسانۂ ایام (دہلی) تھا جس کے بند ہونے کے بعد ناصر علی نے اپنا چوتھا اُردو میگزین ناصری بھی دہلی ہی سے نکالا لیکن وہ بھی زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔ اُن کا پانچواں اور آخری جریدہ صلائے عام نامی تھا جو دہلی سے ۱۹۰۵ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ پرچہ چوبیس سال تک جاری رہا۔ اس درمیان میں اُن کی ادبی خدمات کے صلے میں انھیں خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔

میر ناصر علی کے والد کا نام مولوی سید ناصر الدین محمد ابوالمنصور تھا جو دہلی کے ایک مسلّمہ عالم و فاضل شخص تھے۔ ناصر علی حکومت ہند کے نمک کے محکمے سے منسلک تھے اور ۱۹۰۸ء میں فرخ نگر (ضلع گڑگاواں) سے پنشن پر فارغ ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ دہلی میں اعزازی مجسٹریٹ رہے (از ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۳ء) پھر وہ پنجاب کی ریاست پٹودی کے دیوان مقرر ہوئے (از ۱۹۱۳ء تا ۱۹۲۳ء)۔ ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان انھوں نے علم الکیمیا پر ایک اُردو کتاب لکھی تھی، جسے حکومت نے پسند کر کے ٹیکسٹ بک بنا دیا تھا۔ اُردو رسائل کے مضامین کے علاوہ انھوں نے اپنی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی (ماہنامہ ساقی، دہلی ۱۹۳۲ء "ناصر نمبر" خان بہادر میر ناصر علی پر ایک خاص اشاعت۔ نیرنگ خیال، لاہور سالنامہ جنوری ۱۹۲۹ء "میر ناصر علی دہلوی اور اُن کا لٹریچر" از مظفر حسین شمیم، سیکریٹری، انجمن ترقی اُردو، ہند، اورنگ آباد دکن)

(۱۹)

سیّد سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے رجسٹرار تھے، پھر وہ برطانوی حکومت ہند کے پولٹیکل ایجنٹ

---

[1] ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو، کراچی نے چھاپ دیے بعنوان "طنزیات و مقالات" مرتبہ محمد محی الدین بدایونی۔

رہے ، برطانوی سفارت خانہ بغداد میں ایک ڈپلومیٹ کی خدمات انجام دیں، ڈپٹی کلکٹر رہے ، اور جزائر انڈمان (کالا پانی) میں برطانیہ کی طرف سے کمشنر رہے ۔ وہ اردو، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبانیں بخوبی جانتے تھے ۔ وہ خاص طور پر ترکی زبان میں دلچسپی لیتے تھے ۔ وہ اردو نثر میں اُس خاص طرزِ تحریر کے بانی تھے جسے 'ادب لطیف' کہا گیا ہے اور اس آرٹ اور ٹیکنیک میں وہ نیاز فتحپوری سے بازی لے گئے تھے ۔ اُن کی ادبی تصانیف کے نام یہ ہیں : 'خیالستان' (ان کے مضامین کا مجموعہ) 'جلال الدین خوارزم شاہ' (مشہور ترک مصنف ناطق بے کمال کے تاریخی ڈرامہ کا اردو ترجمہ) 'ثالث بالخیر' (ایک اور ترک کہانی کا اردو ترجمہ) اور 'حکایات و احتساسات' ۔

(۲۰)

علامہ راشد الخیری دہلوی

۱۸۶۸ء ۔ ۱۹۳۶ء

مولانا راشد الخیری کے والد مولوی واحد حیدر آباد (دکن) میں محکمۂ آبکاری کے ایک افسر تھے ، جس میں مولانا راشد الخیری نے بھی ۱۹۰۸ء تک کام کیا تھا ۔ اُس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علامہ راشد الخیری نے کچھ عرصے تک شیخ عبدالقادر کے رسالہ 'مخزن' لاہور کو ایڈٹ کیا ۔ 'حیاتِ صالحہ' اُن کا پہلا ناول تھا جو اُنھوں نے ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا مگر وہ شائع ۱۹۰۲ء میں ہوا ۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا راشد الخیری نے شیخ محمد اکرم بیرسٹر کے اشتراک سے اپنا مشہور اردو میگزین 'عصمت' ، دہلی خواتین کے لیے جاری کیا تھا ۔ ۱۹۱۱ء میں اُنھوں نے ایک اور اردو ماہنامہ 'تمدن' کے نام سے جاری کیا تھا مگر وہ نقصان اُٹھا کر بند ہو گیا ۔ ۱۹۲۲ء میں علامہ موصوف نے 'تربیت گاہِ بنات' کے نام سے دہلی میں مسلمان یتیم لڑکیوں کے لیے ایک یتیم خانہ قائم کیا جو ان کی وفات کے بعد بھی مدت تک چلتا رہا ۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اردو کے ممتحن بھی رہے ۔ وہ ہندوستانی مسلم خواتین کی فلاح و بہبود کی خاطر اپنی خدمات کے لیے مشہور تھے ۔ وہ اردو کے حلقوں میں 'مصورِ غم' کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے اپنے ناولوں میں الم ناک حالات کی بڑے مؤثر پیرائے میں عکاسی کی ہے ۔ لیکن ان پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ ایک تو ان کے المیہ میں مبالغہ آمیزی کے باعث غیر فطری عنصر کا غلبہ ہے ، دوسرے اُن کی تحریروں میں ناپسندیدگی کی حد تک یکسانیت ہے ۔ مولانا خیری نے مولانا ڈاکٹر نذیر احمد کی دو

طرح سے پیروی کی سعی کی۔ خواتین کے ہمدرد و خیر خواہ کی طرح سے اور مسلمان خواتین کے حالات کو سدھارنے کی خاطر اپنی ناول نگاری سے۔ مولانا راشد الخیری نے اُردو نثر میں ۶۱ کتابیں لکھی تھیں جن سے اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کے بہترین ادبی کارناموں کی فہرست:۔ ”صبح زندگی“، ”شام زندگی“، ”شبِ زندگی“، ”نوحۂ زندگی“، ”درِ شہوار“، ”سرابِ مغرب“، ”بنت الوقت“، ”مودودہ“، ”منازل السائرہ“، ”فسانۂ سعید“، ”رودادِ قفس“، ”عروسِ کربلا“۔ اور ”سمرنا کا چاند“ وغیرہ ”بیلے میں میلہ“ اُن کی آخری کتاب تھی۔

(۲۱)

سیّد سلطان حیدر جوش

وہ اُردو نثر کے صاحبِ طرز اہلِ قلم کے مختصر گروہ میں سے ایک تھے، جنھوں نے اپنی مزاحیہ و طنزیہ تحریروں کے ذریعہ سے اُردو ادب پر اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے صحیح پیشرو تھے۔ اُنھوں نے اُردو میں ”پنچ“ کے طرز پر لکھنا شروع کیا لیکن ان کا اندازِ تحریر ادیبانہ تھا۔ وہ گورنمنٹ کی ملازمت میں ۱۹۱۴ء میں داخل ہوئے اور علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ۱۹۴۳ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کی معروف تصانیف یہ ہیں:۔ ”پیری“ (۱۹۱۰ء)، ”ابن مسلم“، ”نواب فرید“، ”صبر کی دیوی“، ”فسانۂ جوش“، ”ہوائی“، اور ”نقش و نقاش“ (۱۹۴۵ء)۔ ان کے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے سَو سے اوپر مختصر افسانے لکھے تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء اور مدفن قبرستان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے۔

(۲۲)

خواجہ حسن نظامی دہلوی

(۱۲۹۶ھ ـــ ۱۳۷۴ھ)

خواجہ حسن نظامی ”مصوّرِ فطرت“ کہلاتے تھے کیونکہ وہ کسی بھی معمولی اور غیر اہم موضوع پر حیرت انگیز روانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے اور اس میں بڑی دلچسپی و دل آویزی پیدا کر دیتے تھے۔ اُردو نثر میں ان کے اسلوبِ تحریر میں نہایت سادگی و اثر آفرینی ہے۔ مولانا راشد الخیری کی طرح اُنھوں نے بھی اُردو نثر

کی قابلِ یادگار خدمت کی ہے۔ ان کے افسانوں کا تعلق بیشتر ۱۸۵۷ء کے جاں کاہ اور ہولناک واقعات سے تھا جن میں انتہائی غیر انسانی بربریت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اس طرح ان کی تصانیف مؤرخانہ بھی ہیں اور بڑے ادبی محاسن کی حامل بھی۔ ان کی مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں: "چٹکیاں اور گدگدیاں"، "غدرِ دہلی کے افسانے" (بارہ حصوں میں)، "محرم نامہ"، "میلاد نامہ"، "طمانچہ بر رخسارِ یزید"، "پڑوس کے سترہ پاجی"، "آپ بیتی"، "جگ بیتی"، "سلاطینِ بہمنی"، "کرشنا بیتی"، "جرمنی خلافت"، اور "سفر نامہ ممالکِ اسلامیہ" وغیرہ۔

(۲۳)

منشی پریم چند

۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء

پریم چند کا خاندانی نام نواب رائے تھا لیکن اسکول میں اُن کا نام دھنپت رائے درج کرایا گیا تھا وہ شہر بنارس (یو پی۔انڈیا) کے قریب ایک موضع پانڈے پور کے ایک ہندو کالیستھ خاندان میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا تھا اور اسی سے ان کی شہرت ہوئی۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ پریم چند کا بچپن اور جوانی بڑی تنگ دستی میں بسر ہوئے اور اُن کی یہ عسرت بدستور قائم رہی حتیٰ کہ وہ بمبئی اور کلکتہ کی فلمی زندگی سے وابستہ ہو گئے۔ وہ قریباً بیس سال تک پرائمری اسکول ٹیچر رہے، جس کو اُنھوں نے ۱۹۲۰ء میں خیر باد کہا اور اپنے ادبی میگزین "مادھوری" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن انھیں وہ نقصان اُٹھاکر بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد اُنھوں نے الہ آباد سے اپنا دوسرا رسالہ "جاگرن" نکالا لیکن وہ بھی نہ چل سکا۔ ۱۹۳۰ء میں اُنھوں نے بنارس میں اپنا پریس قائم کیا اور اُس سے اپنا تیسرا ماہنامہ "ہنس" کے نام سے شائع کیا۔ پریم چند اب ہندی میں بھی لکھا کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں پریم چند نے لکھنؤ میں "ترقی پسند مصنفین" کی ایسوسی ایشن کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ اُسی سال کے ماہ ستمبر میں ان کا بنارس میں انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے تک وہ نولکشور پریس لکھنؤ کے شعبۂ ہندی کے نگراں رہے، جبکہ مرزا محمد عسکری اس کے شعبۂ اُردو کے انچارج تھے۔ پریم چند ناول نویس اور فلم ڈراماسٹ دونوں حیثیتوں سے ناکام رہے لیکن اُنھوں نے اُردو کی مختصر افسانہ نویسی میں بڑی شہرت پائی، جن میں اُنھوں نے دیہی زندگی اور ہندو سوسائٹی اور ان کی روایات کی بڑی کامیابی سے

عکاسی کی ہے۔ لیکن یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ پریم چند ایک اہلِ قلم کی حیثیت سے اپنا دامن فرقہ وارانہ تعصب سے نہ بچا سکے کیونکہ ان کی تحریروں میں تعصب قومی نمایاں ہے۔ خاص کر ہندی میں وہ درجۂ اول کے مخالف اسلام ہندو فرقہ پرور نظر آتے ہیں۔ اُردو میں علامہ نذیر احمد نے ناول نویسی کا آغاز کیا تھا، جبکہ مختصر افسانہ نگاری علامہ راشد الخیری نے شروع کی تھی۔ پریم چند اُردو کی مختصر افسانہ نویسی میں علامہ راشد الخیری کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ پریم چند گریجویٹ تھے اور ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف ہندو سیاست سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اُردو میں لکھنا ترک کر دیا تھا اور صرف ہندی میں لکھنے لگے تھے۔ وہ حسب ذیل تصانیف کے مالک تھے:۔ 'پریم پچیسی'، 'پریم بتیسی'، 'پریم چالیسی'، 'سوزِ وطن'، 'خواب و خیال'، 'خاکِ پروانہ'، 'نجات'، 'فردوسِ خیال'، 'زادِ راہ'، 'میدانِ عمل'، 'بیوہ'، 'بازارِ حسن' وغیرہ۔

(۲۴)

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دادا بدخشاں سے آئے تھے جن کی دربارِ دہلی میں بڑی توقیر ہوئی تھی۔ فرحت اللہ بیگ گریجویشن کے بعد دہلی سے حیدر آباد (دکن) چلے گئے تھے۔ وہ اُردو ادب میں اپنی مزاح نگاری کے باعث مقبول ہیں۔ اُن کا طرزِ بیان سادہ، سنجیدہ، لطیف اور ظرافت سے پُر ہوتا ہے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے، الفاظ منتخب، اندازِ بیان دلکش و پُرکشش اور ظرافت نگاری دل موہ لیتی ہے۔ تصانیف: 'نذیر احمد کی کہانی'، 'آخری وصیت'، 'پھول والوں کی سیر'، 'دادا جان کا پارلیمنٹ میں جانا'، اور 'دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'، وغیرہ [رسالہ 'کلیم'، دہلی، اپریل ۱۹۳۷ء۔ ماہنامہ 'تاج'، لاہور، مارچ ۱۹۳۶ء 'نیرنگِ خیال'۔ لاہور، نومبر ۱۹۳۶ء 'نگار'، لکھنؤ، مئی ۱۹۳۴ء 'عہدِ حاضر کے افسانہ نگار'، 'عالمگیر'، لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۷ء 'حدیقۂ اردو'، 'عالمگیر'، لاہور، جون ۱۹۳۹ء]

(۲۵)

سیّد وقار عظیم

وقار عظیم نے اپنی ادبی زندگی برِ صغیر میں 'ترقی پسند مصنفین' کی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی شروع

کی تھی۔ تیس سال سے اوپر تک اس تحریک نے غلبہ قائم رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اردو کے عظیم نقادوں، مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری، اختر رامپوری، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، حسن عسکری، احتشام حسین وغیرہ کا دور دورہ تھا۔ وقار عظیم نے بطور نقاد کے ۱۹۳۳ء سے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد وہ الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگئے۔ اس کے بعد وہ جامعہ ملیہ، دہلی اور دہلی پالی ٹیکنک میں پڑھاتے رہے حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ اپنی طویل ادبی زندگی میں، جو چالیس سال پر محیط تھی، انھوں نے ستر سے اوپر کتابیں لکھیں، ایڈٹ یا مرتب کیں یا ان کے تراجم کئے اور بے شمار مضامین تحریر کئے۔ انھوں نے چار معروف رسائل 'آجکل'، 'ماہِ نو'، 'نقوش'، اور سہ ماہی 'اردو' کو ایڈٹ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوشی کے بعد وہ لاہور میں مجلسِ ترقیٔ ادب اور مجلسِ اقبال وغیرہ علمی و ادبی اداروں سے منسلک ہو گئے۔ نابینا پروفیسر اقبال عظیم ان کے چھوٹے بھائی ہیں جو اکثر اردو مشاعروں میں نظر آتے ہیں۔ پروفیسر وقار عظیم لاہور میں ۱۹۷۸ء میں فوت ہوئے۔

(۲۶)

غلام عباس

غلام عباس، ۱۷ نومبر ۱۹۰۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم وہیں اور لاہور میں ہوئی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء سے ہوا۔ ان کی پہلی مختصر کہانی 'جلاوطن'، روسی مفکر ٹالسٹائے کے افسانہ 'دی لانگ ایکزایل' سے ماخوذ تھی جبکہ ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ غلام عباس نے غیر ملکی لٹریچر بہت پڑھا تھا۔ وہ امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر 'پھول' اور 'تہذیبِ نسواں'، لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ تاج ہی کے ایما سے انھوں نے ارونگ IRVING کے 'الحمرا' کا اردو ترجمہ کیا۔ انھوں نے چراغ حسن حسرت کے جرنل 'شیرازہ' کے لیے 'جزیرۂ سخنوراں' کا اردو ترجمہ کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی اور اس کے اردو اور ہندی میگزینوں 'آواز' اور 'سارنگ' کی ادارت کی۔ غلام عباس کی پہلی طبع زاد کہانی 'مجسمہ' تھی جو 'کارواں'، لاہور میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن جس کہانی نے انھیں عہدِ حاضر کا زبردست افسانہ نگار ثابت کیا وہ 'آنندی' تھی جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

غلام عباس بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں 'الحمرا کے افسانے'، 'جزیرۂ سخنوراں'، 'گوندنی

والا نکیہ"، "دھنک" (ناولیٹ)، "چاند تارا" (بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ)، "آنندی"، "جاڑے کی چاندنی" اور "کن رس" شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں بچوں کے لیے ہیں۔ لیکن وہ بنیادی طور پر مختصر افسانہ نویس تھے ان کے بعض افسانے روسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی، چیک، ازبک، چینی، فارسی اور عربی اور دیگر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں انھوں نے ایک کتاب "ایک نوعمر افسانہ نگار کے نام" سے لکھی اور اس کے بعد سے مختصر افسانوں کے ایک مجموعہ کی تدوین میں مصروف رہے غلام عباس کا انتقال ۷۴ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے کراچی میں یکم نومبر ۱۹۸۲ء کو ہو گیا۔

(۲۷)

پروفیسر احمد علی

احمد علی لکھنؤ (یوپی۔ انڈیا) کے باشندے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اردو ادب میں اُن کی شخصیت بہت متنازعہ فیہ رہی ہے۔ وہ انگریزی کتب کے بھی مصنف ہیں۔ وہ دو نہایت بدنام اردو ناولوں "شعلے" اور "انگارے" کے مصنفین میں سے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ "انگارے" نامی کتاب نے "جدید اردو لٹریچر کے احیا میں ایک تاریخی کردار ادا کیا ہے اور کہ اُردو کی مختصر کہانیوں کا یہ مجموعہ ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ہے" لیکن اختر حسین رائے پوری کی رائے میں "انگارے" میں فحش نگاری اور شہوانیت انگیزی کے علاوہ کوئی آرٹسٹک یا ادبی خوبی نہیں تھی، اور یہی وجہ تھی کہ یہ بیہودہ کتاب حکومت وقت نے ضبط کر لی تھی"۔ یہی کیفیت "شعلے" کی بھی تھی۔ بہ ایں ہمہ ترقی پسند طبقہ نے اس کو بہت سراہا، یہی کیفیت جوش ملیح آبادی کی آخری نثری تصنیف "یادوں کی بارات" کی بھی ہے، جو اپنے گھناؤنے مضامین کے باوجود "ترقی پسندوں" میں بہت پسند کی گئی۔ احمد علی کی تصانیف امریکہ کی ٹیکسس TEXAS اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اور انھوں نے غیر ملکی یونیورسٹیوں میں متعدد لکچر دیے ہیں۔ انگریزی شاعری میں ان کی دو کتابیں ہیں اور تین انگریزی ناول یعنی Twilight in Ocean of night of Rals and Diplomats اور in Delhi ۱۹۸۱-۸۲ء میں وہ قرآن حکیم کے انگریزی ترجمہ میں مصروف رہے کہا جاتا ہے کہ احمد علی سرمایہ داری کے نظام اور کمیونزم دونوں کے مخالف ہیں۔ وہ پاکستانی سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا اردو ناول "انگارے" ترقی پسند تحریک کا پہلا ادبی شاہکار ہے۔

اُردو کے دیگر معروف مختصر افسانہ نویس ایم اسلم۔ مجنوں گورکھپوری، لطیف الدین احمد میاں عبدالعزیز فلک پیما، سُدرشن، رفیعی اجمیری، مسعود علی ذوقی، امتیاز علی تاج، آغا حیدر حسن دہلوی اعظم کریوی، قاری سرفراز حسین، سجاد مرزا بیگ دہلوی، سعادت حسن منٹو اور کنھیا لال کپور وغیرہ۔

٣٥

اُردو ڈرامہ، اسٹیج، فلمیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن

کہتے ہیں کہ مغل شہنشاہ فرخ سیر کے عہدِ سلطنت میں دہلی کے ایک اُردو شاعر نوازؔ نامی نے 'شکنتلا' کی ہندی کہانی کو اُردو ڈرامہ کا جامہ پہنایا تھا، جس کو اُردو زبان کا پہلا ڈرامہ سمجھنا چاہیے مگر وہ اب ناپید ہے۔ ڈرامے دو طرح کے ہوتے ہیں :- (۱) طربیہ (کامیڈی)، یا المیہ (ٹریجڈی)، اور (۲) تراگی کامیڈی، میلوڈرامہ، فارس ''Farce''، برلیسک Burlesque یا اوپرا Opera ۔ مغربی اوپرا اطالوی شعرا کی ایجاد ہے۔ اطالیہ کے بعد اس کی سرپرستی فرانس نے کی۔ اُردو کا پہلا غنائی اوپرا امانتؔ کی 'اندرسبھا' تھا، جس نے اس کے خالق کے نام کو امر بنا دیا۔ امانتؔ کے بعد مداری لال نے بھی اپنا اندرسبھا ڈرامہ لکھا مگر وہ مقبول نہ ہوا۔ اندرسبھا کی سرپرستی اودھ کے سلطان واجد علی شاہ اخترؔ نے کی جو بڑی شان و شوکت سے قیصر باغ لکھنؤ میں اسٹیج ہوتا تھا۔ اس کے بعد اہالیانِ لکھنؤ نے اسے اسٹیج کیا، جہاں سے وہ بمبئی پہنچا۔ یہ اُردو ڈرامہ اور اسٹیج کی بدنصیبی تھی کہ اُن پر شروع سے ہندوستان کی پارسی کمپنیوں کی اجارہ داری قائم رہی جو محض تجارتی نقطۂ نظر سے اور جلبِ منفعت کے لیے قائم ہوئی تھیں۔ اُردو ڈرامہ کی تاریخ دراصل انہی چند ہندوستانی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے عروج و زوال کی کہانی ہے جن کا واحد مطمعِ نظر دولت جمع کرنا تھا اور کچھ نہیں۔ ان کا شمہ بھر تعلق بھی خدمتِ ادب یا معاشرتی اصلاح سے نہ تھا۔ جو ڈرامے یہ پارسی تھیٹریکل کمپنیاں اسٹیج کرتی تھیں وہ ہندی، پوربی، گجراتی اور اُردو وغیرہ زبانوں کا ملغوبہ ہوتے تھے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ معروف اُردو شعرا اور معزز لوگ ڈرامے لکھنا اور انھیں اسٹیج کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ بعض وہ منشی، جنھوں نے ان پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کی ملازمت میں رہ کر ان کے لیے ڈرامے لکھے اور جو اسٹیج ہوئے ان کے نام یہ ہیں :- رونقؔ بنارسی، حسینی میاں ظریفؔ، ونایک پرشاد طالبؔ، سید مہدی حسن احسنؔ، بیتابؔ، مرزا نظیر بیگ اور آغا حشرؔ۔ ان میں مشہور ترین مؤخر الذکر ہوئے۔

دنیا کے تمام قدیم لٹریچر شاعری ہی سے شروع ہوئے تھے کیونکہ نثر کی نسبت نظم کو ازبر کرنا آسان تر ہے۔ اُردو ادب بھی نظم ہی سے شروع ہوا، کیونکہ نثر عرصے تک فارسی ہی میں لکھی جاتی رہی۔ اس طرح اُردو نثر اُردو نظم کے بہت عرصے کے بعد وجود میں آئی۔ قدیم اُردو ڈرامہ بھی پہلے پہل نظم ہی میں لکھا گیا تھا

اردو بھی عنائی اوپرائی شکل میں سب سے پہلے مرزا محمد ہادی رسوا اور احسن لکھنوی ڈرامہ نگاروں نے اردو ڈرامہ کو نظم سے نکال کر صحیح ڈرامہ کی شکل دی، لیکن تیکنیکی اعتبار سے وہ ناقص تھے۔ اردو ڈرامہ کی زبوں حالی کے پیش نظر حسب ذیل معروف اردو اہل قلم نے اس میدان میں طبع آزمائی کی لیکن ان میں سے اکثر اپنی کوشش میں ناکام رہے :-

ڈرامے کا نام	ڈرامہ نگار کا نام
۱۔ "شہید وفا" ————	مولانا عبدالحلیم شرر
۲۔ "رشید اور موہنہ" ————	منشی احمد علی شوق
۳۔ "زود پشیماں" ————	مولوی عبدالماجد
۴۔ "وکرم اروسی" (ترجمہ) ————	مولوی عزیز مرزا
۵۔ جنگ روس و جاپان ————	مولوی ظفر علی خاں
۶۔ "راج دلاری" ————	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی
۷۔ "انارکلی" ————	میر امتیاز علی تاج
۸۔ جانِ ظرافت (مولییر MOLIERE کا ترجمہ)	محمد عمر اور نور الٰہی
۹۔ "قزاق" (شلر SCHILLER کا ترجمہ) ————	ایضاً
۱۰۔ "ظفر کی موت" (ترجمہ) ————	ایضاً

مغربی یوروپی ممالک میں ناروے کا ملک ادب اور شاعری کے میدانوں میں غیر معروف تھا، لیکن اسی ملک کے ایک مصلح ہنری ابسن HENRY IBSEN نے انیسویں صدی کے آخر میں ڈرامہ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور کُل یوروپ نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ابسن نے قدیم روایات سے کلیتاً روگردانی کرتے ہوئے اپنے ڈراموں کے لیے عنوانات و مضامین عوام کی روزمرہ زندگی سے لئے۔ اسی نے ڈراموں اور اسٹیج سے خود کلامی کے طریقہ کو مسترد کیا۔ ابسن پہلے اپنے ڈرامے منظوم لکھا کرتا تھا لیکن اپنی زندگی کے آخر میں وہ انھیں محض نثر میں لکھنے لگا۔ اس تبدیلی کو تمام یوروپ نے قبول کر لیا۔ اردو میں بھی اب ڈرامے نثر ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ یوروپی ڈرامہ بالکل ابسن کے زیرِ اثر تھا۔ جارج برنارڈ شا نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "انگلستان پر جو ابسن کا زبردست اثر ہوا وہ تین عظیم انقلابات، چھ خونریز صلیبی جنگوں، دو غیر ملکی حملوں اور ایک تباہ کن زلزلے سے بھی مجموعی طور پر نہ ہو سکتا تھا"۔ ہر ملک کے معروف ڈرامہ نگاروں نے ابسن کی اس حد تک تقلید کی کہ انگلستان میں بھی

ولیم آرچر W. ARCHER، برنارڈ شا B. SHAW، گالسورتھی GALSWORTHY، گرانویل بارکر G. BARKER اور سمرسیٹ ماگھم S. MAUGHAM جیسے مشہور ڈرامہ نگاروں نے بھی اپنے ڈراموں میں فخر یہ طور پر ابسین کی تیکنیک کو استعمال کیا۔ اس طرح فرانس میں تھیٹر لیبر LIBRE، جرمنی میں "فرائی بوہنے" FREIE BUHNE اور انگلستان میں ریپرٹوری تھیٹر REPERTORY ڈرامہ اور تھیٹریکل اسٹیج میں ابسین کی تیکنیک کو ترقی دینے کے لیے کھولے گئے۔ بزاں بعد ریپرٹوری کا یورپ میں ایک مسلمہ تحریک کی حیثیت سے رواج ہوگیا۔

برِ صغیر جنوبی ایشیا میں، آغا حشر، محمد عمر نورالٰہی، مرزا نذیر بیگ اور احسن وغیرہ نے شیکسپیئر کے انگریزی ڈرامے اُردو میں ترمیم و تنسیخ کے بعد اسٹیج کیے لیکن ناکام رہے۔ مختصر یہ کہ قدیم اُردو ڈرامے منظوم ہوتے تھے، لیکن بیسوی صدی میں ڈرامہ کی صنف اُردو نثر سے متعلق ہوگئی۔

فنونِ لطیفہ میں انہوں نے یہ مضامین تحریر کیے :۔ ڈرامہ، شاعری، خطابت، موسیقی، مجسمہ سازی، نقاشی، فنِ تعمیر، باغبانی اور رقص۔ لیکن ڈرامہ ان سب پر فائق ہے، کیونکہ وہ کم و بیش ان تمام فنون پر حاوی ہے۔ ڈرامہ میں شاعری بھی ہوتی ہے، خطابت بھی، موسیقی بھی، نقاشی بھی، رقص بھی، مجسمہ سازی بھی، تعمیرات بھی، نیز باغبانی۔ اسی لیے اس کو تمام دیگر اصنافِ ادب پر فوقیت حاصل ہے۔ تھیٹر جس کی جگہ اب فلمیں بڑی تیزی سے لیتی جا رہی ہیں، کی اثر انگیزی پریس اور پلیٹ فارم دونوں پر غالب ہے، البتہ اب ریڈیو اور ٹیلی ویژن نہایت سرعت سے تھیٹر اور سینما دونوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس طرح اگر انسانی اظہارِ بیان کے یہ جدید آلات۔ تھیٹر، سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ باقاعدگی کے ساتھ اور منظم طور پر بروئے کار لائے جائیں تو ان کی وسیع و مؤثر اپیل پریس اور پبلسٹی کے دیگر ذرائع کی نسبت زیادہ کارگر ہو سکتی ہے۔

قدیم ڈرامہ مذہب سے وابستہ تھا۔ انگلستان میں ڈرامہ گرجاؤں کی حدود کے اندر مذہبی تبلیغ کی خاطر اسٹیج کیا جاتا تھا۔ بعد کو وہ ملک کی اقتصادی، سوشل، سیاسی اور ادبی زندگی کی ترقی کا آلۂ کار بن گیا۔

اُردو ڈرامہ کی تاریخ میاں نواز دہلوی کے "شکنتلا" کے اُردو ترجمہ سے شروع ہوتی ہے، لیکن اُردو تھیٹر کی بنیاد میر آغا حسن امانت لکھنوی کی "اندر سبھا" سے پڑی تھی جو برِ صغیر میں اسٹیج کے بانی تھے ۱۸۷۷ء میں وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی نے میاں رونق اور منشی طالب کے تحریر کردہ ڈرامے اسٹیج کیے۔ اُردو کے ابتدائی ڈرامہ نویسوں میں مداری لال، حسین میاں ظریف، محمد عبدالوحید قیس، حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نذیر بیگ کے نام نمایاں ہیں۔ جن کے ڈراموں نے پچاس ساٹھ سال سے زاید عرصے تک برِ صغیر کے اسٹیج پر اپنی گرفت

۔۔رہی، بلکہ ان میں سے بعض ڈرامے عہدِ جدید تک اسٹیج ہوتے ہیں۔ ان میں سے معروف ترین ڈرامے حسب ذیل ہیں:۔

ڈرامہ نویس کا نام	ڈرامہ کا نام	تاریخ اشاعت
۱۔ حافظ محمد عبداللہ، زمیندار بالپورہ	۱۔ ذخیرۂ عشرت۔	۱۸۸۷ء
	۲۔ عشق فرہاد و شیریں۔	۱۸۸۷ء
	۳۔ عشق مہرانگیز و قُباد۔	۱۸۸۷ء
	۴۔ جشن پرستان۔	۱۸۹۳ء
	۵۔ سخاوت حاتم طائی۔	۱۸۸۷ء
	۶۔ عشق لیلیٰ مجنوں۔	۱۸۸۹ء
	۷۔ عشق رانجھا ہیر۔	۱۸۸۸ء
۲۔ مرزا نذیر بیگ تلمیذ محمد عبداللہ	۱۔ شہزادہ بے نظیر و ملکہ مہرانگیز۔	۱۸۹۳ء
	۲۔ گلستانِ بے بہا۔	۱۸۹۴ء
	۳۔ نتیجۂ محبت۔ (اس ڈرامہ کو پارسی جوبلی تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج کیا تھا)	۱۸۹۲ء
۳۔ سید بزرگ شاہ لاہوری	قمرالزمان و بدر دُورہ۔	۱۸۸۶ء
۴۔ منشی ایسری پرشاد خوشدل اِٹاوی	جلسۂ پرستان۔	۱۸۹۴ء
۵۔ میاں محمود خاں رونق احمد آبادی	سیفِ سلیمانی۔	۱۸۸۸ء

قدیم اُردو ڈراموں میں اور بھی شائع ہوئے تھے لیکن ان میں سے بہت کم اب کسی لائبریری میں محفوظ ہوں گے۔ وہ قدیم طرز پر منظوم لکھے گئے تھے جیسے خُدا دوست، چاندنی بی، تکلیل بہار، حُسنِ فرنگ، زہرِ عشق، شیریں فرہاد، علی بابا، نقشِ سلیمانی، اکسیرِ اعظم، لیلیٰ مجنوں، گل بکاولی، بدرِ مُنیر، بزمِ سلیمان، الٰہ دین، فتنہ خانم، زہرہ و بہرام، نل دمن، رام لیلا، فسانۂ عجائب، وغیرہ۔

دوسرے دَور کے ڈرامہ نگاروں میں طالب اور احسن بہت مشہور رہے۔ طالب کے معروف اُردو ڈراموں کے نام یہ ہیں: لیل و نہار، نگاہِ غفلت، گوپی چند، اور ہریش چندرا۔ احسن کے مشہور ڈراموں کے نام یہ ہیں: ہیملٹ، چندراولی، دلفروش، بھُول بھُلیاں، اور چلتا پُرزہ۔ منشی غلام دیوانہ

کے مقبول ڈراموں کے نام یہ ہیں: "تائیدِ یزدانی" اور "سیر پرستان"۔ سید عباس علی نے دو ڈرامے لکھے تھے: "گلِ روزِ زرینہ" اور "جامِ جہاں نما"۔ پنڈت نارائن پرشاد بیتاب کے مشہور اُردو ڈرامے حسبِ ذیل ہیں:
"قتلِ نذیر"، "زہری سانپ"، "فریبِ محبت"، "گورکھ دھندہ" اور "کرشنا سداما"۔

تیسرے دور کے اُردو ڈرامہ نویسوں میں سب سے زیادہ معروف و کامیاب آغا حشر تھے۔ ان کا اندازِ پیش کش اور تیکنک اُردو اسٹیج پر چھا گیا تھا اور جدید زمانے تک رائج رہا۔ اُن کے بہترین اُردو ڈرامے   : "مریدِ شک"، "میٹھی چھری"، "شہیدِ ناز"، "سفید خون"، "صیدِ ہوس"، "اسیرِ حرص"، "خوبصورت بلا"، "سلور کنگ"، "خوابِ ہستی"، "ٹھنڈی آگ"، "خود پرست"، "شامِ جوانی"، "تصویرِ وفا"، "ترچھی نظر"، "ترکی حور" اور "آنکھ کا نشہ"۔ آغا حشر نے کچھ ہندی ڈرامے بھی لکھے تھے: "سُور داس"، "بن دیوی"، "مادھو مُرلی"، "سیتا بن باس" اور "شرون کمار"۔

منشی محشر کے یہ   ڈرامے بھی شائع ہو چکے ہیں: "آتشی ناگ"، "نگاہِ ناز"، "حسین قاتل"، "شکنتلا"، "ہندی خنجر"، "رسیلا جوگی"، "دشمنِ ایمان"، "ہمارا خُدا"، "چمکتی بجلی"، "زہری چھُری" اور "خونِ جگر"۔

مرزا عباس کے ڈرامے   : "نورِ جہاں"، "نورِ اسلام"، "مدن منجری"، "سرکاری جاسوس"، "لاجونتی"، "دُکھیا بھارت"، "شاہی فرمان"، "پنجاب میل"، "ایک ہی پیسہ" اور "شاہی فقیر"۔

ڈرامہ نگار	ڈرامے
۱۔ منشی رحمت علی رحمت	= "دردِ جگر"، "باوفا قاتل"، "جلاّد عاشق"، "محبت کے پھول"، اور "تصویرِ رحمت"۔
۲۔ منشی عبدالعزیز ذائق	= "نورِ عرب"، "فخرِ عرب"، اور "کرشنا لیلا"۔
۳۔ عشرت حسین نیّر	= "فریبی عورت"، "ایمان"، "اتحاد"، "وطن"، اور "انصاف"۔
۴۔ شاد	= "سرفروشی"، "ہمارا گھر"، اور "تاجدار جوگن"۔
۵۔ مائل دہلوی	= "چندرا گپت"، "تیغِ ستم"، اور "گوتم بُدھ"۔
۶۔ منشی نازاں	= "نورِ وطن"، "باغِ ایران"، اور "نورِ یمن نار"۔
۷۔ پنڈت رادھے شیام	= "سری کرشنا"، "مشرقی حور"، اور "پری ورتن"۔
۸۔ انور حسین آرزو لکھنوی	= "چاند گہن"، "متوالی جوگن"، اور "بیراگن"۔

جدید اُردو اہلِ قلم اُردو ڈرامہ کو حسبِ ذیل چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:-

دَورِ اوّل:- وہ ڈرامے جو امانت کی "اندر سبھا" کے بعد لکھے گئے۔ وہ شروع سے آخر تک منظوم

تھے۔ بلا کسی نثر کے اوران کا انداز 'اوپرا' کا تھا، مثلاً 'چتر ابکاولی' اور 'زہر عشق' وغیرہ۔

دوسرا دور: اس دور کے ڈراموں میں نظم کے ساتھ نثر بھی شامل ہونے لگی تھی لیکن ڈرامہ کا بیشتر حصہ ہنوز منظوم ہوتا تھا۔ مثلاً 'چندراولی' اور 'ہیملٹ' وغیرہ۔

تیسرا دور: اردو ڈرامے کے اس دور پر آغا حشر کا تسلط رہا۔

چوتھا دور: ترقی پسند ادیبوں سے پہلے کا آخری دور لاہور کے میرا متیاز علی تاج کے ڈراموں کا دور تھا جن کے بہترین ڈراموں کے نام یہ ہیں:۔ 'انارکلی'، 'دولھن'، 'پرتھی راج'، 'قسمت'، 'پورس' اور 'یاسمین'۔

ان کے علاوہ بعض دیگر معروف اردو ڈرامے حسب ذیل تھے:۔

۱۔ آزاد = 'اکبر'

۲۔ منشی جوالا پرشاد = 'معشوقۂ فرنگ' اور 'رومیو جولیٹ'۔

۳۔ منشی دوار کا پرشاد اُفق = 'رام چرتر'

۴۔ حکیم احمد شجاع = 'باپ کا گناہ'، 'فرعون'، 'جانباز' اور 'بھارت کا لعل'۔

۵۔ ڈاکٹر سید عابد حسین = 'پردۂ غفلت'

۶۔ پروفیسر علم الدین سالک = 'حرم وفا' اور 'برق غضب'۔

'ناٹک' ہندوستانی رواج کی ایک قدیم رسم ہے، خاص کر رہس ناٹک جس کو عام لوگ 'رام لیلا' کہتے تھے اور جو سالانہ میلوں کی شکل میں رائج تھا۔ لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کے دورِ حکومت میں یہ 'رہس ناٹک' ہر سال اسٹیج کیا جاتا تھا۔ واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں اسے بڑی ترقی ملی حتیٰ کہ اس کے لیے ایک مستقل 'پری خانہ' قائم کیا گیا۔ یہ 'اندر سبھا' کے ڈرامے کا آغاز تھا (۴۷-۱۸۴۹ء)۔ شروع میں 'اندر سبھا' کے ڈرامے کا اسٹیج لکھنؤ کے حضور باغ کے اندر واجد علی شاہ کے 'فلک سیر' نامی محل میں لگایا گیا تھا۔ بعض اہل قلم نے یہ بات غلط لکھی ہے کہ نواب واجد علی شاہ نے بذات خود اس تھیٹر میں حصہ لیا تھا۔ اس رہس دھاری ناٹک، نے پہلے تو ترقی کر کے 'اندر سبھا' کے اسٹیج ڈرامے کی شکل اختیار کی پھر ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بعد بعض پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے اسے یوروپی طرز کے اسٹیج ڈرامہ کی صورت میں ڈھال لیا۔ 'اندر سبھا' کے ڈرامہ کے آغاز کی تاریخ ۱۸۴۸ء بتائی جاتی ہے۔ سید آغا حسن امانت لکھنوی نے بنا ڈرامہ 'اندر سبھا امانت'، ۱۸۵۱ء میں لکھا تھا جو ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ برصغیر میں اردو تھیٹر ور اسٹیج کا نقطۂ آغاز تھا۔ امانت کے بعد 'اندر سبھا مداری لعل' نے کسی قدر کامیابی حاصل کی، مگر اس قدر

جنتی کرامات کو حاصل ہوئی تھی۔

آغا حشر کو اُردو ادب کا شیکسپیئر کہا گیا ہے۔ وہ ایک فاضل شخص تھے۔ ایک اچھے شاعر، ایک کامیاب مقرر اور ایک فطری فنکار اور ڈرامانگار۔ وہ متعدد زبانیں جانتے تھے: عربی، فارسی، اُردو، ہندی، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی۔ ان کا پورا نام آغا محمد شاہ حشر کاشمیری تھا۔ اُن کے آباو اجداد کشمیر کے باشندے تھے مگر وہ خود امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی ڈرامہ نویسی کا آغاز بمبئی سے ہوا جہاں وہ 'نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی' سے وابستہ ہو گئے تھے، جس کے مالک محمد علی ناخدا تھے۔ اُردو کا پہلا اسٹیج سیٹھ پشتونجی فرامجی کی تھیٹریکل کمپنی نے قائم کیا تھا جو پارسی تھے اور خود شاعر تھے۔ ان کا تخلص 'بیدل' تھا اور وہ نواب علی نفیس کے شاگرد تھے۔ اس کمپنی کے بیسے (جس کے مالک ناخدا تھے) آغا حشر نے شیکسپیئر کے کئی انگریزی ڈراموں کو اُردو کا جامہ پہنایا، مثلاً 'بزم فانی'، 'رومیو اور جولیٹ'۔ آغا حشر نے اس کمپنی سے علیحدگی اختیار کر کے خود اپنی 'انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی' قائم کر لی تھی مگر نقصان اُٹھا کے اُسے بند کرنا پڑا۔ پھر وہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں کی معروف 'مدان اینڈ کمپنی' میں بطور ایکٹر ملازم ہو گئے۔ جب بولنے والی فلموں کا آغاز ہوا تو اُنھوں نے فلم کے لیے ایک ڈرامہ 'عورت کا پیار' کے نام سے لکھا، جس کی کامیابی کے بعد اُنھوں نے فلم کے لیے متعدد ڈرامے لکھے جن میں سے 'چندی داس' اور 'یہودی کی لڑکی' بہت کامیاب رہے۔ اپنی زندگی کے آخر میں اُنھوں نے لاہور میں اپنی فلم کمپنی 'حشر پکچرز' کے نام سے قائم کی۔

آغا حشر کا انتقال لاہور میں اپریل ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد ریڈیو پاکستان نے مختصر افسانہ نویسوں کی سرپرستی کی، بالخصوص اُن مختصر اُردو ڈرامہ نویسوں کی جو خود کو 'ترقی پسند' کہتے تھے۔ چنانچہ اکثر ریڈیو ڈرامے ان 'ترقی پسندوں' کے انتہا پسندوں نے تحریر کیے، مثلاً سعادت حسن منٹو، جن کا انتقال کثرت شراب نوشی کے باعث لاہور میں صرف ۴۲ سال کی عمر میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو ہوا۔ منٹو نے لاہور میں اپنی زندگی کے آخری ایام سخت عسرت و بے توقیری میں گذارے۔ منٹو کی ترقی پسند ادیبوں میں ہردلعزیزی اس امر کے باعث قائم تھی کہ اُنھوں نے بیشتر جنسیات پر لکھا اور ان کی کہانیاں سفلی جذبات کو اُبھارتی اور لذت کوشی و شہوانیت کو ہوا دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں کوئی گہرائی نہیں، سوائے سطحی عریانیت اور جنسی تلذذ کی دعوت کے۔ اُن کے بعض معروف ڈرامے یہ ہیں:- 'انتظار'، 'کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'، 'کبوتری'، 'ایلی'، 'جیب کترا'، 'نیلی رگیں'، 'ساڑھی'، 'نقش فریادی'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'جرنلسٹ'، 'کمرہ نمبر ۹'، 'تین اُنگلیاں'، 'تحفہ'، 'قانون کی حفاظت'، 'بیمار'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'عید کارڈ'، اور 'لالٹین کا اشارہ' وغیرہ۔

ہندوستانی اردو اہلِ قلم کرشن چندر (متوفی مارچ ۱۹۷۷ء) ڈرامہ نگار کی نسبت ناول نویس اور مختصر افسانہ نگار زیادہ بہتر ہیں۔ اُن کے ڈراموں کا مجموعہ 'دروازہ' اس حقیقت کی دلیل ہے۔ لیکن انھوں نے بعض اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں، مثلاً 'نیل کنٹھ' اور 'سرائے کے باہر'۔ ایک اور ہندوستانی اردو اہلِ قلم 'اُپندر ناتھ اشک' نے بھی اُردو ڈرامے لکھے ہیں مگر وہ کرشن چندر کے ڈراموں سے بھی کمتر درجے کے ہیں۔ پاکستانی ریڈیو ڈراماٹسٹ میں انتصار حسین اور سلیم احمد زیادہ کامیاب ہیں۔ شروع ہی سے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن پر ترقی پسندوں کا تسلط رہا جو آرٹ کے نام سے ہر خلافِ اسلام تحریک کو فروغ دیتے رہے ہیں، مثلاً ٹیلی ویژن پر 'منٹو راما' کے پروگرام کی اشاعت وغیرہ۔ معین الدین کے چند قابلِ تعریف ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے اور ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے، مثلاً 'تعلیم بالغاں'، 'مرزا غالب بندر روڈ پر' اور 'لال قلعہ سے لالو کھیت تک'۔

اُردو میں پاکستانی فلموں پر خامہ فرسائی کرنا محض عبث ہے کیونکہ ان کا معیار انتہائی پست و شرمناک ہے۔ پاکستانی فلم سازوں نے آج تک کوئی فلم بین الاقوامی معیار کی نہیں بنائی۔ پاکستان ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بعض معروف ڈرامہ نگار: حسینہ معین امجد اسلام امجد، سلیم چشتی، حمید کاشمیری، اشفاق احمد سلیم احمد اور بانو قدسیہ وغیرہ۔

['ہمایوں'، لاہور، جون اور جولائی سنہ ۱۹۳۴ء 'اُردو ڈرامہ'، از محمد حسین ادیب۔ 'نیرنگ خیال'، لاہور جولائی سنہ ۱۹۲۷ء 'ہندوستانی ڈرامے'، از حکیم یوسف حسن ایڈیٹر، اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء 'ڈرامہ اندرسبھا کی صحیح تاریخ'، از سرخوش۔ 'آغا حشر اور اُردو ڈرامہ'، از سید امتیاز علی تاج، مئی سنہ ۱۹۲۶ء 'ایشیا' میرٹھ، ستمبر اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء 'مشرق کا ایک ڈرامہ نگار، آغا محمد شاہ حشر کاشمیری' از غلام علی خاں مائل۔ 'ترقی پسند ادب'، از عزیز احمد، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۵ء 'ترقی پسند ڈرامہ'، ص ۲۱۱-۲۰۸]

۳۶

اُردو میں تنقید، مزاح و طنز نگاری

پریس کے لیے اُردو کے لوہے کے ٹائپ سب سے پہلے اٹھارھویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، میں استعمال کیے گئے تھے جن سے کالج کے اسٹاف کی تحریر کردہ اُردو کتب طبع کی گئی تھیں۔ مگر چونکہ ٹائپ سے چھپائی مہنگی بھی تھی اور غیر مقبول بھی اس لیے ۱۸۲۷ء سے لیتھوگرافی کے ذریعہ سے طباعت متعارف کی گئی جس کا پہلا پریس دہلی میں کھولا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں پریس کی آزادی کا اعلان ہوا اور اس کے دوسرے سال سے دہلی میں اُردو جرائد کی طباعت و اشاعت کا آغاز ہو گیا۔ غالباً سب سے پہلے اُردو اخبارات 'اُردو اخبار' (جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے والد نے جاری کیا تھا) اور 'سید الاخبار' (جو سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی نے نکالا تھا اور جن کا نام سید محمد تھا)۔ ۱۸۶۳ء میں سر سید احمد خاں نے اُردو میں مغرب کی سائنٹفک کتابوں کو ترجمہ کر کے طبع کرنے کے لیے غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی۔ ۱۸۶۶ء سے سر سید احمد نے ایک اُردو اخبار شائع کرنا شروع کیا، جو سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن سمجھا جاتا تھا اور جس کا نام بعد کو 'دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ' ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں سر سید احمد نے اپنا اُردو ماہنامہ جاری کیا جس کا نام 'تہذیب الاخلاق' تھا۔ اور جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ اسی ماہنامے نے اُردو کے اُن پانچ عظیم اہلِ قلم۔ سید احمد خاں، حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ اور نذیر احمد کو مسلم قوم سے رُوشناس کرایا، جنھوں نے اُردو ادب میں مکمل انقلاب برپا کر کے موجودہ صدی میں اس کے احیائے جدید کے عہد کا آغاز کیا۔ اسی میگزین میں سب سے پہلے عظیم انقلابی اُردو نظم 'مسدسِ حالیؔ' شائع ہوئی تھی۔ اگرچہ 'تہذیب الاخلاق' کے مقاصد مختلف تھے، لیکن اس کا سب سے بڑا مقصد اُردو ادب میں غیر متعصبانہ اور سائنٹفک تنقید کو متعارف کرنا تھا۔

سر سید احمد خاں اُردو میں ادبی تنقید کے بانی تھے۔ پہلی مرتبہ 'تہذیب الاخلاق' سات سال تک جاری رہا جس کے بعد وہ بند ہو گیا۔ ان سات برسوں میں اس میں ۲۲۶ مضامین شائع ہوئے جن میں سے صرف سر سید احمد خاں کے مضامین کی تعداد ۱۱۲ تھی۔ تین سال کے تعطل کے بعد، وہ پھر جاری کیا گیا۔

دوسری مرتبہ وہ دو سال اور پانچ ماہ تک جاری رہا۔ بارہ سال تک بند رہنے کے بعد وہ تیسری مرتبہ جاری ہوا اور تقریباً تین سال مزید تک چلتا رہا۔ ادبی ذوق میں اصلاح اور اظہارِ خیال کی آزادی کی جو تحریک سر سید احمد خاں نے ۱۸۱۶ء تا ۱۸۹۶ء اپنے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعہ سے شروع کی تھی اُس کی صدائے بازگشت اُردو نثر میں اپنے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں اور اُردو نظم میں اپنے مسدس حالی، یا مد و جزرِ اسلام میں مولانا حالی نے بڑے مؤثر انداز میں ہمیں سنائی۔ حالی ہی کی 'یادگارِ غالب'، اور 'حیاتِ جاوید' اُردو کی تین تنقید کے اعلیٰ ترین معیار کے شاہکار ہیں۔ اُردو تنقید نگاری کا جو پودا سر سید احمد خاں نے اپنے جریدے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعہ سے لگایا تھا وہ مولانا حالی کی آبیاری سے ایک تناور درخت بن گیا۔ مولانا حالی کو تنقید نگاری میں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ اگرچہ لکھنوی مدرسۂ فکر کے بعض اہلِ قلم کو ان کا 'مقدمہ' ناپسند ہوا لیکن اس حقیقت کا عام طور پر اعتراف کیا گیا کہ ان کی ادبی تنقید ان کے ذاتی تعصبات سے پاک ہے۔ اُردو ادب آج تک مولانا حالی جیسے بے لاگ اور ایماندار ناقد پیدا نہ کر سکا۔

مولانا حالی کے ساتھ علامہ شبلی اور مولانا محمد حسین آزاد دونوں نے اُردو تنقید نگاری کو مزید ترقی دی۔ مولانا آزاد اُردو ادب میں اپنے لٹریری شاہکار، 'آبِ حیات'، (لاہور ۱۸۸۳ء) کے باعث بہت مشہور ہوئے۔ آزاد ایک پیدائشی و فطری ادیب تھے، مؤرخ نہیں۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے 'آبِ حیات' معتبر نہیں ہے، لیکن جہاں تک زبان، اسلوبِ بیان و اظہارِ خیال کی نُدرت کا تعلق ہے، وہ اُردو ادب کا ایک بے مثال و بے نظیر شاہکار ہے۔ آج تک کوئی اُردو اہلِ قلم آزاد کے دل آویز طرزِ بیان کی کامیابی کے ساتھ نقل نہ کر سکا۔

علامہ شبلی بیک وقت ایک عالم بھی تھے اور ادیب بھی۔ اس کے علاوہ سید احمد خاں اور آزاد کے برعکس اُنھوں نے اپنے ادبی اوصاف کو محض اپنے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُنھوں نے اپنے متبعین کی ایک جماعت تیار کی جس نے اُن کے ادبی کام کو آگے بڑھایا۔ اپنے رہنما کی طرح اُنھوں نے دین کو اپنے ایک ہاتھ میں اور اُردو ادب کو دوسرے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ علامہ شبلی بیک وقت ایک مذہبی رہنما بھی تھے، شاعر بھی، ناقد بھی، مؤرخ بھی، سوانح نگار بھی اور فلسفی بھی۔

جن اُردو اہلِ قلم نے مغربی تکنیک پر مبنی اُردو میں تنقید نگاری کے جدید اسالیب متعارف کیے ان میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالماجد دریابادی، مہدی الافادی الاقتصادی، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، امداد امام اثر، حبیب الرحمن خاں حسرت شروانی، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر محی الدین

قادری زور، پروفیسر حامد حسن قادری، سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سید مسعود حسن ادیب لکھنوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بدایونی وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری پہلے اردو اہل قلم تھے، جنھوں نے انگریزی ادب کے طرز پر، اردو میں 'اعتراف' کا اسلوب متعارف کیا۔ ان کا 'مقدمۂ دیوانِ غالب' (بھوپالی ایڈیشن) اردو ادب میں ایک انوکھی شے ہے، جو لافانی ہو چکی ہے۔ علامہ شبلی کے 'تذکرۂ شعرالعجم' پر حافظ محمود شیرانی کی 'تنقید' اردو میں تحقیق و تنقید کا شاہکار ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے بھی 'شعرالعجم' پر تنقید کی تھی۔ اگر اردو تنقید نگاری کے میدان میں کوئی شخص مولانا حالی کا سچا جانشین کہا جا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق تھے (متوفی کراچی ۱۹۶۱ء)۔ لکھنوی اہالیانِ قلم نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں مولانا حالی کی اپنی تنقید کے باعث مولانا حالی کی مذمت کی تھی۔ اسی طرح سے لکھنوی حلقوں نے مولانا شبلی کے 'موازنۂ انیس و دبیر' پر معاندانہ تنقید کی تھی اور ان کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے 'ردّ الموازنہ' شائع کیا تھا۔ حافظ محمود خاں شیرانی کی 'تنقید شعرالعجم' اور 'ردّ الموازنہ' دونوں 'مثنوی گلزارِ نسیم' پر مولانا شرر اور چکبست لکھنوی کے درمیان تنقیدی ادبی مباحثہ کی گویا صدائے بازگشت تھیں جن پر 'اودھ پنچ' لکھنؤ کے صفحات میں بڑی مزاحیہ رائے زنی کی گئی تھی۔ بعض معروف اردو نقاد حسب ذیل ہیں:-

سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر عابد حسین، تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بدایونی، ڈاکٹر عبادت بریلوی،

(۱)

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

(از ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء — — — ۷۷ سال)

خواجہ حالی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر، ادیب، مقرر، نقاد اور مصلح۔ مولانا حالی، خواجہ ایزد بخش کے دوسرے بیٹے تھے۔ مولانا حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین تھے۔ حالی پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم پانی پت ہی میں پائی اور وہ ابھی صرف سترہ سال کے تھے کہ ان کی شادی کر دی گئی۔ اپنی شادی کے بعد وہ تکمیلِ تعلیم کے لیے دہلی گئے جہاں وہ ۱۸۵۵ء تک ٹھیرے۔ ۱۸۵۶ء میں انھیں ضلع حصار کی کلکٹریٹ میں کلرکی کی آسامی مل گئی، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ۱۸۶۳ء تک پانی پت

میں ہی رہے، جبکہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور حسرتی نے اُنھیں اپنے بچوں کی اتالیقی کے لیے جہانگیر آباد بلا لیا۔ مولانا حالی جہانگیر آباد میں ۱۸۷۰ء تک رہے۔ اس دوران میں، حالی اپنا شاعرانہ کلام نواب شیفتہ کو دکھاتے رہے اور کبھی کبھی وہ اسے دہلی مرزا غالب کے پاس بھی بغرض تصحیح بھیج دیا کرتے تھے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی کو اُن اُردو مسوّدات کی اصلاح کے لیے، جو انگریزی کی سائنٹفک کتابوں کے تراجم ہوتے تھے، لاہور میں حکومت پنجاب کے 'دارالکتب' میں نوکری مل گئی۔ یہ ملازمت مولانا حالی کی مستقبل میں ادبی زندگی کے لیے نہایت عمدہ تربیتی ادارہ ثابت ہوئی۔ حالی نے پنجاب بک ڈپو، لاہور میں چار سال تک کام کیا۔ اُنھوں نے یہ زمانہ لاہور سوسائٹی کی طرزِ زندگی سے سخت بددل ہو کر گذارا۔ خواجہ حالی پہلے اُردو اہلِ قلم تھے، جو ہر چند کہ کسی مغربی زبان سے واقف نہ تھے، لیکن اُنھوں نے یوروپی لٹریچر کی تمام جدید ٹیکنیک کو حاصل کر لیا تھا۔

کچھ عرصے تک دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں ٹیچری کرنے کے بعد، مولانا حالی ایچیسن کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے دوبارہ لاہور گئے۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے، پنجاب کے انگریز ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہولرائڈ کی ترغیب سے، لاہور میں ایک انوکھے مشاعرے کی بنیاد ڈالی، جس میں رائج الوقت و روایتی غزلوں کے لیے مصرعہ طرح کے بجائے 'نطری شاعری' کے لیے نظموں کے عنوانات کی نشاندہی کر دی جاتی تھی تاکہ اُن پر شعرائے اُردو طبع آزمائی کریں۔ پہلے پہل مولانا آزاد نے اور پھر آزاد اور حالی دونوں نے اس جدید طرز کے مشاعرے میں اپنی اپنی 'نطری' اُردو نظمیں پڑھیں۔ حالی کی نظمیں 'برسات'، 'اُمید'، 'انصاف'، اور 'حُبِّ وطن'، اسی مشاعرے کے لیے لکھی گئیں اور وہاں پڑھی گئی تھیں۔ ۱۸۷۶ء سے حالی نے قدیم روایتی و غیر حقیقی طرز پر شعر گوئی ترک کر دی تھی، حتّٰی کہ اُن کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی جن سے رابطہ قائم ہونے کے بعد حالی ایک اور ہی طرح کے انسان بن گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۹ء میں حالی نے اپنی شہرۂ آفاق اُردو نظم 'مدوجزرِ اسلام' (یا 'مسدس حالی')، مکمل کی، جس کو خواجہ حالی نے خود شائع کیا اور اس کے بعد وہ سرسید کے اُردو میگزین 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوئی۔ مسدس حالی نے برصغیر میں جدید اُردو شاعری کی بُنیاد ڈالی اور اس کے مصنف کی حیثیت کو اسلامیانِ ہند میں جدید خطوط پر اسلامی اُردو شاعری کے بانی کے طور پر مستحکم کیا۔ حالی کے بعض مداحین نے اُنھیں اُردو شاعری کے کولڈ اسمتھ اور اُردو نثر کے لارڈ میکالے کے خطابات دیے ہیں۔ 'مسدس' نے حالی کے نام کو اُردو اور اسلامی لٹریچر ہی میں لافانی نہیں بنایا بلکہ اس نے سرسید کے مشن اور علی گڈھ تحریک کو بھی بے پناہ فائدہ پہنچایا۔ اس نے سوچنے والے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور ان کو ان کی خوابِ غفلت سے

بگاڑ دیا۔ مسدس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ مسدس حالی کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ [illegible]
کی حکمران خاتون ریاست بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کے بعض اشعار [illegible]
مصور کیا تھا۔ مولانا حالی کو شمس العلماء کا خطاب ۱۹۰۴ء میں ملا تھا۔ اسلوب بیان کی سادگی و [illegible] کی زبان
کی شگفتگی اور ادیبانہ طرز تحریر میں سرسید، مولانا آزاد اور علامہ شبلی اپنی اپنی جگہ خواہ حالی سے بڑھ کر
تو ہوں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مخلص، صادق البیان، سنجیدہ اور سائنٹفک انداز کے [illegible]
جن کی تحریروں میں فلسفیانہ گہرائی اور اپنے مضمون سے مکمل مناسبت ہے، حالی ان سب سے بازی
لے گئے ہیں۔

۱۸۸۸ء میں مولانا حالی کو ان کی ادبی و اصلاحی خدمات کے صلے میں نظام حیدرآباد دکن کی
حکومت نے ان کی عمر بھر کے لیے ۷۵ روپے (جو بعد کو سو روپے کر دی گئی تھی) ماہوار کی پنشن عطا کی
تھی۔ خواجہ حالی نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں ہمیشہ ایک روح پرور اردو نظمیں
پڑھیں۔ مولانا حالی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اور وہ درگاہ حضرت شاہ بو علی قلندر پانی پت میں دفن ہوئے۔ ان
کے معروف ترین ادبی کارناموں کی تفصیل یہ ہے۔ (نثر میں) ”تریاق مسموم“ (۱۸۶۵ء) [illegible] محمدی
پر تبصرہ“، ”مولود شریف“ (۱۸۶۴ء)، ”طبقات الارض“، ایک فرانسیسی تصنیف کے عربی ترجمے سے
اردو میں ترجمہ، ”مجالس النساء“ (۱۸۷۴ء) حالی کی واحد ناولٹ، ”حیات سعدی“، ”یادگار غالب“،
”حیات جاوید“، ”مقدمہ شعر و شاعری“ (ان کے دیوان کا نثری دیباچہ) اور ”مقالات حالی“ (ان کے مضامین
کا مجموعہ جسے ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے شائع کیا)۔ (نظم میں) ”مسدس حالی“، ”شکوۂ ہند“، ”دیوان غزلیات“
اور ان کی نیچرل اور نیشنل نظموں کا مجموعہ۔ ان کی کلیات (ان کے عربی، فارسی اور اردو منظوم اور نثری کارناموں
کا مجموعہ) ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ”حیات خسرو“ بھی حالی کی ابتدائی تالیفات میں سے ہے۔ حالی
کی اردو رباعیات بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں ہیں۔ مولانا حالی نثر کے بجائے نظم کے میدان میں زیادہ مقبول
ہوئے کیونکہ ان کی نثر میں ادبی چاشنی و شگفتگی کم اور سائنٹفک واقفیت زیادہ ہے۔

(۲)

علامہ شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڈھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک باکمال انسان تھے۔ ایک

زبردست عالم، مصنف اور فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے شاعر، ایک ادیب اور عربی کے
[illegible] ایک نقاد، فلسفی، مورخ و سوانح نگار۔ اُن کی نہایت معروف
کتابوں کے نام یہ ہیں: المامون، سیرت النعمان، الفاروق، علم الکلام، الغزالی، الکلام،
سوانح مولانا روم، [illegible] سفرنامہ مصر و شام و روم، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم۔
[illegible] دونوں کتابیں علم الکلام اور الکلام میں شبلی نے یونانی فلسفہ کے نقائص بیان کئے
خصوصیت شعر العجم کی پانچ ضخیم جلدوں میں شبلی نے جو فارسی ادب و شاعری کا عالمانہ جائزہ لیا
ہے وہ تین تک سے پہلے ایک حوالے کی کتاب بن گئی ہے۔ علامہ شبلی نے ردِ
وہابیت میں رسالہ بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں کے ایک رسالہ کے جواب میں لکھا تھا۔ ان کے
موازنہ انیس و دبیر نے اُن کے ایک عظیم ادبی نقاد ہونے کی شہرت میں اضافہ کیا اور برصغیر میں اعلیٰ علمی و
ادبی حلقوں میں ان کا بڑا چرچا ہوا۔ ان کی ان تصانیف نے ہمارے شعری شعور کی بڑی اصلاح کی۔ ان کا
مقالہ جس میں کتب خانہ اسکندریہ کی متعصب عیسائی پادریوں کے ہاتھوں تباہی پر مشہور تحقیقی
مضمون ان کے تبحرِ علمی اور منصف تنقید نگاری کا شاہکار ہے۔ ان کی نامکمل سیرۃ النبیؐ، جس کو ان
کے جانشین علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا، کا متعدد زبانوں، مثلاً ترکی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ۱۸۹۴ء میں ملا تھا اور وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی منتخب ہوئے
تھے۔ جب وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں پروفیسر تھے تو وہاں اُن کا پروفیسر آرنلڈ سے بہت
قریبی رابطہ قائم ہو گیا تھا جن سے شبلی نے فرانسیسی زبان سیکھی تھی۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید احمد خاں کی
وفات کے بعد علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ سے ترکِ تعلق کر کے حیدر آباد دکن چلے
گئے تھے۔ جہاں سے اُن کی تاحیات تین سو روپے ماہوار کی پنشن مقرر ہو گئی تھی۔ دکن سے واپسی پر
شبلی نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی تھی۔ علامہ شبلی کا انتقال اعظم گڑھ میں ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

اس امر کا اعادہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ شبلی بڑے حسن شناس بھی تھے۔ وہ دلفریب
موسیقی اور نسوانی حسن کے مداح تھے۔ وہ مسلم خواتین کے پردے سے باہر آنے کے مخالف نہ تھے۔ بمبئی کے
سلیمانی بوہرہ تعلیم یافتہ اعلیٰ خاندان کی ایک نوجوان حسین خاتون عطیہ بیگم (جو وزیر اعظم حیدر آباد دکن،
سر اکبر حیدری کی سالی تھیں اور ضعیف العمری میں کراچی میں فوت ہوئیں) سے ان کے قریبی تعلقات عام طور
پر لوگوں کو معلوم ہیں۔ عطیہ بیگم کو اہالیانِ کراچی عطیہ فیضی رحمین کے نام سے جانتے ہیں۔ فیضی رحمین ایک
معروف یہودی پینٹر تھے جو بمبئی میں مسلمان ہو گئے تھے اور اُنھوں نے عطیہ بیگم سے شادی کر لی تھی۔

(۳)

مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی

اُن کا پورا نام محی الدین احمد تھا، کُنیت ابوالکلام تھی اور آزاد تخلص تھا۔ اُن کا آبائی گھر ضلع لاہور کے ایک قصبہ قصُور میں تھا۔[1] اُن کا اپنا گھر دہلی میں تھا لیکن وہ بیشتر کلکتہ میں رہتے تھے۔ وہ مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور دہلی میں، جبکہ وہ حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم تھے، ۱۹۵۶ء میں فوت ہوئے۔ بچپن میں اُن کا عُرف فیروز بخت تھا۔ بچپن کا یہ زمانہ مولانا ابوالکلام نے مکہ معظمہ اور مدینۂ منورہ میں گزارا تھا۔ ابھی وہ چودہ سال کے ہی تھے کہ وہ جامعۂ ازہر، قاہرہ سے فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین ایک معروف صوفی تھے جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں برِ صغیر میں وارد ہوئے تھے اور شہنشاہ اکبر کے ایک دودھ شریک بھائی مرزا عزیز کوکلتاش کی زیرِ سرپرستی آگرے میں مقیم ہو گئے تھے۔ شیخ جمال الدین نے اکبر کے نئے مذہب 'دینِ الٰہی' کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مولانا آزاد کے والد، مولانا خیر الدین اپنے وقت کے بنگال میں بڑے صوفی اور پیر تھے، جہاں ان کے بہت مُرید تھے۔ آزاد کی والدہ کا تعلق مدینۂ منورہ سے تھا۔ اس طرح آزاد کا تعلق اپنے والد اور والدہ دونوں کی جانب سے عرب سے تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہندوستان میں ہنگامے کے باعث مولانا خیر الدین کو کئی سال تک عرب میں مقیم رہنا پڑا۔ جس کے بعد سلطان عبد الحمید فرمانروائے ترکی نے اُنھیں قسطنطنیہ (اب استنبول) بُلا لیا۔ مولانا خیر الدین ترکی میں تین سال تک مقیم رہے، جس کے دوران سلطان ترکی نے اُنھیں ترکی سے عرب تک جانیوالی مشہور 'نہر زبیدہ' کی مرمت کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا خیر الدین ترکی سے واپس کلکتہ آئے اور وہیں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے۔ ان کی متعدد عربی تصانیف مصر میں شائع ہوئی تھیں۔

اُردو کے ایک اہلِ قلم کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام کا تعلق سر عبد القادر کے جدید اُردو مدرسۂ فکر سے تھا جس کا مرکز لاہور تھا۔ آزاد کی ادبی و صحافی زندگی کا عملاً آغاز اُن کی اُردو اخبار 'وکیل'، امرتسر کی ادارت سے ہوا۔ اُس وقت وہ اُردو کے مشہور ماہنامہ 'مخزن'، لاہور، میں بھی لکھا کرتے تھے، جس کے مدیر خود سر عبد القادر تھے۔ مولانا آزاد نے اپنا مشہور اُردو اخبار 'الہلال'، کلکتہ سے جنگِ طرابلس کے دوران نکالا

---

[1] اب حکومت پاکستان نے اُسے ایک ضلع کی حیثیت دے دی ہے۔

تھا، جس کی اشاعت نے آزاد کو برِ صغیر میں ایک مسلم لیڈر کی حیثیت دے دی۔ مولانا ابوالکلام غیر معمولی خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک متبحر عالم، بے مثال ادیب، ماہرِ زبان، نقیبہ، صحافی، اہلِ قلم، مقرر، مفکر اور فلسفی تھے۔ مذہبی طور پر وہ مسلم ہند کے ایک مسلّمہ امام اور سیاسی حیثیت سے چوٹی کے مسلم لیڈر تھے۔ اُردو کے مصنف اور اہلِ قلم کی حیثیت سے وہ ایک خاص طرزِ انشائی کے موجد تھے، جسے "ابوالکلامی اُردو" کا نام دیا گیا جس میں عربی و فارسی الفاظ و اصطلاحات کی بھر مار نے اُسے محض اسلامی قانون و فلسفہ کی عالمانہ کتابوں کے لیے مختص کر دیا تھا، لیکن وہ ادب و تاریخ نویسی کے لیے یقیناً موزوں نہ تھی۔ اس طرزِ انشائی نے، جو بظاہر نہایت پُر شکوہ و بلند آہنگ تھا، بہت سے مبتدی اہلِ قلم کو گمراہ کر کے بے معنی طرزِ تحریر پر ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ نیاز فتحپوری نے اسی "ابوالکلامی اُردو" کے مشکل اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی تھی۔ قومی پریس، میرٹھ، نے مولانا ابوالکلام کے مضامین کے مجموعہ کو متعدد جلدوں میں شائع کیا تھا۔

"الہلال" کے بعد مولانا ابوالکلام کا دوسرا عظیم اُردو صحافتی کارنامہ "البلاغ" کلکتہ تھا جس نے "اُردو صحافت" کا وقار و معیار بلند کیا۔ مولانا آزاد کی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں :- "دعوتِ حق"، "دعوتِ عمل"، "اتحادِ اسلامی"، "لمحاتِ صداقت"، "تذکرہ"، "ترجمان القرآن" (نامکمل) اور "خطبات و مضامین"، "غبارِ خاطر"، "قولِ فیصل"، "مسئلہ خلافت" وغیرہ

مگر افسوس کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے "مسلمانوں کی بدنصیبی سے" اپنے لیے سیاست کی راہ پسند کی بجائے ایک عظیم دینی رہنما کے، جس کے لیے وہ بیحد موزوں تھے، اور سیاست میں بھی اُنھوں نے بدقسمتی سے مُسلم ہندوستان کی اکثریت کے خلاف (جس نے پاکستان بنایا) ہندوستان کی ہندو سیاست کی اسلامی مفاد کے خلاف ہمنوائی کی۔ اس طرح مولانا ابوالکلام نے ملّتِ اسلامیہ کے خلاف کام کیا اور وہ آخر تک قیامِ پاکستان کے مخالف رہے۔ اس ملت کشی کے انعام کے طور پر وہ ہندوستان کی ہندو کابینہ میں وزیرِ تعلیمات بنا دیئے گئے تھے۔

(۴)

سید سلیمان ندوی

آپ صوبہ بہار کے گاؤں دیسنہ میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے اور اتفاق دیکھئے کہ اسی تاریخ کو

۱۹۵۳ء میں کراچی میں وفات پائی۔ آپ کا تعلق زیدی سادات کے خاندان سے تھا۔ آپ نے پھلواری شریف، دربھنگہ اور دارالعلوم ندوہ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نے ماہنامہ "الندوہ" جاری کیا تو اس کی دیکھ بھال کا کام ان کے ہی سپرد ہوا۔ آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے چلائی جانے والی ہر تحریک میں حصہ لیا۔

سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی کے بحیثیت سربراہ 'دارالمصنفین، اعظم گڑھ' اور اس کے آرگن 'معارف' کے مدیر، نہایت موزوں جانشین تھے۔ اُنھوں نے علامہ شبلی کے اسلوبِ تحریر کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ سید سلیمان ندوی کی بعض تصانیف یہ ہیں: "حیاتِ شبلی"، "رحمتِ عالم"، "نقوشِ سلیمانی"، "خطباتِ مدراس"، "ارض القرآن"، "سیرۃ النبیؐ" (جلد سوم تا ہفتم)، "خیام"، "سیرۃ عائشہؓ" اور "لغاتِ جدیدہ" وغیرہ۔ تقسیمِ ہند کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی ہجرت کر کے ہندوستان سے کراچی آ گئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

(۵)

مولوی عبدالسلام ندوی

سید سلیمان ندوی کے پاکستان چلے آنے کے بعد، ان کی جگہ بحیثیت سربراہ 'دارالمصنفین، اعظم گڑھ'، مولانا عبدالسلام ندوی نے سنبھالی۔ اُنھوں نے حسبِ ذیل تصانیف کے ذریعہ سے اُردو ادب کی بیش قیمت خدمت کی ہے: "سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ"، "اسوۂ صحابہؓ"، "ابن یمین"، "انقلاب الامم" اور "التربیت الاستقلالیہ" وغیرہ۔ مولوی حکیم عبدالحیؒ، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے "تذکرہ گلِ رعنا" کی طرح مولوی عبدالسلام ندوی کے تذکرہ "شعرالہند" کی بھی اُردو کے ادبی حلقوں میں بڑی تعریف ہوئی ہے۔

(۶)

مولوی عبدالماجد فلسفی دریابادی

مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر کے فرزند ہیں ۱۸۹۲ میں پیدا ہوئے۔ وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی (ہندوستان) ہے۔ بی اے کے بعد والد کے انتقال کے سبب تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے منسلک ہو گئے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے روحانی عقیدت تھی اور ادب میں سنجیدہ ادب کا اضافہ کیا۔

فلسفہ میں ان کے استغراق و تبحر کے باعث مولوی عبدالماجد کا خطاب ہی 'فلسفی' ہوگیا تھا۔ اُن کی معروف تصانیف یہ ہیں :۔ 'فلسفۂ جذبات'، 'فلسفۂ اجتماع'، 'تاریخ اخلاق یوروپ'، 'مکالماتِ برکلے'، 'تصوفِ اسلام'، 'پیامِ امن' اور 'فلسفیانہ مضامین' وغیرہ۔ مولانا عبدالماجد اُردو کے مسلّمہ نقاد تھے۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ مولوی عبدالماجد نے مصحفی کی 'مثنوی بحرالمحبت' کو اپنے قابلِ قدر مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اُن کا عظیم کارنامہ اُن کا لاجواب اُردو ترجمہ و تفسیر قرآن ہے، جو انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ مولانا عبدالماجد عرصے تک حیدرآباد (دکن) میں مقیم رہنے کے بعد لکھنؤ واپس آئے، جہاں سے اُنھوں نے ایک اُردو جرنل 'سچ' کے نام سے جاری کیا تھا جس کا نام بعد کو اور پھر صدق جدید کو یا گیا تھا۔

(۷)

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر لاہور

شیخ عبدالقادر قصور (ضلع لاہور) میں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اسلامیہ کالج میں پروفیسر اور لاہور کے انگریزی ہفت روزہ اخبار 'آبزرور' کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ لاہور کے مشہور اُردو ماہنامہ 'مخزن' کے بھی مدیر رہے۔ تقریباً دس سال تک وہ لائل پور (اب فیصل آباد) میں گورنمنٹ ایڈووکیٹ رہے تھے۔ پھر وہ مختلف اوقات میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج، پنجاب کی مجلس مقننہ کے صدر، حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم، پنجاب کے گورنر کی مجلس عاملہ کے رکن، پنجاب یونیورسٹی کے فیلو، جنیوا میں مجلس اقوام کے ایک ہندوستانی مندوب، لندن میں سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کے ایک رکن اور دہلی میں وائسرائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن رہے تھے۔ اُردو کے ایک مُربّی کی حیثیت سے سر عبدالقادر جدید مدرسۂ فکر اُردو، لاہور کے بانی مشہور ہیں۔ وہ 'انجمن ارباب علم پنجاب'، لاہور کے بھی صدر اور سرپرست تھے۔ ۱۸۹۸ء میں اُردو نثر و نظم پر ان کے مختلف اوقات میں دیئے ہوئے انگریزی خطبات کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اُنھوں نے علامہ اقبال کی 'بانگِ درا' اور حفیظ جالندھری کے 'شاہنامۂ اسلام'، دونوں پر مقدمے لکھے تھے۔ اُن کے رسالہ 'مخزن' میں طبع شدہ اُردو مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ لیکن ان کے بیٹے جسٹس منظور قادر نے ادبی حیثیت سے کوئی مقام حاصل نہیں کیا اور وہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ کے طور پر بھی قطعی ناکام رہے۔

(۸)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن سیوہارہ (ضلع بجنور، یوپی، بھارت) کے رہنے والے تھے اور وہیں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے وہ ایک عظیم ماہر لسانیات تھے اور دنیا کی کم و بیش پندرہ مختلف زبانیں جانتے تھے۔ یہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اردو میں انگریزی طرز کی فاضلانہ محاسن نگاری کی بنیاد ڈالی۔ وہ نقادِ سخن کی حیثیت سے بڑے بلند مقام پر فائز تھے قیام یورپ کے دوران وہاں کے مشہور شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے ان کی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ میں بہت وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ کے قیام اور اس کی دستور سازی میں ان کا ہاتھ تھا۔ دیوان غالب کے نسخہ حمیدیہ (بھوپال ایڈیشن) پر، ان کا فکر انگیز مقدمہ، اردو ادب میں کلاسیکی حیثیت کا حامل ہے۔ مگر افسوس کہ ڈاکٹر بجنوری جوانی ہی میں ۱۹۱۹ء میں فوت ہو گئے تھے۔

(۹)

ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی گورکھپوری

۱۸۷۵ء - ۱۹۲۱ء

ایم مہدی حسن علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے انڈر گریجویٹ اور تحصیلدار تھے۔ وہ اردو ادب میں ایک شگفتہ و صاحب طرز انشاء پرداز کی حیثیت سے معروف ہیں، وہ علم الاعضاء کے پروفیسر کی طرح اردو میں نسوانی حسن کے جائزے اور توضیح کے معاملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اردو میں طرزِ بیان مولانا محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی دہلوی کے ادب کا مجموعی طور پر عکاس تھا۔ ماہنامہ 'نقاد' آگرے کے ابتدائی پرچوں میں شائع شدہ ان کے ادبی مضامین کے باعث انھیں غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'افاداتِ مہدی' کے نام سے اور ان کی خط و کتابت 'خطوطِ مہدی' کے عنوان سے دونوں شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۰)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

سنہ ۱۸۶۹ء - سنہ ۱۹۶۱ء

مولوی عبدالحق ہاپڑ (ضلع میرٹھ، یوپی، بھارت) میں سنہ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ سے سنہ ۱۸۹۵ء میں گریجویشن کیا، جہاں وہ سرسید احمد خاں کے منظورِ نظر رہے اور جہاں اُنھیں یونیورسٹی کے بہترین مضمون نگار ہونے کے صلے میں 'لینڈٹون تمغہ' ملا تھا۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد عبدالحق نواب محسن الملک کے ساتھ علی گڈھ سے حیدرآباد (دکن) گئے جہاں وہ مدرسۂ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ وہاں مختلف اوقات میں دارالترجمہ کے ڈائریکٹر، انسپکٹر تعلیمات، اور عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن) کے شعبۂ اُردو کے سربراہ بنا دیئے گئے۔ یہ مولوی عبدالحق کی مساعیِ جمیلہ کا ہی نتیجہ تھا کہ اُس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۳ء سے (مولوی عزیز مرزا کی وفات کے بعد) وہ 'انجمن ترقیِ اُردو' کے اعزازی سیکریٹری اور اس کے سہ ماہی آرگن 'اردو' کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ مولوی عبدالحق (جن کو اُردو زبان و ادب کی خدماتِ جلیلہ کے صلے میں اعزازی ڈاکٹریٹ ملی تھی) ایک عظیم نقاد اور اپنے عہد کے سب سے بڑے اُردو ادیب تھے۔ وہ صحیح معنی میں مولانا حالی کے جانشین تھے، مگر ان کا اسلوب حالی کے خشک اندازِ تحریر کی نسبت زیادہ شگفتہ تھا۔ تنقید نگاری میں اُن کا معیار بہت بلند تھا۔ اُنھوں نے بے شمار کتابوں پر 'مقدمے' لکھے تھے جس کے باعث لوگ اُنھیں ازراہِ تمسخر 'مقدمہ باز' کہتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ مع 'انجمن ترقیِ اُردو' اور سہ ماہی رسالہ 'اُردو' کے دہلی چلے آئے تھے، لیکن سنہ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد وہ کراچی آ گئے تھے، جہاں ان کا سنہ ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا۔ اُردو زبان و ادب کی ان کی عظیم خدمات کے صلے میں قوم نے اُنھیں محبت سے 'بابائے اُردو' کا لقب دیا۔ کراچی میں اُردو کالج انھی کے نام نامی سے قائم ہے جس کو اُردو یونیورسٹی بنانے کی مساعی جاری ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تصانیف: قواعدِ اُردو، اُردو لغات، مصطلحاتِ اُردو، 'چند ہمعصر' اور 'مقدماتِ عبدالحق' (دو جلدیں)، وغیرہ۔

(۱۱)

پروفیسر مولوی حامد حسن قادری

۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ رام پور میں تعلیم حاصل کرکے سینٹ جان کالج آگرہ میں صدر شعبہ فارسی و اردو رہے۔ حامد حسن قادری ادیب انشا پرداز اور نقاد تھے ان کا سب سے بڑا کارنامہ "داستان تاریخ اردو" ہے جو نثر نگاری کی سب سے مکمل اور جامع تاریخ ہے ۱۹۶۴ء میں کراچی میں انتقال کیا انہوں نے بچوں کیلئے ایک اُردو اخبار "سعید" کئی سال تک کانپور سے شائع کیا تھا۔ اُن کی بعض تصانیف یہ ہیں: "کمالِ داغ"، "نفطرتِ اطفال"، "تاریخِ مرثیہ گوئی"، "رباعیان"، "زندگی"، اور متعدد مضامین اور مختصر افسانے وغیرہ۔

(۱۲)

پروفیسر محمود خاں شیرانی

(پیدائش ٹونک ۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء وفات و مدفن ٹونک ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء عمر ۶۶ سال)

محمود شیرانی کا تعلق پٹھانوں کے ایک قبیلہ شیرانی سے تھا۔ ان کے آبا و اجداد سلطان محمود غزنویؒ کی فوج میں شامل ہوکر فتح سومناتھ کے بعد کھاٹو (راجپوتانہ۔ انڈیا) میں آباد ہو گئے جو مسلم ریاست ٹونک کے قریب ہے۔ بعد میں اسی قصبہ کے نزدیک اُنھوں نے اپنی الگ بستی "ڈھائی شیرانیان" بنا لی جو "شیرانی آباد" کے نام سے مشہور ہوئی۔

محمود شیرانی کے والد منشی اسمٰعیل خاں نواب ٹونک کے مختار عام تھے اور ریاست کے اُمراء میں شمار ہوتے تھے۔ بچپن میں رواج کے مطابق محمود شیرانی کو قرآن حفظ کرایا تھا اور اُردو اور فارسی کی تعلیم دی گئی۔ ۱۸۹۶ء میں جودھپور سے مڈل پاس کرکے وہ اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے منشی کا امتحان ۱۸۹۸ء میں منشی عالم ۱۸۹۹ء میں اور منشی فاضل ۱۹۰۱ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ پھر ۱۹۰۴ء میں جودھپور سے میٹرک کا پاس کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۰۴ء میں ہی بیرسٹری کے لئے انگلستان گئے جہاں انہوں نے لنکنز ان میں داخلہ لیا لیکن دسمبر ہی میں شدید علالت کے باعث تعلیم معطل ہوگئی جولائی ۱۹۰۶ء میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ وطن واپس آ گئے لیکن اسی سال کے ماہ دسمبر میں وہ ہی تعلیم کی تکمیل کے لئے واپس انگلستان گئے۔

مگر جب بھائیوں نے اخراجات کے لئے رقم بھیجنا بند کردی تو مجبوراً تعلیم کو خیر باد کہہ کے تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ پروفیسر آرنلڈ کے توسّل سے انہیں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں کام مل گیا جس کے ساتھ ساتھ وہ قلمی کتب اور علمی نوادرات کا لندن میں کاروبار کرنے لگے۔ اِس طرح محمود شیرانی کوئی ڈگری نہ لے سکے۔ لندن میں اُنہیں سید علی بلگرامی، جسٹس امیر علی، علامہ اقبال، اور سر عبدالقادر وغیرہ اکابر کی محبت و صحبت حاصل ہوئی اور وہ لندن میں پان اسلامک سوسائٹی کے سیکریٹری رہے۔ ۱۹۰۸ء میں قلمی کتب اور مشرقی نوادرات میں مہارت کی بنا پر انہیں لندن کی مشہور فرم لیوزک نے گراں مشاہدے پر اپنا مشیر مقرر کیا اور ۱۹۱۳ء میں ہندوستان بھیجا۔ لیکن جنگِ عظیم اوّل کے آغاز کے باعث یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں وہ ٹونک چھوڑ کر اپنے آبادی وطن ڈھائی شیرانیاں چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال اور سر عبدالقادر کی مدد سے وہ اسلامیہ کالج لاہور میں اُردو کے لکچرار ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں وہ پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج لاہور میں اُردو کے پہلے لکچرار مقرر ہوئے جہاں سے وہ ۱۹۴۰ء میں سبکدوش ہو کر ۱۹۴۱ء میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ انڈیا) واپس چلے گئے۔ انہوں نے عرصے تک شدید علیل رہنے کے بعد ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو ٹونک میں وفات پائی اور اور وہیں دفن ہوئے۔ مشہور اُردو شاعر داؤد خاں (اختر شیرانی) آپ کے اکلوتے فرزند تھے۔

محمود شیرانی کی بعض معروف تصانیف حسبِ ذیل ہیں :-

۱:- پنجاب میں اُردو، ناشر انجمن ترقی اُردو - اسلامیہ کالج - لاہور - بار اوّل ۱۹۲۸ء

۲:- مجموعہ نغز (مرتبہ) پنجاب یونیورسٹی - لاہور ۱۹۳۳ء

۳:- سرمایۂ اُردو (مرتبہ) - پنجاب یونیورسٹی - لاہور ۱۹۲۵ء

۴:- تنقید شعر العجم - انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۲ء

۵:- پرتھی راج راسا - انجمن اُردو (ہند) دہلی ۱۹۴۳ء

۶:- خالق باری - انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی ۱۹۴۴ء

۷:- مقالات شیرانی - کتاب منزل لاہور ۱۹۴۸ء

۸:- مقالات حافظ محمود شیرانی - مجلس ترقیِ ادب - لاہور - جلد اوّل ۱۹۶۶ء تا جلد دہم (زیر طبع) ۱۹۸۰ء

۹:- مکاتیب حافظ محمود شیرانی - مجلس یادگار - حافظ محمود شیرانی - زیر طبع - ۱۹۸۰ء

ان کے علاوہ محمود شیرانی کے بے شمار علمی، ادبی و تنقیدی مضامین مختلف ماہناموں میں شائع ہوئے۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی اُردو کے عظیم محقق، ادیب و ناقد تھے (جناب مشفق خواجہ کراچی کے شکریہ کے ساتھ)

(۱۳)

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ لکھنوی

آپ نسباً سید تھے۔ ۱۸۹۳ء میں بہرائچ میں پیدا ہوئے ان کے والد سید مرتضیٰ حسین صاحب علم اور طبابت کا پیشہ کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۷۵ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ وہ کم وبیش تین درجن کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں :۔ امتحانِ وفا، فرہنگِ امثال، فیضِ میرؔ، مجالس رنگین، دلستانِ اُردو، روحِ انیسؔ، نظامِ اُردو، اور جواہرِ سخن (دو جلدیں) وغیرہ۔ ادیبؔ لکھنوی نے آزاد کے اسلوبِ انشاء پردازی کے نقل کی سعیِ مشکور کی ہے۔

(۱۴)

ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زورؔ

آپ ۱۹۰۴ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اور لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرکے جامعہ میں ہی پروفیسر مقرر ہو گئے ڈاکٹر زورؔ نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی۔ آپ ایک عظیم اردو ادیب اور معروف نقاد تھے۔ ان کی مشہور تصانیف کے یہ نام ہیں۔ اُردو شہ پارے، اردو کے اسالیب بیان، سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب، روحِ تنقید (یہ آپ کی معرکۃ آرا کتاب ہے) گارساں دتاسی GARCIN DE TASSI، گلزارِ ابراہیم، مرقعِ سخن، بادۂ سخن، کیفِ سخن اور متاعِ سخن وغیرہ۔

(۱۵)

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پورا نام عبادت یار خاں۔ قلمی نام عبادت بریلوی۔ پیدائش بریلی (روہیلکھنڈ۔ یو پی۔ انڈیا) ۴ اگست ۱۹۲۰ء۔ تعلیم ایم اے، پی اے آنرز (۱۹۴۱-۴۲ء) پی ایچ ڈی (۱۹۴۶ء) لکھنؤ یونیورسٹی۔ سابق صدر شعبہ اُردو اینگلو عربک کالج دہلی یونیورسٹی (۱۹۴۴ء - ۱۹۵۰ء) اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ پروفیسر اُردو

اور پرنسپل (۱۹۵۰ء - ۱۹۸۰ء)۔ سابق اُستاد اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی۔
مطبوعات، اُردو تنقید کا ارتقاء (۲) تنقیدی زاویے۔ (۳) غزل اور مطالعۂ غزل۔ (۴) روایت کی اہمیت۔
(۵) تنقیدی تجربے۔ (۶) جدید شاعری۔ (۷) مومن اور مطالعۂ مومن۔ (۸) غالب اور مطالعۂ غالب (۹) میر تقی
میر (۱۰) ولی اورنگ آبادی۔ (۱۱) شاعری اور شاعری کی تنقید۔ (۱۲) ادب اور ادبی قدریں وغیرہ وغیرہ۔
(چالیس سے زائد تصانیف) ۱۹۸۲ء میں خواجہ میر درد پر کام کر رہے تھے۔

ترقی پسند اُردو تنقید نگاری

اختر حسین رائے پوری کا تنقیدی مضمون 'زندگی اور ادب' ہر چند کہ اُردو میں ترقی پسند تنقید نگاری کا صحیح ترجمان تسلیم کیا گیا ہے لیکن خود اُس پر کڑی تنقید کی گئی ہے کیونکہ اس میں عام طور پر اُردو شاعری اور خاص کر علامہ اقبال کے ساتھ ناروا بے انصافی سے کام لیا گیا ہے۔ اختر رائے پوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ادب اور انقلاب' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اپنے مذکورہ صدر مضمون میں اختر رائے پوری نے علامہ اقبال پر فاشسٹ ہونے کا الزام لگایا تھا اور اُن پر متواتر سخت اعتراضات کے باوجود اُنھوں نے اپنے اس الزام کو واپس نہیں لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر رائے پوری علامہ اقبال کے فلسفہ اور پیغام کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ورنہ اختر رائے پوری کے علاوہ 'ترقی پسند' اہلِ قلم اور شعراء کی اکثریت نے علامہ اقبال کی ادبی لیڈر شپ کو دل کھولکر خراجِ تحسین پیش کیا ہے، مثلاً دیوندر ستیارتھی کا مختصر افسانہ 'میری زندگی کا ایک ورق' اور فیض وغیرہ کی نظمیں۔ پروفیسر احمد علی کا مضمون 'ادب کا ترقی پسند نظریہ' ترقی پسندوں میں اُردو میں ترقی پسند تنقید نگاری کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر احمد علی کے بعد دیگر مسلّمہ ترقی پسند اُردو نقاد احتشام حسین، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، عصمت چغتائی، سید سبطِ حسن، کرشن چندر (متوفی مارچ ۱۹۷۷ء) اور سید وقار عظیم وغیرہ ہیں۔

سید وقار عظیم (متوفی ۱۹۷۶ء) برِّصغیر جنوبی ایشیا میں 'ترقی پسند' ادیبوں کی تحریک کے بانیوں میں سے تھے، جس نے تیس سال سے زیادہ مدت تک اُردو ادب پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی جو اُردو تنقید نگاری پر بھی چھائی رہی۔ وقار عظیم الہ آباد، دہلی اور پنجاب یونیورسٹیوں نیز جامعہ ملیہ، دہلی، میں پروفیسر رہے تھے اور ان کی ادبی زندگی چالیس سال پر محیط تھی جس کے دوران میں اُنھوں نے پچاس سے زائد ادبی تصانیف مُرتب کی تھیں۔ نابینا پروفیسر اقبال عظیم (جو ایک اچھے شاعر ہیں)، اُن کے چھوٹے بھائی ہیں۔

مزاح نگاری

نصف صدی سے زیادہ مدت ہوئی کہ اُردو میں مزاح نگاری کا آغاز بھوپال کے مُلّا رموزی کی 'گلابی اُردو' سے ہوا، لیکن وہ عرصے تک مقبولِ عام نہ رہی۔ اِس سے بھی پہلے اردو کے مشہور میگزین 'اودھ پنچ، لکھنؤ' (جو ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا) نے اُردو میں تنقید نگاری، پیروڈی، طنز و مزاح نگاری کو فروغ دیا، جو عرصے تک مقبولِ عام رہا۔ اُردو کے بہترین طنز و مزاح نگار (مع پیروڈی) یہ لوگ رہے ہیں:- منشی سجاد حسین، مُلّا رموزی، میاں عبدالعزیز فلک پیما، سید احمد شاہ بُخاری 'پطرس'، مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سید امتیاز علی تاج، مرزا عظیم بیگ چغتائی مرزا اسلم مشتاق احمد یوسفی (چراغ تلے، زرگزشت خاکم بدہن وغیرہ) وغیرہ۔

(۱)

منشی سجّاد حسین

۱۸۵۶ء - ۱۹۱۵ء

منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں اپنی ہی زیرِ ادارت اُردو کا بہترین و مقبول ترین اخبار 'اودھ پنچ' لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ آج تک اُردو میں اودھ پنچ کا کوئی رقیب پیدا نہ ہو سکا اور نہ کسی اور اُردو جریدے نے اس موضوع پر اس سے بہتر ادب پیش کیا۔ سجاد حسین نے اُردو ناول بھی لکھے تھے: جیسے 'طلسمی فانوس'، 'طرحدار لونڈی'، 'کایا پلٹ'، 'میٹھی چھری'، 'حاجی بغلول'، 'پیاری دُنیا'، اور 'احمق الذی'۔

(۲)

پروفیسر رشید احمد صدّیقی

رشید احمد صدیقی مُسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، میں شعبۂ اُردو کے سربراہ تھے۔ اُنھوں نے اپنی 'پیروڈی'، طنزیات و مزاح نگاری سے اُردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کا اسلوب تحریر معنی آفریں، فکر انگیز اور بیحد مؤثر تھا۔ ہندوستانی اکادمی، الہ آباد، نے اُن کی تصنیف 'طنزیات و مضحکات' اور مکتبۂ جامعہ، دہلی نے ان کے مضامین کا ایک اور مجموعہ شائع کئے تھے۔ کردار نگاری ان کی تحریروں

کی خصوصیت تھی۔ ان کی طنزیہ تحریروں میں غضب کی شگفتگی و تمسخر پنہاں ہیں۔ اور مزید خوبی یہ ہے کہ ان کے مزاح میں ہمیشہ اخلاقی محاسن کی عکاسی موجود ہوتی ہے۔ انھوں نے کبھی محض تفنن طبع کے لیے نہیں لکھا۔ اُن کی تحریروں میں ہمیشہ مقصد آفرینی ہوتی تھی اور وہ مقصد سوسائٹی کی اصلاح تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء اور تاریخ وفات ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء ہے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قبرستان میں دفن ہوئے تھے۔

(۳)

میاں عبدالعزیز فلک پیما

ہر چند کہ فلک پیما خاص طور پر طنز نویس یا مزاح نگار نہیں تھے، لیکن ان کی تمام تحریریں فلسفہ اور گہرے طنز پر منتج ہوتی تھیں، جن میں مزاح کی چاشنی مستزاد ہوتی تھی۔ یہ ایں ہمہ وہ زبان پر مکمل قدرت نہیں رکھتے تھے۔ مزید برآں اُن کی تحریروں پر مغربی اثر کا غلبہ بعض اوقات انھیں غیر مؤثر اور غیر دلچسپ بنا دیتا تھا اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ اُن کے الفاظ اُن کے خیالات کو پورے طور پر ادا نہ کر پاتے تھے۔

(۴)

سید احمد شاہ بخاری "پطرس"

سید احمد شاہ پطرس بخاری ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے پھر پرنسپل ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن اقوام متحدہ پاکستان کے مستقل نمائندے مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں امریکہ میں فوت ہوئے۔

احمد شاہ بخاری اُردو میں ہلکے پھلکے مذاق اور پیروڈی کے استاد تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ ہے ان کی تحریریں طبع زاد ہوتی تھیں، جن میں بڑا بانکپن ہوتا تھا اور ان کا مزاح بے پناہ اثر رکھتا تھا۔

پطرس کے مضامین میں اعلیٰ درجہ کی چاشنی اور تازگی ہے وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز مزاح نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

(۵)

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی کی ۱۹۰۹ء میں پیدائش ہوئی۔ ان کی عبارت میں روانی، طرزِ بیان کی دلآویزی۔ بے تکلفی سے کوئی مقالہ خالی نہیں ہوتا۔ ان کی شہرت کا سبب سودیشی ریل ہے۔
شوکت تھانوی ریڈیو پاکستان کے نہایت معروف مزاح نگار تھے اور مدتوں قاضی جی کے روپ میں لوگوں سے دادِ تحسین حاصل کرتے رہے۔
سیرت نگاری پر ان کی مشہور کتاب شیش محل ہے۔

(۶)

عظیم بیگ چغتائی

آپ آگرہ میں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی پاس کر کے ریاست جودھپور میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۴۱ء میں جب ان کا انتقال ہوا وہ بطور چیف جسٹس اپنے فرائض انجام دے رہے تھے اپنے مکالمہ اور طنز سے مزاح پیدا کرتے تھے لیکن چغتائی کا پلاٹ ہی ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور صاف ہونے کے باوجود بے کیف نہیں لہذا قاری کی دلچسپی کبھی کم نہیں ہونے پاتی انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں مگر "کولتار" اور "شریر بیوی" نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔

(۷)

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

آپ دہلی میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کر کے حیدرآباد دکن میں ملازم ہو گئے اور بطور اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری ریٹائر ہوئے۔ وہیں ۱۹۴۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ طنز و ظرافت

ان کی انشا کا طرۂ امتیاز تھا بیان کی سادگی اور زبان کا لوچ ان کی ظرافت میں چار چاند لگا دیتا۔ مشاہیر کی قلمی تصویر کشی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ "مولوی نذیر احمد کی کہانی اپنی زبانی" ان کا غیر فانی شاہکار ہے۔

(۸)

کنھیا لال کپور

"ترقی پسند" اردو ادب کنھیا لال کپور سے بہتر مزاح نگار پیدا نہ کر سکا۔ ہندوستان کا یہ شہری اردو ادیب اپنی مثال آپ ہے۔ اُنھوں نے بہت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ ان کے بعض ناقابلِ فراموش مضامین یہ ہیں: "رومان کی تلاش"، "ایک آرٹسٹ"، "چینی شاعری"، "سنا تے کا مرض"، "اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے"، اور "غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں" وغیرہ۔ وہ ان ایم راشد اور غیظ احمد غیظ وغیرہ کی نظموں کو "پیروڈی" میں تبدیل کرنے میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہے ہیں۔ چراغ حسن حسرت نے بھی "ترقی پسند" اردو مضامین کی "پیروڈی" نگاری میں کمال کیا ہے۔

["روحِ تنقید"۔ مقدمہ۔ از پروفیسر زورؔ۔ "حالیؔ" از عبدالرحمٰن سیوہاروی "زمانہ"، کانپور، جنوری سنہ ۱۹۰۷ء "نگار" فروری سنہ ۱۹۳۹ء "حالیؔ"، از فراقؔ گورکھپوری۔ "نگار"، جنوری سنہ ۱۹۲۷ء "حالیؔ اور نثر اردو"، از سید محی الدین قادری زورؔ۔ روزنامہ "اجمل" بمبئی "سالنامہ اسپیشل نمبر ۲۹" اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء "خواجہ الطاف حسین حالیؔ"، از سید جمیل احمد نقوی امروہوی "نیساں"، الہ آباد سنہ ۱۹۳۴ء "رباعیات حالیؔ"، از مرزا محمد بشیر۔ "مقدمہ بر خطوط عطیہ بیگم" مولوی عبدالحق از محمد امین، شائع کردہ "دختر ظل السلطان"، بھوپال "شبلیؔ اور اردو"، از ابواللیث صدیقی۔ "عالمگیر" لاہور سالنامہ، جون سنہ ۱۹۳۹ء "مہدی الافادی"، از عطاء اللہ پالوی۔ علی گڑھ میگزین، جنوری سنہ ۱۹۳۹ء "عبدالحق" "حدیقۂ اردو"، "ایشیا" میرٹھ فروری سنہ ۱۹۴۲ء "عظیم بیگ چغتائی"، از احتشام حسین "نگار"، لکھنؤ مئی سنہ ۱۹۳۴ء "عہدِ حاضر کے افسانہ نگار"، از حمورابی "عالمگیر" لاہور اسپیشل نمبر سنہ ۱۹۳۷ء "اردو نثر پر ایک نظر" از پروفیسر مولانا محمد طاہر فاروقی۔ "ترقی پسند ادب"، از عزیز احمد، حیدرآباد دکن، سنہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۹–۲۱۲]

۲۷

اُردو صحافت

یوروپ میں صحافت کا باقاعدہ آغاز ابتدائی سترھویں صدی سے ہوگیا تھا جبکہ ہندوستان میں انگریزی کا پہلا اخبار کلکتہ سے ۱۷۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ برِصغیر جنوبی ایشیا میں اُردو صحافت کا آغاز اس کے بیالیس سال کے بعد ہوا۔ اس طرح اُردو صحافت یوروپی صحافت سے دو صدی پیچھے رہی۔

اُردو صحافت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

(۱) اس کا پہلا دَور ۱۸۵۸ء کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا دَور ۱۸۸۸ء میں،

(۳) تیسرا ۱۹۱۰ء میں، اور

(۴) آخری دَور کا تعلق موجودہ صدی سے ہے۔

پہلا اُردو پریس (غالباً ٹائپ میں) ۱۸۱۰ء میں کلکتہ میں 'ہندوستانی پریس' کے نام سے اکرام علی نے قائم کیا تھا۔ پہلا اُردو اخبار 'خیر خواہِ ہند' کے نام سے ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا تھا جو بابٹسٹ مشن پریس، کلکتہ میں طبع ہوتا لیکن بنارس سے شائع ہوتا تھا۔ وہ ٹائپ میں چھپتا اور اس کا مالک ایک عیسائی پادری شیرمن SHERMAN نامی تھا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُردو صحافت کی ابتدائی نشو و نما عیسائی مبلغین کی مساعی کی مرہونِ منت ہے جو اس کو تبلیغِ نصرانیت کی خاطر استعمال کرتے تھے۔ مارگریٹا بارنس MARGARETA BARNES کے مطابق (دی انڈین پریس، ص ۲۳۱) سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد نے دہلی سے ۱۸۳۸ء میں غالباً اُردو کا پہلا اخبار 'سید الاخبار' کے نام سے اپنی ادارت میں نکالا تھا، مگر ایڈیٹر خود جلد فوت ہوگئے تھے۔ اُسی سال مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے 'اُردو اخبار' شائع کیا تھا، جس کے متعلق بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ اُردو کا غالباً پہلا روز نامہ تھا۔ لیکن وہ اخبار کی نسبت ایک ادبی جرنل زیادہ تھا۔ گارساں دتاسی GARCIN DE TASSI کے مطابق (لکچرز ۱۸۵۳-۵۵ء) ۱۸۵۱ء میں دہلی سے دو اور اُردو اخبارات 'قران السعدین' (ہفتہ وار مصور اخبار) اور 'فوائد الناظرین' بھی شائع ہوئے تھے، ان دونوں کے ایڈیٹر ہندو تھے۔

ابتدائی اُردو صحافت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان ابتدائی جراید اور اخبارات کے ایڈیٹر بالعموم ہندو ہوتے تھے۔ اس طرح برِصغیر کی اُردو صحافت کا آغاز و ارتقا بیشتر ہندو حضرات کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے چند سال قبل برِصغیر میں اُردو صحافت اپنے عروج پر تھی۔ پہلا اُردو پریس دہلی میں ۱۸۴۵ء میں مولوی عنایت حسین نے قایم کیا تھا جس کا نام 'دارالسلام' تھا۔ آخری مُغل شہنشاہِ ہند دہلی میں اپنی 'درباری خبریں' اُردو زبان میں 'اُردو اخبار' کے نام سے شائع کیا کرتے تھے جن کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا تھا۔ غالب نے اس کا ذکر بار بار اپنی 'اُردوے معلّٰی' میں کیا ہے اور خواجہ حسن نظامی نے اس کے بہت سے نمبر نقل کیے ہیں۔ ۱۸۵۲ء میں ریاست گوالیار (وسطی ہند) کا 'اسٹیٹ گزٹ' اُردو میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں مولانا حسن علی محدث نے ایک مذہبی جریدہ 'جلالی' کے نام سے لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں ایک اُردو ہفت روزہ اخبار 'جامِ جہاں نما' کے نام سے کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں کلکتہ سے 'احمدی' لکھنؤ سے 'خیالی' اور آگرے سے 'صدرالاخبار' جاری ہوئے تھے۔ مؤخرالذکر اُردو اخبار کا ایڈیٹر ایک عیسائی پادری فینک FENIK نامی تھا۔ ۱۸۴۷ء میں اُردو میں آگرے سے 'اسعدالاخبار' اور کلکتہ سے 'مراۃ الاخبار' نامی پرچے شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں دہلی سے دو اُردو جراید 'احمدی' اور 'حیدری' نامی شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں 'گلزارِ ہمیشہ بہار' بنارس سے اور 'مدرسہ' اور 'مالوہ اخبار' (ہفت روزہ) اُردو میں اندور (وسطی ہند) سے جاری ہوئے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں بمبئی سے 'صادق'، 'کوہِ نور' لاہور سے اور 'گلزارِ پنجاب' گجرانوالہ سے شائع ہوئے تھے۔ مؤخرالذکر دونوں اُردو جراید کے مالک اور ایڈیٹر ہندو تھے۔ ۱۸۵۱ء میں 'اُردو دہلی اخبار' (ہفت روزہ) جاری ہوا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں دہلی سے 'حنفی' (ہندو) اور 'وحیدالاخبار' لاہور سے 'چشمۂ فیض' سیالکوٹ سے 'خورشیدِ عالم' اور الہ آباد سے 'نورالابصار' نامی اُردو اخبارات شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں 'احمدی' اور 'زبدۃ الاخبار' آگرے سے، 'ذوالفقار حیدری' لکھنؤ سے 'مفادِ ہند' (سرکاری) بنارس سے اور 'ہمائے بے بہا' لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں اُردو کے پہلے اخبارات گجرات اور سُورت سے جاری ہوئے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں پہلا اُردو مزاحیہ جریدہ 'مذاق' کے نام سے رامپور سے شائع ہوا تھا۔ اُردو میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کا گزٹ اور دو قانونی جراید 'ہفت روزہ رپورٹ گیا ہے' اور 'معدن القوانین' آگرے سے جاری ہوئے تھے۔ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں برِصغیر کے مختلف مقامات سے کئی نئے اُردو اخبارات کا اجرا ہوا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں چار نئے جراید کے علاوہ پہلا اُردو روزنامہ (مذکورہ بالا تمام اُردو جراید ہفت روزہ وغیرہ تھے) 'اُردو گائیڈ' کے نام سے کلکتہ سے جاری ہوا تھا جس کے مالک

خان بہادر مولوی کبیر الدین تھے۔ اُردو صحافت کے مذکورہ بالا پہلے دور میں قریباً ۸۲ اُردو جرائد شائع ہوئے، جن میں سے چار عیسائی مبلغین کی ملکیت تھے اور ۲۳ کے مالک ہندو تھے۔

اُردو صحافت کے دوسرے دور میں حیدر آباد (دکن) پیش پیش رہا، جبکہ وہاں ۱۸۶۹ء میں پہلا اُردو جرنل، جو سرکاری آرگن تھا، "اعلامیہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ہی وہاں ایک ادبی ماہنامہ "میگزین "مخزن الفوائد" کے نام سے ۱۸۷۴ء سے جاری ہوا جس کے نگران مولوی مسیح الزماں تھے اور جو اسٹیٹ پریس میں طبع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی سید حسین بلگرامی تھے۔ ۱۸۷۸ء میں نارائن سوامی نے "مفیدِ عام" کے نام سے ایک اُردو میگزین حیدر آباد کینٹونمنٹ کی ریزیڈنسی سے اور ایک ہفت روزہ اخبار "آصف الاخبار" کے نام سے جاری کیے۔ ۱۸۸۱ء میں شیخ خدا بخش اور شیخ نظام الدین نے ایک ہفتہ وار پرچہ گولکنڈہ سے شائع کیا۔ ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۴ء کے درمیان حسب ذیل اُردو جرائد شائع ہوئے:۔ "بزمِ دکن"، "ذخیرۂ تعلیم"، "رفیقِ دکن"، "شاہِ دکن"، "شگوفہ"، "شفق"، "علوم و فنون"، "منتظم"، "شفیق"، "مذاقِ سخن"، "ہزار داستاں"، اور "پیکِ آصفی"، وغیرہ۔ اُردو صحافت کے دوسرے دور کا سب سے زیادہ مشہور اُردو اخبار "اودھ اخبار" لکھنؤ تھا جو ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا تھا اور ہمارے زمانے تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے مالک منشی نولکشور تھے۔ اس اخبار نے بہت سے اُردو اہلِ قلم کو شہرت کی معراج تک پہنچایا۔ اسی اخبار کے ذریعہ سے سرشار اور شرر بھی مقبولِ عام ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک نولکشور پریس، لکھنؤ برصغیر میں اُردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز رہا۔ نولکشور پریس کے مقابلے میں کسی اور پریس نے اسلامی لٹریچر کی اتنی خدمت نہیں کی۔ "اودھ اخبار" کے معاصر جرائد حسب ذیل تھے: "اسحاق"، جونپور، "انجمن افروز"، اور "حسینی"، دہلی۔ اور "شمس الاخبار"، "صبحِ صادق"، "طلسمِ خیالی"، اور "مدراس پنچ"، مدراس۔

۱۸۵۹ء میں دس نئے جرائد جاری ہوئے اور ۱۸۶۰ء میں ۲۳ نئے پرچے شائع ہوئے۔ ان میں سے اکثر کے ایڈیٹر اور ناشر ہندو تھے۔ ۱۸۶۰ء میں پہلا شیعہ آرگن "اثنا عشری"، لکھنؤ سے نکلا اور اُسی سال پہلا ہندی ہفتہ وار اخبار، "بریلی تت بودھانی پتریکا"، بریلی اردو ہیلکھنڈ۔ یو۔ پی۔ انڈیا سے جاری ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں بابو دکھا ہرن نے لکھنؤ سے اپنا پہلا آزاد سیاسی اخبار شائع کیا جو بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ اس کا نام "ہندوستانی" تھا اور اس کے ایڈیٹر کا نام گنگا پرشاد ورما تھا۔ اُس وقت وہ ہندوستان میں ہندو کانگریس پارٹی کا ترجمان تھا۔ اُسی سال فرنگی محل کا آرگن "نجم العلوم"، لکھنؤ سے بھی شائع ہوا۔ ۱۸۶۲ء کا مشہور اُردو جریدہ "نور العلم" تھا جس کا مقصد لوگوں کو علومِ جدیدہ کی طرف مائل

کرتا تھا۔ لالہ نرسنگھ رائے نے لاہور سے غالباً پہلا اُردو علمی میگزین 'بحرِ حکمت' نامی نکالا تھا۔ اُسی سال آگرے سے ہندو مت کا پہلا مذہبی پرچہ 'گیان پرکاش' بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں آنریبل عبد اللطیف نے 'انجمن اسلامیہ' کلکتہ سے جاری کیا۔ ۱۸۶۴ء میں بابو پیارے لال موہن بنرجی نے قانونی ماہانہ میگزین 'مخزن الفوائد' جاری کیا۔ ۱۸۶۵ء میں میٹیا برج (کلکتہ) کا 'سلطانی' اخبار اور ہنود کا ایک مذہبی پرچہ 'گیاوتی ہتر ایکا' شائع ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سرسید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کے آرگن کے طور پر شائع ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مولوی محمد اسمٰعیل تھے لیکن بعد کو خود سرسید نے اس کی ادارت سنبھال لی تھی۔ اس اخبار نے اُس وقت کی ہندوستان میں مسلم سوسائٹی کی ذہنی تربیت کے لیے بڑا کام کیا تھا۔ اُس سال کا دوسرا معروف اُردو جریدہ 'اکمل الاخبار' دہلی تھا جو حکیم اجمل خاں کے خاندان کی ملکیت تھا۔ ۱۸۶۷ء کے نئے اُردو پرچے پنڈت بنکٹ رام شاستری کا 'بدھیا بلاس' اور 'بنارس گزٹ' بنارس، 'دبدبہ سکندری' رامپور، 'صادق الاخبار' اور 'اخلاق الانوار' سہارنپور اور 'محتشم' بادرہ تھے۔ ۱۸۶۸ء کے نئے اُردو جرائد 'آگرہ اخبار' اور 'مُفیدِ عام' آگرہ تھے۔ ۱۸۶۹ء کا معروف ترین اُردو جریدہ 'جریدۂ اسلامیہ' حیدرآباد (دکن) تھا جس کے ناشر مرزا زین العابدین شیرازی تھے۔ یہ ہفتہ وار پرچہ تھا۔ ۱۸۷۰ء میں 'اتالیق پنجاب' کے نام سے ایک سرکاری تعلیمی جرنل لاہور سے شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر بابو پیارے لال اور مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ ۱۸۷۱ء کے معروف اُردو جرائد پنڈت مکند رام کا 'اخبارِ عالم' لاہور اور سرسید احمد خاں کا رسالہ 'تہذیب الاخلاق' تھے۔ موخر الذکر جریدے کے انقلابی مضامین نے ہندوستان کی پوری مُسلم سوسائٹی کو مذہبی، تعلیمی، ذہنی و معاشرتی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس رسالہ کا نام اُردو صحافت کی تاریخ میں امر ہوچکا ہے۔ اس اخبار کے مضامین کی بدولت سرسید احمد خاں کا نام ہمیشہ کے لیے اُردو کے عظیم الشان اہلِ قلم کی حیثیت سے لافانی ہوگیا ہے۔ 'تہذیب الاخلاق' نے اُردو میں ایک نئے ادبی دَور کا آغاز کیا، جس کے مضمون نگار اُس وقت کے عظیم اُردو مفکر و ادیب تھے، مثلاً حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد، محسن الملک اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ۔

۱۸۷۲ء کا سب سے زیادہ مشہور اُردو جریدہ ماہنامہ 'دہلی سوسائٹی' تھا جس کے ایڈیٹر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ تھے۔ ۱۸۷۳-۷۴ء کے دو معروف اُردو پرچے ہفت روزہ 'وکیل' امرتسر اور حیدرآباد (دکن) کا 'مخزن الفوائد' تھے۔ اول الذکر اپنے عہد کا نہایت اہم اُردو جرنل تھا، بالخصوص اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی جریدے سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ثانی الذکر پرچہ مولوی مسیح الزماں نے جاری کیا تھا مگر اس کے مدیر مولوی سید حسن بلگرامی تھے۔ ۱۸۷۵ء کے مشہور اُردو جرائد حسبِ ذیل تھے :-

'جریدۂ روزگار' مدراس۔ اور 'گلدستۂ ریاض' (ریاض خیرآبادی کا پرچہ) ۱۸۷۶-۷۷ء میں اردو کے دس نئے جرائد جاری ہوئے، لیکن ان میں مشہور ترین 'اودھ پنچ' لکھنؤ تھا جس کے مدیر منشی سید سجاد حسین تھے اور جس کے مضمون نگاروں میں ایسے معروف اہلِ قلم تھے جیسے کہ عبدالغفور شہبازؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، مولوی عبدالحلیم شررؔ اور اکبر الٰہ آبادی وغیرہ۔ 'اودھ پنچ' اردو کا بہترین مزاحیہ اخبار تھا اور اس کے پہلے ایڈیٹر منشی سجاد حسین خود زبردست مزاح نگار وادیب تھے۔

'اودھ پنچ' نے ایسے ہونہار اردو اہلِ قلم دریافت کیے جیسے کہ منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوقؔ اور نواب سید محمد آزادؔ وغیرہ۔ 'اودھ پنچ' ۱۹۲۹ء میں بند ہو گیا۔ منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد مولانا ممتاز حسین عثمانی 'اودھ پنچ' کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ مولانا عثمانی ایک عظیم ماہرِ لسانیات، زبردست خطاط اور ایک قاموسی شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے اردو شارٹ ہینڈ سسٹم کی تخلیق میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ان کے انتقال کے بعد لکھنؤ کے ایک معروف شاعر ظریفؔ لکھنوی 'اودھ پنچ' کے ایڈیٹر ہو گئے تھے، لیکن وہ اس کے تین سال کے بعد ہی بند ہو گیا۔ اسی سال شمالی ہند کا پہلا اردو روزنامہ 'قیصر الاخبار' الٰہ آباد سے جاری ہوا۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان میں ملک میں بہت سے اردو جرائد معرضِ وجود میں آئے، جن میں 'آریہ درپن' کے نام سے آریہ سماج کا اسلام کے خلاف پہلا پرچہ تھا شامل تھا۔ اس وقت کے دیگر مخالف اسلام ہندو مذہبی تبلیغی جرائد   تھے: 'آریہ بھوشن' شاہجہانپور، 'آریہ سماچار' میرٹھ، 'دھرم پرکاش' کپورتھلہ اور 'بلدیو پرکاش' آگرہ۔

سلطان عبدالحمید والیِ ترکی نے بھی اپنی 'پان اسلام' والی پالیسی کے ماتحت اردو کا ایک جریدہ 'ترجمانِ شرق' کے نام سے قسطنطنیہ (اب استنبول) سے شائع کیا تھا جس کے ایڈیٹر اسکندر آفندی تھے۔ اسی زمانے میں نارائن سوامی نے اپنا جریدہ 'آصف الاخبار' حیدرآباد (دکن) سے جاری کیا تھا۔ آریہ ہنود کے 'آریہ درپن' کی طرح اسی مخالفتِ اسلام مقصد کی خاطر ایک ہندوستانی مسلمان نے جو مرتد ہو کر عیسائی پادری بن گیا تھا، اور جس کا نام رجب علی تھا، امرتسر سے ایک اردو جریدہ 'صفیرِ ہند' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ان دونوں ہندو اور عیسائی پرچوں کے خلاف اسلام مضامین کے باعث ملک میں بڑی مذہبی بدمزگی پیدا ہوئی اور مسلمانوں کو ان کے جواب کے لیے کمربستہ ہونا پڑا۔ ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۷ء کے درمیان کا زمانہ اردو صحافت کے لیے بہت اہم ثابت ہوا کیونکہ اس دوران میں ملک میں سینکڑوں نئے جرائد وجود میں آئے۔ صرف ۱۸۸۱ء کے ایک سال میں ۹۴ نئے اردو جرائد جاری ہوئے جن میں لاہور کے دو پرچے 'کوہِ طور' اور 'مفیدِ عام'، میرٹھ کا 'طوطیِ ہند' اور حیدرآباد (دکن) کا 'شفق' (جس کے ایڈیٹر سید حسین رضوی تھے)

قابلِ ذکر ہیں۔

۱۸۸۲ء میں ملک میں اَسّی نئے اُردو جرائد شائع ہوئے، جن میں سے قابلِ ذکر پرچہ 'معلّم شفیق' تھا جو حیدر آباد (دکن) سے جاری ہوا تھا اور جس کے ایڈیٹر مولوی محبّ حسین تھے۔ یہ حیدر آباد (دکن) کا پہلا جریدہ تھا جس نے مع مذہب کے جدید نظریات کی آزادانہ حمایت کی تھی۔ اُس زمانے میں اسلام کے جدیدیت شکن علامہ سید جمال الدین افغانی حیدر آباد (دکن) میں مقیم تھے جنہوں نے اپنے بعض مشہور مضامین اس جریدے میں شائع کیے تھے۔ مولوی محبّ حسین اُس وقت افغانی مرحوم کے رفیق کار تھے۔ اُسی سال مولوی محبّ حسین نے ایک اور پرچہ 'اسلامیہ' کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں ۴۸ نئے اُردو جرائد ملک میں شائع ہوئے، جن میں سے میرٹھ کا 'شہنائے ہند' زیادہ اہم تھا۔ بعض ادبی میگزین حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئے اور اُسی سال ہندو جرائد بھی نکلے: لاہور کا 'دیش اُپکارک'، الٰہ آباد کا 'ست پرکاش' اور راولپنڈی کا 'سکھ دیک سبھا'۔ ۱۸۸۴ء میں ایک سو ایک نئے اُردو جرائد کا اجرا ہوا جن میں حیدر آباد (دکن) کا 'ذخیرۂ تعلیم' نمایاں تھا اور جس کے ایڈیٹر مولوی عزیز الدین تھے۔ 'رفیقِ دکن' بھی اُسی سال جاری ہوا جو ریاست حیدر آباد (دکن) کے محکمۂ تعلیم کا آرگن اور ماہنامہ تھا۔ اُسی سال لکھنؤ کے عیسائی امریکی مشن نے 'رفیقِ نسواں' کے نام سے ایک خوبصورت جریدہ لکھنؤ سے شائع کیا جس کا مقصد مسلمان خواتین کو عیسائی بنانا تھا۔ یہ پرچہ مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ اُس وقت 'ہندوستان' کے نام سے ایک اُردو جرنل لندن سے شائع ہوا تھا جس کو ایک عیسائی مشنری ایڈٹ کرتا تھا مگر اس کے مالک اودھ کے ایک ہندو تعلقدار راجہ رام پال سنگھ تھے۔ برِ صغیر میں ۱۸۸۵ء میں ۹۴ نئے اُردو پرچوں کا اجرا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں ۹۵ نئے اُردو جرائد کا۔ اس سال کا سب سے اہم جریدہ 'زمیندار' نامی تھا جسے منشی محبوب عالم نے پہلے ماہانہ گوجرانوالہ سے جاری کیا تھا اور پھر اسے ہفت روزہ کر دیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں متعدد ادبی جرائد حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئے جس سے ظاہر تھا کہ ادبی صحافت وہاں عروج پر تھی۔ دکن میں ایک اور اہم اُردو اخبار اُس سال 'افسر الاخبار' نامی گولکنڈہ سے شائع ہوا تھا۔ اُسی سال عورتوں کے لیے ایک اہم اُردو جریدہ 'اخبار النساء' کے نام سے دہلی سے جاری ہوا جس کے ایڈیٹر مولوی سید احمد مؤلف 'فرہنگِ آصفیہ' تھے۔ اُسی سال مشہورِ زمانہ 'پیسہ اخبار' پنجاب کے آزمودہ کار صحافی مولوی محبوب عالم نے لاہور سے جاری کیا۔ دوسرے دَور کے آخری سال (۱۸۸۸ء) میں برِ صغیر کی اُردو صحافت کا جریدہ 'وکیلِ قومی' نامی لکھنؤ سے جاری ہوا، جس کے ایڈیٹر عبداللہ حسرتی تھے۔

اُردو صحافت کا تیسرا دَور ۱۸۸۹ء سے ہندوستان کے انتہا پسند ہندوؤں کے قومی آرگن لاہور

"بھارت سُدھار" کی اشاعت سے شروع ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں برصغیر میں صرف تین نئے اُردو اخبارات شائع ہوئے اور ۹۲-۱۸۹۱ء میں صرف چار، جن میں پٹیالہ کا "مُخبرِ صادق" زیادہ اہم تھا اور جس کے ایڈیٹر شیخ ضیاء الحق تھے۔ ۹۴-۱۸۹۲ء میں ملک میں صرف چار نئے اُردو پرچے جاری ہوئے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں "انتخابِ لاجواب" لاہور شائع ہوا جس کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم کے بھائی منشی عبدالعزیز تھے۔ یہ انگلستان کے اخبار "ٹٹ بٹس" TIT BITS کی اُردو نقل تھا۔ ۹۸-۱۸۹۶ء کے دو سال خالی گئے کیونکہ اس دوران میں کوئی نیا اُردو پرچہ شائع نہیں ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں صرف ایک نیا اُردو پرچہ "پیشوا" نامی شیخ ضیاء الحق نے لاہور سے شائع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں ملک میں بیس نئے اُردو جرائد شائع ہوئے، جن میں سے اہم جرائد یہ تھے: "کرزن گزٹ" (جس کے مدیر مرزا حیرت تھے) جو مذہب پر اپنے آزادانہ اظہارِ خیال کے باعث مشہور ہوا۔ مثلاً اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ واقعۂ کربلا کبھی ظہور پذیر نہیں ہوا تھا۔ دوسرا قابلِ ذکر پرچہ نثار علی شہرت کا "شمشیرِ قلم" لاہور تھا۔ تیسرا نیا معروف اُردو جرنل مولوی عبداللطیف قادری کا "جریدۂ روزگار" مدراس تھا۔ اس کے ساتھ برصغیر میں اُردو جرنلزم کا تیسرا دور اختتام کو پہنچا۔

برصغیر جنوبی ایشیا میں اُردو صحافت کا چوتھا اور موجودہ دور بیسویں صدی کے آغاز (۱۹۰۱ء) سے شروع ہوا۔ موجودہ صدی میں اُردو صحافت مکمل طور پر منقلب ہو گئی۔ اِس دور سے قبل اُردو صحافیوں کا قلم عام طور پر قومی سیاست کی حدود پر آ کر رک جاتا تھا۔ اُس وقت اُن کے خیال میں سیاست ایک خطرناک مشغلہ تھا چنانچہ ان کی خبریں اور خیالات دونوں سیاست سے معرّا ہوتے تھے۔ ایک نہایت افسوسناک صورت، جو موجودہ صدی سے پیشتر اُردو صحافت کی تھی، وہ اس کی جلبِ منفعت کا مقصد تھا جو ڈرا دھمکا کے یا سرمایہ دار کی خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعہ سے پورا ہوتا تھا اور جو یقیناً صحافیوں کے کردار و عزتِ نفس پر ایک سیاہ داغ تھا۔ لیکن خوش نصیبی سے موجودہ صدی کے شروع ہوتے ہی اُردو صحافت میں ایک حیرت انگیز انقلاب رُونما ہوا اور اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ یہ کایا پلٹ پہلے بنگال میں ہوئی جس کا اتباع پنجاب نے کیا۔ چونکہ موجودہ صدی کے آغاز سے ہی سینکڑوں اُردو جرائد منصۂ شہود پر نمودار ہوئے، لہٰذا ان سب کا ذکر یہاں کرنا ممکن نہیں ہے۔ لاہور کے "زمیندار" کے بعد پہلا حقیقی معنی میں سیاسی اُردو اخبار "مُسلم گزٹ" لکھنؤ (۱۹۱۲ء) تھا جس کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم اور جس کے مایۂ ناز مضمون نگار علامہ شبلی تھے۔ اُس وقت سید جالب دہلوی، جو ایک مشہور زمانہ مسلم صحافی تھے، جدید اُردو صحافت کے "بابائے صحافت" کہلاتے تھے۔ موجودہ صدی کے بہترین اور مقبول ترین اُردو جرائد حسب ذیل ہیں:-

"زمیندار" لاہور، "مدینہ" بجنور، "ہمدم" لکھنؤ، "خلافت" بمبئی، "انقلاب" لاہور، "الجمعیت" دہلی۔

'صدق' لکھنؤ، 'ہمدرد' کلکتہ، 'الہلال' اور 'البلاغ' کلکتہ وغیرہ۔

اُردو کے معروف و مقبول ترین ادبی ماہنامے — شرر کا 'دلگداز' لکھنؤ (۱۸۸۴ء)۔
سر سید احمد خاں کا 'تہذیب الاخلاق' (۱۸۷۰ء)۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا 'مخزن الفوائد' حیدر آباد دکن (۱۸۷۴ء)۔ 'حسن' حیدر آباد (۱۸۸۸ء)۔ وحید الدین سلیم اور نواب محمد اسمٰعیل خاں کا 'معارف' علی گڑھ (۱۸۹۸ء)۔ سر شیخ عبد القادر کا 'مخزن' لاہور (۱۹۰۱ء)۔ حسرت موہانی کا 'اُردوئے معلیٰ' علی گڑھ (۱۹۰۴ء)۔ مولانا ظفر علی خاں کا 'دکن ریویو' اور 'افسانہ' حیدر آباد دکن سے (۱۹۰۳ء)۔ مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا 'الندوہ' لکھنؤ (۱۹۰۳ء)۔ منشی دیا نرائن نگم کا 'زمانہ' کانپور (۱۹۰۴ء)۔ 'ادیب' انڈین پریس، الہ آباد (۱۹۰۸ء)۔ 'الناظر' لکھنؤ (۱۹۰۹ء)۔ نظیر اکبر آبادی کا 'نقاد' آگرہ (۱۹۱۳ء)۔ ہوش بلگرامی کا 'ذخیرہ' حیدر آباد دکن (۱۹۱۵ء)۔ 'معارف' اعظم گڑھ (۱۹۱۶ء)۔ چکبست کا 'صبحِ اُمید' لکھنؤ (۱۹۱۸ء)۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کا سہ ماہی 'اُردو' (۱۹۲۱ء)۔ 'اورینٹل کالج میگزین' لاہور (۱۹۲۵ء)۔ ہندوستانی اکادمی کا 'ہندوستانی' الہ آباد (۱۹۳۱ء)۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا 'لسان الصدق' کلکتہ (۱۹۰۲ء)۔ 'جادو' ڈھاکہ۔ 'زبان' اور 'شہاب' جوناگڑھ۔ 'سفینہ' مدراس۔ 'صفیرِ سخن' پشاور۔ 'زبانِ ہند' اور 'ارمغان' کراچی۔ اور 'لالۂ صحرا' بہاولپور (۳۶-۱۹۳۰ء) وغیرہ وغیرہ۔ 'ہمایوں' لاہور۔ 'نیرنگِ خیال' اور 'عالمگیر' لاہور۔ 'نگار' لکھنؤ (نیز کراچی)۔ 'جامعہ' اور 'ساقی' دہلی وغیرہ بھی بہت اچھے اُردو رسائل تھے۔

لاہور کے مولانا ظفر علی خاں اور شمس العلماء مولوی ممتاز علی اُردو صحافت میں عظیم شخصیتوں کے مالک تھے۔ اول الذکر ایک عظیم شاعر، صحافی اور مصنف تھے اور روزنامہ 'زمیندار' لاہور کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ ثانی الذکر 'تہذیبِ نسواں' اور 'پھول' لاہور کے بانی اور 'تذکرۃ الانبیاء' اور 'مقاصد القرآن' کے مصنف تھے۔ وہ لاہور میں ایک دار الاشاعت کے بھی بانی تھے۔ مشہور اُردو ادیب سید امتیاز علی تاج اُنھی کے فرزند تھے۔ اُردو تصانیف کی اشاعت کے سلسلے میں 'تاج کمپنی' اور 'فیروز سنز' کے ادارے بھی کراچی اور لاہور میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں، بالخصوص اشاعتِ قرآن کے سلسلے میں۔ کراچی اور لاہور میں روزنامہ 'جنگ' (جس کے مالک میر خلیل الرحمٰن ہیں) اور روزنامہ 'نوائے وقت'، 'امروز'، 'جسارت' اور 'حریت' وغیرہ معروف ہیں۔ اردو میں ڈائجسٹوں کی وبا نے اُردو رسائل کو سخت نقصان پہنچایا۔ 'ماہِ نو' کراچی، حکومت کا اچھا ماہنامہ ہے۔ اُردو ٹائپ میں نوری نستعلیق کی ایجاد کا سہرا سید مطلوب الحسن اور مرزا جمیل دہلوی کے سر ہے، جس میں 'جنگ' لاہور کی طباعت کا آغاز ہو گیا ہے۔ (نگار، نومبر

۱۹۴۰ء، 'اُردو صحافت'، از قاضی عبدالغفار مُرادآبادی۔ 'ہمایوں'، لاہور، جنوری ۱۹۳۸ء 'اُردو رسائل کی مختصر تاریخ'، از سید سلیمان ندوی ('معارف')۔ 'زمانہ'، کانپور، جولائی ۱۹۳۶ء 'علمی خبریں'۔ 'معارف'، اعظم گڈھ، خطبۂ صدارت ہندوستانی اکادمی اُردو کانفرنس، لکھنؤ۔ 'عالمگیر'، لاہور، اسپیشل نمبر ۱۹۳۷ء 'اُردو نثر پر ایک نظر'، از پروفیسر مولانا محمد طاہر فاروقی]

(۲۸)

'ترقی پسند' اُردو ادب

ناول اور افسانے

اُردو ادب کی جدید تحریک، جس کو اس کے حامی 'ترقی پسندی' کہتے ہیں دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی حقیقت نگاری اور انقلابی۔ پہلی تحریک نے یوروپ سے برِصغیر میں درخور پایا۔ جس کا مقصد مشرقی ادب کی تمام قدیم و روایتی اقدار کو اُکھاڑ پھینکنا تھا۔ بعض مغربی تعلیم یافتہ اُردو ادیبوں نے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کے درمیان تنازعہ کا قضیہ کھڑا کیا ہے۔ یہ دونوں نظریات اُنھوں نے یوروپ کی جدید ادبی تحریکات سے مستعار لیے ہیں۔ 'ادب برائے ادب' کی تحریک یوروپ میں فرانس سے شروع ہوئی تھی۔ وِسلر WHISTLER نے اسے انگریزی ادب میں متعارف کیا اور آسکر وائلڈ OSCAR WILDE نے اس کی پشت پناہی کی، جس کے پروپیگنڈے کا آرگن 'یلو بک' YELLOU BOOK میگزین تھا۔ آسکر وائلڈ کے آرٹ اور لٹریچر کا برِصغیر کے نوعمر اُردو اہلِ قلم پر بے پناہ اثر پڑا۔ اُسی زمانے میں ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری (جن کا انتقال کراچی میں ۱۹۶۶ء میں ہوا) نے یونانی علم الاصنام اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کو دریافت کیا۔ اُنھوں نے خدا کے وجود اور زندگی کی تمام اخلاقی اقدار کی نفی کر کے، 'دانستہ یا نادانستہ طور پر' اپنے ماہنامے 'نگار' لکھنؤ کو 'ادب برائے ادب' یا 'ادب برائے حُسن' کی تحریک کا آرگن بنایا، مگر ایسے وقت کہ وہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور دیگر علمائے حق کے خلاف برسرِ پیکار تھے، 'ترقی پسند' اُردو تحریک کے آغاز نے ان کے بے دینی و الحاد کے قلعہ کو سرنگ لگا کر اُڑا دیا اور ان کی مقبولیت ایک دھاکے سے اُڑ گئی۔ یہ امر ان کے لیے یقیناً سخت الم ناک تھا کہ جو شکست ان کو خدا پرست نہ دے سکے تھے وہ نیاز فتحپوری کو نئی تحریک کے نوعمر ملحدوں کے ہاتھوں نصیب ہوئی۔ لیکن 'ادب برائے ادب' کی تحریک کو نیاز فتحپوری اور ان کے ماہنامے 'نگار' کے زوال کے بعد اپنا کوئی دوسرا اُردو آرگن نہ مل سکا۔ 'حقیقت نگاری' کی تحریک اب مکمل طور پر جدید اُردو شاعری و نثر نگاری دونوں میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ فرانس میں ۱۸۶۲ء میں شروع ہوئی جس نے 'رومانیت'، اور 'نظریاتیت'، نیز اخلاقیات کی تردید کی۔

یوروپ میں 'حقیقت نگاری' کی دو اور شاخیں نمودار ہوئیں۔ ان میں پہلی 'فطرت نگاری' (NATURALISME) تھی جس کا آغاز بھی، ہر اہم ادبی تحریک کے مانند، فرانس سے ہوا۔ جس کا سب سے بڑا حامی موپاساں MAUPASSANT تھا۔ حقیقت نگاری کی دوسری شاخ ایکس پریشنزم (EXPRESSIONISME) تھی جس کا آغاز وارتقا اطالیہ میں ہوا جس کے ساتھ ہی یوروپ میں دیگر جدید ادبی تحریکیں پوسٹ امپریشنزم (POST-IMPRESIOUISM) فیوچرازم (FUTURISM) اور امیجزم (IMAGISM) وغیرہ بھی معرض وجود میں آئیں۔ اٹلی سے ان تحریکوں نے انگریزی ادب میں درخور پایا' جہاں سے انھیں 'ترقی پسند' اردو اہل قلم نے اپنایا۔

حقیقت پسندی (REALISM) عریانیت وفحاشی نیز ادبی مباحث میں بیباک و بد لحاظ جنسی ترغیبات کی ذمہ دار ہے۔ یوروپ بلکہ کل مغربی دنیا کے حواسوں پر، نیز اس کے جدید لٹریچر پر، عورت سوار ہے۔ ابسن (IBSEN) نے بالخصوص نسوانی تحریک (FEMINISM) کو سراہا۔ فرائڈ FREUD کے فلسفہ نے بھی اس کو مدد دی۔ 'ترقی پسند' اردو ادب میں ڈی ایچ لارنس (D. H. LAWRENCE) کی تحریروں سے یہ 'عورت پرستی' مستعار لی گئی، جس کی ترقی کا سہرا سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ کی فحش نگاری کے سر ہے۔ سعادت حسن منٹو کے مختصر افسانے 'دھواں' اور 'بلاؤز' وغیرہ، عصمت چغتائی کے 'لحاف' اور 'جال' وغیرہ، محمد حسن عسکری کا 'پھسلن' اور ممتاز مفتی کے بعض افسانے اس کے بدترین نمونے ہیں۔

دوسری شاخ، یعنی انقلابی تحریک، کا قریبی تعلق سوویٹ روس اور اس سے وابستہ دیگر مشرقی یوروپی ممالک کے کمیونسٹ عوامی (پرولیتیرین) لٹریچر سے ہے۔ لیکن اردو ادب اس سے خال خال ہی متأثر ہوا ہے۔ مگر اردو ادب پر اس تباہ کن تحریک کا مسموم اثر احمد علی، سجاد ظہیر اور رشید جہاں کی شرمناک کتاب 'انگارے' سے واضح ہوا، جس کے بعد احمد علی کی دوسری فحش کتاب 'شعلے' شائع ہوئی تھی۔

اگر اس کو ناول کہا جا سکے تو قاضی عبدالغفار کی تصنیف 'لیلیٰ کے خطوط' اردو میں 'ترقی پسند' مختصر افسانے اور ناول کی نمائندہ پہلی کتاب تھی۔ اس سے پیشتر پیشہ ور گانے اور ناچنے والی طوائف کی زندگی پر مبنی دو نہایت دلپذیر اردو ناول مرزا رسوا کا 'امراؤ جان ادا' اور سجاد حسین کسمنڈوی کا ترجمہ 'نشتر' شائع ہو چکے تھے۔ 'لیلیٰ کے خطوط' کے مقابلے میں قاضی عبدالغفار کی دوسری کوششیں، 'مجنوں کی ڈائری' اور 'تین پیسے کی چھوکری' قطعی ناکام رہیں۔ احمد علی کے 'انگارے' اور 'شعلے' دونوں

کتابوں میں مختصر افسانے 'ترقی پسند' اُردو تحریک کے ابتدائی دور سے متعلق کیے جاتے ہیں۔ برِصغیر میں عام طور پر ان دونوں کتابوں کی سخت مذمت کی گئی اور انھیں بیمار ذہنوں کی پیداوار کہا گیا۔ سجاد ظہیر کا ناکام ناولیٹ 'لندن کی ایک رات' بھی اسی سلسلے کی کمتر درجے کی تخلیق ہے۔

ہندوستان میں اُپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی اور کرشن چندر اُردو میں 'ترقی پسند' مختصر افسانہ نویسوں کے پیش رو کہلاتے ہیں۔ ان میں سے مؤخر الذکر اپنے انسانیت پرست پُرخلوص اسلوب کے باعث زیادہ مقبول ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی بھی کرشن چندر کے اسلوب کے اتباع میں کامیاب اُردو اہلِ قلم ہیں۔ ایک اور معروف 'ترقی پسند' مختصر افسانہ نگار علی عباس حسینی ہیں جن کی مندرجہ ذیل مختصر کہانیاں اُردو داں طبقوں میں بڑی مقبول ہوئیں: 'ایک ماں کے دو بچے'، 'بوڑھا اور بالا'، 'دیش اور دھرم'، 'بھوکی ہنسی'، 'شکار یا شکاری'، 'حقِ نمک'، 'سخی'، 'آم کا پھل'، 'جھولا'، 'باسی پھول'، اور 'تار بابو' وغیرہ۔ لیکن بطور ایک 'ترقی پسند' افسانہ نویس کے خواجہ احمد عباس بالکل ناکام رہے ہیں۔ ان کی تمام تخلیقات: 'فیصلہ'، 'ایک لڑکی'، 'ناگن'، 'سرکشی'، 'تین عورتیں' اور 'معمار' وغیرہ سب ناکام کوششیں تھیں۔ سعادت حسن منٹو (ان کا انتقال محض ۴۲ سال کی عمر میں کثرتِ شراب نوشی کے باعث لاہور میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو ہوگیا) ترقی پسند اُردو نویسی کی کہیں بدتر مثال تھے۔ ان کے مختصر افسانوں میں جنس مکمل طور پر مذہب پر غالب آگئی ہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ دو عنوانات پر خامہ فرسائی کی، یعنی جنس (اُس کا تاریک و گھناؤنا رُخ) اور دیوانگی۔ ان کی معکوس اور بیمار جنسی بھوک اخلاق اور انسانی معاشرے کی دشمن تھی۔ ڈی ایچ لارنس اور موپاساں کی طرح عورت ان کے حواس پر چھا گئی تھی۔ ان کی میہ کہانیاں اس حقیقت پر دال ہیں: 'نامکمل تحریر'، 'دھواں'، 'پھاہا'، 'بلونت'، 'کبوتر والا'، 'سائیں'، 'چوہے دان'، 'اُسکا اور میرا انتقام'، 'بانجھ'، 'شوشو'، 'اُس کا پتی'، 'نعرہ'، 'اُلو کا پٹھا'، 'وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے'، 'شیرو'، 'ترقی پسند'، 'کالی شلوار'، 'دھواں'، اور 'بُو' وغیرہ۔ ان تمام کہانیوں میں ہمدردی کا انسانی عنصر غائب ہے۔ منٹو کی محبت ایک مرض تھا، ایک بیماری، سیاہ کاری و شرم کا معاملہ۔ اس کے برعکس کرشن چندر کا عشق ایک صحت مند و توانا معاملہ ہے۔ منٹو نے جس طرح ایک شرابی کی بے تکی زندگی بسر کی تھی، اُسی طرح وہ اپنی عمرِ طبعی تک پہنچنے سے قبل ہی لاہور میں جاں بحق ہوگئے۔ عصمت چغتائی منٹو سے بھی بدتر نمونہ 'ترقی پسند' اُردو طرزِ تحریر کا تھیں۔ رشید جہاں کے بعد وہ جنسی بدحواسی کا بدترین نمونہ تھیں۔ عصمت چغتائی کی کہانیوں میں جنسی گرسنگی کی سڑاند آتی ہے، مثلاً 'بِھری' میں سے، 'ساس'، 'پردے کے پیچھے سے'، 'اُف یہ بچے'، 'لحاف'، 'بھول بھلیاں'، 'جال'۔

"میرا بچہ"، "کافر"، "خدمت گار"، "حیرانی"، "باغی"، "پنکچر" اور "ایک شوہر کی خاطر" وغیرہ۔ بعد ازاں قرۃ العین حیدر نے رشید جہاں اور عصمت چغتائی دونوں کی خرافات نگاری کی نمائندگی کی۔ محمد حسن عسکری بھی اُردو میں ترقی پسند اہلِ قلم کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اُن کی تحریریں بے اثر و ناکام ہیں۔

اُردو میں "ترقی پسند" ناول اور مختصر افسانہ کے بانی ہونے کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار کا ذکر خصوصیت کا متقاضی ہے۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مُرادآباد (روہیلکھنڈ۔ یوپی۔ انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد خان بہادر قاضی ابرار احمد مُرادآباد کے زمیندار تھے۔ قاضی عبدالغفار نے علی گڑھ اور بریلی میں تعلیم پائی تھی۔ وہ حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی جوہر رامپوری دونوں کے رفقائیں سے تھے۔ انھوں نے ان اہم اُردو جرائد کی ادارت کی تھی: "ہمدرد"، "جمہور"، "صباح" اور "پیام"۔ اُن کی تصانیف؟ "نقشِ فرنگ"، "لیلیٰ کے خطوط"، "مجنوں کی ڈائری"، "روزنامچہ"، "اُس نے کہا"، "افسانے" اور "جمال الدین افغانی" وغیرہ [راقم الحروف کے نام قاضی عبدالغفار مُرادآبادی کا ان کے دفتر روزنامہ "پیام" حیدرآباد (دکن) سے ایک نجی خط]۔

نیازؔ فتحپوری کا پورا نام نیاز محمد خاں تھا۔ نیازؔ اُن کا تخلص بھی تھا، گو وہ بطور شاعر معروف نہیں۔ وہ فتحپور ہسوہ (یوپی۔ انڈیا) میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد امیر خاں ریاست رامپور میں پولس انسپکٹر تھے، جہاں نیازؔ فتحپوری کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ نیازؔ اُردو کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ۱۹۰۲ء میں ایک پولس سب انسپکٹر کی حیثیت سے الہ آباد سے کیا تھا۔ لیکن تین سال کی ملازمت کے بعد انھوں نے اس نوکری سے استعفا دے دیا تھا۔ ۱۹۱۴ء تک ان کی زندگی بے مقصد رہی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۵ء تک اُنھوں نے ریاست بھوپال کے محکمۂ تصنیف و اشاعت میں کام کیا۔ اس کے بعد وہ برائے چندے آگرے میں مقیم رہنے کے بعد مستقلاً لکھنؤ میں جا بسے، جہاں سے وہ ۱۹۶۲ء میں کراچی آئے اور ۸۲ سال کی عمر میں ۱۹۶۶ء میں یہیں فوت ہوئے۔ میر ناصر علی کے مشہور اُردو میگزین "صلائے عام"، دہلی نے سب سے پہلے نیازؔ کو اُردو داں طبقہ سے روشناس کیا (دہلی کا یہ معروف اُردو ماہنامہ میر ناصر علی کی ۱۹۳۳ء میں وفات کے ساتھ بند ہو گیا تھا)۔ اس کے بعد نیازؔ کے اُردو مضامین بیشتر "مخزن"، لاہور اور "نقاد"، آگرہ میں چھپتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں نیازؔ فتحپوری نے خود اپنا ماہنامہ "نگار"، آگرہ سے شائع کیا، جہاں سے وہ اسے بھوپال لے گئے، لیکن ۱۹۲۵ء میں وہ "نگار" کو مستقلاً لکھنؤ لے گئے۔ کچھ عرصے تک "نگار" ۱۹۶۳ء میں کراچی سے بھی شائع ہوا۔ نیازؔ کی تصانیف کی تفصیل: "صحابیات"، "تاریخ الدولتین"

"نگارستان"، "جمالستان"، "مُذاکراتِ نیاز"، "نقاب اُلٹ جانے کے بعد"، "جذباتِ بھاشا"، "گہوارۂ تمدّن"، "شہاب کی سرگذشت"، "ایک شاعر کا انجام"، "فراست الید"، "فلاسفۂ قدیم"، "ترغیباتِ جنسی"، "مکتوباتِ نیاز"، "المسالۃ الشرقیہ"، "مجموعۂ استفسار و جواب"، "اصحابِ کہف"، "مرزنجی سباح کی ڈائری" اور دو تراجم: رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتان جلی، اور کیوپڈ اور سائکے Cupid and Psyche.

نیاز فتحپوری کا طرزِ تحریر نامانوس اور ادق عربی و فارسی الفاظ و بیانات سے پُر تھا۔ بعض مصنفین نے اسے مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب سے تشبیہ دی ہے جو سراسر غلط ہے کیونکہ مولانا ابوالکلام نیاز سے کہیں بہتر و بامعنی اُردو لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔

اُردو میں ادبِ لطیف کو سیّد سجاد حیدر یلدرم نے متعارف کیا جن کی طرزِ تحریر کے نمونے ماہنامہ "مخزن"، لاہور کے ابتدائی پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔ اس اسلوب کو بعد کو نیاز فتحپوری نے اپنے ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ میں اپنایا۔ یلدرم کا ادبِ لطیف ایک لطیف شئے تھی مگر نیاز فتحپوری نے اسے مسخ کر کے کثیف بنا دیا۔ یلدرم کا اسلوب کافی جرأت مندانہ لیکن تہذیب و نفاست کے دائرے کے اندر تھا، نیاز فتحپوری نے اس میں عریانی و بے حیائی کا اضافہ کر کے اسے ایک نہایت گندی چیز بنا دیا۔ عریانی و بے شرمی کا یہ زہر سب سے پہلے آگرے کے اُردو رسالہ "نقاد" نے پھیلایا۔ اُردو ادب میں یہ غیر ادبی زہر نیاز کے اُردو ترجمہ "گیتان جلی" (مصنفہ رابندر ناتھ ٹیگور) کے بعد ایک وبا کی شکل اختیار کر گیا۔ نیاز فتحپوری کی "ادبی" تخلیقات سے متأثر ہو کر اُردو کے مُبتدیوں نے اُردو ادب کو اپنی بیہودہ تحریروں سے ایک انتہائی غلیظ چیز بنا دیا۔ عریانی و فحاشی کے ساتھ ابہام و لایعنی تحریروں کو سراہا گیا حتّٰی کہ خرافات نویسی فیشن بن گئی اور جو چیز فہم و فراست سے بعید ہوئی "آرٹ" کہلائی۔ اُردو ادب کی اس متعفّن لاش میں ایک آخری کیل ساغر نظامی کے ماہنامہ "پیمانہ"، آگرہ نے ٹھونک دی۔ اس غیر ذمہ دار اور "مادر پدر آزاد" جریدے نے ایک سلسلہ مضامین "ایک دوشیزہ کی ڈائری" کے عنوان سے شائع کیا تھا، جس کی فحش نگاری نے تمام اُردو داں لوگوں کی گردنیں شرم سے جھکا دی تھیں۔ نیاز فتحپوری کے اندازِ تحریر کو بہت بہتر طور پر خلیقی دہلوی، لطیف الدین احمد اکبر آبادی اور میاں بشیر احمد، ایڈیٹر ماہنامہ "ہمایوں"، لاہور نے اپنایا تھا۔

نیاز فتحپوری کو، ترقی پسند اُردو اہلِ قلم قبول نہیں کرتے، لیکن نیاز کی اُردو ادب میں جگہ ان کے سوا کہیں اور نہیں ہے، کیونکہ اُردو کی شائستگی، سنجیدگی، صداقت، خلوص، معنویت و متانت کا کوئی تعلق نیاز اور ان کی تحریروں سے نہیں ہے۔ نیاز ایک ناکام شاعر بھی تھے، حالانکہ وہ اس حقیقت

کے مُفکر تھے اور اسے پردۂ اخفا میں رکھتے تھے۔ سستی شہرت کے حصول کی خاطر، ایک عرصے تک، اُنھوں نے ارادی طور پر خیالات، عقاید و ادب میں انتشار پھیلایا اور ہر روایت کو، خواہ وہ دُنیاوی ہو یا دینی اُلٹنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے اسلام کے مسلّمہ عقاید معجزات، دوزخ و جنّت وغیرہ کی نفی کی حتیٰ کہ اُنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ادب میں نیاز نے آزاد کی 'آبِ حیات' کا مضحکہ اڑایا اور غالب کی شاعرانہ عظمت کو نہ مانا وغیرہ۔ مختصر یہ کہ اپنے رسالہ 'نگار' کو مقبول بنانے کے لیے اُنھوں نے قصداً خود کو ایک نامعقول انسان کے طور پر پیش کیا۔

'ترقی پسند' اُردو تحریک نے اُردو ناول سے اغماض کر کے خود کو کلیتاً مختصر افسانہ نویسی کے لیے وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں اُپندر ناتھ اشک کا ناول 'ستاروں کے کھیل' کوئی قابلِ ستائش کارنامہ ثابت نہیں ہوا۔ سجاد ظہیر کی تصنیف 'لندن کی ایک رات' ناول کم اور افسانہ زیادہ ہے۔ احمد علی کا انگریزی ناول 'ٹوائی لایٹ ان دہلی' Twilight in Delhi ایک کامیاب کوشش تھی، لیکن اُردو میں ان کی عریاں نگاری، فحاشی و اخلاق سوزی ناقابلِ معافی ہیں۔ اُنھوں نے اُردو ادب میں نفاست، شائستگی اور خود اپنے اسلامی معاشرے سے بغاوت کی ہے۔ ہندوستان میں دُنیائے اُردو میں پریم چند کے بعد کرشن چندر ایک کامیاب اُردو ناول نویس ہوئے، جس کا ثبوت ان کا ناول 'شکست' ہے۔

اُردو ادب اپنی زندگی میں کئی چولے بدل چکا ہے۔ اُردو زبان کو سادہ بنانے کی پہلی کوشش میر امّن دہلوی نے کی تھی۔ دوسری سر سیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء نے۔ تیسری تبدیلی جدید زمانے میں اُن لوگوں نے کی جو مغربی ادب اور اس کی ٹیکنیک سے واقف ہیں۔ یہ نیا اُردو ادب قریباً ۱۹۳۶ء سے عالم وجود میں آیا۔ بعض اہلِ قلم نے اسے 'ترقی پسند' اُردو ادب کہا ہے۔ اس نئے یا 'ترقی پسند' اُردو ادب کے مشعل بردار حسبِ ذیل ہیں:۔ سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، ل احمد، اختر حسین رائے پوری، صادق الخیری، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، اختر انصاری، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی، اُپندر ناتھ اشک، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، محمد حسن عسکری، کنھیا لال کپور، احتشام حسین اور ان کے دو مبشر و قاضی عبدالغفار مُراد آبادی اور نیاز فتحپوری۔

'انگارے' اور 'شعلے' کے بعد ترقی پسند اُردو ادب کی تیسری 'بائبل' رشید جہاں کی 'عورت' تھی۔ اس مخربِ اخلاق اُردو تحریک کے سلسلے میں ایک اور اہم نام لینا باقی ہے۔ یعنی طاہرہ دیوی شیرازی،

مصنف 'سحر بنگال' کا۔ اِس لحاظ سے حجاب امتیاز علی اور شفیق الرحمٰن دونوں محتاط اہلِ قلم کہے جا سکتے ہیں۔ آخری نام عزیز احمد مصنف 'گریز'، 'ہوس'، اور 'آگ'، نامی ناولوں کا ہے جس کے آوارہ قلم نے خود 'ترقی پسند' اُردو ادب کو بدنام کیا۔

پاکستانی سیاست پر پیپلز پارٹی کے غلبہ سے پیشتر یہ 'ترقی پسند' اُردو اہلِ قلم ہر اُس گروپ میں سرایت کر جاتے تھے جہاں ان کو جگہ مل سکتی تھی، لیکن سنہ ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی نئی سوشلسٹ سیاست نے اس نعرے کے ساتھ کہ 'مشرق سُرخ ہے'، 'ترقی پسند' اُردو ادب کو سرکاری سرپرستی فراہم کی۔ اور نئے اشتراکی گروپ پیدا ہو گئے۔ 'عوامی ادبی انجمن' کی داغ بیل تو پہلے ہی پڑ چکی تھی، لیکن وہ عقب میں ہی رہی۔ بعد کو اس کی جگہ ایک زیادہ فعال اور جارحانہ گروپ 'ترقی پسند اہلِ قلم کی انجمن' (پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن۔ پی ڈبلیو اے) نے لے لی۔ قریباً اٹھارہ سال کی خموشی کے بعد اس کا پہلا اجلاس پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی صدارت میں ہوا، جو برِصغیر میں 'ترقی پسندی' کی تحریک کے سربراہ کہے جاتے ہیں۔ علی سردار جعفری کی 'ترقی پسند' تحریک کی تاریخ 'ترقی پسند ادب'، کو مجنوں کے نام معنون کیا گیا ہے جن کی تحریروں نے اس تحریک کو زبردست سہارا دیا۔ عہد جدید کے سوشلسٹ (یعنی 'ترقی پسند') اہلِ قلم، جن کا تعلق 'عوامی ادبی انجمن'، اور 'پی ڈبلیو اے' سے رہا ہے، نیز 'پی پی پی' اور نیپ N.A.P. (نیشنل عوامی پارٹی۔ ولی گروپ) کے متوسلین یہ لوگ ہیں:۔ شوکت صدیقی، پروفیسر عتیق احمد رفیق چودھری، سید انور، ڈاکٹر ایم آر حسن، کوکب جمیل، انور سجاد اور نسیم دُرّانی۔ منٹو کی طرح جوش ملیح آبادی نے بھی جدید اُردو کے تعفن میں اپنی 'یادوں کی بارات' لکھ کر کافی اضافہ کیا۔ بایں ہمہ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر تنویر احمد اور بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی تین تحریروں نے 'ترقی پسند' اُردو ادب کی لاج رکھ لی جو یقیناً 'رجعت پسند' کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

['نظارہ'، لکھنؤ جون سنہ ۱۹۳۱ء 'نیاز کی شاعری'، از نقب دار سبز پوش 'ساقی'، دہلی، جون سنہ ۱۹۳۶ء 'مولانا نیاز فتحپوری بحیثیت افسانہ نگار'، از سید محمود مورخ 'نیرنگ خیال'، لاہور، مئی سنہ ۱۹۳۳ء 'نیاز کی ہنگامہ پسندی'، از محمد احمد شملوی 'ترقی پسند ادب'، از عزیز احمد، حیدر آباد (دکن) سنہ ۱۹۴۵ء ص ۷۶-۹، ص ۲۰۷-۱۵۴، ص ۵۲-۲۲۰ 'تحفۂ نو' از محمود السابق، کراچی سنہ ۱۹۴۹ء 'نیا ادب'، ص ۶۴-۵۰]

(۳۹)

اُردو کی اہلِ قلم خواتین

جدید اُردو افسانہ نویسی کی مدت نصف صدی سے کچھ ہی زائد ہو گی۔ خواتین اُردو اہلِ قلم اُردو ادب کی اس صنف کو ترقی دینے میں مردوں سے پیچھے نہیں رہی ہیں۔ جدید زمانے کی اوّلین اہلِ قلم میں ایک بیگم عبدالقادر تھیں جو دہشت ناک کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ وہ جہلم کی رہنے والی تھیں۔ اُن کی معروف پُراسرار و دہشت انگیز کہانیوں کی کتابوں کے نام یہ ہیں:۔ ''لاشوں کے شہر'' ''وادیٔ قاف'' ''صدائے جرس'' اور ''راہبر''۔ ان کے بعد نمبر نذر سجاد حیدر کا ہے جن کے اُردو افسانوں نے اس صنف کو بڑی ترقی دی اور ان کی ناول ''اختر النساء'' ایک کلاسیکی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ اس گروپ کی تیسری ادیبہ خاتون حجاب اسمٰعیل تھیں، جو سید امتیاز علی تاج سے شادی کرنے کے بعد حجاب امتیاز علی بن گئی تھیں۔ وہ برِصغیر کی پہلی ہواباز (پائلٹ) خاتون تھیں۔ سید امتیاز علی تاج ''انارکلی'' وغیرہ کے معروف مصنف تھے حجاب امتیاز علی کی رومانی تصانیف کے نام یہ ہیں:۔ ''ظالم محبت'' ''ممی خانہ'' اور ''صنوبر کے سائے'' وغیرہ اُس اوّلین دَور کی چوتھی ناول نگار خاتون صالحہ عابد حسین تھیں جو خواجہ الطاف حسین حالی کی پرپوتی تھیں۔ وہ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۳۳ء میں ان کی شادی ڈاکٹر عابد حسین، پرنسپل جامعہ ملیہ، دہلی سے ہوئی جو خود ایک معروف اُردو ادیب تھے۔ اُن کی مختصر اُردو کہانیوں کے دو مجموعے ''نقش اول'' (۱۹۴۱ء) اور ''سازِ ہستی'' (۱۹۴۲ء) کے ناموں سے شائع ہوئے تھے۔ اُن کی ریڈیو تقاریر کا مجموعہ ''بات چیت'' کے نام سے اور اُن کا ناول ''عذرا'' کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ اس ابتدائی اُردو افسانہ اور ناول نویس گروپ کی پانچویں اور چھٹی اہم خواتین حمیدہ سلطان (''ثروت آرا بیگم'' اور ''ارمان نصیب'' نامی ناولوں کی مصنفہ) اور اے آر خاتون (مقبولِ عام ناولوں ''تصویر''، ''شمع''، وغیرہ کی مصنفہ) تھیں۔

اِس اوّلین اُردو افسانہ اور ناول نویس گروپ کی ساتویں خاتون اہلِ قلم اُردو کی ایک بنگالی ناول نگار طاہرہ دیوی شیرازی تھیں جو آسکر وائلڈ اور نیاز فتحپوری دونوں کے شرمناک و اخلاق سوز فلسفوں کی پیرو تھیں۔ اُن کا عُریاں ناول ''سحرِ بنگال'' اس کا کافی ثبوت ہے۔ اس فہرست کی آٹھویں اہلِ قلم خاتون رشید جہاں تھیں، جو ترقی پسند یا وہ گو و مخرّبِ اخلاق خواتین اہلِ قلم کی پیشرو اور خود ایک انتہا پسند

ماڈرن، لامذہب وآزاد خیال خاتون تھیں۔ وہ شیخ عبداللہ (برِصغیر میں تعلیم نسواں کے علم بردار اور مسلم گرلز کالج، علی گڑھ کے بانی) کی بیٹی تھیں۔ رشید جہاں نے سجاد ظہیر اور احمد علی کے ساتھ مل کر وہ مردود اور ذلیل ناول 'انگارے' نامی لکھی تھی، جس کو اُس وقت یوپی (انڈیا) کی صوبائی حکومت نے اس کی گندہ نویسی کے باعث ضبط کر لیا تھا۔ ان کے محبوب عنوانات تحریر جنس اور سوشلزم تھے، جو ان کی کتاب 'عورت' اور ان کے افسانوں سے ظاہر ہیں۔ رشید جہاں کی طرزِ تحریر کی متبع نویں اُردو افسانہ نویس خاتون (جو اُردو کے معروف مزاحیہ نگار عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن اور اُردو کے معروف اہلِ قلم شاہد لطیف کی بیوی تھیں، جن سے ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی) عصمت چغتائی تھیں جو علی گڑھ کی گریجویٹ، اسکول ٹیچر، صحافیہ اور فلم ڈرامالسٹ تھیں۔ اُنھوں نے جو ایک نہایت ذلیل اور بے رحمانہ مضمون 'دوزخی' کے عنوان سے اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی وفات پر شائع کیا تھا اُس کی پورے اُردو داں طبقہ نے سخت مذمت کی تھی۔ ان کے افسانوں سے سخت تعفن کی بدبو آتی ہے کیونکہ وہ انتہائی رکیک قسم کی جنسی آوارگی پر مبنی ہیں۔ ان کی مخصوص تصانیف کے نام یہ ہیں: 'ضدی' (اس ناولیٹ کو فلمایا جاچکا ہے)، 'ٹیڑھی لکیر' (ایک مکمل ناول) اور ان کے مختصر افسانوں کے تین مجموعے، 'کلیاں'، 'چوٹیں'، اور 'ایک بات'۔ اس ابتدائی گروپ کی دسویں اور آخری خاتون افسانہ و ناول نگار ممتاز شیریں تھیں، جو بنگلور کی گریجویٹ اور اُردو کے معروف نقاد صمد شاہین کی بیگم تھیں۔ دونوں میاں بیوی شروع میں بنگلور سے اُردو کا ایک ادبی جریدہ 'نیا دور' نامی شائع کیا کرتے تھے جو بعد کو کراچی سے نکلنے لگا تھا۔ ممتاز شیریں ایک عمدہ اور متوازن قسم کی افسانہ نگار خاتون تھیں۔ ان کی قابلِ ذکر تصانیف یہ ہیں: 'انگڑائی'، 'اپنی نگریا' اور 'دیپک راگ'۔

اب ہم عصرِ جدید کی اُردو افسانہ نویس خواتین سے دوچار ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے لکھنؤ کی دو بہنیں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور آتی ہیں، جنہوں نے قبل قیام پاکستان اپنا ادبی زندگی کا آغاز بمبئی سے کیا تھا۔ بڑی بہن خدیجہ مستور کے مختصر افسانوں کے مجموعوں کے عنوانات اس طرح کے ہیں: 'چلی پی کے ملن کو'، 'جھکے جھکے'، 'دیوان'، 'کھیل'، 'ٹھنڈا میٹھا پانی'، 'بیچاری'، 'دادا، تھکے ہارے'، 'بوچھار'، 'کھیل'، اور 'چند روز' اور وغیرہ۔ اُن کا ناول 'آنگن' اس قدر مقبول ہوا کہ اُس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اس پر آدم جی کا ادبی انعام بھی ملا۔ خدیجہ مستور دو سال تک علیل رہنے کے بعد ۲۶ جولائی ۱۹۸۲ء کو لندن میں انتقال کر گئیں جہاں وہ اپنے خاوند ظہیر بابر (سابق ایڈیٹر 'امروز' لاہور) کے ساتھ بغرض علاج گئی تھیں۔ [illegible] آخری ناول تھا جو [illegible] خدیجہ

---

[1] جسے ادارہ فروغ اردو لاہور نے ۱۹۶۳ء میں شائع کر لیا۔

ڈاکٹر رشید جہاں کی پیرو تھیں، جو اپنے عہد میں نو آموز ترقی پسند اہلِ قلم کی لکھنؤ میں رہنما تھیں۔ خدیجہ لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھیں اور ۱۹۴۷ء میں لاہور میں مقیم ہوگئی تھیں۔ اُنھوں نے ایک فرزند پرویز بابر اور بیٹی کرن چھوڑیں۔ ان کی تین بہنیں ہاجرہ مسرور اور عائشہ جمال وغیرہ۔ احمد علی خاں (ایڈیٹر انگریزی روزنامہ 'ڈان' کراچی)، حسن عابدی (ایڈیٹر اخبارِ خواتین، کراچی) اور وہاب الخیری کی بیویاں ہوئیں۔ ان کے دو بھائی: توصیف احمد خاں (روزنامہ 'حُرّیت' کراچی کے مُراسلہ نگار) اور خالد احمد (شاعر) تھے۔ ان کی دو بہنیں ہاجرہ مسرور اور عائشہ جمال بھی معروف اُردو اہلِ قلم ہیں۔ خدیجہ مستور کا معروف ناول 'آنگن' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا، جس کا ہندی، بنگالی، گجراتی اور روسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ہاجرہ مسرور کے افسانوں کے تین مجموعوں کے نام یہ ہیں :- 'چرکے'، 'چھپے چوری'، اور 'ہائے اللہ'۔ ان کے بعد تیسری معروف افسانہ نگار قرۃ العین حیدر ہیں، (مشہور اُردو ادیب سیّد سجاد حیدر یلدرم کی دختر اور سید مطلوب الحسن کی عم زاد ہیں)۔ یہ خاندان نہٹور (ضلع بجنور۔ یوپی، انڈیا) کے نجیب الطرفین سادات سے تعلق رکھتا ہے، قرۃ العین کی اُردو کہانیاں عُریاں، حیا سوز و شہوت انگیز ہیں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی اور طاہرہ دیوی شیرازی کی جانشینی کی کوشش کی ہے۔ اُن کی کہانی 'ستاروں سے آگے'، اور ان کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' کافی مقبول ہوئے۔ عہدِ جدید کی چوتھی افسانہ نگار خاتون شائستہ اختر ایک غیر ملکی یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹر اور انگریزی اور اُردو جرائد کی معروف مضمون نگار ہیں۔ اُن کا اسلوب سنجیدہ و با وقار ہے اور وہ بیشتر غریب و پس ماندہ طبقہ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ پانچویں خاتون اہلِ قلم تسنیم سلیم ہیں جن کی منتخب اُردو کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں کا آغاز سنجیدگی و متانت سے کیا تھا لیکن وہ بھی رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے اسالیب کے زیرِ اثر آتی چلی گئیں۔ چھٹی اہلِ قلم خاتون سلمیٰ رشید، خورشید مُنیر فلم ڈراماٹسٹ کی اہلیہ تھیں، جن کے اُردو افسانے متین و باوقار تھے۔ ساتویں خاتون اہلِ قلم صدیقہ بیگم دو معروف مجموعہ ہائے افسانہ جات 'ہچکیاں'، اور 'پلکوں میں آنسو'، کی مصنفہ ہیں۔ آٹھویں خاتون اہلِ قلم شکیلہ اختر 'درپن' نامی افسانوں کے مجموعے کی مصنفہ ہیں۔ نویں خاتون سحاب قزلباش، آغا حشر کاشمیری کی دختر، جو اپنی شادی کے بعد سحاب ملک کے نام سے مشہور ہوئیں، اُردو میں اپنے قابلِ قدر افسانوں کے مجموعے 'بدلیاں' کے باعث معروف ہیں وہ شاعرہ بھی تھیں۔ دسویں اُردو ناول نویس خاتون اسما طیّب حسین (دختر پروفیسر مرزا محمد سعید) مصنف مذہب اور باطنی تعلیم کے مشہور اُردو ناول یہ ہیں :- 'خرابِ ہستی' اور 'یاسمین'۔

عہدِ جدید کی بعض دیگر معروف اہلِ قلم خواتین حسبِ ذیل ہیں :۔
عائشہ دُرّانی، محمودہ رضویہ، جہاں بانو، ستیدہ اشرف، سنجیدہ اشرف، سرلادیوی، ناہید عالم، شفیق بانو، کوشلیا اشک، صغرا ہمایوں مرزا، زہرہ جبیں، صفیہ اختر، آمنہ نازلی کشور ناہید وغیرہ ہیں۔

تذکرے

نمبر	نام تذکرہ	نام مُصنّف
۱۔	دریائے لطافت	سید انشاء اللہ خاں انشاؔء
۲۔	باغ و بہار	میر امّن دہلوی
۳۔	آثار الصنادید	سر سید احمد خاں
۴۔	فکر بلیغ	شاؔد عظیم آبادی
۵۔	پنجاب میں اُردو	پروفیسر محمود خاں شیرانیؔ
۶۔	تذکرۂ گلزارِ ابراہیم	علی ابراہیم خاں خلیؔل
۷۔	تُزکِ بابری [ریاست رامپور کی اسٹیٹ لائبریری میں مسوّدہ]	
۸۔	تذکرۂ جلوۂ خضر	صفیؔر بلگرامی
۹۔	تُزکِ جہانگیری (مُرتبۂ سر سید احمد خاں)	
۱۰۔	تذکرۂ شعرائے اُردو	میر حسؔن (انجمن ترقی اُردو ایڈیشن)
۱۱۔	تذکرۂ سخنِ شعراؔ	عبدالغفور خاں نسّاؔخ
۱۲۔	مُغل اور اُردو	نواب نصیر حسین خیاؔل
۱۳۔	آئینِ اکبری	ابوالفضل
۱۴۔	رسالہ تصوّف و اخلاق	خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی
۱۵۔	معراج العاشقین	خواجہ سید محمد گیسو دراز (انجمن ترقی اُردو ایڈیشن)
۱۶۔	دکن میں اُردو	نصیر الدین ہاشمی
۱۷۔	تذکرۂ شعرائے دکن	عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری
۱۸۔	تذکرۂ گلِ رعنا	مولوی عبدالحیٔ
۱۹۔	یورپ میں دکنی مخطوطات	نصیر الدین ہاشمی

نمبر	نام تذکرہ	نام مصنف
۲۰-	اُردوئے قدیم	شمس اللہ قادری
۲۱-	رسالہ در تحقیق زبان ریختہ	مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ
۲۲-	اُردو سروے رپورٹ (۱۹۲۵ء)	ضامن علی- ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد
۲۳-	تاریخ فیروز شاہی	ضیاء الدین برنی
۲۴-	تاریخ فیروز شاہی	عفیف سراج
۲۵-	آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد
۲۶-	فرہنگِ آصفیہ	سید احمد دہلوی
۲۷-	تاریخ فرشتہ	حکیم محمد قاسم فرشتہ
۲۸-	'ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر از بین BEAN (انگریزی)	
۲۹-	'ہندوستان کی لسانی پیمائش' (انگریزی)۔ سر گریرسن GRIERSON	
۳۰-	'ہندوستانی علم الالسنہ' (انگریزی)۔ ڈاکٹر گلکرائیسٹ GILCHRIST	
۳۱-	'ایشیائی تحقیقات' (انگریزی)۔ ڈاکٹر کیل بروک CALEBROOK	
۳۲-	'ہندوستانی لٹریچر کی تاریخ' (جرمن)۔ ڈاکٹر ونٹرنز WINTERNITZ	
۳۳-	مقالاتِ اُردو۔ مرتبہ انجمن اُردوئے معلّٰی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	
۳۴-	'عرب و ہند کے تعلقات'۔ سید سلیمان ندوی (اُردو اکاڈمی۔ الہ آباد)	
۳۵-	تذکرۂ نکات الشعراء	میر تقی میر
۳۶-	تذکرۂ ریختہ گویان	گردیزی
۳۷-	تذکرۂ گلشنِ ہند	مرزا علی لطف
۳۸-	تذکرۂ گلشن بیخار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
۳۹-	تذکرۂ شعرائے گجرات	فائق
۴۰-	تذکرۂ مخزنِ نکات	قائم چاند پوری
۴۱-	تذکرۂ چمنستانِ شعراء	شفیق اورنگ آبادی
۴۲-	تذکرۂ ہندی گویان	مصحفی
۴۳-	تذکرۂ طبقات الشعراء	کریم الدین

نمبر	نام تذکرہ	نام مصنف
۴۴۔	تاریخِ ادبِ اردو (انگریزی)	رام بابو سکسینہ (اردو ترجمہ از عسکری)
۴۵۔	نمونۂ منشورات	احسن مارہروی
۴۶۔	تحفۃ الشعراء	محمد افضل بیگ اورنگ آبادی
۴۷۔	طبقات الشعراء	قدرت اللہ شوق سنبھلی
۴۸۔	تذکرۂ گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر
۴۹۔	تذکرۂ شعرائے دکن	سردار علی حیدر آبادی
۵۰۔	تذکرۂ گلستانِ سخن	صہبائی
۵۱۔	تذکرۂ بزمِ سخن	سید علی خاں
۵۲۔	تذکرۂ طورِ کلیم	نور الحسن خاں
۵۳۔	گلشنِ گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی
۵۴۔	خُم خانۂ جاوید	لالہ سری رام
۵۵۔	تذکرۂ نوائے وطن	شاد عظیم آبادی
۵۶۔	تذکرۂ آبِ بقا	مرزا جعفر علی نشتر لکھنوی
۵۷۔	تذکرۂ ہندو شعراء	خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی
۵۸۔	تذکرۃ الشعراء	مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی
۵۹۔	سرمایۂ زبانِ اردو	جلال لکھنوی
۶۰۔	اردو لٹریچر کی تاریخ (انگریزی)۔	گراہم بیلی GRAHAM BAILEY
۶۱۔	اردو کے یوروپی شعراء	محمود علی خاں اورنگ آبادی
۶۲۔	اردو لٹریچر کی تاریخ (انگریزی)۔	سر چارلس لایل CHARLES LYALL
۶۳۔	تذکرۂ معرکۂ سخن	عبد الباری آسی۔
۶۴۔	جدید اردو شاعری	عبد القادر سروری
۶۵۔	اردو شہ پارے	پروفیسر ڈاکٹر زور
۶۶۔	اربابِ نثرِ اردو	سید محمد
۶۷۔	شعر الہند	مولوی عبد السلام ندوی

نام	نام تذکرہ	نام مصنف
۶۸۔	کاشف الحقایق	نواب سید امداد امام اثرؔ
۶۹۔	سیر المصنفین	محمد یحییٰ تنہاؔ
۷۰۔	دیبوا اسکول آف اردو لٹریچر	سر شیخ عبدالقادر
۷۱۔	تاریخ نظم و نثر اردو	آغا محمد باقر
۷۲۔	تذکرۂ جمیل	مشیر احمد علوی ناظر
۷۳۔	مختصر تاریخ ادبِ اردو	پروفیسر سید اعجاز الہ آبادی
۷۴۔	اردو کے اسالیبِ بیان	پروفیسر ڈاکٹر زورؔ
۷۵۔	نغمۂ عندلیب	حکیم قطب الدین باطنؔ اکبر آبادی